میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068

ڈاکٹر نجم السحر بٹ

ماسٹر اور مارگریٹا

میخائیل بلگاکوف

ماسٹر اور مارگریٹا

روسی ناول

مصنف

میخائیل بلگاکوف

مترجم

ڈاکٹر نجم السحر بٹ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Mikhail Bulgakov
Master Aur Margarita/ Mikhail Bulgakov, tr. by Dr. Najam-ul Sahar Butt.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2011.
400pp.
1. Literature - Novel.
I. Title.

2011
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2458-6
ISBN-13: 978-969-35-2458-1

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

میرے والدؒ

مشہور صحافی بدرالاسلام بَٹ کے نام

جن کا قلم ہمیشہ حق کی آواز بلند کرتا رہا۔

پیش لفظ

میخائل بُلگا کوف کا شمار بیسویں صدی کے بلند پایہ ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ میخائل 1891ء میں یُوکرائن کے شہر کیف میں پیدا ہوئے۔ میڈیسن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ بطور ڈاکٹر فوج میں خدمات انجام دیتے رہے۔ 1920ء میں بُلگا کوف کے اندر پوشیدہ ادیب نے انہیں ڈاکٹری کا پیشہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ شہرہ آفاق ناول "ماسٹر اور مارگریٹا" بلاشک وشبہ ادبی حلقوں میں ماسٹر پیس کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اس ناول میں ادیب کا تخیل اور انداز بیان اتنا پُر اثر ہے کہ قاری خود کو کہانی کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ ناول بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے اوائل میں رقم کیا گیا۔ اس ناول میں جس خوبصورتی سے سماجی برائیوں پر تنقید کی گئی ہے، رومانس اور مزاح کا بلند معیار روا رکھا گیا ہے، انسانیت کی قدیم تاریخ کے بعض پہلو، فلسفے کے مختلف نظریات اور تصوراتی دنیا کا جو اچھوتا امتزاج پیش کیا گیا ہے وہ صرف اور صرف میخائل بُلگا کوف کا ہی خاصہ ہے۔

میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں بُلگا کوف کی اس لازوال تخلیق کو اپنے ہم وطنوں کے لئے عام کر سکوں۔ کم وبیش پانچ سال قبل میں نے ماسٹر اور مارگریٹا کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ابتدائی لمحات میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ کچھ تو میری اردو زبان کی ناپختگی اور کچھ میری پیشہ ورانہ مصروفیات ہمیشہ آڑے آتی رہیں (میں بھی بُلگا کوف کا ہم پیشہ میڈیکل ڈاکٹر ہوں) چند باب ترجمہ کرنے کے بعد میں نے ایک لمبا عرصہ دوبارہ قلم ہاتھ میں نہیں لیا۔ گذشتہ ایک ڈیڑھ سال کے دوران میرے کچھ دوستوں نے ترجمہ کرنے کی میری خواہش کو دوبارہ بیدار کر دیا اور میں نے از سرنو لکھنا شروع کر دیا۔ ترجمہ دوبارہ شروع کرنے کی ایک دوسری وجہ پاکستان میں روز بروز بڑھتی ہوئی کرپشن، رشوت خوری، معاشی بدحالی اور گرتی ہوئی اخلاقی اقدار بھی ہیں کیونکہ یہی وہ تمام مسائل ہیں جنہیں میخائل بُلگا کوف نے اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔

میں نے میڈیسن کی تعلیم کے سلسلے میں گیارہ برس ماسکو میں گزارے۔ اس دوران روسی زبان پر

عبور حاصل کرنے کے علاوہ مجھے روسی ثقافت، روسی لوگوں کے طرز زندگی اور ان کے انداز فکر کا بھی بخوبی مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ مواقع روسی لٹریچر کو بہتر طور پر سمجھنے میں بہت مددگار ثابت ہوئے۔ مغربی خصوصاً یورپی لوگوں کے برعکس روسیوں کی عادات اور افکار بہت حد تک مشرقی لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ سائبیریا سے نقل مکانی کر کے پاکستان آنے والی مرغابیاں اور سرد ہوائیں بھی شائید دونوں قوموں کے مزاج میں قدر مشترک پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

روسی ادیبوں کا طرز تحریر عمومی طور پر اردو کے اہل قلم سے بہت مختلف ہے۔ میخائل بُلگا کوف کا انداز بیاں تو بالخصوص منفرد خوبیوں کا حامل ہے۔ میں نے اپنے تئیں ممکنہ حد تک اس کلاسیکل ناول کی روح اور اس کے مصنف کا طرز تحریر اردو میں بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے تاکہ پڑھنے والے مصنف کے مزاج اور انداز تحریر سے بہتر طور پر متعارف اور لطف اندوز ہو سکیں۔ متعدد کرداروں اور جگہوں کے نام، جن کی اردو میں ادائیگی کافی مشکل ہے۔ میں نے آسانی کے لیے ایک حد تک تبدیل کر دیئے ہیں۔ کچھ نام جو واقعی ہمارے ناموں سے ملتے جلتے ہیں برقرار رکھے ہیں۔ روسی زبان سے براہ راست اردو ترجمے کی یہ پہلی کاوش ہے اور یقیناً اس میں بہتری کی کافی گنجائش موجود ہے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ خامیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اردو دان اس منفرد ماسٹر پیس ناول سے یقیناً لطف اندوز ہونگے۔

ماسٹر اور مارگریٹا کے ترجمے میں معاونت پر میں اپنے والد بدر الاسلام بٹ، اپنی اہلیہ ڈاکٹر زیب النسا، بیٹوں خرم، حمزہ، بیٹی الینا اور میرے دوستوں ڈاکٹر فاروق، ڈاکٹر ارشد، ڈاکٹر ہدا، ڈاکٹر نوشین اور رضوانہ کا ممنون ہوں۔

حصہ اول

باب اول

ناواقف لوگوں سے ہرگز بات نہ کریں

موسم بہار کا ایک گرم دن تھا۔ ماسکو شہر کی ایک معروف گلی میں دو آدمی نمودار ہوئے۔ ایک کی عمر تقریباً ساٹھ برس ہوگی۔ اس نے گرمیوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا قد چھوٹا، جسم موٹا اور سر گنجا تھا۔ ہاتھ میں اس نے نہایت احتیاط سے اپنی ٹوپی پکڑ رکھی تھی اور آنکھوں پر چہرے کی مناسبت سے بہت بڑے حجم کا سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ دوسرا آدمی پہلے سے عمر میں کم، گٹھے ہوئے جسم کا مالک، سر کے سنہرے بال ایک مختصری رنگ برنگی ٹوپی میں چھپانے کی ناکام کوشش کیئے اور سلوٹوں سے بھری سفید پتلون کے نیچے سیاہ چپل پہنے ہوئے تھا۔

پہلا شخص ماسکو کے ایک مشہور ادبی رسالے کا ایڈیٹر مائیکل بیرلی تھا جو اس کے علاوہ شہر کی ایک بہت بڑی ادبی انجمن کا بھی صدر تھا۔ اس کا ساتھی ایک شاعر ایوان پانیر تھا جس کا تخلص ''بے گھر'' تھا۔

قدرے چھاؤں میں پہنچنے کے بعد دونوں کی نظریں بیک وقت سامنے لگے بورڈ ''جوس کارنر'' پر پڑیں اور وہ جلدی سے اس میکدے کی جانب لپکے۔

یہاں مئی کی اس شام کے متعلق ایک انہونی بات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ شہر کی یہ معروف گذرگاہ اس وقت خلاف معمول سنسان پڑی تھی۔ نہ کوئی آنے والا اور نہ کوئی جانے والا۔ جس کی اس فضا میں جب سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا کوئی بنی نوع ''جوس کارنر'' سے مستفید ہونے نہیں آ رہا تھا۔

سیب کا جوس ہوگا؟ مائیکل نے پوچھا۔

نہیں ہے۔ کاؤنٹر پر موجود خاتون نے جواب دیا اور نجانے کیوں ناراض بھی ہوگئی۔

آب جو تو ضرور ہوگا۔ بے گھر نے پوچھا۔

نہیں ہے۔ شام کو سپلائی آئے گی۔ جواب ملا۔ صرف آڑو کا جوس ہے اور وہ بھی گرم ہے۔ خاتون نے اعلان کیا۔

کوئی بات نہیں۔ چلے گا۔ لاؤ جلدی سے دو گلاس دے دو۔

آڑو کا جوس پینے کے بعد دونوں ادیبوں کو ہچکی نے گھیر لیا۔ وہ پیسے ادا کرنے کے بعد سڑک کے پار لگے بنچ پر براجمان ہو گئے۔

یہاں اس شام کا دوسرا غیر معمولی واقعہ رونما ہوا۔ مائیکل کی ہچکی اچانک رک گئی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا اور ایک لمحے کے لئے کہیں غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد واپس تو لوٹ آیا لیکن ایک کانٹے کی چبھن کے ساتھ۔ مائیکل پر ایک عجیب سا خوف طاری ہو گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پیچھے نظر ڈالے بغیر اس جگہ سے بھاگ جائے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے کس چیز نے خوف زدہ کر دیا ہے۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ ''شائید میرا دل کچھ گڑبڑ کر رہا ہے''۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ''غالباً میں کام کی زیادتی کی وجہ سے بہت زیادہ تھک گیا ہوں اور اب یہ سارے دھندے چھوڑ کر مجھے چھٹی لے کر پہاڑوں کی سیر کرنے چلے جانا چاہیے''۔

اسی لمحے اس کے سامنے گردش کرنے والی ہوا تھم گئی اور اس میں ایک شفاف عجیب الخلقت شخص ظاہر ہوا۔ اس کے چھوٹے سے سر پر گھڑسواروں والی ٹوپی تھی اور تن پر دھاری دار کوٹ۔ اس آدمی کا قد دراز، شانے سکڑے، جسم ناقابلِ بیاں حد تک دبلا اور چہرہ کارٹون جیسا تھا۔

مائیکل کی زندگی کچھ اس طرح گذری تھی کہ وہ غیر معمولی چیزوں اور حادثات کا عادی نہیں تھا۔ اس کا رنگ مزید سفید ہو گیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ لیں اور اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا''۔ لیکن ایسا ہو رہا تھا۔ لمبا تڑنگا آدمی جو شیشے کی طرح شفاف تھا ہوا میں معلق اس کے سامنے کبھی دائیں کبھی بائیں جھول رہا تھا۔ خوف مائیکل پر اس حد تک طاری ہو گیا کہ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جب انہیں کھولا تو سب کچھ غائب ہو چکا تھا۔ ہوا شفاف ہو چکی تھی اور دھاری دار کوٹ والا تحلیل ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مائیکل کے دل میں چبھا کانٹا بھی نکل چکا تھا۔

''ہت تیرے کی''۔ مائیکل بولا۔ ''ایوان تمہیں معلوم ہے میں ابھی شدت گرما کا شکار ہونے لگا تھا بلکہ مجھے تو کچھ تشبیہیں (جمع، تشبیہ۔ مترجم) بھی دکھائی دینے لگی تھیں''۔ اس نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں سے ابھی تک خوف عیاں ہو رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

بہر حال اس کا خوف آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا اور خود اعتمادی بحال ہو گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے رومال کو جھٹکا اور آڑو کا جوس پینے سے قبل جاری گفتگو کو دوبارہ شروع کیا۔

یہ گفتگو، جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تھی۔ دراصل مائیکل نے بحیثیت ایڈیٹر، شاعر "بے گھر" کو مذہب پر ایک تنقیدی نظم لکھنے کو کہا تھا۔ نظم تو "بے گھر" نے بہت جلد کہہ ڈالی لیکن بدقسمتی سے ایڈیٹر کو یہ نظم پسند نہ آئی۔ اس نظم میں "بے گھر" نے اپنی تنقید کا نشانہ حضرت عیسیٰ کو بنایا تھا اور آپ کی شخصیت کو بے حد مسخ شدہ صورت میں پیش کیا تھا۔ نظم "بے گھر" کو واپس تھما کر دوبارہ لکھنے کو کہا گیا۔ اب مائیکل شاعر کو حضرت عیسیٰ کے بارے میں لیکچر دے رہا تھا تا کہ اسے اپنی بنیادی غلطی کا علم ہو سکے۔

نظم میں شاعر نے جس انداز سے (بے شک منفی ہی سہی) حضرت عیسیٰ کی شخصیت کو پیش کیا تھا وہ ایک جیتے جاگتے انسان کی تصویر لگتی تھی۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس میں شاعر کی تخلیقی سوچ کا دخل تھا یا وہ اس موضوع سے ہی ناواقف تھا۔

مائیکل شاعر پر یہ بات ثابت کرنا چاہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ کی شخصیت نہ تو اچھی تھی اور نہ ہی بری۔ دراصل ان کا (نعوذ باللہ۔ مترجم) وجود ہی نہیں تھا اور ان کے بارے میں تمام داستانیں دراصل انسانی ذہن کی اختراع ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ مائیکل بہت مستعلیق آدمی تھا۔ وہ اپنے نظریئے کو درست ثابت کرنے کے لئے مشہور تاریخ دانوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مثلاً سکندریہ کے نیلوں اور عقل وفہم کا دریا کہلانے والے یوسف فلاویہ کی تحریروں میں کہیں بھی حضرت عیسیٰ کی شخصیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

شاعر جس کے لئے یہ تمام باتیں بالکل نئی تھیں ہمہ تن گوش تھا۔ اپنی سبز آنکھوں سے وہ مائیکل کو گھورے جا رہا تھا۔ بس کبھی کبھار ہچکی اسے ہلا کر رکھ دیتی تو وہ دھیرے سے آڑو کے جوس کو کوس دیتا۔

"کوئی بھی ایسا مشرقی مذہب نہیں ہے"۔ مائیکل اپنا لیکچر جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "جس میں ایک ستم زدہ خاتون نے لوگوں کے لئے ایک نجات دہندہ "خدا" کو جنم نہ دیا ہو۔ انہی مذاہب کی تقلید کرتے ہوئے عیسائیوں نے بھی اپنا خدا یعنی یسوع کو تخلیق کر لیا۔ جبکہ حقیقت میں یسوع کا کوئی وجود تھا ہی نہیں"۔

مائیکل کی بلند آواز ویران گلی میں گونج رہی تھی۔ جوں جوں یہ گفتگو پروان چڑھ رہی تھی توں توں شاعر "بے گھر" کے علم میں بیش قیمت اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آج اسے پہلی مرتبہ زمین و آسمان کے بیٹے، نرم دل مصری خدا "عزیرس" کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ اس کے علاوہ پرانے یونان اور میکسیکو کے خداؤں سے بھی اس کا تعارف آج ہی ہوا تھا۔

عین اس وقت جب مائیکل "بے گھر" کو یہ بتا رہا تھا کہ میکسیکو میں لوگ اپنے خدا کا بت کس طرح بنایا کرتے تھے۔ شہر کی اس سنسان گلی میں پہلا شخص نمودار ہوا۔

بعدازاں مختلف تحقیقی اداروں نے اپنی رپورٹوں میں اس شخص کا جو حلیہ بیان کیا وہ اصل سے کہیں بھی مشابہہ نہیں تھا۔ ایک رپورٹ میں درج تھا کہ وہ آدمی چھوٹے قد کا تھا۔ اس کے دانت سنہری تھے اور وہ دائیں ٹانگ سے لنگڑا رہا تھا۔ دوسری رپورٹ کا کہنا تھا کہ وہ آدمی لمبے قد کا تھا۔ اس کے دانت چاندی کے تھے اور وہ بائیں ٹانگ سے لنگڑا رہا تھا۔ تیسری رپورٹ کے مطابق اس آدمی کے حلیے میں کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ دراصل یہ تمام رپورٹیں حقیقت سے عاری تھیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ آدمی لنگڑا نہیں تھا۔ قد میں نہ تو چھوٹا اور نہ لمبا۔ بس ذرا اونچا تھا۔ جہاں تک اس کے دانتوں کا تعلق ہے تو بائیں جانب اس کے دانت چاندی کے تھے اور دائیں جانب سونے کے۔ اس نے سلیٹی رنگ کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور اسی رنگ کے غیر ملکی جوتے پہنے ہوئے تھا۔ سلیٹی رنگ کی ٹوپی اس نے ایک جانب تھوڑی سی جھکا رکھی تھی جس پر ایک کتے کا سر نقش تھا۔ اس کی عمر بظاہر ساٹھ سال ہوگی۔ منہ قدرے ٹیڑھا، چہرہ صفائی سے شیو کردہ، بال براؤن، دائیں آنکھ سیاہ اور بائیں آنکھ سبز، بھنویں سیاہ لیکن ایک جانب نسبتاً اونچی۔ اپنی ہیئت سے وہ غیر ملکی لگتا تھا۔

ایڈیٹر اور شاعر کے قریب سے گزرتے ہوئے غیر ملکی نے ایک اچٹتی نگاہ ان پر ڈالی اور پھر اچانک ساتھ والے بنچ پر براجمان ہوگیا۔

''جرمن''۔ مائیکل سوچ رہا تھا۔

''انگریز''۔ بے گھر خیال آرائی کر رہا تھا۔''اور اسے دستانوں میں گرمی بھی نہیں لگ رہی''۔

غیر ملکی جس دل چسپی کے ساتھ بلند و بالا عمارتوں پر نظر دوڑا رہا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس جگہ کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے۔ اس نے نظریں بالائی منزلوں کی کھڑکیوں پر مرکوز کر رکھی تھیں جن کے شیشوں پر مائیکل بیرلی کے لئے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں آخری بار بکھر رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں دھیرے دھیرے نچلی منزلوں کی طرف منتقل ہو رہی تھیں جہاں شام کے دھندلے سائے مزید گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ نجانے کیوں غیر ملکی ہولے سے ہنس دیا۔ اس نے دونوں ہاتھ چھڑی پر رکھے اور اپنی ٹھوڑی کو ہاتھوں پر ٹکا دیا۔

''تم نے ایوان''۔ مائیکل کہہ رہا تھا۔''بہت مضحکہ خیز انداز میں خدا کے بیٹے یسوعؑ کی پیدائش کا قصہ بیان کیا ہے۔ لیکن اصل مزاح تو یہ ہے کہ یسوع سے قبل بھی خدا کے بیٹوں کی ایک لمبی قطار پیدا ہوئی تھی۔ مثلاً ادونس، اطیس، مترا وغیرہ۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ تمام خدا انسانی ذہن کے تخلیق کردہ تھے۔ تمہیں اسی نکتے پر زیادہ زور دینا چاہیے۔

اس لمحے "بے گھر" نے اپنی ہچکی کو دبانے کی کوشش میں سانس روک لی جس سے ہچکی مزید بلند آواز ہو گئی۔

مائیکل کو اپنی گفتگو روکنی پڑی کیونکہ غیر ملکی اپنی جگہ سے اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے قریب آ کر رک گیا۔ وہ دونوں اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"معاف کیجئے گا"، غیر ملکی گویا ہوا۔"میں ناواقف ہوتے ہوئے بھی مخل ہو رہا ہوں۔ آپ کی گفتگو کا موضوع ہی اتنا دل چسپ ہے کہ۔۔۔۔۔۔" وہ ٹوپی ہاتھ میں تھامے تھوڑا جھک پڑا۔ مائیکل اور بے گھر کو بھی مجبوراً اس کی تعظیم میں کھڑا ہونا پڑ گیا۔

"نہیں غالباً فرانسیسی ہے"۔ مائیکل سوچ رہا تھا۔

"شائد پولینڈ سے ہے"۔ بے گھر کا خیال تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ "بے گھر" کو یہ غیر ملکی پہلی نظر سے ہی پسند نہیں آیا تھا جبکہ مائیکل کو یہ شخص اچھا یا شائید غیر معمولی لگا تھا۔

"اجازت ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں"۔ غیر ملکی بولا۔ دونوں دوست حیرت زدہ ہو کر اپنی جگہوں سے کھسک گئے اور غیر ملکی ان کے درمیان بیٹھ گیا اور اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

اگر میں نے غلط نہیں سنا تو آپ کے خیال میں حضرت عیسیٰ کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ اپنی سبز آنکھ مائیکل پر ٹکائے بولا۔

نہیں آپ نے غلط نہیں سنا۔ میں نے بالکل یہی کہا تھا۔ مائیکل بولا۔

واہ کیا دل چسپ بات ہے۔ غیر ملکی ادھوری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

اسے کیا تکلیف ہے؟ "بے گھر" سوچ رہا تھا۔

اور آپ اپنے دوست سے متفق ہیں؟ وہ "بے گھر" کی جانب رخ کرتے ہوئے بولا۔

سو فیصد۔ "بے گھر" نے اعتماد سے جواب دیا۔

کمال ہے۔ غیر ملکی بولا۔ اور چوروں کی طرح ادھر ادھر نظر دوڑانے کے بعد قدرے دھیمی آواز میں کہنے لگا۔"آپ لوگوں کی گفتگو جہاں تک میری سمجھ میں آتی ہے آپ لوگ اور بہت ساری چیزوں کے علاوہ خدا کی موجودگی سے بھی منکر ہیں"۔ اس نے آنکھوں میں خوف بھرتے ہوئے آہستہ سے مزید کہا۔ "ڈرو نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا"۔

"ہاں، ہاں ہم خدا کو نہیں مانتے"۔ مائیکل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔"اور یہ بات ہم مکمل آزادی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں"۔

آپ لوگ دہریئے ہیں؟

ہاں ہم دہریئے ہیں۔ مائیکل نے جواب دیا۔ ''بے گھر'' سوچ رہا تھا۔'' لگتا ہے یہ غیر ملکی بطخ ہمیں چپک ہی گئی ہے''۔

ارے واہ! کیا بات ہے! حیرت زدہ غیر ملکی نے بلند آواز میں نعرہ لگایا اور لٹو کی طرح سر گھما گھما کر کبھی مائیکل کو اور کبھی شاعر کو دیکھ رہا تھا۔

''ہمارے ملک میں دہریہ پن کسی کے لئے اچنبھے کی بات نہیں ہے''۔ مائیکل نے قدرے شائستہ انداز میں کہا۔'' ہماری زیادہ تر آبادی باشعور ہے اور عرصہ ہوا خدا کے بارے میں قصے کہانیوں پر یقین نہیں رکھتی''۔

غیر ملکی ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے جذبے کے ساتھ مائیکل کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔'' میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں''۔

''یہ آپ کس بات کا شکریہ ادا کر رہے ہیں''۔ ''بے گھر'' نے پوچھا۔

اس اہم ترین نظریئے کا۔ جو کہ مجھ جیسے دیس دیس جانے والے کے لئے بہت ہی دل چسپ ہے۔ غیر ملکی نے انگلیاں ہوا میں نچاتے ہوئے کہا۔

نہیں یہ ''انگریز'' نہیں ہے۔ مائیکل سوچ رہا تھا اور شاعر کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ یہ غیر ملکی باشندہ ان کی زبان اتنی روانی کے ساتھ کیونکر بول رہا ہے۔

''لیکن آپ کی اجازت سے ایک سوال پوچھنا چاہوں گا''۔ کچھ توقف کے بعد غیر ملکی بولا۔'' خدا کی موجودگی کے حق میں جو پانچ ثبوت پائے جاتے ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

ہاتھ مسلتے ہوئے مائیکل بولا۔ ارے ان ثبوتوں کا کیا پوچھتے ہو۔ انسانوں نے ان ثبوتوں کو عرصہ ہوا دفن کر دیا ہے اور آپ کو مجھ سے متفق ہونا پڑے گا کہ عقل اور فہم کے دائرے میں ان ثبوتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

''خوب، بہت خوب''۔ غیر ملکی بولا۔'' آپ نے تو مرحوم بزرگوار م مینوئل کا نظریہ من و عن بیان کر دیا ہے۔ لیکن لطیفہ تو یہ ہے کہ اس نے پانچوں ثبوتوں کی دھجیاں بکھیرنے کے بعد ایک لحاظ سے خود اپنا ہی مذاق اڑایا تھا اور خدا کی موجودگی کا ایک چھٹا ثبوت پیش کر دیا تھا۔

''اچھا تو آپ مشہور فلسفی کانت کے پیش کردہ ثبوت کی بات کر رہے ہو''۔ قدرے مسکراتے ہوئے علم سے لبریز مائیکل نے کہا۔'' اس ثبوت کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اسی لئے تو اس کے بہت سے ہم عصر فلسفیوں نے کہا تھا کہ کانت کا ثبوت صرف غلاموں کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

''اس قسم کے ثبوت پیش کرنے پر کانٹ کو ذرا تین سال کے لئے سائبیریا بھیج دیا جائے تو اس کی عقل ٹھکانے آ جائے''۔ اچانک ''بے گھر'' بول اٹھا۔

مائیکل نے بے گھر کو گھورتے ہوئے کچھ اشارہ کیا۔ جبکہ غیر ملکی کانٹ کو سائبیریا بھیجنے کی بات سن کر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ بلکہ یہ بات اسے بہت بھلی لگی تھی۔

''میں نے اس بوڑھے کھوسٹ کو ناشتے کی میز پر کہا بھی تھا''۔ غیر ملکی بولا ''پروفیسر آپ نے جو یہ نیا شوشہ چھوڑا ہے یہ بلاشبہ بہت عقلمندی کا مظاہرہ ہے لیکن بات کچھ ناگوار لگتی ہے۔ لوگ آپ کو کوسا کریں گے''۔

مائیکل کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں۔ ''فلسفی کانٹ کے ساتھ ناشتے کی میز پر؟ یہ کیا بک رہا ہے''۔ وہ سوچ رہا تھا۔

غیر ملکی اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بے گھر سے مخاطب تھا۔ ''لیکن اسے اب سائبیریا بھیجنا ممکن نہیں ہے کیونکہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوا وہ ایسی جگہ منتقل ہو چکا ہے جو سائبیریا سے بھی کہیں دور ہے اور وہاں سے اسے واپس لانا ممکن نہیں ہے''۔

''افسوس صد افسوس''۔ شاعر نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''مجھے بھی بہت افسوس ہے''۔ اجنبی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا ''لیکن جو سوال مجھے گھیرے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ اگر خدا کی ہستی کا وجود نہیں ہے تو پھر انسانوں کی زندگی کون چلاتا ہے اور اس تمام دنیا کے کاروبار کس کے ماتحت ہیں؟''۔

''خود انسان ہی سب کچھ چلاتا ہے''۔ جلدی سے قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے شاعر نے کہا۔

''معذرت چاہتا ہوں''۔ غیر ملکی دھیمے سے بولا ''کوئی بھی کام چلانے کے لئے ایک خاص مدت کے لئے کسی نہ کسی شکل میں ایک واضح پلان کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان یہ سب کچھ کیسے کنٹرول کر سکتا ہے۔ جبکہ وہ تو نہ صرف ایک مضحکہ خیز حد تک مختصر عرصے مثلاً ایک ہزار سال کے لئے بھی کوئی واضح پلان مرتب نہیں کر سکتا۔ بلکہ اپنے آنے والے کل کے متعلق بھی وہ کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتا۔ ایک لمحے کے لئے فرض کر لیں''۔ غیر ملکی مائیکل سے مخاطب ہوا۔ ''کہ آپ نے دوسروں کی اور اپنی زندگی کو کنٹرول کرنا شروع کر دیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ آپ کو اس کام کا لطف آنا شروع ہو گیا ہے اور اچانک۔ ہی! ہی! آپ کو پھیپھڑے کا کینسر ہو جاتا ہے''۔ غیر ملکی نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ (یوں لگتا تھا کہ پھیپھڑے کے کینسر کا ذکر کرتے وقت اسے ذہنی سکون مل رہا تھا)۔

''جی ہاں۔ کینسر''۔ وہ بلیوں کی طرح آنکھیں سکیڑتے ہوئے بلند آواز میں کہنے لگا۔ ''اور پھر آپ کا سارا کنٹرول بھک سے اڑ گیا۔ ایسی کیفیت میں آپ غالباً کسی دوسرے کی زندگی کے معاملات کے

بارے میں سننا بھی پسند نہیں کریں گے۔ قریبی رشتہ دار آپ سے جھوٹ بولنے لگتے ہیں اور آپ کچھ گڑ بڑ محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹروں کے ہاں چکر لگانے شروع کردیتے ہیں۔ ان سے ناامید ہوتے ہیں تو عطائیوں کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ نجومیوں کے پاس جانے سے بھی نہیں جھجکتے۔ لیکن یہ ساری تگ و دو بے کار ہے اور اس کا کوئی مثبت حاصل نہیں ہے۔ یہ بات آپ بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں۔ بالآخر اس کہانی کا انجام المناک انداز میں ہوتا ہے۔ وہ شخص جو کچھ دیر پہلے یہ دعوے کررہا تھا کہ وہ دوسروں کی زندگی کو کنٹرول کرسکتا ہے اچانک لکڑی کے تابوت میں ساکن پڑا ہوتا ہے۔ اس کے گرد جمع لوگ یہ جانتے ہوئے کہ اب اس شخص کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ اسے یا تو منوں مٹی کے نیچے دبا دیتے ہیں یا آگ کی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں۔ بلکہ حالات اس سے بھی بدتر پیش آسکتے ہیں۔ ایک شخص پہاڑوں پر سیر کے لئے جانے کا پروگرام بناتا ہے (وہ مائیکل پر نظریں جمائے کہہ رہا تھا) بظاہر یہ ایک معمولی کام ہے لیکن وہ اسے بھی مکمل نہیں کرسکتا کیونکہ وہ تھوڑی دیر بعد انجانے میں اچانک پھسلے گا اور کسی ٹرام کے نیچے کچلا جائے گا''۔

''کیا آپ اب بھی یہی کہیں گے کہ وہ اپنی زندگی کو خود کنٹرول کررہا تھا۔ نہیں صاحب! یہاں یہ کہنا غالباً درست ہوگا کہ کوئی دوسرا اس کی زندگی کی ڈور سنبھالے ہوئے ہے''۔ یہ کہنے کے بعد اجنبی ایک عجیب سے انداز میں ہنس پڑا۔

مائیکل کینسر اور ٹرام کے بارے میں اجنبی کی گفتگو بہت غور سے سن رہا تھا۔ نجانے کیوں اس کے دماغ میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں اور ایک ہی بات اس کے ذہن میں گونج رہی تھی کہ یہ شخص غیر ملکی نہیں ہے، غیر ملکی نہیں ہے۔ یہ تو کوئی عجیب ہی چیز ہے۔ نجانے کون ہے۔

''آپ سگریٹ پئیں گے؟'' اجنبی اچانک بے گھر سے مخاطب ہوا۔ ''کون سے پسند کریں گے آپ؟''۔

''آپ کے پاس کیا رنگ برنگ ہیں؟'' جلے بھنے شاعر نے پوچھا۔

''ارے آپ فرمائیے تو سہی کون سا برانڈ پسند کریں گے؟''۔ اجنبی نے دوبارہ پوچھا۔

''ہمارا نشان''۔ شاعر غصے میں بولا۔

اجنبی نے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر کھولا اور شاعر کو پیش کرتے ہوئے کہا ''لیجئے یہ رہا، ہمارا نشان''۔

مائیکل اور شاعر کو اس بات نے اتنا حیران نہیں کیا کہ سگریٹ کیس سے واقعی ''ہمارا نشان'' برآمد ہوا، جتنا کہ خود سگریٹ کیس نے۔ یہ سگریٹ کیس غیر معمولی طور پر بڑا تھا اور غالباً سونے کا بنا ہوا تھا۔ اس کے ڈھکن پر نیلے اور سفید رنگ کے شعلے لپکاتی ہیروں کی مثلث جڑی تھی۔

شاعر اور اجنبی نے سگریٹ سلگا لئے جبکہ مائیکل سوچ رہا تھا کہ اجنبی کو غالباً اس طرح جواب دینا چاہیے تھا کہ ہاں انسان فانی ہے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی منکر نہیں ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔ مائیکل اپنی اس سوچ کو الفاظ میں ادا نہ کرسکا کیونکہ غیر ملکی اس سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''جی ہاں۔ انسان فانی ہے۔ یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ انسان کی موت ناگہانی ہے۔ اچانک ہے۔ اور وہ تو وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ آج شام وہ کیا کرے گا۔

''آپ کچھ زیادہ ہی فلسفی بن رہے ہیں''۔ مائیکل بولا ''مجھے اپنی آج شام کی مصروفیات کے متعلق تقریباً سب کچھ معلوم ہے۔ ہاں اگر گلی سے گزرتے ہوئے میرے سر پر کوئی اینٹ نہ آن پڑے تو۔۔۔۔۔۔''

''اینٹ کسی کے سر پر بلاوجہ نہیں گرتی''۔ اجنبی مائیکل کی بات کاٹتے ہوئے بولا ''اور ہاں جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو یقین مانئے آپ کو اینٹ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ کی موت کسی اور طرح سے ہوگی''۔

''ارے واہ!'' مائیکل محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر ہوسکتا ہے آپ کو معلوم ہو کہ میری موت کیسے ہوگی۔ ذرا میں بھی تو جانوں''۔

''کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ یقیناً''۔ غیر ملکی بولا۔ وہ مائیکل کو ایسی نظروں سے گھور رہا تھا کہ جیسے درزی اس کا ماپ لے رہا ہو۔ وہ دکھیا انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''ایک۔ دو۔ زہرہ دوسرے گھر میں ہے۔ چاند اوجھل ہوگیا ہے۔ چھ۔ حادثہ۔ شام۔ سات''۔ اس نے اچانک بلند آواز میں اعلان کیا۔ ''آپ کی گردن کاٹ دی جائے گی''۔

مائیکل اس مذاق سے بالکل محظوظ نہیں ہوا تھا اور عجیب وغریب نفرت اور خوف کے جذبات سے بھرپور نگاہیں اجنبی پر ٹکاتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ کام کون کرے گا؟ دشمن؟ کوئی غیر ملکی؟ یا تخریب کار؟''۔

''نہیں''۔ اجنبی نے جواب دیا۔ ''ایک روسی لڑکی, آپ کی ہم خیال لڑکی''۔

''اونہہ'' شانے اچکاتے ہوئے مائیکل بولا۔ ''بھائی صاحب یہ ناممکن ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا''۔

''معاف کیجئے گا، ایسا ہی ہے''۔ غیر ملکی بولا۔ ''ہاں اگر کوئی خفیہ بات نہیں تو بتائیے کہ آج شام آپ کی کیا مصروفیات ہیں''۔

''کچھ خفیہ نہیں۔ ابھی میں کچھ دیر کے لئے گھر جاؤں گا۔ اس کے بعد دس بجے رات ماسکو کے اہل قلم کی ایک میٹنگ ہے اور میں اس تقریب کی صدارت کروں گا''۔ مائیکل نے جواب دیا۔

''نہیں، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا''۔ غیر ملکی نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''وہ کیوں؟''

''کیونکہ'' غیر ملکی جواب دیتے ہوئے آسمان کو گھورے جا رہا تھا۔''انوشکا نے سورج مکھی کا تیل خرید لیا ہے۔ نہ صرف خرید لیا ہے بلکہ گرا بھی دیا ہے۔اس لئے میٹنگ آج نہیں ہوگی''۔

مائیکل غیر ملکی کی بے ربط پاگلانہ گفتگو کو سمجھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔''یہ سورج مکھی کا تیل بیچ میں کہاں سے آن ٹپکا اور یہ انوشکا کون ہے؟''۔

''میں بتاتا ہوں کہ سورج مکھی کا تیل کہاں سے آن ٹپکا ہے''۔ بہت دیر سے خاموش شاعر بے گھر نے اس فضول گفتگو سے تنگ آ کر غیر ملکی کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے کہا''آپ جناب والا'' وہ اجنبی سے مخاطب ہوا''کبھی ذہنی امراض کے ہسپتال نہیں گئے؟''۔

''ایوان'' مائیکل نے اسے گھورا۔

لیکن غیر ملکی نے بالکل برا نہیں منایا۔''گیا تھا۔کئی بار گیا تھا''۔ وہ شاعر پر نظریں جمائے بولا ''میں تو ہر جگہ جا چکا ہوں۔بس افسوس ہے تو اس بات کا کہ پروفیسر صاحب سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ''ذہنی خلفشار'' کیا ہوتا ہے۔ جناب ایوان بے گھر صاحب''۔

اپنا پورا نام سن کر شاعر اچھل پڑا اور بولا''آپ کو میرا پورا نام کس نے بتایا؟''۔

''ارے آپ کو کون نہیں جانتا'' اس نے جیب سے گذشتہ روز کا''ادبی اخبار'' نکال لیا جس کے پہلے صفحہ پر بے گھر کی تصویر اس کی تازہ نظم کے ساتھ چھپی تھی۔

''میں معذرت چاہتا ہوں''۔شاعر بولا''میں اپنے دوست کے ساتھ کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں''۔

''ضرور ضرور، میں یہاں بہت سکون میں ہوں۔ ویسے بھی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے''۔ غیر ملکی مسکراتے ہوئے بولا۔

شاعر مائیکل کو ایک طرف لے گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔''مائیکل یہ آدمی کوئی غیر ملکی وغیرہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ کوئی تارک وطن روسی ہے اور یہاں جاسوسی کرنے آیا ہے۔ اس سے قبل کہ یہ یہاں سے بھاگ جائے اس کے کاغذات چیک کرنے چاہئیں''۔

''تمہارا خیال درست لگتا ہے''۔ مائیکل بولا

''میری بات کا یقین کرو، مائیکل، شاعر اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔''یہ آدمی جان بوجھ کر پاگل بنا ہوا ہے۔ نہ جانے ہم سے کیا معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آؤ ذرا اس کی خبر لیں''۔ وہ مائیکل کو بازو سے کھینچتا ہوا اس بنچ کے پاس لے آیا جہاں چند لمحے قبل غیر ملکی بیٹھا تھا،لیکن اب وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سبزی مائل کتابچہ،ایک لفافہ اور ایک شناختی کارڈ دبا رکھا تھا۔

''معاف کیجئے اس دل چسپ بحث میں، میں اپنا تعارف کرانا بھول گیا۔ یہ میرا پاسپورٹ ہے، یہ میرا شناختی کارڈ ہے اور یہ ماسکو کا ویزا۔ دراصل مجھے یہاں مشاورت کے لئے دعوت دی گئی ہے۔ یہ رہا آپ کی حکومت کا دعوت نامہ''۔ اجنبی دونوں دانش وروں کو مسکراتی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

ہت تیرے کی۔ اس کے کان کتنے تیز ہیں۔ سب کچھ سن لیا ہے اس نے۔ یہ سوچتے ہوئے مائیکل نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہمیں آپ کے کاغذات دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس دوران شاعر نے اجنبی کے کارڈ پر اس کے نام کا پہلا حرف "W" دیکھ لیا تھا جس سے پہلے لفظ پروفیسر درج تھا۔

اجنبی نے اپنے کاغذات جیب میں ڈال لئے۔ تینوں کے بیچ جو تناؤ بڑھ رہا تھا وہ کم ہو گیا۔ بنچ پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے مائیکل نے پوچھا۔ ''تو آپ ہمارے ہاں بطور مشیر مدعو ہیں، جناب پروفیسر صاحب؟''۔

''جی ہاں، بطور مشیر''

''آپ جرمن ہیں؟''۔ مائیکل نے پوچھا

''کون میں؟ غیر ملکی کچھ سوچتے ہوئے بولا'' جی ہاں غالباً جرمن ہی ہوں''۔

''آپ روسی زبان بہت روانی سے بولتے ہیں''۔ مائیکل تعریفی انداز میں بولا۔

''جی ہاں۔ دراصل مجھے بہت سی زبانوں پر عبور حاصل ہے''۔ پروفیسر نے جواب دیا۔

''کس شعبے سے آپ کا تعلق ہے''۔

''میرا شعبہ، کالا علم ہے''۔

''اور آپ کو اس قسم کے شعبے پر مشاورت کے لئے دعوت دی گئی ہے؟''۔ حیرت زدہ مائیکل نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ دراصل یہاں سرکاری لائبریری میں دسویں صدی کے کالے علم کے مشہور ماہر 'آوریل' کے تحریر کردہ کچھ نسخے دریافت ہوئے ہیں اور انہی نسخوں کو سمجھنے کے لئے مجھے یہاں بلایا گیا ہے کیونکہ میں دنیا میں کالے علم کا واحد ماہر ہوں''۔

''اچھا تو آپ تاریخ دان ہیں'' سکھ کا سانس لیتے ہوئے مائیکل بولا۔

''میں تاریخ دان! آپ نے شائید ٹھیک ہی تعین کیا ہے۔ اور ہاں آج شام ٹرام کی پٹڑی کے پاس ایک عجیب واقعہ رونما ہوگا''۔ پروفیسر آسمان کو طرف گھورتا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ ''اور ہاں آپ لوگ اب حضرت عیسیٰ کے وجود کو بھی تسلیم کر لیجئے کیونکہ وہ حقیقتاً اس دنیا میں آئے تھے''۔

''دیکھئے پروفیسر صاحب، مائیکل معذرتی انداز میں بولا۔ ''ہم آپ کے علم کی وسعت سے تو متاثر ہو سکتے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ کے متعلق ہمارے نظریات آپ سے یکسر مختلف ہیں''۔

''کسی قسم کے نظریات کی ضرورت نہیں ہے۔ان کا وجود ایک مسلمہ حقیقت تھا، اور بس''۔ عجیب الخلقت پروفیسر بولا۔

''آخر ثبوت بھی تو ہونے چاہیں''۔ مائیکل نے کہا

''نہیں ضرورت کسی ثبوت کی''۔ پروفیسر دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ (اس کا تلفظ اب بالکل صاف ہو گیا تھا) سب کچھ تو صاف نظر آ رہا ہے ۔۔موسم بہار کے مہینے نسان کی چودہ تاریخ کی صبح خونی آستین والے سفید گاؤن میں ملبوس فوجی مارچ کے انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے۔۔۔۔۔۔''

باب دوم

پونتی پلات

موسم بہار کے مہینے نسان کی چودہ تاریخ کی صبح، خونی آستین والا سفید گاؤن پہنے فوجی مارچ کے انداز میں قدم اٹھاتے، شاہی محل کے دونوں حصوں کے عین بیچ میں بنے چبوترے پر قاضی پونتی پلات نمودار ہوا۔

قاضی کو دنیا میں سب سے زیادہ نفرت گلاب کی خوشبو سے تھی۔ اور اس خوشبو نے اسے آج صبح سے ہی گھیر رکھا تھا۔ ظاہر تھا کہ اب سارا دن ہی خراب گزرے گا۔ قاضی کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے باغیچے میں لگے پام اور چنبیلی کے پودوں سے بھی گلاب کی خوشبو خارج ہو رہی ہے اور اس خوشبو میں فوجیوں کے گھڑسوار دستے کے پسینے اور چمڑے کی بو شامل ہو کر عجیب سا تعفن پیدا کر رہی ہے۔ چبوترے سے کچھ ہی دور فوجی دستے کے لئے کھانا تیار ہو رہا تھا۔ اس کا دھواں اس تعفن میں شامل ہو کر گویا سونے پر سہاگے کا کام کر رہا تھا۔

''او خداؤ، مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو۔ یہ تو وہی آدھے سر کا درد شروع ہونے لگا ہے۔ اس عذاب سے نہ کوئی بچاؤ ہے اور نہ ہی کوئی علاج۔ سر کو سکون دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ شائید کچھ افاقہ ہو جائے''۔

چبوترے پر ایک نہایت خوبصورت فوارہ نصب تھا۔ جس کے قریب ہی ایک بیش قیمت تخت نما کرسی رکھی تھی۔ قاضی ادھر ادھر دیکھے بغیر کرسی پر براجمان ہو گیا اور اس نے دونوں ہاتھ کسی سوالی کے انداز میں اپنے سامنے پھیلا دیئے۔ قاضی کا منشی جو دیر سے سر جھکائے کھڑا تھا تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے سرکاری مہر والا ایک کاغذ قاضی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

قاضی سر درد کی شدت سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس نے بمشکل ادھ کھلی آنکھوں سے کاغذ کا معائنہ کیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

ملزم جلیلی کا رہنے والا ہے؟ کیا یہ کیس داروغہ کو بھیجا ہے؟

جی ہاں حضور۔منشی نے جواب دیا۔تو کیا کہا ہے اس نے؟

حضور داروغہ نے اس پر کوئی فیصلہ دینے سے انکار کر دیا ہے اور ملزم کی سزائے موت کے فیصلہ پر آپ کی رائے مانگی ہے۔

قاضی نے بیزاری اور کرب کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ملزم کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ چند ہی لمحوں میں دو سپاہی ایک ستائیس سالہ آدمی کو دھکیلتے ہوئے قاضی کے سامنے لے آئے۔اس شخص کے بدن پر ہلکے نیلے رنگ کا بوسیدہ لباس تھا اور اس نے ایک سفید رومال سر پر باندھ رکھا تھا۔اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ بائیں آنکھ سوج کر بند ہو چکی تھی اور منہ کے پاس خون آلود زخم تھا۔ملزم خوف، حیرت اور تجسس کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ قاضی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

اچھا تو یہ تم ہو جو لوگوں کو یروشلم کی عبادت گاہ تباہ کرنے پر اکسا رہے تھے؟ قاضی پتھر کی مورت بنا بیٹھا تھا اور صرف اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔آدھے سر کے درد کی شدت سے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔

''اے رحمدل انسان میرا یقین کیجئے''۔

قاضی اپنا انداز برقرار رکھے ہوئے کوئی جنبش کئے بغیر ملزم کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔''یہ کیا؟ تم مجھے رحمدل کہہ رہے ہو؟ بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔سارے یروشلم میں مجھے دہشت کا بھوت کہا جاتا ہے اور یہ خطاب میری شخصیت کے عین مطابق ہے ''۔۔۔۔۔۔'کینٹر جنگلی کو پیش کیا جائے''۔دھیمے انداز میں قاضی نے حکم دیا۔

اچانک ایسا لگا کہ جیسے چبوترے پر اندھیرا چھا گیا ہے۔کینٹر جسے جنگلی کا خطاب دیا گیا تھا سب سے بلند قامت فوجی سے بھی غالباً دو ہاتھ اونچا ہوگا۔اس کے کاندھے اس قدر کشادہ تھے کہ صبح کا طلوع ہوتا ہوا سورج ان کے پیچھے پوری طرح چھپ گیا تھا۔

قاضی کینٹر سے لاطینی زبان میں مخاطب ہوا۔''ملزم مجھے رحمدل انسان کہہ رہا ہے۔اسے ایک منٹ کے لئے یہاں سے لے جاؤ اور اپنی زبان میں سمجھاؤ کہ مجھ سے کیسے مخاطب ہونا چاہیے۔لیکن خیال رہے کہیں گردن نہ مروڑ دینا''۔

کینٹر ہر جگہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔اس کی وجہ محض اس کا لمبا قد ہی نہیں تھا۔اس کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ ایک لڑائی کے دوران اس کے چہرے کا جغرافیہ کچھ اس طرح بگڑ چکا تھا کہ دیکھنے والے کو خوف سے جھرجھری آ جاتی تھی۔کینٹر نے ملزم کو ہاتھ سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔کینٹر کے وزنی بوٹوں کی آواز۔دھم دھم۔گونج رہی تھی۔ملزم خاموشی سے اس کے پیچھے چل رہا تھا۔چبوترے پر مکمل خاموشی

چھا گئی تھی۔ کبھی کبھار فقط کبوتروں کی غٹرغوں سنائی دے رہی تھی۔ یا پھر فوارے میں گرتا ہوا پانی اٹھکیلیاں کرتا ایک دلنواز حسن پیش کر رہا تھا۔ قاضی کا دل چاہ رہا تھا کہ سرفوارے کی دھار کے نیچے رکھ دے اور وہیں منجمد ہو جائے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

کینٹر جنگی جب باغیچے میں داخل ہوا تو اس نے وہاں کھڑے محافظ سے کوڑا لے لیا اور کھڑے کھڑے بغیر کوئی زور لگائے ملزم کو کاندھوں کے درمیان ضرب لگا دی۔ لیکن بظاہر آہستہ سے مارے گئے کوڑے کا نتیجہ نہایت غیر متوقع نکلا۔ ملزم زمین پر یوں آن گرا کہ جیسے کسی نے اس کی ٹانگیں کاٹ دی ہیں۔ درد کی شدت سے اس کی سانس رک گئی۔ چہرے کا رنگ نیلا پڑ گیا اور آنکھیں باہر کو ابل آئیں۔

رومن قاضی کو صرف ظل الٰہی کہہ کر مخاطب کیا جائے۔ اس کے سوا کوئی لفظ منہ سے نہ نکلے۔ تمہیں سمجھ آ گئی ہے یا ایک اور لگاؤں؟ کینٹر بولا۔ ملزم بمشکل لڑکھڑاتا ہوا اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اور ہکلاتے ہوئے بولا ''نہیں، نہیں، مت مارو مجھے۔ میں سب سمجھ گیا ہوں''۔ چند لمحوں کے بعد وہ دوبارہ قاضی کے سامنے کھڑا تھا۔ بے جان سفاک سی آواز گونجی۔

نام؟

میرا؟۔ ملزم اپنے تمام وجود سے ہر سوال کا جواب دینے کو تیار نظر آ رہا تھا۔

اپنا نام تو مجھے بخوبی معلوم ہے۔ تم جتنے ہو اس سے زیادہ بے وقوف بننے کی کوشش مت کرو۔ قاضی بلند آواز میں بولا۔ بتاؤ اپنا نام۔

یشوا۔ ملزم جلدی سے بولا

کوئی عرفیت؟

جی ہاں۔ گانسری۔

کہاں کے رہنے والے ہو؟

شہر ''ہمالہ'' کا۔

نسلاً کون ہو تم؟

صحیح طرح تو معلوم نہیں۔ قدرے جھجک کر ملزم بولا۔ مجھے اپنے ماں باپ بالکل یاد نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے باپ کا تعلق ملک شام سے تھا۔

تم کہاں رہتے ہو؟

میرا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ میں شہر شہر پھرتا ہوں۔

یعنی کہ تم آوارہ ہو۔ قاضی بولا۔ کوئی رشتہ دار ہے؟

کوئی نہیں ہے۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔

پڑھے لکھے ہو؟

جی ہاں۔

مادری زبان کے علاوہ بھی کوئی زبان جانتے ہو؟

جی ہاں، یونانی

سر درد کی شدت سے ابلتی قاضی کی ایک آنکھ نیم وا ہوئی جبکہ دوسری غالبًا درد کے خوف سے بند ہی رہی۔ قاضی یونانی زبان میں بولا۔

''اچھا تو یہ تم تھے جو عبادت گاہ کو تباہ کرنا چاہتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کام پر اکسا رہے تھے؟

ملزم ایک بار پھر چونک اٹھا۔ اس کے چہرے سے خوف کے تاثرات چند لمحوں کے لئے چھٹ گئے اور وہ یونانی میں بولا۔

میں مہربا۔۔۔۔۔ یکدم اپنی غلطی کا احساس ہونے پر لفظ ''مہربان'' اس کے حلق میں ہی اٹک گیا اور خوف پھر ایک بار اس کے تمام وجود سے جھلکنے لگ گیا۔''میں نے جناب ظل الٰہی! اپنی زندگی میں کبھی بھی عبادت گاہ کو تباہ کرنے کا نہیں سوچا۔ اور نہ ہی کبھی اس بے ہودہ کام کے لئے کسی کو اکسایا ہے''۔

''تہواروں پر عموماً طرح طرح کے لوگ ہمارے شہر میں آ جاتے ہیں۔ ان میں جادوگر، ستارہ شناس، نجومی اور قاتل بھی شامل ہوتے ہیں''۔ قاضی بلا توقف بولے جا رہا تھا۔''اور بسا اوقات نوسرباز بھی آ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں تو تم نوسرباز ہو۔ میرے پاس بالکل صاف لکھا ہے کہ تم لوگوں کو اکسا رہے تھے اور گواہ بھی یہی کہتے ہیں''۔

''یہ رحم دل لوگ۔ ملزم نے بولنا شروع کیا''۔ جناب ظل الٰہی! یہ کچھ بھی سمجھ نہیں پائے۔ میں نے انہیں جو کچھ سکھانے کی کوشش کی وہ انہوں نے الٹ پلٹ کر دیا ہے۔ مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے کہ یہ غلط فہمی عرصہ دراز تک برقرار رہے گی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ بے وقوف میری باتوں کو صحیح طور سے رقم نہیں کر رہا تھا''۔

ماحول پر یکدم خاموشی چھا گئی۔ اب دونوں کرب زدہ آنکھیں نیم وا ہو کر ملزم کو گھور رہی تھیں۔

''میں تمہیں آخری مرتبہ خبردار کر رہا ہوں کہ پاگل بننے کی اداکاری مت کرو''۔ قاضی آہستگی سے لیکن دھمکی آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔''تمہارے بارے میں لکھا تو بہت کم گیا ہے۔ لیکن تمہیں تختہ دار تک پہنچانے کے لئے اتنا ہی مواد کافی ہے''۔

''نہیں۔نہیں ظلِ الٰہی۔ یہ بہتان ہے۔ دراصل میرے پیچھے پیچھے ایک گدھا ہاتھ میں قلم اور کاغذ لئے گھومتا رہتا ہے اور مسلسل لکھتا رہتا ہے۔ ایک دن میری نظر اچانک اس کے چیتھڑے پر پڑی اور اس کی تحریر دیکھ کر میں بے حد پریشان ہو گیا کیونکہ اس میں جو کچھ درج تھا وہ میں نے کبھی بھی زباں سے نہیں نکالا۔ میں نے اس کی بہت منت سماجت کی کہ خدارا اس کو جلا دو۔ لیکن وہ اس کاغذ کو مجھ سے چھین کر بھاگ گیا''۔

''کون ہے وہ؟'' قاضی نے کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''میتھیو۔ یہی نام ہے اس کا''۔ ملزم نے بہت پرجوش انداز میں بتانا شروع کیا۔''وہ انجیروں کے باغ میں صفائی کرنے پر مامور تھا۔ وہیں اس کے ساتھ میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے جب اس سے گفتگو شروع کی تو اس نے پہلے پہل میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ بلکہ میری بے عزتی کرتا رہا۔ وہ مجھے کتا کہہ کر وہ اپنی دانست میں میری توہین کرتا تھا۔ حالانکہ اس جانور میں کوئی ایسی بری چیز نہیں کہ میں کتا کہلائے جانے پر اپنی ہتک محسوس کروں''۔

منشی نے لکھنا بالکل روک دیا تھا اور ہونقوں کی طرح منہ کھولے حیرانگی کے عالم میں ایک ہی سمت میں دیکھے جا رہا تھا۔ قاضی کے چہرے کی سمت۔

بالآخر اس نے اپنے تمام پیسے زمین پر پھینک دیئے اور میرے ساتھ سفر پر جانے کو تیار ہو گیا۔

قاضی کا چہرہ ایک طرف سے کچھ پھڑ پھڑایا۔ پیلے دانت آپس میں ٹکرائے اور منشی کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

یہ یروشلم بھی کیسا عجیب شہر ہے۔ یہاں کیا کچھ دیکھنے سننے کو نہیں ملتا۔ ذرا اندازہ تو کرو باغیچے میں صفائی کرنے والے نے پیسے زمین پر پھینک دیئے۔

منشی کی ادھوری عقل اس بات کو سمجھ نہ سکی اور اس نے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے قاضی کی مسکراہٹ اسے واپس لوٹانا ضروری سمجھا۔

اس کا کہنا تھا کہ اب اسے پیسوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ ملزم نے میتھیو کی عجیب و غریب حرکت کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔''اور تب سے وہ میرا ہمسفر بن گیا''۔

قاضی کرسی میں دھیرے دھیرے ہچکولے لیتے ہوئے، ملزم کے چہرے پر طلوع ہوتے سورج کی کرنوں کو بغور دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میرے لئے سب سے آسان کام یہ ہے کہ اس شیطان سے جان چھڑانے کے لئے دو لفظ کہہ دوں۔''لٹکا دو''۔ اور بس۔ تمام گھڑ سواروں کو یہاں سے چلتا کروں۔ اپنے کمرے میں جا کر اندھیرا کروا لوں۔ مسہری پر چاروں شانے چت ہو جاؤں، یخ ٹھنڈا پانی منگواؤں، دکھیاری آواز میں اپنے کتے ''بانگا'' کو بلاؤں اور اسے اپنے آدھے سر کے درد کا رونا روؤں۔ اور اچانک

ایک ظالم محبوبہ کی طرح نجانے کہاں سے قاضی کے دماغ میں لفظ ''زہر'' کی گردان شروع ہوگئی۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے ملزم کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یروشلم کے سفاک سورج کی حدت میں وہ کیوں اس بدبخت ملزم کے سامنے بیٹھا ہے۔ نجانے کیسے کیسے اور غیر ضروری سوال اسے پوچھنے پڑیں گے۔

میتھیو؟۔ پھنسی پھنسی آواز میں قاضی نے پوچھا۔

جی ہاں، میتھیو۔ کسی زہر آلود تیر کے مانند ملزم کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اچھا یہ بتاؤ کہ تم بازار میں مجمع لگائے لوگوں کو عبادت گاہ کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟

قاضی کو لگ رہا تھا کہ ملزم کی آواز اس کی کنپٹیوں کو چیرے جا رہی ہے۔ یہ منحوس آواز کہہ رہی تھی: ظل الٰہی میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک دن پرانے مذاہب کے جھوٹ کا مندر ٹوٹ جائے گا اور سچائی کا نیا مندر کھڑا ہوگا۔

تم آوارہ گرد لوگوں کو سچائی کا فلسفہ سنا کر کیوں بھڑکا رہے تھے؟ تم تو خود سچائی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تمہیں کیا معلوم کہ سچائی کیا ہے۔

اسی لمحے قاضی کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگ گئے۔ ''اے خداؤ! میری عقل کو کیا ہوگیا ہے۔ یہ میں بھری عدالت میں اس گنوار سے کیا بے وقوفی کی باتیں پوچھ رہا ہوں''۔ اور اس کے تخیل میں پھر ایک بار سیاہی مائل سیال سے بھرا پیالہ ابھر آیا۔ زہر۔ مجھے زہر چاہیے۔ اس دوران ملزم کی منحوس آواز دوبارہ اس کے کانوں میں گونجنے لگ گئی۔

سچائی، سب سے پہلے تو یہ ہے کہ تمہارا سر دکھ رہا ہے اور اس شدت سے دکھ رہا ہے کہ تم موت کی دعائیں مانگ رہے ہو۔ اس وقت تم میں نہ صرف مجھ سے بات کرنے کی طاقت نہیں بلکہ میری طرف دیکھنا بھی تمہارے لئے مشکل ہو رہا ہے اور میں اس وقت تمہارے لئے غیر ارادی طور پر ''جلاد'' کی حیثیت اختیار کر گیا ہوں جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ اس وقت تمہاری سوچ پر تالے پڑ چکے ہیں اور تمہاری خواہش ہے کہ تمہارا پیارا کتا اس وقت آ کر تم سے لپٹ جائے۔ یہ کتا اس دنیا میں غالباً واحد ہستی ہے جس کے ساتھ تمہیں لگاؤ ہے۔ لیکن تمہاری اذیتیں ابھی ختم ہو جائیں گی۔ تمہارا سر درد ٹھیک ہو جائے گا۔

منشی کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں۔ وہ لکھنا بھول کر ملزم کو گھورے جا رہا تھا۔

قاضی نے درد کی اذیت سے بھری آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سورج محل کی فصیلوں سے کافی اونچا ہو چکا تھا۔ دھوپ ملزم کی جانب بڑھے آ رہی تھی جبکہ وہ دھوپ سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک قاضی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو یوں تھام رکھا تھا کہ جیسے وہ ابھی پھٹ جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور کرب جھلک رہا تھا۔ لیکن اس نے اگلے ہی لمحے قوت

ارادی سے خود پر قابو پالیا اور واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس دوران ملزم اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے تھا۔ منشی نے اب لکھنا بالکل بند کر دیا تھا اور اونٹ کی طرح لمبی سی گردن اٹھائے ملزم کو بغور سن رہا تھا۔

''اور یہ لو۔ بس ختم ہوگئی تمہاری اذیت''۔ ملزم مسکراتی نظروں سے قاضی کی جانب دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔ اور مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے۔ میرا تمہیں مشورہ ہے ظلِ الٰہی کہ کچھ وقت کے لئے محل چھوڑ دو اور شہر سے کہیں باہر پیدل سیر کے لیئے نکل جاؤ۔ مثلاً جولان کی سرسبز پہاڑی پر ہی سہی۔ آج شام بارش ہوگی۔ ملزم سورج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ سیر کرنے سے تمہاری طبیعت تروتازہ ہو جائے گی۔ اگر کہو تو میں بخوشی تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ میرے دماغ میں اس وقت کچھ اچھوتے خیالات آرہے ہیں جو تمہارے لئے غالباً بہت دل چسپ ہوں گے۔ میں یہ خیالات تمہارے ساتھ بانٹنا چاہتا ہوں کیونکہ تم مجھے کافی عقل مند لگتے ہو''۔

منشی کسی مردے کی طرح سفید ہو گیا اور تھرتھر کانپتے ہوئے عدالت کی کتاب اپنے ہاتھوں سے گرا بیٹھا۔

''مشکل یہ ہے''۔ ملزم بلا روک ٹوک اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے تھا۔ ''کہ تم بہت تنہائی پسند ہو۔ لوگوں پر بالکل یقین نہیں رکھتے ہو۔ دیکھو۔ تمہیں یہ تو ماننا پڑے گا کہ انسان کو اپنی تمام زندگی صرف ایک کتے کے لئے تو وقف نہیں کر دینی چاہیے۔ تمہاری زندگی بہت بے رنگ ہے''۔ ملزم کا چہرہ اس وقت جوش سے تمتما رہا تھا۔

منشی پر اس وقت صرف یہ فکر طاری تھی کہ اسے اپنے کانوں پر یقین کرنا چاہیے یا نہیں۔ لیکن یقین تو کرنا پڑ رہا تھا۔ اب وہ اپنے خیالات میں اس منظر کی تصویر کشی کی کوشش کر رہا تھا جو قاضی کے جلال کے نتیجے میں رونما ہونے والا تھا کیونکہ رومن عدالت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کوئی ملزم قاضی کی موجودگی میں اس قدر بے لگام ہو رہا تھا۔ لیکن یہ آنے والا منظر بھی منشی کے ذہن میں واضح نہیں ہو رہا تھا۔

اس دوران قاضی روہانسی آواز میں بولا۔ ''ملزم کے ہاتھ کھول دیئے جائیں''۔ سپاہیوں میں سے ایک نے نیزے سے بآواز بلند زمین کو تھپ تھپایا۔ نیزہ دوسرے سپاہی کے حوالے کیا اور آگے بڑھ کر ملزم کے ہاتھ کھول دیئے۔

منشی نے زمین سے کتاب اٹھالی اور فیصلہ کیا کہ اب وہ نہ تو کچھ لکھے گا اور نہ ہی کسی بات پر حیران ہوگا۔

اقرار کرو۔ قاضی آہستہ سے بولا۔ کہ تم ایک عظیم طبیب ہو۔

نہیں قاضی صاحب میں طبیب نہیں ہوں۔ ملزم لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔

قاضی ترچھی نگاہوں سے ملزم کو گھور رہا تھا اور اب اس کی آنکھوں میں کرب کی جگہ لپکتے شعلوں نے لے لی تھی۔جن سے سبھی مانوس تھے۔

''میں نے تمہیں پوچھا نہیں، شائید تمہیں لاطینی زبان بھی آتی ہے''۔قاضی بولا۔

''جی ہاں، آتی ہے''۔ملزم نے جواب دیا۔

قاضی کے ہلدی مائل چہرے پر کچھ رنگ سا آ گیا تھا اور وہ لاطینی میں بولا۔''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کتے کو بلانا چاہتا تھا''۔''یہ تو بہت آسان بات ہے'' ملزم بھی لاطینی میں بول رہا تھا۔''تم جس طرح ہوا میں ہاتھ چلا رہے تھے اس سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ تم کسی کو سہلا رہے ہو اور ہونٹ ۔۔۔۔۔۔۔''

''ہاں''، قاضی نے ملزم کی بات کاٹتے ہوئے یونانی میں کہا۔''اچھا تو تم طبیب ہی ہو''۔

''نہیں، نہیں''۔زندہ دل ملزم بولا۔''میرا یقین کیجئے میں طبیب نہیں ہوں''۔

''ٹھیک ہے اگر تم یہ بات چھپانا چاہتے ہو تو کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی اس بات کا تمہارے مقدمے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اچھا تو تمہارا کہنا ہے کہ تم لوگوں کو اکسا نہیں رہے تھے۔ نہ ہی انہیں عبادت گاہ کو جلانے، توڑنے یا کسی اور طریقے سے تباہ کرنے کی دعوت دے رہے تھے؟''۔

''میں نے ظل الٰہی اس بیہودہ کام کے لئے کسی کو نہیں اکسایا۔ کیا میں اتنا بے عقل نظر آتا ہوں؟''۔

''ہاں، بے عقل تو تم نہیں لگتے۔ قاضی دھیمے سے بولا اور ایک خوفناک سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ناچنے لگ گئی۔اچھا تو قسم کھاؤ کہ یہ سب کچھ نہیں ہوا تھا''۔

کس کی قسم کھاؤں میں، جناب قاضی صاحب؟

کس کی؟ اپنی زندگی کی ہی قسم کھالو۔ قاضی بولا۔ کیونکہ تمہاری زندگی اس وقت ایک ڈور پر اٹکی پڑی ہے۔

کہیں آپ کا یہ خیال تو نہیں کہ آپ ہی نے میری زندگی کو ڈور پر اٹکا رکھا ہے۔ملزم بولا۔اگر ایسا ہے تو آپ بہت بڑی بھول کر رہے ہیں۔

قاضی نے ایک جھرجھری لی اور دانت بھینچتے ہوئے بولا۔ ہاں میں ہی اس ڈور کو کاٹ سکتا ہوں۔

''یہ بھی آپ کی بھول ہے''۔ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ملزم بول رہا تھا۔آپ کو اس بات سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ میری زندگی کی ڈور وہی کاٹ سکتا ہے جس نے اسے وہاں باندھا ہے''۔

بہت خوب، قاضی مسکراتے ہوئے بولا۔ مجھے اب یقین ہو چلا ہے کہ یروشلم کے باغی تمہارے ہی نقش پا پہ چلتے ہوں گے۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ تمہاری زبان کو اتنی قوت کس نے دی ہے۔لیکن جس نے

بھی یہ کام کیا ہے خوب کیا ہے۔ اور ہاں ایک بات تو بتاؤ کہ یہ تم ہی گدھے پر سوار یروشلم میں مغربی دروازے سے داخل ہوئے تھے نا اور اس وقت تمہارے ساتھ گداگروں کا ایک ہجوم بھی تھا جو تمہارے حق میں اس طرح نعرے بازی کر رہا تھا کہ جیسے تم کوئی پیغمبر ہو"۔

ملزم قاضی کو الجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرے پاس تو جناب نہ کبھی پہلے گدھا تھا اور نہ ہی اب ہے۔ ہاں میں یروشلم میں مغربی دروازے سے ضرور داخل ہوا تھا لیکن پیدل۔ میرے ساتھ میتھیو کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ اور نہ ہی کوئی مجھے دیکھ کر نعرے لگا رہا تھا کیونکہ اس وقت یروشلم میں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔

"کیا تم ان میں سے کسی کو جانتے ہو؟" قاضی ملزم پر نگاہیں مرکوز کیئے بول رہا تھا۔ "ایک تو ہے ویسماس، دوسرا گیسٹاس اور تیسرا برابا"۔

"میں ان رحم دل لوگوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا"۔ ملزم بولا۔

سچ؟

بالکل سچ۔

اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ تم یہ لفظ 'رحمدل' اتنی کثرت سے کیوں استعمال کرتے ہو۔ کیا تم ہر کسی کو 'رحمدل' کہہ کر پکارتے ہو؟

"جی ہاں، سب کو"۔ ملزم بولا۔ "اس دنیا میں کوئی بھی انسان سنگ دل نہیں ہے"

"یہ بات میں پہلی بار سن رہا ہوں"۔ پونتی پلات بولا "ہوسکتا ہے میں لوگوں کو اچھی طرح نہیں جان پایا"۔

بس بس آگے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ منشی سے بولا۔ ملزم سے دوبارہ مخاطب ہوتے ہوئے پونتی پلات بولا۔ "یہ باتیں تم نے کسی یونانی کتاب میں پڑھی ہیں؟"۔

"نہیں میں اپنی سمجھ بوجھ سے اس نتیجے تک پہنچا ہوں"۔

"اور تم اس کا پرچار بھی کرتے ہو؟"

"جی ہاں"۔

اچھا یہ جو کینٹر ہے، کیا یہ بھی رحم دل ہے؟

جی ہاں۔ ملزم بولا۔ لیکن وہ ایک انتہائی بدقسمت انسان ہے۔ جب سے رحمدل لوگوں نے اس کا چہرہ بگاڑا ہے وہ سنگ دل اور بے رحم ہوگیا ہے۔ ویسے میرے لئے یہ دلچسپی کی بات ہے کہ یہ سب ہوا کیسے؟

''ضرور ضرور''۔ پونتی پلات چیخا۔ میں خود اس واقعے کا چشم دید گواہ ہوں۔ ''رحم دل'' لوگ اس پر اس طرح جھپٹے تھے جیسے شکاری کتے ریچھ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ دشمن اس کی گردن، ہاتھوں، بانہوں کو گدھوں کی طرح بھنبھوڑ رہے تھے۔ یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ سپاہیوں کا ایک دستہ جس کا انچارج میں تھا، بروقت وہاں پہنچ گیا۔ وگرنہ عزیزم فلسفی تمہیں آج اس کے ساتھ گفتگو کرنے کا شرف حاصل نہ ہوتا''۔

''کاش کہ میں اس سے گفتگو کر سکتا''۔ ملزم ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے سوچنے کا انداز یکسر تبدیل ہو سکتا ہے''۔

''میرا خیال ہے کہ۔ پونتی پلات بولا۔ ''ہمارے افسروں اور سپاہیوں کو تمہارے ساتھ گفتگو میں شاید ہی کوئی راحت حاصل ہوگی۔ ویسے بھی گفتگو کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس کا دھیان میں خود رکھوں گا۔

اس دوران ایک چڑیا اندر گھس آئی۔ سنہری چھت کے نیچے اس نے ایک چکر لگایا۔ تھوڑا اور نیچے ہوئی اور اپنے تیز پروں سے تانبے کے مجسمے کا چہرہ چھوتے ہوئے ستون کے ایک سوراخ میں گھس گئی۔ شاید اس نے وہاں گھونسلا بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چڑیا کی اڑان کے دوران پونتی پلات کے درد سے نجات شدہ، ہلکے پھلکے دماغ میں ایک فیصلہ تیار ہو چکا تھا۔ فیصلہ یہ تھا۔ قاضی نے آوارہ گرد فلسفی یشوا عرف ''گانسری'' کا مقدمہ غور سے سنا اور اسے کہیں بھی قانون شکنی کا مرتکب نہیں پایا۔ بالخصوص یشوا کی سرگرمیوں اور یروشلم میں کچھ عرصہ قبل ہونے والے ہنگاموں کے درمیان کوئی تعلق ثابت نہیں ہوا۔ یہ آوارہ گرد فلسفی دراصل ذہنی مریض ہے۔ اس لیے قاضی داروغہ کی تجویز کردہ سزائے موت سے اتفاق نہیں کرتا۔ لیکن چونکہ ملزم کی احمقانہ اور ذہنی انتشار کی مرکب گفتگو یروشلم کے عوام میں بے چینی پیدا کر سکتی ہے لہٰذا قاضی ملزم یشوا کو شہر بدر کر کے کیساری جزیرے میں (یعنی وہ جگہ جہاں قاضی کی اپنی رہائش گاہ ہے) قید کرنے کا حکم دیتا ہے۔

بس اب یہ حکم منشی کو لکھوانا باقی تھا۔ اچانک چڑیا کے پر قاضی کے عین سر کے اوپر پھڑپھڑائے۔ اس نے فوارے کے پانی میں ایک غوطہ لگایا اور چبوترے سے باہر آزاد فضاؤں میں پرواز کر گئی۔

ملزم کے حوالے سے مزید کوئی بات تو نہیں ہے؟ قاضی نے منشی سے پوچھا۔

''ہے جناب، ایک اور مسئلہ ہے''۔ منشی کی آواز اچانک گونجی اور اس نے ایک اور تحریر قاضی کی جانب بڑھا دی۔

''اور کیا ہو سکتا ہے؟'' قاضی اپنے آپ سے گویا ہوا۔ تحریر پڑھنے کے بعد اس کا چہرہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ شائید سیاہ رنگ کا خون اچانک اس کی گردن اور چہرے کی رگوں میں رک گیا تھا یا پھر شائید کوئی اور عمل رو پذیر ہو رہا تھا۔ بہرحال اس کے چہرے کی پیلاہٹ کی جگہ نیلاہٹ اور سیاہی نے لے لی تھی۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں۔ قاضی کے چہرے میں تغیر کی وجہ غالباً سیاہ خون ہی تھا کیونکہ وہی خون اس

کی کنپٹیوں میں بھی ابل رہا تھا اور قاضی کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگ گیا تھا۔اور پھر۔اچانک قاضی کی نظر اسے دھوکہ دینے لگ گئی۔اس کے سامنے ملزم کا چہرہ تحلیل ہوگیا۔اس کی جگہ ایک اور چہرے نے لے لی ۔اس نئے چہرے والے شخص نے سنہری تاج پہن رکھا تھا۔اس کی پیشانی پر ایک گول وضع کا زخم تھا جس پر عجیب سی مرہم کا لیپ لگا ہوا تھا۔اس کے دانتوں سے عاری گال پچکے اور نچلا ہونٹ اپنے بھاری پن کی وجہ سے ٹھوڑی تک لٹکا ہوا تھا۔ پونتی پلات کو ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے گلاب کی کیاریاں اور یروشلم کے اونچے برج کہیں غائب ہوگئے ہیں اور آس پاس کی تمام چیزیں گھنے سبزے میں دفن ہو کر رہ گئی ہیں۔اس کے کانوں میں عجیب سی آوازیں گونجنے لگ گئی تھیں۔ان آوازوں کے شور میں ایک واضح آواز بانسری کی مدھم سی دھن تھی۔اس دھن میں سے اچانک ایک باریک سی آواز ابھری۔'' قانون، قانون، قانون، بادشاہ سلامت کی توہین کا قانون''۔

قاضی کے ذہن میں عجیب وغریب، بے ربط سے خیالات ابھر آئے تھے۔''مرگیا''۔اس کے بعد''مرگئے''اور پھر ایک عجیب پاگلانہ سے خیال۔''لافانی''۔ نے دماغ کو گھیر لیا۔

''لافانی'' کے خیال سے نجانے کیوں غم اور اداسی نے قاضی کے دماغ پر قبضہ کرلیا تھا۔

پونتی پلات نے اچانک اپنے جسم کو اکڑا لیا اور ذہن میں ابھرنے والے تمام خیالات کو جھٹک کر نظریں چبوترے پر گاڑ دیں۔ایک بار پھر ملزم کی آنکھیں اس کے سامنے تھیں۔

''سنو عیشوا''، قاضی ایک عجیب سے لہجے میں بولا۔اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا لیکن آنکھوں میں الجھن نمایاں تھی۔'' کیا تم نے کبھی ہمارے بادشاہ، عظیم قیصر، کے بارے میں کوئی بات کہی تھی؟ جواب دو۔کہی تھی یا نہیں کہی تھی؟''۔ قاضی نے لفظ نہیں کچھ زیادہ ہی لمبا کھینچ ڈالا تھا اور نظروں ہی نظروں میں عیشوا کو اس انداز میں دیکھ رہا تھا کہ جیسے اپنے سوال کا جواب اس کے دماغ میں گھسانا چاہتا ہوں۔

''سچ بولنا آسان اور تسکین آمیز ہوتا ہے''

ملزم بولا۔

جواب میں قاضی بیزار اور غصیلے لہجے میں بولا

''تمہارے لئے سچ بولنا تسکین آمیز ہو یا تکلیف دہ۔ سچ تو تمہیں بہرصورت بولنا ہی پڑے گا۔ لیکن بولنے سے قبل اپنے ہر لفظ کو اچھی طرح تول لینا۔ بصورت دیگر ذلت آمیز اور اذیت ناک موت تمہارے لئے اٹل ہے''۔

نجانے یہودیہ کے قاضی کو کیا ہوگیا تھا۔اس نے اپنا ہاتھ اس طرح بلند کرلیا کہ جیسے سورج کی تیز روشنی سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو یا پھر ہاتھ کی اوٹ سے ملزم کی انتہائی ذومعنی نگاہوں سے کوئی پیغام حاصل

کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''اچھا تو''۔ قاضی بولا۔''جواب دو کیا تم کسی یہودا نامی شخص کو جانتے ہو اور کیا تم نے قیصر روم کے بارے میں اس کے ساتھ کوئی بات کی تھی؟''۔

''دراصل یہ واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا تھا''۔ ملزم خوشدلی کے ساتھ چہکا۔''پرسوں شام مندر (عبادت گاہ) کے نزدیک میرا تعارف ایک نوجوان کے ساتھ ہوا۔ اس نوجوان نے اپنا نام یہودا عسکریتی بتایا تھا۔ اس شخص نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور میری خوب خاطر تواضع کی۔

''رحمدل شخص؟'' پونتی پلات نے پوچھا (اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک لپک رہی تھی)۔

''انتہائی رحمدل اور پرتجسس آدمی''۔ ملزم نے جواب دیا۔''یہ نوجوان میرے نظریات میں خصوصی دل چسپی لے رہا تھا۔ میری باتیں انتہائی انہماک سے سن رہا تھا اور۔۔۔۔۔''

''اور شمع روشن کر رہا تھا''۔ قاضی نے دانتوں کو بھینچ لیا اور ملزم کی گفتگو کو کاٹتے ہوئے کہا ۔

''جی ہاں'' ملزم قدرے حیرانگی کے ساتھ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔''اس نے حکومت کے بارے میں میرے نظریات دریافت کیے۔ یہ موضوع تو خصوصاً اس کی دل چسپی کا مرکز بنا ہوا تھا۔

''تو کیا جواب دیا تم نے؟'' پونتی پلات بولا۔''تم کہو گے کہ بھول گیا ہوں'' مگر قاضی کے لہجے سے عیاں تھا کہ اس طرح کا جواب اسے غالباً نہیں ملے گا۔

''اور باتوں کے علاوہ میں کہہ رہا تھا''۔ ملزم بولا''کہ طاقت کا استعمال کسی بھی قسم کا ہو انسانوں پر جبر کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک دن آئے گا جب نہ تو کوئی حکومت رہے گی، نہ ہی کوئی حاکم رہے گا، نہ کوئی قیصر رہے گا اور نہ ہی کوئی دوسرا جبر رہے گا۔ انسان سچ اور انصاف کے زیر سایہ آ جائے گا۔ تب انسان کسی قسم کی حکومت یا طاقت کی ضرورت سے آزاد ہو جائے گا''۔

''اور پھر آگے؟'' قاضی نے ملزم کے خاموش ہو جانے پر پوچھا۔

''آگے کچھ بھی نہیں''۔ ملزم بولا۔ اس دوران چند آدمی اندر داخل ہوئے۔ میری مشکیں کسیں اور مجھے لا کر زنداں میں پھینک دیا۔

منشی اس خوف سے کہ کہیں کوئی لفظ چھوٹ نہ جائے بہت تیزی سے کاغذ پر قلم چلا رہا تھا۔

''اس دنیا میں آج تک عظیم شہنشاہ قیصر کی حکومت سے زیادہ شاندار اور ہر دلعزیز حکومت نہ تو کبھی پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی ہوگی''۔ قاضی کی نحیف آواز گونجی۔ نجانے کیوں قاضی نے اپنی نفرت آمیز نگاہوں کا نشانہ منشی اور گھڑسوار سپاہیوں کو بنا رکھا تھا۔''اور ویسے بھی پاگل آدمی تمہیں اس موضوع پر فتوے دینے کا حق حاصل نہیں ہے''۔

قاضی اچانک بلند آواز میں چلایا۔ ''گھڑ سواروں کو چبوترے سے دفعان کیا جائے''۔ اور منشی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''تخلیہ۔ مجھے ملزم کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا جائے۔ معاملہ نازک اور حکومتی معاملات کا ہے''۔

گھڑ سوار اپنے گھوڑوں کے نعلوں سے غمناک سی دھن بجاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ منشی بھی ان کے نقش قدم پر چل پڑا۔

چبوترے پر اچانک خاموشی چھا گئی۔ صرف فوارے کا پانی حالات سے بے نیاز اٹھکیلیاں کرتا مدھم سی دھن چھیڑے ہوئے تھا۔ قاضی فوارے کے پانی کی چھتری کو بنتے اور بکھرتے دیکھ رہا تھا۔

بولنے میں پہل ملزم نے کی۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ اس نوجوان یہوداؔ کے ساتھ میری گفتگو کے نتیجے میں کوئی بہت بڑی آفت کھڑی ہوگئی ہے۔ ظل الٰہی! مجھے ڈر ہے کہ اس نوجوان پر کوئی بہت بڑا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ مجھے اس غریب پر بہت ترس آ رہا ہے''۔

''میرا خیال ہے''۔ قاضی عجیب سے انداز میں کھنکارتے ہوئے بولا۔ ''اس دنیا میں یہوداؔ سے بھی زیادہ بدقسمت اور قابل رحم کوئی اور شخص ہے۔ تمہیں غالباً اس کی فکر یہوداؔ سے زیادہ کرنی چاہیے۔ ہاں تو''۔ عیشوا کے زخمی چہرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قاضی بول رہا تھا۔ ''جیسا کہ میں دیکھ رہا ہوں دو بدمعاشوں گیماس اور دیسماس نے تمہارے پرچار کی وجہ سے تمہاری باقاعدہ مرمت کی ہے۔ یہی وہ آدمی ہیں جنہوں نے اپنے ساتھیوں سے مل کر چار سپاہی بھی قتل کیے ہیں۔ اور یہ یہوداؔ ایک قابل نفرت غلاظت کا ڈھیر ہے۔ کیا اب بھی کہو گے کہ یہ سب ''رحمدل'' لوگ ہیں؟

''جی ہاں''۔ ملزم نے جواب دیا۔

''اور سچ کی بادشاہت قائم ہوگی؟''

''ہوگی۔ جناب ظل الٰہی''۔ عیشواؔ نے وثوق بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا''۔ پونتی پلاطس اچانک خوفناک آواز میں چیخنے لگ گیا۔ ٹھیک اسی انداز میں کئی سال قبل وادیٔ ''دیب'' میں قاضی چلایا تھا۔ ''کاٹ دو ان کو۔ اڑا دو ان کو۔ ہمارا کینٹر ان کے شکنجے میں آ گیا ہے''۔ وہ اپنی خوفناک آواز کو مزید بلند کرتے ہوئے چبوترے کے باہر کھڑے لوگوں کو بھی متوجہ کر رہا تھا۔ ''مجرم، مجرم، مجرم''۔ اور پھر آواز کو اچانک دھیما کرتے ہوئے بولا۔ ''عیشوا! تم کسی قسم کے خدا پر یقین رکھتے ہو یا نہیں؟''۔

''خدا صرف ایک ہی ہے''۔ عیشواؔ بولا ''اور میں اسی پر یقین رکھتا ہوں''۔

''اچھا تو پھر اس خدا سے دعا کرو اور خوب زور لگا کر دعا کرو''۔ قاضی کی آواز کچھ بیٹھ گئی تھی۔ ''ویسے تو اب اس دعا کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بیوی ہے؟'' قاضی کے لہجے سے اچانک افسردگی جھلکنے لگ گئی تھی۔ وہ خود یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

''نہیں۔ میں تنہا ہوں''۔

''لعنت ہے اس شہر پر''۔ قاضی بڑبڑاتے ہوئے اپنے ہاتھ مسل رہا تھا۔ ''کیا ہی اچھا ہوتا اگر تمہیں یہوداسے ملاقات سے پیشتر ہی قتل کر دیا جاتا''۔

''اور تم ظل الٰہی، کیا مجھے آزاد کر سکتے ہو؟ اچانک ملزم بولا ''یوں لگتا ہے کہ وہ مجھے مار دینا چاہتے ہیں''۔

پونتی پلات کا چہرہ غصے اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے لقوہ زدہ دکھنے لگ گیا تھا۔ سرخ ڈوروں سے اٹی آنکھوں کو ملزم کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے وہ بولا۔

''او بد بخت آدمی یہ خیال تمہارے ذہن میں کیسے آیا کہ رومن قاضی اُس شخص کو چھوڑ دے گا جس نے تم جیسی غلیظ گفتگو کی ہو۔۔ یا پھر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری جگہ لے لوں گا؟ میں تمہارے خیالات سے متفق نہیں ہوں اور میری بات دھیان سے سنو! اگر اس لمحے کے بعد میں نے تمہیں کسی سے ایک لفظ بھی کہتے ہوئے دیکھ لیا تو تمہاری خیر نہیں۔ سن رہے ہو؟ تمہاری خیر نہیں''۔

ظل الٰہی!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''خاموش'' پونتی پلات چلایا اور چبوترے پر دوبارہ نمودار ہونے والی چڑیا کو وحشت ناک نظروں سے گھورتے ہوئے غرایا'' حاضر ہو جاؤ''۔ اور جب گھڑ سوار اور منشی اپنی اپنی جگہ پر واپس آ گئے تو پونتی پلات نے اعلان کیا کہ اس نے داروغہ کی عدالت میں ملزم عیشوا کو سنائی جانے والی سزائے موت کی توثیق کر دی ہے۔ منشی نے بلا تاخیر و تامل قاضی کا فیصلہ قلم بند کر لیا۔

چند لمحوں بعد قاضی نے کپتان کو طلب کر کے حکم دیا کہ ملزم عیشوا کو حکومت کے جاسوسی ادارے کے سربراہ کے حوالے کر دیا جائے اور اسے یہ پیغام دیا جائے کہ ملزم عیشوا کو قید تنہائی میں رکھا جائے۔ نیز زنداں کے تمام ملازمین کو تنبیہ کر دی جائے کہ کوئی بھی عیشوا کے ساتھ کسی قسم کی گفتگو نہیں کرے گا۔ اور نہ ہی اس کے کسی سوال کا جواب دیا جائے گا۔ میرے اس حکم پر سختی سے عمل کیا جائے۔

کپتان کے اشارے پر گھڑ سواروں نے عیشوا کو گھیرے میں لے لیا اور ہوا میں لہراتے ہوئے کوڑوں کے سائے میں اسے چبوترے سے باہر لے گئے۔

ملزم کے باہر نکل جانے کے بعد قاضی کے سامنے ایک دراز قد سنہری داڑھی والا خوب صورت

نوجوان انتہائی مؤدب انداز میں سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آہنی ٹوپی پر عقاب کے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ سینے پر سونے میں ڈھلے دو ہم صورت شیروں کے سر چمک رہے تھے۔ اس کی تلوار کا میان سے باہر جھانکنے والا حصہ بھی سونے سے جڑی شبیہوں سے منقش تھا۔ چمکدار چمڑے سے بنے لمبے بوٹوں کے تسمے گھٹنوں تک لپٹے ہوئے تھے۔ اپنی کوٹ نما پوشاک کے ادھ کھلے حصے کو اس نے دائیں شانے پر اوڑھ رکھا تھا۔ یہ نوجوان ایک شاہی دستے کا کمانڈر تھا۔ قاضی کے دریافت کرنے پر کمانڈر نے بتایا کہ دستہ اس وقت شہر کے وسطی چوراہے میں بنے چبوترے کو گھیرے میں لے رہا ہے۔ اسی چبوترے سے عیشوا اور دوسرے ملزمان کو سنائی جانے والی سزا کا اعلان عام کیا جائے گا۔

قاضی نے رومن شاہی دستے کے دو الگ الگ گروپ بنانے کا حکم دیا۔ ایک گروپ کی سربراہی کینٹر کے سپرد کرنے کے بعد اسے حکم دیا گیا کہ وہ ملزموں، انہیں سزائے موت دینے کے ضروری آلات اور جلادوں کو اپنی تحویل میں لے لے۔ پھانسی سے قبل ان سب کو نزدیکی سنگلاخ پہاڑی ''کل وری'' پر پہنچا دیا جائے اور ہمہ وقت سپاہی ان کو گھیرے میں لیئے رکھیں۔

دستے کا دوسرا گروپ ابھی روانہ ہوجائے اور پہاڑی پر پھانسی گھاٹ والی جگہ کے گرد رکاوٹیں کھڑی کر کے ایک حصار بنا دیا جائے۔ اور شاہی دستے کی معاونت کے لئے مزید ایک فوجی دستہ بھی پہاڑی کی حفاظت کے لئے بھیج دیا جائے۔

جب شاہی دستے کا کمانڈر چبوترے سے باہر نکل گیا تو قاضی نے منشی کو حکم دیا کہ مذہبی امور کی کونسل کے صدر، کونسل کے ارکان اور عبادت گھروں کے حفاظتی ادارے کے سربراہ کے ساتھ اس کی ملاقات کا انتظام کیا جائے۔ لیکن اس ملاقات سے قبل کونسل کے صدر کو علیحدگی میں قاضی کے سامنے پیش کیا جائے۔

قاضی کے اس حکم پر بلا تاخیر اور من وعن عمل کر دیا گیا۔ اس دوران یروشلم کے آسمان پر غیر معمولی آب و تاب سے چمکنے والا سورج اپنے نکتۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ باغیچے کے بالائی حصے میں بنے چبوترے کی سیڑھیوں کے محافظ۔۔ سنگ مرمر سے تراشے گئے سفید شیروں کی جوڑی کے عین درمیان قاضی اور مذہبی امور کی کونسل کے نگران صدر، یہودی راہبوں کے سربراہ یوسف کائفا کی ملاقات ہوئی۔

باغیچے میں سکوت طاری تھا۔ چبوترے کی چھت سے باہر تمتماتے سورج کی چندھیا دینے والی روشنی میں آنے کے بعد قاضی نے ایک نفرت بھری نگاہ یروشلم پر ڈالی۔۔ خصوصاً یروشلم کی اس عبادت گاہ پر جس کی چھت کی جگہ ایک نا قابل بیاں حد تک اژدھے کے سر سے مشابہہ سنہری دھبوں سے مزین سفید مرمر کے ٹیلے نے لے رکھی تھی۔ قاضی کے کانوں میں دور شاہی محل کی حدود کے باہر سے ایک بے ہنگم شور کی آواز گونجنے لگ گئی۔ کبھی کبھار اس شور پر حاوی ہونے والی آوازوں سے یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی کراہ رہا ہے

یا بین کررہا ہے۔

قاضی سمجھ گیا تھا کہ یہ شہر کے وسط میں پچھلے کچھ عرصہ سے سیاسی بے سکونی کے شکار یروشلم کے باسی، ملزموں کو سنائی جانے والی سزا کے اعلان کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے شور وغل میں پانی بیچنے والوں کی صدائیں بھی شامل ہو رہی تھیں۔

دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لئے قاضی نے یوسف کائفا کو بالکونی کے سائے میں آ جانے کی دعوت دی۔ لیکن یہودیوں کے راہب نے مذہبی تہوار کی آمد کا بہانہ بنا کر سائے میں آنے سے انکار کر دیا۔ قاضی نے اپنے کوٹ کے ساتھ جڑی ٹوپی کو اپنے کسی حد تک بالوں سے عاری سر پر اوڑھا اور یونانی زبان میں گفتگو کا آغاز کیا۔ پونتی پلات نے کائفا کو بتایا کہ اس نے عیشوا کا مقدمہ سنا ہے اور اسے تجویز کردہ سزائے موت کی توثیق کر دی ہے۔ اس طرح کُل ملا کر چار بدمعاشوں کو سزائے موت سنائی گئی ہے۔ اس پر عمل بھی آج ہی کیا جائے گا۔ ان میں سے دو بدمعاش تو دیسماس اور گیستاس ہیں جو کہ لوگوں کو رومن قیصر کے خلاف اکسا رہے تھے۔ انہیں رومن سپاہیوں کے ساتھ لڑائی کے دوران گرفتار کیا گیا تھا۔ لہٰذا انہیں سزا بھی رومن قانون کے تحت دی گئی ہے۔ ان ملزمان کی سزا میں کسی ردوبدل کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے دو ملزموں برابا اور عیشوا کو مقامی حکام نے گرفتار کیا ہے اور انہوں نے ہی دونوں کے لئے سزائے موت تجویز کی ہے۔ لیکن مقامی روایت کے مطابق ان دونوں میں سے کسی ایک کی سزا ایسٹر کے تہوار کی مناسبت سے معاف کرنا ہوگی۔

ہاں! تو رومن قاضی۔ پونتی پلات۔ یہ جاننا چاہتا ہے کہ یہودی راہبوں کی کونسل کس ملزم کو زندگی کا تحفہ بخشے گی۔ برابا کو یا عیشوا کو؟

کائفا نے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے جواب دیا۔ ”کونسل نے ملزم برابا کی سزا معاف کرنے کا فیصلہ کیا ہے“۔

قاضی کو بخوبی اندازہ تھا کہ راہب کا جواب یہی ہوگا۔ پھر بھی اس نے حیرت کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔ یہ اظہار قاضی نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا۔ اس کے حیرت زدہ چہرے کی بھنویں اوپر کو اٹھ گئیں اور نگاہیں سیدھا راہب کے دماغ میں گھسی جا رہی تھیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کے جواب نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ قاضی آہستگی سے بولا۔ اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کوئی غلطی تو نہیں کر رہے۔ پونتی پلات نے اپنے نکتہ اعتراض کو مزید واضح کرنے کے لئے کہا کہ رومن حکومت کسی بھی طرح مقامی مذہبی اور حکومتی امور میں دخل انداز نہیں ہونا چاہتی۔ یہ بات راہب کو بھی اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن آج کے فیصلے میں آپ لوگ صریحاً غلطی کر رہے ہیں اور رومن حکومت اس غلطی کی درستگی میں دل چسپی رکھتی ہے۔

اگر آپ غور کریں تو برابا اور عیشوا کے جرائم کی سنگینی اور نوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ عیشوا ایک ذہنی مرض میں مبتلا شخص ہے۔ اس کا جرم پاگل پن کے دورے کی کیفیت میں اول فول بکنا ہے جس کی وجہ سے یروشلم اور کچھ دوسری جگہوں پر لوگوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں دوسرے ملزم برابا کا جرم انتہائی سنگین ہے۔ وہ نہ صرف لوگوں کو مسلح بغاوت پر اکسا رہا تھا بلکہ اس نے گرفتاری کے دوران ایک سپاہی کو موت کے گھاٹ بھی اتار دیا تھا۔ ظاہری سی بات ہے کہ برابا عیشوا سے زیادہ خطرناک مجرم ہے۔ اس موازنے کی بنا پر قاضی رومن حکومت کی طرف سے عظیم راہب کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست کرتا ہے اور استدعا کرتا ہے کہ ان دونوں میں سے اس ملزم کی سزا معاف کی جائے جس کا جرم کم سنگین ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اس کا حقدار عیشوا ہے۔

ہاں تو اب آپ کیا کہیں گے؟ قاضی نے پوچھا۔

راہب نے انتہائی دھیمی لیکن پر اعتماد آواز میں جواب دیا کہ مذہبی امور کی کونسل نے یہ مقدمہ بہت غور سے سنا ہے اور تجویز کیا ہے کہ آزادی ملزم برابا ہی کا حق ہے۔

کیسے؟ میری یعنی رومن حکومت کی رائے کے باوجود؟۔ میں ایک مرتبہ پھر سوچنے کا مشورہ دیتا ہوں۔

''میں پھر دہراتا ہوں کہ آزاد برابا ہی کو کیا جائے گا''۔ کائفا نے آہستگی سے جواب دیا۔

سب ختم ہو گیا تھا۔ مزید گفتگو بے سود تھی۔ عیشوا ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا اور قاضی کے خوفناک درد سر کا علاج اب کوئی نہیں کر سکے گا۔ اس اذیت ناک درد کا اور کوئی معالج بھی تو نہیں تھا۔ لیکن پونتی پلاط کے لئے زیادہ تکلیف دہ اور پریشان کن ایک دوسری بات تھی۔۔ اور وہ تھی ایک عجیب سی بے چینی اور افسردگی جس نے قاضی کو محل کے چبوترے پر بھی آن گھیرا تھا۔ قاضی اس کیفیت کی کوئی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور جو وجہ اس کے ذہن میں آئی وہ بہت ہی عجیب تھی۔ قاضی کے دماغ میں ایک دھندلا سا خیال گھوم رہا تھا کہ جیسے ملزم عیشوا کو کوئی بات ادھ کہی رہ گئی ہے یا پھر ملزم کی کوئی بات ادھ سنی رہ گئی ہے۔

قاضی نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور یہ خیال جس طرح آیا تھا اسی طرح فوراً غائب ہو گیا۔ لیکن بے چینی اور افسردگی اپنی جگہ قائم رہی۔ قاضی کے دماغ میں ایک عجیب سی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ گھنٹی کی آواز بتدریج واضح ہوتی گئی اور بالآخر ایک انسانی آواز میں تبدیل ہو گئی جو پکار رہی تھی ''لافانی، لافانی،۔۔۔۔۔ کوئی لافانی ہو گیا ہے''۔ قاضی کو اس بات کی سمجھ تو نہ آئی لیکن اس لافانی کے تصور سے اس کا جسم دہکتے ہوئے سورج کے باوجود برف کی مانند سرد پڑ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے'' قاضی بولا ''اگر تم لوگوں کا یہی فیصلہ ہے تو ایسا ہی سہی''۔ یہ کہنے کے بعد قاضی نے اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائی اور یہ دیکھ کر بالکل حیران رہ گیا کہ اس کے آس پاس کی دنیا یکسر تبدیل

ہوچکی ہے۔ گلاب کے پھولوں سے اٹی کیاریاں غائب ہوگئی تھیں۔ انار کا درخت، بالکونی میں لگے سفید پھول اور مرمر کا مجسمہ دور کہیں گھاس کی ہریالی میں گم ہوگئے تھے اور خود ہریالی نے بنفشی رنگ کے لہلہاتے ڈھیر کی شکل اختیار کرلی تھی جس میں آبی پودے ادھراُدھر ڈگمگا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی پونتی پلات بھی ڈگمگا رہا تھا۔ اس پر ایک خوفناک ہیبت طاری ہورہی تھی۔ اس کیفیت سے اس کا بدن جل رہا تھا اور دم گھٹ رہا تھا۔ اس کے جسم کی تمام قوت کہیں غائب ہوتی جارہی تھی۔

''میرا دم گھٹ رہا ہے''۔ قاضی چلا رہا تھا۔ ''میرا دم گھٹ رہا ہے''۔

''آج کچھ زیادہ ہی حبس ہے۔ غالباً کہیں طوفان آرہا ہے''۔ کائفا نے قاضی کے سورج کی مانند سرخ چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اس مرتبہ تو ایسٹر کا مہینہ کچھ زیادہ ہی خوفناک ہے''۔

''نہیں''۔ قاضی بولا ''میرا دم گھٹنے کی وجہ یہ نہیں ہے۔ میرا دم تو تمہاری وجہ سے گھٹ رہا ہے''۔ آنکھیں سکیڑتے ہوئے ایک عجیب وحشیانہ مسکراہٹ کے ساتھ پونتی پلات نے کائفا کو دیکھا اور مزید بولا۔'' تم مجھ سے بچ کر رہنا۔۔ یہودیوں کے راہب!''۔

راہب کی سیاہ آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ چند لمحے قبل پونتی پلات کے چہرے پر چھائے حیرانگی کے تاثرات نے اب راہب کے چہرے پر رنگ جمالیا تھا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں، قاضی صاحب''۔ راہب نے نہایت سکون اور پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔'' آپ مجھے اُس سزائے موت کے سلسلے میں دھمکی دے رہے ہیں جس کی توثیق آپ خود کرچکے ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی؟ ہم لوگ تو اس بات کے عادی ہوچکے ہیں کہ رومن قاضی کچھ کہنے سے قبل اپنے الفاظ کو اچھی طرح تول لیتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہماری گفتگو کوئی سن نہ لے''۔

پونتی پلات نے اپنی زہرآلود نگاہیں راہب پر جماتے ہوئے دانتوں کو سختی سے بھینچ لیا۔'' یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔۔ راہبوں کے راہب! بھلا ہماری گفتگو یہاں کون سن سکتا ہے۔ کیا میں اُس آوارہ نوجوان عیشوا کی طرح پاگل ہوں یا میں کوئی بچہ ہوں؟۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ کہاں، کب، کیا بولنا ہے۔ یہ باغیچہ اور یہ محل اندھے اور بہرے ہوگئے ہیں۔ میری اجازت کے بغیر یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اس حقیقت سے تم بھی بخوبی واقف ہو۔ آج کے بعد تمہیں اور تمہاری قوم کو''۔ قاضی نے دائیں جانب واقع عبادت گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا'' کبھی بھی سکون نصیب نہیں ہوگا۔ یہ تمہیں میں کہہ رہا ہوں ۔میں، سلطنت روم کا عظیم قاضی ۔۔ پونتی پلات''۔

''جانتا ہوں، جانتا ہوں''۔ اپنی سیاہ داڑھی کو سہلاتے ہوئے کائفا نے ایک ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیا اور خوف زدہ ہوئے بغیر بولا۔'' یہودی قوم جانتی ہے کہ تم رومن قاضی ہم لوگوں سے کس قدر نفرت

کرتے ہو۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تم لوگ ہماری قوم کو کتنی اذیتیں پہنچاؤ گے۔ لیکن تم اس قوم کو کبھی بھی ختم نہیں کر سکو گے۔ ہماری حفاظت خود خدا کرے گا۔ ہماری فریاد عظیم قیصر بھی سنے گا اور ہمیں پونتی پلاطس کے ظلم وتشدد سے بچائے گا"۔

وہم ہے تمہارا! پونتی پلاطس چلّایا۔ ہر کہے گئے لفظ کے ساتھ اس کی طبیعت ہلکی سے ہلکی تر ہوتی جا رہی تھی۔ اب نہ تو کسی شرم و حجاب کی ضرورت تھی اور نہ ہی بولتے وقت مناسب الفاظ کا ڈھونڈنا ضروری تھا۔ "تم راہب لوگ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی قیصر کو میری شکائتیں کرتے رہتے ہو۔ میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے اور جان لو کہ اس لمحے سے تمہارا بُرا وقت شروع ہو چکا ہے۔ اب میرا یہ پیغام عظیم شہنشاہ کو پہنچے گا کہ تم اس کی سلطنت کے غداروں اور باغیوں کو پناہ دیتے ہو۔ اور ہاں بھول جاؤ میرا سلیمانی چشمے کے پانی سے یروشلم کو سیراب کرنے کا وعدہ۔ اب تمہاری پیاس میں یقیناً پانی سے تو نہیں بجھاؤں گا۔ یاد کرو وہ دن جب مجھے تمہاری وجہ سے شاہی فوج کو ساحل سمندر کے پہرے سے ہٹا کر یہاں لانا پڑا تھا اور تب میری آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھا تھا۔ میری بات یاد رکھنا راہب! اب یروشلم میں تمہیں ایک نہیں دس دس دستے دیکھنے کو ملیں گے۔ عربی گھوڑوں کی تڑاپ تڑاپ کی آوازوں کے پس منظر میں تمہیں صرف آہیں، سسکیاں اور کراہیں سنائی دیں گی۔ تب تمہیں یاد آئے گا یہ برابا۔ جس کی تم زندگی بچا رہے ہو اور تبھی تمہیں افسوس ہوگا کہ تم نے دنیا میں امن کی باتیں کرنے والے فلسفی کو تختہ ءدار پر چڑھا کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔

راہب کے چہرے کا ایک رنگ جا رہا تھا اور دوسرا آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ قاضی کو گھورتے ہوئے مسکرایا اور دانت بھینچتے ہوئے بولا۔ "قاضی! جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا تم خود اس پر یقین رکھتے ہو؟ نہیں، بالکل نہیں۔ لوگوں کے جذبات سے کھیلنے والے اس فلسفی کو یہاں امن کی تلاش کھینچ کر نہیں لائی۔ تمہیں بھی یہ بات خوب اچھی طرح معلوم ہے۔ تم اُسے محض اس لیئے آزاد کرنا چاہتے ہو تا کہ وہ لوگوں میں بے چینی پیدا کرے۔ ان کے مذہب کا مذاق اڑائے اور بالآخر عوام کو رومن تلواروں کے حوالے کر دے۔ لیکن میں یہودیوں کا عظیم راہب، جب تک زندہ ہوں اپنے عقیدے کی توہین نہیں ہونے دوں گا۔ اپنی قوم کا دفاع کروں گا۔ تم سُن رہے ہو نا پلاطس؟" راہب نے دھمکی آمیز انداز میں مکا فضا میں بلند کیا اور عالم جوش میں چلّایا" یہ بات تم کان کھول کر سن لو قاضی"۔

کا نفا خاموش ہوگیا اور قاضی کو پھر سے ایک شور سنائی دینے لگ گیا۔ ایسا شور کہ جیسے سمندر کی بپھری ہوئی لہریں شاہی محل کی فصیل کے ساتھ سر ٹکرا رہی ہوں۔ یہ شور قاضی کے پاؤں سے سرائیت کرتا ہوا اس کے تمام جسم میں پھیل رہا تھا۔ محل کے پچھواڑے سے بگل چونکا دینے والا شور پیدا کر رہے تھے اور لاتعداد بوٹوں کی دھمک سے ایک عجیب سی گنج پیدا ہو رہی تھی۔ فوجیوں کے آہنی ہتھیاروں کی چھنا چھن سے

ایک دل دہلا دینے والی سُر پیدا ہو رہی تھی۔ قاضی سمجھ گیا کہ اس کے حکم کی پیروی میں روم کے شاہی دستے کا پہلا حصہ مجرموں کو سزائے موت دیئے جانے سے قبل اپنی پریڈ شروع کر رہا تھا۔

''تم سن رہے ہو قاضی؟'' کائفا نے آہستگی سے اپنی بات دہرائی۔ ''اب کیا تم یہ کہو گے کہ یہ سب کچھ۔۔(اپنی بات پر زیادہ زور دینے کے لئے کائفا نے دونوں بازو اوپر بلند کئے تو اس کے سر سے ٹوپی نیچے گر گئی) اُس کچھوے کی اوقات رکھنے والے دو ٹکے کے قاتل برابا کا کیا دھرا ہے؟

قاضی نے پسینے سے شرابور ٹھنڈی پیشانی کو ہاتھ سے صاف کیا۔ پہلے نظریں زمین پر مرکوز کیں پھر آسمان کو نشانہ بنالیا۔ اس وقت آگ اگلتا ہوا آسمانی گیند عین اس کے سر کے اوپر تمتما رہا تھا۔ قاضی دھیمے اور جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔

''دوپہر ہونے کو ہے۔ ہم گفتگو میں کچھ زیادہ ہی الجھ گئے ہیں۔ ادھر حکومتی امور بھی میرا انتظار کر رہے ہیں''۔ انتہائی محتاط انداز میں قاضی نے یہودی راہب سے معذرت کی اور ایک درخت کے سائے میں پڑے بنچ پر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے باقی افراد کا انتظار کرنے کو کہا تاکہ آخری صلاح مشورے کے بعد ملزموں کو سنائی جانے والی سزائے موت کے بارے میں حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔

کائفا نے مؤدب انداز میں سرکو خم کیا اور بنچ پر براجمان ہو گیا جبکہ قاضی واپس چبوترے پر پہنچ گیا جہاں منشی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ قاضی نے منشی کو حکم دیا کہ محل کی انتظارگاہ سے شاہی دستے کے سالار، عبادت گاہوں کے محافظ دستے کے سربراہ اور یہودیوں کی کونسل برائے مذہبی امور کے اراکین کو فوراً باغیچے میں پیش کیا جائے۔۔۔۔اور جب یہ سب لوگ آجائیں تو مجھے اطلاع کر دی جائے۔ یہ کہنے کے بعد وہ محل کے اندر چلا گیا۔

جس دوران منشی لوگوں کو اجلاس کے لئے اکٹھا کر رہا تھا قاضی ایک نیم روشن کمرے میں ایک شخص کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ اس آدمی نے اپنا آدھا چہرہ ٹوپی میں چھپا رکھا تھا اور اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ جیسے کسی نے اس کا ٹینٹوا دبا رکھا ہے۔ یہ ملاقات بہت ہی مختصر رہی۔ قاضی نے جلدی سے اس آدمی کو کچھ کہا جس کے بعد وہ عجلت میں کمرے سے باہر نکل گیا اور قاضی باغیچے کی جانب چل دیا۔

باغیچے میں تمام لوگوں کی موجودگی میں قاضی نے رسمی طور پر اعلان کیا کہ اس نے ملزم یشوا کو سنائی جانے والی سزائے موت کی توثیق کر دی ہے اور یہودی کلیسہ کے نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے پوچھا کہ وہ کس ملزم کی سزا معاف کرنا چاہتے ہیں؟۔ یہودیوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔۔برابا

یہ سن کر قاضی اپنے منشی سے مخاطب ہوا۔۔یہ تمام باتیں روزنامچے میں درج کرلو۔ کچھ توقف کے بعد قاضی نے حاضرین کو اشارہ کرتے ہوئے میٹنگ برخاست کرنے کا اعلان کیا۔

تمام حاضرین میٹنگ دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگ گئے۔ سنگ مرمر سے مزین سیڑھیوں کے دونوں اطراف کیاریاں گلاب کے پھولوں سے اٹی پڑی تھیں۔ یہی وہ منحوس کیاریاں تھیں جن کی اذیت ناک خوشبو قاضی کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ سیڑھیوں کا اختتام ایک ہموار میدان میں ہوتا تھا جہاں سے یروشلم کے سرکاری محل کے ستون اور چبوترے واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ میدان کے مشرق میں ایک بہت بڑا پتھروں سے تراشا گیا چبوترہ تھا۔ پونتی پلات کی منزل یہی چبوترہ تھا۔ اس نے جب پلٹ کر اپنے پیچھے نظر دوڑائی تو محل کی دیوار اور چبوترے کا درمیانی حصہ ویران پڑا تھا لیکن اس کے سامنے حد نظر تک میدان انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بن چکا تھا۔ اگر سپاہیوں نے اس ہجوم کو قابو میں نہ رکھا ہوتا تو وہ چبوترے پر بھی قابض ہو چکا ہوتا۔ قاضی بار بار ہتھیلی پر مکے مار رہا تھا اور اس نے آنکھیں اس طرح بھینچ رکھی تھیں کہ جیسے سورج کی تیز روشنی سے بچنا چاہتا ہو۔ لیکن درحقیقت وہ نظریں ان ملزمان سے چرا رہا تھا جنہیں اس کے پیچھے پیچھے چبوترے پر لایا جا رہا تھا۔ سفید گاؤن میں ملبوس قاضی کا ہیولہ ہجوم کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اچانک اس انسانی سمندر سے شور کی ایک لہر پیدا ہوئی جو ابھی پوری طرح واپس نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور لہر نے اس کی جگہ لینی شروع کر دی۔ پھر تیسری، پھر چوتھی، پانچویں۔۔ ہر نئی لہر پہلی سے زیادہ بلند آواز تھی۔ ان لہروں میں عورتوں کی چیخیں اور آہیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں" لگتا ہے کہ ملزمان کو چبوترے پر لایا جا چکا ہے"۔ قاضی سوچ رہا تھا" اور یہ جو زنانہ آہیں سنائی دے رہی ہیں غالباً کچھ عورتیں ہجوم کے دباؤ تلے کچلی گئی ہیں"

قاضی نہایت تحمل کے ساتھ ہجوم کے خاموش ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ہجوم کو فوری طور پر کسی صورت بھی خاموش نہیں کرایا جا سکتا۔ اُسے انتظار تھا اس لمحے کا جب چیخ چیخ کر لوگوں کی ہمت جواب دے جائے اور وہ خود ہی خاموش ہو جائیں۔ بالآخر خاموشی کا لمحہ آن پہنچا۔ قاضی نے اپنا دائیاں ہاتھ بلند کیا اور ہجوم کی باقی ماندہ ہل چل بھی مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ قاضی نے اپنا پورا زور لگا کر پھیپھڑوں کو گرم ہوا سے بھرا اور اس کی جذبات سے عاری آواز ہزاروں لوگوں کے کانوں میں گونج اٹھی۔

"بلند مرتبہ شہنشاہ روم قیصر کے نام سے۔۔۔۔" قاضی کے تسلسل کو توڑتے ہوئے سپاہیوں نے دو مرتبہ نعرہ بلند کیا۔" قیصر زندہ باد۔۔۔۔ قیصر زندہ باد۔۔" قاضی نے ایک ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور سورج کی طرف رخ کر لیا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سبز رنگ کے شعلے لپکنے لگ گئے تھے۔ اس کا دماغ کسی تنور کی مانند دہک اٹھا تھا۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے وہ بولا۔۔" چار ملزمان جنہیں یروشلم میں قتل، لوگوں کو بغاوت پر اکسانے اور حکومت وقت کے قوانین اور مذہب کی تضحیک کرنے کے جرم میں ذلت آمیز سزائے موت سنائی گئی ہے آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ان کو آج ہی کل وری پہاڑی کے دامن میں صلیبوں پر لٹکا

کر سزائے موت عمل میں لائی جائے گی۔ ان ملزمان کے نام ہیں۔ دیسماس، گیستاس، براباا اور عیشوا۔
ہجوم نے اس اعلان کے بعد ایک طویل شور بلند کیا۔ اس شور کے ختم ہونے پر قاضی دوبارہ گویا ہوا۔۔
'' لیکن موت کی سزا صرف تین ملزموں کو دی جائے گی۔ کیونکہ صدیوں سے جاری روایت کے مطابق آج بھی ایسٹر کے تہوار کے موقع پر کسی ایک ملزم کی سزائے موت معاف کر دی جائے گی۔ یہودیوں کی کونسل نے اس خوش نصیب ملزم کا چناؤ کر لیا ہے اور ہمارے فراخ دل شہنشاہ روم نے بھی اس کی توثیق کر دی ہے۔ جس خوش نصیب کو ابھی آزاد کر دیا جائے گا اس کا نام ہے۔۔۔۔۔
قاضی نے اتنا کہنے کے بعد قدرے تامل کیا اور سوچنے لگ گیا کہ کہیں اپنے اس اعلامیے میں وہ کوئی بات کہنا بھول تو نہیں گیا۔ اسے معلوم تھا کہ آزادی پانے والے کا نام سنتے ہی یہ دم سادھے لوگ جاگ اٹھیں گے اور جو شور بلند ہوگا اس میں مزید نہ تو کچھ کہا جا سکے گا اور نہ ہی کچھ سنا جا سکے گا۔
۔۔سب۔۔لگتا ہے میں سب کچھ کہہ چکا ہوں۔ اب صرف نام۔۔ نام۔۔ قاضی بڑبڑا رہا تھا۔
نجانے کیوں یہ نام اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ بالآخر لفظ ''سب'' کو قاضی دیر تک منہ میں چبانے کے بعد اپنا تمام تر زور لگا کر چیخا ''براباا''
اس اعلان کے بعد قاضی کو یوں لگا کہ جیسے سورج ایک دھماکے کے ساتھ اس کے سر کے عین اوپر پھٹ گیا ہے اور اس کے کانوں میں دہکتے انگارے گھس گئے ہیں۔ اور ان انگاروں میں نفرت، آہوں اور سسکیوں کے شعلے لپک رہے ہیں۔
قاضی پیچھے نظر دوڑائے بغیر چبوترے سے نیچے اترا اور سیڑھیوں کی جانب چل پڑا ۔ اسے اندازہ تھا کہ انسانوں کے اس جم غفیر کی نگاہوں کا مرکز اب وہ عجوبہ ہے جسے سپاہی موت کی بے رحم زنجیروں سے اس وقت آزاد کر رہے ہیں اور اس خوش نصیب کے چہرے پر زخمی بازوؤں اور شکستہ ہڈیوں میں شدید تکلیف کے باوجود مسکراہٹ ہے۔ ایک عجیب دیوانوں والی مسکراہٹ۔ قاضی کو یہ بھی معلوم تھا کہ ٹھیک اسی وقت سپاہی زنجیروں میں جکڑے باقی تین ملزموں کو دھکیلتے ہوئے شہر کے مغرب میں واقع سنگلاخ کل وری پہاڑی کی جانب چل پڑے ہیں۔ سیڑھیوں کے وسط میں پہنچ کر قاضی نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اب اس ہجوم کی طرف سے اسے کسی قسم کی گزند پہنچنے کا امکان نہیں ہے اور نہ ہی اسے یہاں سے زنجیروں میں جکڑے ملزمان کی روح کو چیر دینے والی نگاہوں کا سامنا کرنے کا خدشہ ہے۔
ہجوم کی آہوں اور چیخوں کا شور و غل بتدریج کم ہونے لگ گیا ۔ اس کی جگہ اب سرکاری چوبداروں کی آوازیں واضح ہوتی جا رہی تھیں جو عبرانی اور یونانی زبانوں میں قاضی کے اعلامئے کو دُہرا رہے

تھے۔ چبوترے اور محل کی سیڑھیوں کے درمیانے حصے میں گھڑسواروں کا ایک دستہ پہنچ گیا تھا۔ دستے کا سالار ایک ناٹے قد کا سیاہ بالوں والا کپتان تھا۔ اس نے اپنی تلوار ہوا میں بلند کرتے ہوئے مشینی انداز میں کچھ الفاظ کہے اور دستے کو مخصوص سمت میں کوچ کرنے کا حکم دیا۔ یہ راستہ کل وری پہاڑی کی طرف جاتا تھا۔ دستے کو حکم تھا کہ وہ ملزمان سے پہلے پھانسی گھاٹ پر پہنچ جائے۔

ملزمان کو جس راستے سے لیجایا جارہا تھا وہاں ہجوم پر قابو پانے کے لئے سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ قاضی نے جب پلٹ کر اپنے پیچھے نظر دوڑائی تو چبوترہ اور میدان ویران ہو چکے تھے۔ میدان پر گرد وغبار کا بادل چھا چکا تھا۔ جس کے اُس پار زنجیروں میں جکڑے تین مسافر اپنی منزل کی جانب رواں تھے۔ قاضی اپنے چہرے کو ایک ہاتھ سے گرد کے طوفان سے بچاتے ہوئے تیزی سے سرکاری محل کے باغیچے کی جانب چل پڑا۔ منشی اور فوج کا سپہ سالار بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑ پڑے۔ اس وقت صبح کے تقریباً دس بجے ہو گئے۔

باب:۳

ساتواں ثبوت

جی ہاں اس وقت صبح کے تقریباً دس بجے ہوں گے۔ محترم ایوان پانیر صاحب۔ پروفیسر بولا:۔
شاعر کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے کہ جیسے ابھی ابھی سوتے سے جاگا ہے اور اسے یہ خبر ملی ہے کہ ماسکو میں شام کے سائے ڈھلنے لگے ہیں۔
قریبی جھیل کا پانی سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ ایک ہلکی کشتی جھیل کے پانی سے کھلوار کرتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے چپواروں کی پانی کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے کی مدھم دھن اور کشتی میں سوار خاتون کی شوخ ہنسی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔
شہر کی اس وسطی گلی میں لوگوں کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ لیکن نجانے کیوں ہمارے ان محو گفتگو دوستوں کے قریب کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت ماسکو شہر کا آسمان کافی روشن دکھائی دے رہا تھا اور چاند کا سفید گولا بھی واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اس کی روشنی ابھی سنہری نہیں ہوئی تھی۔ ایسے میں سانس لینا کافی حد تک آسان ہو گیا تھا۔ آس پاس سے سنائی دینے والی آوازوں میں بھی اب پہلے جیسی بے چینی نہیں رہی تھی۔
کیا عجب بات ہے کہ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا اور اس پروفیسر کے بچے نے ایک طویل کہانی سنا ڈالی ہے۔ شاعر" بے گھر" سوچ رہا تھا۔ یا پھر شائید میری آنکھ لگ گئی تھی اور یہ سب مجھے خواب میں سنائی دیا ہے۔
لیکن اس حقیقت کو غالباً تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ یہ تمام کہانی اس غیر ملکی پروفیسر نے ہی سنائی تھی۔ وگرنہ اس عجیب اتفاق کو ماننا پڑے گا کہ بالکل یہی خواب مائیکل بیرلی نے بھی دیکھا تھا کیونکہ وہ پروفیسر کے چہرے کا بغور معائنہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔" آپ کی کہانی کافی دلچسپ ہے جناب پروفیسر صاحب، لیکن انجیل میں بیان کردہ کہانی سے کافی مختلف ہے"۔

''معاف کیجئے گا قبلہ۔'' پروفیسر نے جواب دیا'' آپ جیسے نستعلیق ادیب کو تو معلوم ہونا چاہئے کہ انجیل میں جو کہانیاں درج ہیں وہ حقیقت میں ایسے نہیں تھیں۔ اگر ہم انجیل کا حوالہ ایک تاریخی سند کی صورت میں دینے لگیں تو۔۔'' پروفیسر نے اچانک ایک مضحکہ خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ مائیکل کے دماغ میں ایک گھنٹی بج اٹھی کیونکہ بالکل یہی بات خود اس نے کچھ دیر پہلے ایوان بے گھر کو کہی تھی۔

یہ تو ٹھیک ہے۔ مائیکل بولا۔ لیکن جو کہانی آپ نے ہمیں سنائی ہے اس کی تصدیق تو کوئی نہیں کر سکتا۔

''ارے نہیں نہیں۔ اس کہانی کی تصدیق بالکل ہو سکتی ہے'' پروفیسر انتہائی اعتماد کے ساتھ بولا۔ اور نہایت رازداری کے انداز میں دونوں دوستوں کو اپنے مزید قریب آنے کا اشارہ کیا۔'' بات یہ ہے کہ ۔۔ پروفیسر نے قدرے خوفزدہ انداز میں دائیں بائیں نظر دوڑائی اور سرگوشی میں بولا''۔ دراصل میں ذاتی طور پر اس تمام وقوعہ کے وقت موجود تھا۔۔ پونتی پلات کے ساتھ ۔۔ باغیچے میں ۔ چبوترے پر اور محل کی بالکونی میں بھی میں موجود تھا۔ لیکن ایک گمنام بلکہ بے نام شخص کی حیثیت میں۔ اس لئے آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ اس بات کا کسی سے بھولے میں بھی ذکر نہ کریں''۔

کچھ دیر کے لیئے خاموشی چھا گئی۔ مائیکل کا رنگ پہلے سفید اور پھر زردی مائل ہو گیا۔'' آپ۔۔ آپ کب سے ماسکو میں ہیں؟'' مائیکل نے لڑکھڑاتی زبان سے پوچھا۔

'' میں ابھی کچھ لمحے پہلے ہی ماسکو پہنچا ہوں''۔ پروفیسر خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ٹھیک اس لمحے دونوں پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ پروفیسر کی بائیں آنکھ کا رنگ سبز ہے اور اس کی نگاہ بالکل دیوانوں جیسی۔ جبکہ دائیں آنکھ کا رنگ سیاہ اور نگاہ بالکل خالی۔ مُردہ۔

یہ لو۔۔ سارا معاملہ سیدھا ہو گیا ہے۔ مائیکل سوچ رہا تھا۔ ایک پاگل جرمن ہمارے شہر میں آیا ہے۔ یا پھر شائید ابھی، کچھ دیر پہلے اس کا دماغ الٹ گیا ہے۔

جی ہاں۔ لگتا تھا کہ ہر بات اب واضح ہو گئی ہے۔ کئی سو سال قبل مرے فلسفی کانت کے ساتھ ناشتہ کرنا۔ کسی لڑکی انوشکا کا بے موقع تذکرہ کرنا۔ کہیں سورج مکھی کے تیل کے گرائے جانے اور کہیں کسی کا سر کٹ جانے کی الٹی سیدھی پیش گوئیاں کرنا۔۔ پروفیسر یقیناً پاگل ہی تھا۔

مائیکل نے حتمی طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ وہ کنکھیوں سے ایوان کو اشارے کر رہا تھا کہ پروفیسر کے ساتھ بحث کرنا بالکل فضول ہے۔

''جی ہاں۔ جی ہاں''۔ مائیکل قدرے جذباتی انداز میں بولا۔'' یہ سب کچھ ممکن ہے۔ واقعی ممکن

ہے۔ قاضی پوتتی پلات، بالکونی اور دوسری تمام چیزیں بھی۔ ویسے آپ یہاں اکیلے ہی تشریف لائے ہیں یا آپ کی اہلیہ بھی ساتھ ہیں؟''

''اکیلا، اکیلا۔ میں ازل سے ہی اکیلا ہوں''۔ تلخ انداز میں پروفیسر نے جواب دیا۔

آپ کا سامان کہاں ہے پروفیسر صاحب؟'' مائیکل نے پوچھا۔ آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟ شائید ہوٹل میٹروپول میں؟''

''کون؟ میں؟ کہیں بھی نہیں''۔ پاگل جرمن نے اپنی اداس سبز آنکھ ارد گرد گھماتے ہوئے کہا۔

''بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ تو پھر رہیں گے کہاں؟''

آپ کے گھر میں۔ پاگل پروفیسر تمسخرانہ انداز میں ایک آنکھ بھینچتے ہوئے بولا۔

میرے لئے یہ عزت افزائی ہوگی۔ مائیکل بولا۔ لیکن یقین کیجئے کہ میرے ہاں آپ کو بہت بے آرامی ہوگی۔ جبکہ ہوٹل میٹروپول میں انتہائی آرام دہ کمرے ہیں۔ یہ ہمارے شہر کا سب سے اچھا ہوٹل ہے۔

اچھا تو کیا شیطان کا بھی کوئی وجود نہیں ہے؟ پاگل آدمی نے ایوان پانیر سے اچانک سوال کیا۔

نہیں ہے۔ شیطان کا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔

مت بحثو بیمار آدمی سے۔ مائیکل نے دانت بھینچتے ہوئے کم عقل شاعر کو مشورہ دیا۔

نہیں ہے کوئی شیطان ویطان۔ اس تمام گفتگو سے اکتائے ایوان نے کہا۔ براہ کرم عقل کے ناخن لیجئے اور اپنے پاگل پن کا کسی اچھے معالج سے علاج کروائیے۔

اچانک پاگل جرمن نے اِس زور سے ہنسنا شروع کر دیا کہ درخت پر بیٹھے کبوتر گھبرا کر اڑ گئے۔ ۔ ارے واہ۔ یہ تو واقعی دلچسپ بات ہے۔ ہنسی سے لرزتے ہوئے پروفیسر بولا۔ تمہارے ہاں جو بھی پوچھو جواب۔ نہیں۔ ہے۔ اس نے ہنسنا بند کر دیا اور جیسا کہ پاگل پن کے مریضوں کے ساتھ عموماً ہوتا ہے۔ ہنسی کے بعد وہ خاصے غصیلے انداز میں بولا۔ ''اچھا تو مطلب یہ ہُوا کہ بس یونہی کچھ بھی نہیں ہے؟''۔

''دھیرج۔ دھیرج جناب پروفیسر صاحب''۔ مائیکل یہ مدنظر رکھتے ہوئے کہ مریض کو غصہ نہیں دلانا چاہیے، بولا۔ آپ یہاں میرے دوست ایوان کے ساتھ بیٹھیں میں ابھی پانچ منٹ میں گلی کے نکڑ سے ایک فون کر کے واپس آتا ہوں اور پھر آپ جہاں کہیں گے ہم آپ کو پہنچا دیں گے۔ دیکھیئے نا۔ ہمارا شہر تو آپ کے لئے انجان ہے''۔

مائیکل کا منصوبہ تھا کہ وہ قریب ترین ٹیلیفون بوتھ سے وزارت خارجہ کے دفتر میں رابطہ کر کے انہیں اطلاع دے گا کہ ایک غیر ملکی پروفیسر جو پاگل پن کے کسی انتہائی موذی مرض میں مبتلا ہے، شہر کے وسط میں بیٹھا انتہائی لغو۔ غیر سائنسی گفتگو کر رہا ہے اور اسے کسی مناسب علاج گاہ تک پہنچانا بہت ضروری ہے

ورنہ کوئی ناگہانی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔

''فون کرنے جا رہے ہو؟ جاؤ۔ جاؤ۔ ضرور کرو فون''۔ ذہنی مریض اچانک اداس دکھائی دینے لگا تھا۔ ''لیکن جانے سے قبل اور کچھ نہیں تو براہ کرم میری اس بات پر ہی یقین کرلو کہ شیطان کا وجود ہے۔ مزید کسی بات پر یقین کرنے کو میں اب آپ سے نہیں کہوں گا اور ہاں یاد رکھیئے کہ اس حقیقت کے حق میں ساتواں ثبوت۔ ایک انتہائی مصدقہ ثبوت موجود ہے اور یہ ثبوت ابھی آپ کو پیش کر دیا جائے گا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے''۔

ایوان پانیر کو نکھیوں سے اشارہ کرتے ہوئے مائیکل گلی کی اس سمت چل پڑا جو چوک پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔

اچانک ایسا لگا کہ پروفیسر بالکل تندرست ہو گیا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ و سفید ہو گیا اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقص کرنے لگ گئی۔

مائیکل۔ عزیزم مائیکل بیرلی۔ پروفیسر نے ادیب کو پیچھے سے آواز دی۔

مائیکل پاگل پروفیسر کی زبان سے اپنا پورا نام سن کر کچھ پریشان ہو گیا۔ لیکن پھر خود ہی اپنے آپ کو تسلیاں دینے لگا کہ اس پاگل شخص نے شائید کسی اخبار یا رسالے میں میرا نام پڑھ لیا ہوگا۔

پروفیسر دونوں ہاتھ ہوا میں نچاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو ابھی آپ کے کیف میں مقیم پھوپھا کو ٹیلیگرام بھجوانے کا بندوبست کروا دوں؟''

مائیکل کو یک لخت ایک شدید جھٹکا لگا۔ یہ کم بخت میرے کیف میں مقیم پھوپھا کے بارے میں کیسے جانتا ہے؟ میرے عزیزوں کے متعلق کسی اخبار یا رسالے میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ بے گھر شائید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ یہ غیر ملکی پروفیسر پاگل نہیں بلکہ کوئی جاسوس لگتا ہے۔ فون، فون۔ مجھے جلد از جلد فون کرنا چاہیئے تا کہ متعلقہ ادارے اس بدبخت کی فوراً خبر لیں۔ یہ سوچتے ہوئے مائیکل چوک کی طرف دوڑ اٹھا۔ گلی کے موڑ پر مخالف سمت سے اچانک ایک شخص مائیکل کے سامنے نمودار ہوا۔ یہ وہی شخص تھا جو کچھ دیر قبل مائیکل کے سامنے ہوا میں معلق ظاہر ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار وہ زمین پر کھڑا تھا اور اس گلی میں حقیقتاً موجود تھا۔ مائیکل کے بغور دیکھنے پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ اس شخص کی مونچھیں بالکل مرغی کے پروں کی مانند تھیں۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی، گول بٹنوں کی طرح اور ان آنکھوں سے ایک طنزیہ تمسخر جھلک رہا تھا۔ وہ دھاری دار پتلون پہنے ہوئے تھا۔ جس کے پائینچے اتنے اونچے تھے کہ غلیظ جرابیں واضح نظر آ رہی تھیں۔ مائیکل کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے تھے لیکن اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو تسلی دی کہ یہ غالباً محض اتفاق ہے کہ اس شخص کی شکل اس شبیہ سے ملتی جلتی ہے جو اس نے کچھ دیر قبل دیکھی تھی۔ ویسے بھی اس وقت

اسے ایسی لغو باتوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ٹرام کی پٹڑی کا راستہ ڈھونڈ رہے ہو بھائی؟ لرزتی آواز میں وہ دھاری دار پتلون والا بولا۔ سیدھے میری طرف چلے آؤ اور تم جہاں چاہو گے وہیں پہنچ جاؤ گے۔ میں راستہ دکھانے کا کوئی زیادہ معاوضہ نہیں لوں گا اور۔۔۔۔۔ ہاں ماضی کے ایک شہنشاہ کا بھلا بھی ہو جائے گا۔ اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے وہ بولا۔

مائیکل اس ''شہنشاہ'' کو نظر انداز کرتے ہوئے فٹ پاتھ کے ساتھ لگے جنگلے کے دروازے سے گذرتا ہوا ٹرام کی پٹڑی پر پہنچ گیا۔ پٹڑی کے بیچوں بیچ کھڑے اسے اچانک ایک سرخ و سفید رنگ کی ٹرام گڑگڑاتی ہوئی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ مائیکل نے انتہائی محتاط انداز میں پٹڑی کو پار کرنے کی ٹھان لی۔ ابھی اس نے ایک پاؤں پٹڑی کے اُس پار رکھا ہی تھا کہ اسے یوں لگا کہ جیسے سردیوں میں جم جانے والی برف پر پھسلتا ہوا وہ فضا میں معلق ہو گیا ہے اور پورے جسم کی حرکات اس کے اپنے بس میں نہیں ہیں۔ اس کی ایک ٹانگ پٹڑی کے وسط میں اور دوسری پٹڑی کے اوپر گر گئی۔ پریشان حال مائیکل ادھر ادھر ہاتھ چلاتا ہوا کوئی سہارا ڈھونڈنے کی کوشش میں تھا کہ اس کی نظر دور آسمان پر سنہری پردے میں لپٹے چاند پر پڑی۔ تاہم اسے یہ سمجھ نہیں آئی کہ چاند دائیں جانب ہے یا بائیں جانب۔ بھرپور کش مکش کے نتیجے میں مائیکل اپنی دائیں کروٹ پر ہو گیا۔ ٹانگوں کو اس نے پیٹ کی طرف سکیڑ لیا اور سر کو ذرا بلند کر کے دیکھا تو اسے ٹرام کی خاتون ڈرائیور کا خوف سے زرد چہرہ اور سنہری بالوں پر لپٹا سرخ رنگ کا رومال برق رفتاری سے اپنی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ مائیکل نے کوئی آواز نہیں نکالی لیکن آس پاس کھڑی خواتین کی چیخوں سے فضا گونج اٹھی۔ ٹرام کی ڈرائیور نے اپنی پوری قوت کے ساتھ بریک کھینچ لی۔ جس کے نتیجے میں ٹرام کا اگلا حصہ زمین سے ٹکرانے کے بعد ہوا میں بلند ہوا اور اس کی کھڑکیوں سے شیشے تڑاخ تڑاخ کرتے ٹوٹ کر بکھرنے لگ گئے۔ عین اس وقت مائیکل کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ ''کیا واقعی؟'' پھر ایک بار۔۔ آخری بار اس کی نظر چاند پر پڑی۔ لیکن اس مرتبہ چاند کے چھوٹے چھوٹے ہزاروں ٹکڑے ہو چکے تھے۔ اس کے فوراً بعد گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔

ٹرام نے مائیکل کا جسم اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ جب کہ پہیوں کے نیچے سے ایک سیاہ رنگ کا گولہ لڑھکتا ہوا گلی کے وسط میں جا گرا۔ یہ گولہ مائیکل کا کٹا ہوا سر تھا۔

باب ۴

ریس

زنانہ چیخوں کا شور کچھ ہی دیر میں مدھم پڑ گیا۔ پولیس کی سیٹیاں اور گاڑیوں کے سائرن بھی خاموش ہو گئے۔ دو ایمبولینس گاڑیاں اپنی منزل کو چل پڑیں۔ ایک مائیکل کا کٹا ہوا سر اور دھڑ لے کر مردہ خانے کی جانب جبکہ دوسری شیشے کے ٹکڑوں سے زخمی ہونے والی خوبرو ٹرام ڈرائیور کو ہسپتال کی جانب۔ سفید وردیوں میں ملبوس کارندوں نے ٹوٹ کر بکھرنے والے شیشوں کے تمام ٹکڑے اکٹھے کر لئے اور خون کے تالاب پر مٹی ڈال کر جھاڑو لگا رہے تھے۔

ایوان'' بے گھر'' ٹرام تک پہنچنے سے قبل ہی صدمے سے بے حال ایک بنچ پر گر پڑا۔ وہاں سے اٹھنے کی سکت اس میں نہیں رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں بالکل بے جان ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کی ٹانگوں پر فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔ آخر کار کچھ دیر بعد وہ اپنی تمام تر قوت یکجا کر کے بنچ سے اٹھنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ وہ دوڑتا ہوا ٹرام کے نزدیک پہنچا تو مائیکل کا کٹا ہوا سر ابھی تک سڑک کی ڈھلوان پر گیند کی مانند لڑھکتا جا رہا تھا۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر ایوان کا ذہن اس قدر ماؤف ہو گیا کہ وہ دوبارہ بنچ پر گر گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس شدت کے ساتھ دانتوں میں بھینچ لیا کہ اس سے خون نکلنے لگ گیا۔ سر پھرے جرمن کے بارے میں وہ یکسر بھول ہی گیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوال گھوم رہا تھا کہ یہ سب کیونکر ممکن ہے؟ ابھی چند ہی لمحے قبل مائیکل بیرلی اس کے ساتھ محو گفتگو تھا اور اب اچانک سڑک پر لڑھکتا ہوا یہ سر؟

خوف زدہ لوگ کچھ چیختے چلاتے افراتفری کے عالم میں ایوان کے آس پاس بھاگ رہے تھے۔ لیکن ایوان ان کی کوئی بھی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔ دو خواتین چلتے چلتے اچانک ایوان کے نزدیک پہنچ کر رک گئیں۔ ان میں سے ایک چلا کر بولی۔۔۔

''انوشکا۔ ہماری انوشکا! عمارت ۳۰۲ کی رہائشی انوشکا۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے سٹور سے سورج مکھی کے تیل کی بوتل خریدی تھی۔ اور عین اسی جگہ نجانے یہ بوتل کیسے اس کم

بخت کے ہاتھ سے گرنے کے بعد ٹوٹ گئی۔ اس کا اپنا سکرٹ بھی تیل میں نچڑ گیا تھا۔ اس وقت وہ نجانے کیسے کیسے مغلظات بک رہی تھی۔ یہ بیچارہ اسی تیل سے آلودہ سڑک پر پھسلتا ہوا ٹرام کے پہیوں کے نیچے کچلا گیا ہے۔

خاتون کی اس تمام گفتگو میں سے ایوان کے سکتہ زدہ دماغ میں صرف ایک لفظ الجھ کر رہ گیا تھا۔ ''انوشکا''۔

انوشکا۔ انوشکا۔ شاعر بڑبڑایا اور خوف زدہ انداز میں ہاتھ پھیلاتا ہوا بولا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟''

انوشکا کے ساتھ ایک دوسرا لفظ ''سورج مکھی کا تیل'' بھی ایوآن کے دماغ میں گردش کرنے لگ گیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد ایک تیسرا لفظ ''پونتی پلات'' بھی اس گردان میں شامل ہوگیا۔ پونتی پلات کو تو ایوآن نے فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا لیکن ''انوشکا'' اور ''سورج مکھی کے تیل'' کا تانا بانا شاعر کو سیدھا اس دیوانے غیرملکی پروفیسر تک لے پہنچا۔

اوہ خدایا! اُسی نے تو کہا تھا کہ اجلاس ملتوی ہوگیا ہے کیونکہ انوشکا نے تیل گرا دیا ہے اور ملاحظہ کیجئے اجلاس واقعی ملتوی ہوگیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کم بخت پروفیسر نے تو صاف صاف کہا تھا کہ مائیکل کا سر ایک عورت کاٹے گی اور ٹرام ڈرائیور ایک عورت ہی تو تھی۔ یہ سب کیا ہے؟

اب اس حقیقت میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اس بظاہر پاگل پروفیسر کو مائیکل کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی تفصیلات پہلے سے ہی معلوم تھیں۔ ایوآن کے سامنے اب دو ممکنہ باتیں واضح تھیں۔۔ پہلی بات تو یہ کہ پروفیسر پاگل نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس تمام حادثے میں دراصل پروفیسر ہی کا ہاتھ ہے۔ عملاً اس نے یہ کیسے کیا ہوگا؟ ایوآن کے ننھے منے دماغ کے لئے یہ سمجھنا ممکن نہیں تھا۔

آخرکار ایوآن کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس سمت واپس چل پڑا جہاں کچھ دیر پہلے وہ لوگ پاگل پروفیسر کے ساتھ محوِ گفتگو تھے اور ایوآن کی خوش قسمتی دیکھئے کہ پروفیسر ابھی تک وہیں موجود تھا۔

آس پاس کی عمارتوں میں بتیاں روشن ہونے لگ گئی تھیں۔ آسمان میں معلق چاند کی سنہری کرنیں بھی اب بخوبی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس مدھم روشنی میں ایوآن کو ایسے لگا کہ جیسے پروفیسر کھڑا ہے اور اپنی بغل میں اس نے چھڑی کی جگہ تلوار دبا رکھی ہے۔

''ماضی کا شہنشاہ'' اسی جگہ جا بیٹھا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ایوآن بے گھر بیٹھا تھا۔ اب اس نے

چہرے پر صریحاً ایک غیر ضروری چشمہ لگا لیا تھا۔ چشمے کا ایک شیشہ غائب تھا اور دوسرا کوئی دس جگہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس چشمے کی وجہ سے دھاری دار پتلون والے کی خباثت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

ٹھنڈے پسینے میں شرابور اور تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ ایوان پروفیسر کے قریب جا پہنچا۔ اس وقت پروفیسر کی آنکھوں اور چہرے پر پاگل پن کے تاثرات کا نام ونشان تک نہ تھا۔

''تم ہو کون؟ جلدی سے اقرار کرو''۔ ایوان نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

''ہم روسی زبان سمجھتے ناہیں''۔ ٹوٹی پھوٹی روسی میں پروفیسر بولا۔

''انہیں روسی زبان سمجھ نہیں آتی''۔ بنچ سے اٹھتے ہوئے دھاری دار پتلون والا بولا۔ حالانکہ اسے کسی نے گفتگو میں شامل ہونے کی دعوت نہیں دی تھی۔

''زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے''۔ ایوان کی خود اعتمادی بحال ہونے کے باوجود اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر آگے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ ''ابھی کچھ ہی دیر پہلے تم کسی اہل زبان کی طرح فر فر روسی بول رہے تھے۔ تم نہ تو جرمن ہو اور نہ ہی پروفیسر ہو۔ تم قاتل ہو۔ جاسوس ہو۔ کہاں ہیں تمہارے شناختی کاغذات؟'' ایوان بری طرح چلانے لگ گیا۔

پراسرار پروفیسر نے پہلے سے ٹیڑھے منہ کو مزید ٹیڑھا کرتے ہوئے صرف شانے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

''محترم!'' دھاری دار پتلون والا خبیث الخلقت شہنشاہ پھر مخل ہوا۔ ''آپ ایک غیر ملکی مہمان کو کیوں پریشان کر رہے ہو؟ آپکو اس بداخلاقی کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ اس دوران پروفیسر چہرے پر ناپسندیدگی کا اظہار لئے وہاں سے چل پڑا۔

پروفیسر کو جاتے دیکھ کر ایوان پریشان ہو گیا اور دھاری دار پتلون والے کو مخاطب کرتے ہوئے چلایا۔ ''اے بھائی اس مجرم کو پکڑنے میں میری مدد کرو۔ یہ تمہارا قومی فریضہ ہے۔ دیکھو، دیکھو وہ یہاں سے فرار ہو رہا ہے''۔

دھاری دار پتلون والا یکدم چہک اٹھا۔ ''کون سا مجرم؟ کہاں ہے وہ؟''۔ اس کی آنکھوں میں تمسخر ناچ رہا تھا۔ ''اچھا وہ غیر ملکی؟ ارے اگر وہ مجرم ہے تو اسے پکڑنے کے لئے ہمیں مل کر شور مچانا چاہیے۔ اکٹھے مل کر نعرہ لگانا چاہیے۔ پکڑو پکڑو ورنہ وہ بھاگ جائے گا۔ آؤ اکٹھے یک زبان ہو کر شور مچائیں اور دھاری دار پتلون والے نے شور مچانے کے لئے منہ کھول لیا۔

اس ''شہنشاہ'' کی باتوں میں آ کر ایوان نے پورا زور لگا کر نعرہ بلند کیا۔۔ '' پکڑو، پکڑو'' لیکن کم بخت دھاری دار پتلون والے نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔ اس کے کھلے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

اکیلے ایوآن کی نعرے بازی کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ قریب سے گزرتی ہوئی دولڑکیوں نے مڑ کر ایوآن پر نگاہ ڈالی اور دونوں بیک زبان چلا اٹھیں۔۔ شرابی۔ شرابی

''اچھا تو تم بھی اس قاتل کے ساتھ ہو؟''۔ فرط جذبات سے ایوآن کی آواز پھٹ گئی۔ ''بدبخت انسان۔ تم کیا میرا مذاق بنا رہے ہو؟'' ایوآن دائیں جانب بھاگ اٹھا۔ دھاری دار پتلون والا بھی اسی جانب لپکا۔ ایوآن نے رخ بدلا اور بائیں طرف بھاگ پڑا۔ دھاری دار پتلون والا بھی اسی سمت میں دوڑ اٹھا۔ یہ تم آوارہ کتوں کی طرح جان بوجھ کر میرے راستے میں کیوں آ رہے ہو؟ ایوان چلایا۔ ''اب پہلے تو میں تمہی کو پولیس کے حوالے کرتا ہوں''۔ ایوآن نے دھاری دار پتلون والے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کم بخت یکدم ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

ایوآن نے زور سے سانس کھینچی تو اس کی نظر دور گلی کے کونے میں اوجھل ہوتے ہوئے پاگل پروفیسر پر پڑی۔ پروفیسر اکیلا نہیں تھا۔ دھاری دار پتلون والا ''شہنشاہ'' بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اور نجانے کہاں سے یکا یک ایک بلا بھی اس جتھے میں شامل ہو گیا۔ بھاری بھرکم، کسی خنزیر کی طرح جسیم اور کوے کی مانند سیاہ۔ اس کی مونچھیں کسی مغرور فوجی حوالدار کی طرح لمبی اور تنی ہوئی تھیں۔ وہ تینوں اکٹھے مارچ کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ اور ہاں بلا اپنے پچھلے پنجوں کے بل چل رہا تھا۔ ایوآن اس ٹولے کے پیچھے دوڑ پڑا۔ لیکن وہ جلد ہی سمجھ گیا کہ اس ترائیکا تک پہنچنا اس کے بس سے باہر تھا۔ ان تینوں کا رخ شہر کے مشہور پررونق بازار کی طرف تھا۔ ایوآن کی سبک رفتاری کے باوجود یہ حضرات اس سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ لوگوں سے کھچا کھچ بھرے بازار میں پہنچ کر تینوں نے جرائم پیشہ لوگوں والا عمومی ہتھکنڈہ اختیار کر لیا۔ تینوں وہاں سے الگ الگ راستوں پر نکل پڑے۔ دھاری دار پتلون والا شہنشاہ ایک بس میں سوار ہو گیا اور چند ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ایوآن نے اب اپنی تمام توجہ بلے پر مرکوز کر دی تھی۔ بلا انتہائی بدتمیز ثابت ہوا۔ اس نے ٹرام کے نزدیک کھڑی ایک نازک اندام حسینہ کو خوف زدہ کر دیا اور خود ٹرام کے پائیدان پر سوار ادھ کھلی کھڑکی سے کنڈکٹر کو ٹکٹ کے لئے دس پیسے کا سکہ تھمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بلے کی حرکات نے ایوآن کو سکتے میں ڈال دیا۔ وہ ایک بیکری کے سامنے منجمد ہو کر رہ گیا۔ لیکن ٹرام کی خاتون کنڈکٹر کے رویے نے ایوآن کو بلے سے بھی کہیں زیادہ حیران کر دیا۔ یہ خاتون بلے پر نگاہ پڑتے ہی غصے سے لال پیلی ہو گئی اور چلا کر بولی۔ ''نکلو یہاں سے۔ بلوں کو ٹرام میں گھسنے کی اجازت نہیں ہے۔ نکلو۔ ورنہ ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کرتی ہوں''۔ لیکن نہ تو کنڈکٹر اور نہ ہی مسافروں میں سے کسی نے اس حیران کن بات پر توجہ دی کہ بلے نے ٹرام پر سوار ہونے کی کوشش تو جو کی سو کی مگر اچنبھے کی اصل بات یہ تھی کہ بلا ٹکٹ کے لئے پیسے دے رہا تھا۔ بلا نہ صرف صاحب حیثیت ثابت ہوا بلکہ بااصول ہونے کا بھی مظاہرہ کر رہا تھا۔ کنڈیکٹر کے

دھتکارنے پر بلّا فوراً ٹرام سے اتر گیا۔ اس کے اترتے ہی کنڈیکٹر نے زنجیر ہلا کر ٹرام ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ دے دیا۔ بلّا نہایت تحمل کے ساتھ ٹرام کی تینوں ویگنوں کے گذرنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخری ویگن کے گذرتے ہی وہ جست لگا کر ویگن کے عقبی پائیدان پر چڑھ گیا۔ یوں اس نے ٹکٹ کے پیسے بھی بچا لئے۔

اس کم بخت بلے کے چکر میں الجھ کر ایوان کچھ دیر تک اصل مجرم یعنی پاگل پروفیسر کو بھول ہی گیا تھا۔ لیکن ایوان کی خوش قسمتی دیکھیئے کہ پروفیسر ابھی تک فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ایوان فوراً ہی اس کی طرف لپکا۔ لوگوں کو دائیں بائیں دھکیلتے ہوئے وہ انتہائی تیز رفتار سے چلتے اور کبھی دوڑتے ہوئے پروفیسر کا پیچھا کرنے لگ گیا۔ لیکن فاصلہ تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس تعاقب کی تیز رفتاری کسی گھڑ سواری کے مقابلے سے کم نہ تھی۔ پروفیسر کے تعاقب میں کبھی دائیں، کبھی بائیں، کبھی روشن اور کبھی اندھیری گلیوں سے گزرتے ہوئے ایوان دو تین مرتبہ ٹھوکر کھا کر گرنے سے کچھ زخمی بھی ہوگیا۔ بالآخر پروفیسر ایک بارونق گلی میں گھسنے کے بعد ایوان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ایوان کچھ دیر کے لئے پریشان ہوگیا۔ لیکن اس کے دماغ میں جلد ہی ایک بجلی سی کوند اٹھی۔ وہ تو ایک بے حد مانوس گلی میں کھڑا تھا۔ اسے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ ہو نہ ہو پروفیسر اسی گلی کے مکان نمبر ۱۳ کے فلیٹ نمبر ۴۷ میں گیا ہے۔ ایوان فوراً ہی مکان نمبر ۱۳ میں داخل ہوگیا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دوسری منزل پر واقع فلیٹ نمبر ۴۷ کے دروازے پر جا پہنچا۔ بے تابی کی شدت سے کانپتے ہوئے اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی اور بے صبری سے انتظار کرنے لگ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد ایک پانچ سالہ نامانوس بچی نے دروازہ کھولا اور نووارد سے کچھ پوچھے بغیر دروازہ کھلا چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ فلیٹ کے کشادہ دریچے میں ایک ہڑبونگ سی مچی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں لگے بلب کی مدہم روشنی میں گندگی سے سیاہ چھت کے نیچے کھونٹی پر بغیر پہیوں کی سائیکل لٹک رہی تھی۔ ایک میز پر مختلف قسم کے پرزے بکھرے پڑے تھے۔ سائیکل کے دائیں جانب دیوار پر ایک گرم ٹوپی لٹکی تھی جس کے لمبے کانوں کی وجہ سے کسی جنگلی جانور کے سر کا گمان ہوتا تھا۔ ایک دروازے کے عقب سے ریڈیو پر ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز غصیلے لہجے میں نظم پڑھتی سنائی دے رہی تھی۔

ایوان اس انجان ماحول سے قطعاً متاثر نہیں ہوا۔ راہداری میں چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کم بخت یقیناً غسل خانے میں چھپ گیا ہوگا۔ تاریک راہداری کے اختتام پر ایک دروازے کے نیچے سے روشنی کی ہلکی سی لکیر نظر آ رہی تھی۔ ایوان نے دروازے کے ہینڈل کو گھمانے کے بعد آہستہ سے دھکیلا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ایوان کی خوش قسمتی دیکھئے کہ وہ غسلخانہ ہی تھا لیکن پروفیسر نامی پاگل کا وہاں کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

پانی گرم کرنے کے لئے دہکتے کوئلوں کی مدھم روشنی اور گرم پانی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی دھند

میں کپڑوں سے عاری ایک خاتون چہرے اور جسم پر صابن کا لیپ کئے کھڑی تھی۔ دروازہ اچانک کھلنے پر اس نے آنکھیں سکیڑ لیں اور مدھم روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی تو اسے ایوان پر کسی دوسرے مہمان کا گمان گزرا۔ وہ مدھم آواز میں چہکتی ہوئی بولی۔''ارے ساشا۔تم کیا پاگل ہوگئے ہو؟ تم جانتے ہو کہ میرا خاوند کچھ ہی دیر میں آنے والا ہے۔ چلو نکلو باہر اور جلدی سے رفو چکر ہوجاؤ۔ پھر کبھی مناسب وقت پر چلے آنا۔ چلو۔ چلو۔ جلدی کرو''۔

ایوان کو اس طرح خاتون کے غسل خانے میں گھسنے پر بہت شرمندگی ہوئی لیکن اس شرمندگی کا اظہار کرنے کا ارادہ اس نے ترک کردیا۔ کیونکہ اس عورت نے انجانے میں اپنی نیچ خصلت ایوان پر عیاں کردی تھی۔ ایوان کے دماغ میں لفظ''فاحشہ'' کی تکرار شروع ہوگئی تھی۔ غسلخانے سے نکل کر وہ باورچی خانے میں جا پہنچا۔ باورچی خانہ خالی پڑا تھا۔ چولہے کے پاس ادھ جلی تیلیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ واحد کھڑکی جسے غالباً برسوں سے صاف نہیں کیا گیا تھا گرد اور جالوں سے اٹی پڑی تھی۔ اس کھڑکی سے چاند کی شرمندہ شرمندہ کرنیں اس کونے کو روشن کئے ہوئے تھیں جہاں دھوئیں اور گرد سے آلودہ۔ غالباً عرصہ دراز سے فراموش کردہ۔ یسوع مسیح کی شبیہ لٹک رہی تھی۔ اس بلند قامت شبیہ کے نیچے شمع دان کے عقب میں ایک کاغذ پر بنی ایک دوسری بقدرے مختصر شبیہ بھی لٹک رہی تھی۔ نجانے ایوان کو کیا سوجھی کہ اس نے فلیٹ چھوڑنے سے قبل شمع دان سے ایک موم بتی اور کاغذ پر بنی یسوع مسیح کی شبیہ اپنے قبضے میں کرلی۔

باہر گلی میں نکل کر ایوان نے دائیں بائیں پر امید نظریں دوڑائیں لیکن پروفیسر کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ اچانک ایوان جذباتی انداز میں بڑبڑانے لگ گیا۔۔ارے ہاں یہ پروفیسر یقیناً دریائے ماسکو کے کنارے پر ہوگا۔ واللہ عالم یہ خیال ایوان کے ذہن میں کہاں سے آیا تھا۔ بہرحال ایوان کچھ ہی دیر میں دریا کنارے موجود تھا۔ دریا کے پرسکون بہاؤ نے کچھ لمحوں کے لئے ایوان کی تمام الجھنیں سلجھا دیں۔ اور ایوان نے ان پرسکون لمحوں کو ابدی کرنے کے لئے دریا کی لہروں کو سینے سے لگانے کی ٹھان لی۔ اس نے زیر جامہ کے علاوہ تمام کپڑے اتار دیئے۔ ان کی ایک گٹھڑی بنا کر دریا کنارے کھڑے ایک بدشکل آدمی کے حوالے کئے اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ یخ پانی میں اترتے ہی ایوان کی سانسیں منجمد ہوکر رہ گئی تھیں۔ کچھ دیر کے لئے تو اسے یوں لگا کہ وہ اس سرد جہنم سے اب کبھی بھی نکل نہیں پائے گا۔ لیکن قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور وہ کسی نہ کسی طرح پانی کی سطح پر ابھر آیا۔ گھٹی گھٹی آہوں اور سسکیوں کے ساتھ اس نے اپنی سانسیں درست کیں اور خوف زدہ نگاہوں سے دریا کنارے لگی روشنیوں پر ٹکٹکی باندھے وہ تیل سے آلودہ پانی میں آہستہ آہستہ کنارے کی طرف تیرنے لگ گیا۔ ٹھنڈے پانی میں شرابور رعشہ کے کسی مریض کی طرح کانپتے ہوئے ایوان بالآخر خشکی پر پہنچ گیا۔ دائیں بائیں نظریں دوڑانے کے بعد اس کے ہوش اڑ گئے

۔کیونکہ جس آدمی کے حوالے اس نے اپنے کپڑے کئے تھے اس کا دور دور تک کہیں نام و نشان نہ تھا۔ جس جگہ ایوان نے اپنے کپڑے اتارے تھے اب وہاں ایک پھٹا پرانا دھاری دار پاجامہ، جا بجا پھٹی ایک جیکٹ، موم بتی، یسوع مسیح کی شبیہ اور ماچس کی ڈبیا پڑی تھی۔ ایوان غصے میں آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے ہوا میں مکے لہرائے اور جو بھی چیتھڑے اس کے ہاتھ لگے وہی پہن لئے۔

اب ایوان کو دو چیزوں کی فکر دامن گیر تھی۔ ایک تو یہ کہ کپڑوں کے ساتھ ساتھ اس کا پریس کلب کا شناختی کارڈ بھی چوری ہو گیا تھا۔ دوسرا یہ کہ فقط زیر جامہ پہنے وہ شہر کی گلیوں سے کیسے گزرے گا؟ بہر حال شبیہ۔ موم بتی اور ماچس کی ڈبیا کو سمیٹ کر ایوان خود سے ہمکلام ہوا۔ گیری باد؟ وہ یقیناً گیری باد ہی گیا ہوگا۔

شہر میں شام ڈھلتے ہی گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر آہنی زنجیریں چھنچھناتے ہوئے ٹرک اڑے جا رہے تھے۔ پارکوں اور فٹ پاتھوں پر تھکے ماندے انسان ستا رہے تھے۔ تمام گھروں کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ہر کھڑکی میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ہر کھڑکی۔ ہر دروازے۔ ہر کواڑ۔ ہر دریچے۔ ہر جھروکے۔ ہر صحن اور ہر چھت سے ایک مشہور ڈرامے کے درد بھرے گیت یا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک مرثیے کی مدھم سی دھن سنائی دے رہی تھی۔ ایوان کے اندیشے کسی حد تک درست ثابت ہوئے تھے۔ کیونکہ اسے زیر جامہ میں دیکھ کر لوگ تعجب بھری نظروں سے پلٹ پلٹ کر گھور رہے تھے۔ ان طنزیہ نگاہوں سے بچنے کے لئے ایوان نے پر رونق جگہوں کو چھوڑ کر نسبتاً ویران اور چھوٹی جگہوں کا راستہ اختیار کر لیا۔ وہ بے چارہ دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کبھی اندھیرے کونوں اور کبھی باڑوں میں چھپتا چھپاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کٹھن مسافت میں نجانے کیوں بار بار وہی مشہور گیت ایوان کے دماغ میں گونج رہا تھا جس میں ایک مرد اپنی بھاری بھرکم آواز میں ڈرامے کی ہیروئن تانیا کے ساتھ اظہار محبت کر رہا تھا۔

باب ۵

گیری باد کا وقوعہ

نیالے سفید رنگ کی قدیم دو منزلہ عمارت شہر کی مشہور رنگ روڈ پر ایک مختصر سے باغیچے کے عقب میں واقع تھی۔ عمارت کے سامنے پتھروں سے مزین ایک قطعہ تھا۔ جہاں سردیوں میں سڑک سے برف صاف کرنے کا سامان رکھا رہتا تھا۔ گرمیوں میں ایک رنگ برنگا خوبصورت شامیانہ لگا کر یہ جگہ ایک چھوٹے سے ریستوران میں تبدیل کر دی جاتی تھی۔ یہ عمارت گیری باد ہاؤس کے نام سے مشہور تھی۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ عمارت ماضی کے مشہور ادیب گیری باد کی ایک خالہ کی ملکیت تھی۔ حقیقت میں یہ عمارت کبھی گیری باد کی خالہ کی ملکیت تھی یا نہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ویسے گیری باد کے متعلق جتنی بھی دستاویزات موجود تھیں ان میں کسی خالہ یا چچی کا ذکر نہیں تھا۔ دوسری جانب ماسکو کے ایک مشہور گپ باز ادیب کا کہنا تھا کہ اس عمارت کی دوسری منزل پر واقع ہال نما کمرے کے عین وسط میں گیری باد اپنے مشہور ناول ''عقل کی تلخیاں'' کے کچھ حصے اپنی خالہ کو سنایا کرتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے گپی ادیب کی یہ اطلاع درست ہو۔ بہر حال ہمارے لیئے یہ بات اہم نہیں ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ ان دنوں اس عمارت پر ماسکو کے پریس کلب کا قبضہ تھا۔ اس پریس کلب کا صدر وہی بدقسمت مائیکل بیرلی تھا جس کا سر ٹرام کے ظالم پہیوں نے تن سے جدا کر دیا تھا۔ لیکن کوئی بھی اس عمارت کو پریس کلب کے نام سے نہیں پکارتا تھا۔ ہر زبان سے بس ایک ہی لفظ نکلتا تھا ''گیری باد''۔

پریس کلب کے لئے ماسکو شہر میں گیری باد سے بہتر کسی دوسری عمارت کا ملنا ناممکن تھا۔ گیری باد میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے نظر ہال میں آویزاں نوٹس بورڈوں پر پڑتی تھی جو مختلف قسم کے اشتہاروں اور اطلاعات سے بھرے رہتے تھے۔ سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ دیوار پہ مختلف کھیلوں میں حصہ لینے والے مشہور کھلاڑیوں۔ ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر کی بھرمار رہتی تھی۔ پہلے کمرے کے دروازے پر تختی آویزاں تھی ''شعبہ برائے شکار مچھلی'' جس کے نیچے ایک کانٹے میں پھنسی مچھلی کی تصویر بھی لگی تھی۔ دوسرے

کمرے کے دروازے پر ایک عجیب وغریب تحریر آویزاں تھی۔ ''ایک دن کا مفت ادبی پاس۔ پاس کے لئے بودلہ صاحب سے رابطہ کریں''۔ عمارت کے تمام دروازے کچھ اسی قسم کی عجیب وغریب تحریروں سے بھرے پڑے تھے۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی سیڑھیوں پر بل کھاتی انسانوں کی ایک قطار دکھائی دیتی تھی۔ جو بلاشبہ ہمیشہ ایک ہی دروازے پر ختم ہوتی تھی۔ اس دروازے پر لکھا تھا ''ہاؤسنگ کے مسائل''۔ اپنا گھر حاصل کرنے کے خواہش مندوں سے کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت پوسٹر چسپاں تھا جس پر سرخ کوٹ اور سیاہ پتلون میں ملبوس ایک خوبرو گھڑسوار ساحل سمندر پر گرمی کی چھٹیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہاں سے چند قدم آگے رات کے ساڑھے دس بجے تک روشن رہنے والا واحد کمرہ تھا جس کی ہوا اتنی گرم اور کثیف ہو چکی تھی کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ شہر کی سڑکیں دن بھر کی نگلی گئی تپش کے بعد اب اپنی بھڑاس اگل رہی تھیں۔ پہلی منزل پر واقع ریستوران کے باورچی خانہ سے اٹھنے والی پیاز کی بو اس بھڑاس میں شامل ہونے کے بعد عجیب تعفن پیدا کر رہی تھی۔ کمرے میں ادیبوں کی یونین کے عہدیدار اجلاس کے شروع ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ انہیں ایک دوسرے کو گھورتے اور بار بار گھڑیوں پر نظریں ڈالتے قریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ موٹی توند والا ناول نگار ''بے سکون'' انگلی سے اپنی گھڑی پر ٹک ٹک کرتے ہوئے بولا۔ ''بھئی اب تو رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ ہمارے صدر صاحب کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں ہے۔ اگر کہیں پھنس ہی گیا تھا تو کم از کم فون پر ہی ہمیں اطلاع کر دیتا''۔ مزید دو تین ادیبوں نے چلا چلا کر ''بے سکون'' کی ہاں میں ہاں ملائی۔

لیکن انہیں کیا معلوم کہ ان کا اس طرح چلانا قطعاً ناحق تھا۔ کیونکہ بے چارہ مائیکل تو کہیں بھی فون کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ گیری باد سے دور۔ بہت دور ایک کشادہ ہال میں ہزاروں واٹ کے قمقموں کی تیز روشنی تلے آہنی میز پر تین حصوں میں منقسم ''وہ'' پڑا تھا جو کچھ دیر پہلے تک مائیکل بیرلی تھا۔

میز کے ایک حصے پر منجمد خون کے لوتھڑوں کے درمیان لباس سے عاری دھڑ پڑا تھا۔ جس کا ایک بازو بری طرح کچلا اور سینہ اندر کی جانب پچکا ہوا تھا۔ میز کے دوسرے حصے پر سامنے کے دانتوں سے عاری سر رکھا تھا جس کی کھلی آنکھیں دھندلا چکی تھیں۔ ہال کی تیز روشنی بھی انہیں بند ہونے پر مجبور نہیں کر پائی تھی۔ میز کے تیسرے حصے پر متوفی کے خون آلود کپڑے چیتھڑوں کی شکل میں بکھرے پڑے تھے۔

سر بریدہ دھڑ کے گرد جو لوگ کھڑے تھے ان میں پوسٹ مارٹم ٹیم کے سربراہ پروفیسر اور ان کے نائبین۔ پولیس کے اہلکار اور پریس کلب کا نائب صدر شامل تھے۔ اس بے چارے کو فون پر اس وقت طلب کیا گیا جب وہ اپنی بیمار بیوی کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ نائب صدر کو پہلے مرحوم کے فلیٹ پر لیجایا گیا جہاں مائیکل کے تمام کاغذات وغیرہ سر بمہر کر دیئے گئے۔ وہاں سے اسے مردہ خانے پہنچا دیا گیا۔ میز کے

گرد جمع حضرات اب اس سوچ میں تھے کہ آیا سر کو دھڑ کے ساتھ سی دیا جائے یا گردن سے دھڑ تک کالے کپڑے میں لپیٹ کر کام چلالیا جائے۔

جی ہاں۔ مائیکل بے چارہ تو اب کہیں بھی فون کرنے سے قاصر تھا۔ ادیبوں کی محفل فضول میں مرحوم کو کوس رہی تھی۔ رات کے بارہ بجتے ہی تمام لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پہلی منزل پر کھچا کھچ بھرے ریستوران میں پیٹ پوجا کرنے چلے گئے۔ کوئی چکن کباب اڑا رہا تھا تو کوئی مرغ کی ٹانگوں پر زور آزمائی کر رہا تھا۔ اس دوران ریستوران کے آرکسٹرا کی مدھر دھن پر سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک جیسی نوجوان نے سریلی آواز میں گانا شروع کر دیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد یوں لگا کہ جیسے کسی نے نوجوان کا گلا دبوچ دیا ہے اور آرکسٹرا والے گویا سکتے میں چلے گئے ہیں۔ ہر سو خاموشی چھا گئی اور ایک بھاری بھرکم غم زدہ آواز نے اعلان کیا کہ ادیبوں اور شاعروں کے ہر دل عزیز مائیکل بیرلی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ہال میں ہائے، وائے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ تمام لوگ بے یقینی کے عالم میں اس خبر کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو لوگ کھڑکیوں کے پاس بیٹھے تھے انہیں اچانک گلی سے ریستوران کے گیٹ کی طرف بڑھتا ہوا ایک ٹمٹماتی روشنی کا ہیولا سا نظر آیا جس کے عقب میں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک عجیب الخلقت بھوت چلا آ رہا تھا۔ یہ لوگ حیرت کے عالم میں کھڑکیوں کے پاس مجمع گیر ہوگئے۔ جونہی یہ بھوت گیٹ پر لگے قمقموں کی روشنی میں واضح طور پر نظر آنے لگا تو سب کی جان میں جان آ گئی۔ کیونکہ یہ بھوت دراصل بھوت نہیں بلکہ مشہور شاعر ایوان بے گھر تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ اس نے اپنا جسم ایک سفید رنگ کی تولیہ نما گدڑی سے ڈھانپ رکھا تھا۔ سینے پر یسوع مسیح کی شبیہ سے منقش کاغذ کا ٹکڑا پن سے آویزاں کر رکھا تھا۔ جبکہ ہاتھ میں ایوان ایک روشن موم بتی تھامے ہوئے تھا۔ اس کے دائیں گال پر ایک تازہ زخم کا نشان تھا۔ ہال میں جو خاموشی چھا گئی تھی اس کی گہرائی کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ شاعر نے شمع سر سے اوپر بلند کرتے ہوئے زوردار آواز میں کہا ''آداب دوستو'' اور ایک دو قریبی میزوں پر بیٹھے لوگوں کو بغور دیکھنے کے بعد وہ غمناک آواز میں بولا۔ ''نہیں۔ نہیں ہے۔ وہ یہاں بھی نہیں ہے''۔

دو مختلف آوازیں سنائی دیں۔ ایک بھاری بھرکم مردانہ۔ ''لو جی بندہ تیار ہے۔ لبالب ٹن ہوگیا ہے''۔ دوسری باریک سی زنانہ۔ ''حیرت ہے شہر کی پولیس نے اسے گلیوں سے کیسے گذرنے دیا''۔ ایوان نے یہ سن لیا اور جواباً وہ بولا۔ ''پولیس والوں نے مجھے دو مرتبہ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔ ایک مرتبہ تو باڑ پھلانگتے ہوئے چہرہ بھی زخمی کر بیٹھا ہوں''۔ ایوان نے شمع دوبارہ بلند کی اور چیختے ہوئے بولا۔ ''بھائیو! میرے ادبی بھائیو ایک درندہ صفت مجرم ہمارے شہر میں وارد ہوگیا ہے۔ پکڑو اسے فوراً پکڑو ورنہ وہ نجانے کیا کیا مصیبت کھڑی کر دے گا''۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کون وارد ہو گیا ہے؟'' بہت ساری آوازوں نے سوال اٹھایا۔

مشیر! ایوان نے جواب دیا۔ اسی مشیر نے ابھی ابھی مائیکل بیر لی کو قتل کر دیا ہے۔

ریستوران میں موجود تمام لوگ اب ایوان کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ''معافی چاہتا ہوں''۔ ایک شائستہ سی آواز آئی۔ ''محترم ذرا تفصیل سے بتائیے۔ کیسے ہوا یہ قتل؟ اور کس نے کیا یہ قتل؟''۔

''غیر ملکی مشیر نے۔ پروفیسر جاسوس نے''۔ ایوان نے جواب دیا۔

کیا نام ہے اس کا؟ سوال پوچھا گیا

''نام۔ نام''۔ اپنی پیشانی پر آہستہ سے مکے مارتے ہوئے ایوان یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا نام ''و'' سے شروع ہوتا ہے۔ میں جلدی میں اس کے شناختی کارڈ کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ ایوان بڑبڑا رہا تھا۔ و ے۔ وا۔ وہ۔ واگنر؟۔ وائنر۔ ونٹر۔ دماغ پر زور دینے سے ایوان کے سر کے بال سرکنڈوں کی مانند کھڑے ہو گئے تھے۔

''نہیں دوستو اس طرح مجھے یاد نہیں آ رہا۔ بہرحال آپ لوگ جلدی سے پولیس کو فون کر دیں اور اس جنونی پروفیسر کی تلاش میں کم از کم پانچ مسلح موٹر سائیکل سواروں کو بھیجنے کا کہیں۔ اور ہاں پولیس کو یہ بتانا نہیں بھولئے گا کہ اس پاگل پروفیسر کے دو ساتھی بھی ہیں۔ ایک لمبا تڑنگا دھاری دار پتلون والا، دوسرا موٹا تازہ چربی چڑھا کالا سیاہ بلا۔ اور میں فی الحال اسے یہاں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیونکہ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ وہ یہیں کہیں گیری بادی میں ہے''۔

ایوان اب سخت غصے میں تھا۔ اس کے چہرے کے تمام چھوٹے چھوٹے پٹھے تیزی سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے گرد حصار بنائے لوگوں کو دائیں بائیں دھکیلتا ہوا راستہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھاری بھر کم خوش نما چشمہ لگائے ایک معصوم سا چہرہ ایوان کے سامنے آ گیا اور نہایت شائستہ آواز میں کہنے لگا۔ ''عزیزم بے گھر آپ ہمارے قریبی دوست ہیں۔ اور معلوم پڑتا ہے کہ ہر دل عزیز مائیکل کی اچانک موت پر آپ گہرے صدمے میں ہیں۔ ہم سب یہ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ آپ کو تھوڑا آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ ابھی کچھ کامریڈ آپ کو بستر تک چھوڑ آئیں گے۔ کچھ دیر آرام کرنے سے آپ کی طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اور آپ اس پریشان کن کیفیت سے باہر نکل آئیں گے''۔

''تم'' دانت پیستے ہوئے ایوان بولا۔ یہ سمجھنے کی بجائے کہ پروفیسر کو پکڑنا بہت ضروری ہے۔ اپنی احمقانہ گفتگو سے میرا دماغ خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ بلوان''۔

''کامریڈ ایوان۔ کچھ تو لحاظ کیجئے۔ وہی چہرہ اب سرخ ہوتے ہوئے بولا ''میں تو فضول میں آپ کے ساتھ الجھ بیٹھا ہوں''۔

''نہیں۔ کبھی نہیں۔ تمہیں تو میں ہرگز معاف نہیں کروں گا''۔ ایوان دبی دبی نفرت آمیز آواز میں بولا۔ اس کے چہرے کے پٹھے اب ہیجانی کیفیت اختیار کر گئے تھے۔ اس نے موم بتی کو دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور اس سرخی مائل چہرے کے ٹھیک بیچوں بیچ ایک زوردار مکہ جڑ دیا۔ لوگوں کو آخر کار اب سمجھ آ گئی تھی کہ ایوان بے گھر کو قابو میں لینے کی ضرورت ہے۔ بہت سارے لوگوں نے یک دم ایوان پر یلغار کر دی۔ موم بتی گرنے کے بعد بجھ گئی اور ایوان کا چشمہ متعدد پیروں تلے روندا گیا۔ ایوان نے اعلان جنگ والے بگل کی مانند آواز بلند کی۔ جس کی گونج باہر گلی میں بھی سنائی دی گئی اور اس نے اپنا دفاع شروع کر دیا۔ برتن میزوں سے گرنے کے بعد ٹوٹنے لگ گئے اور نسوانی چیخوں نے ایک طوفان برپا کر دیا۔

اس دوران جب ریستوران کا عملہ ایوان کی مشکیں کس رہا تھا دروازے پر منیجر اور گیٹ کیپر کے درمیان ایک دل چسپ گفتگو چل رہی تھی۔

''تم نے دیکھا نہیں کہ وہ زیر جامہ پہنے ہوئے ہے''۔ منیجر نے پوچھا

''جی محترم! میں بھلا انہیں داخل ہونے سے کیسے روک سکتا ہوں جبکہ وہ پریس کلب کے باقاعدہ رکن ہیں''۔

''تم نے اس کے زیر جامہ پر دھیان دیا یا نہیں؟''۔ منیجر نے دوبارہ پوچھا۔

''میں سمجھتا ہوں۔ منیجر صاحب''۔ گیٹ کیپر بولا۔ ''میں بخوبی جانتا ہوں کہ ادھر خواتین بھی بیٹھی ہیں''۔

''یہ خواتین بیچ میں کہاں سے آن ٹپکیں۔ اور ویسے بھی انہیں زیر جامہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آدمی زیر جامہ پہنے شہر کی گلیوں میں صرف ایک صورت میں گھوم سکتا ہے۔ پولیس کے حصار میں اور وہ بھی صرف پولیس سٹیشن کی سمت۔ تمہارا بحیثیت گیٹ کیپر یہ فرض بنتا ہے کہ ایسے شخص کو دیکھ کر فوراً سیٹی بجانا شروع کر دو تاکہ پولیس والے چوکس ہو جائیں۔

سن رہے ہو۔ سن رہے ہو نا اب اندر کیا ہو رہا ہے؟'' گیٹ کیپر کے کانوں میں برتن ٹوٹنے کی جھنکار، نسوانی چیخیں اور کچھ آہیں گونج رہی تھیں۔

سن رہے ہو نا۔ بتاؤ اب تمہارے ساتھ کیا کیا جائے؟ تمہیں نوکری سے چھٹی کروا کے گورکن کیوں نہ لگوا دیا جائے؟

بے چارے گیٹ کیپر کا چہرہ شرمندگی سے تمتمانے لگ گیا۔

منیجر نے لہجہ قدرے نرم کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو یہ واقعہ پہلا اور آخری ہونا چاہیے۔ اب جلدی سے پولیس والے کو ساتھ لو اور باہر کھڑی کسی بھی گاڑی میں اس ''بے گھر'' کو ڈالو اور ذہنی امراض کے ہسپتال

پہنچاؤ اور ہاں سب سے پہلے سیٹی بجاؤ''۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ریستوران میں موجود تمام لوگ اور گلی میں کھڑے راہ گیر دیکھ رہے تھے کہ گیٹ کیپر۔ایک پولیس والا ۔ ریستوران کا دوسرا عملہ اور مشہور شاعر روہاآن، ایک نوجوان کو رسیوں اور کپڑوں میں کسی گڑیا کی مانند جکڑے باہر لا رہے تھے۔نوجوان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی رواں تھی اور وہ دائیں بائیں سر گھما تا ہوا تھوتھو کر رہا تھا۔وہ بالخصوص شاعر روہاآن پر تھوکنے کی کوشش کرتا ہوا زور زور سے چلا رہا تھا۔''خنزیر، خنزیر''۔

چاروں اطراف لوگ حیران و پریشان کھڑے تھے اور ماسکو کے اس بدترین وقوعے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ مجمع اس وقت تک نہیں چھٹا جب تک گاڑی بدنصیب ایواآن بے گھر کو لے کر نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

باب ٦

مالیخولیا۔ یوں کہا گیا

جب ماسکو کے مضافات میں کچھ عرصہ قبل تعمیر شدہ ذہنی امراض کے مشہور کلینک کی ایمرجنسی میں ایک سفید اوورکوٹ پہنے باریک نوک دار داڑھی والا ڈاکٹر داخل ہوا تو اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ایوان بے گھر ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ جبکہ ایوان کے بالمقابل تین جسیم قسم کے سیکورٹی ملازمین اس پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ قریب ہی انتہائی اضطراب کی حالت میں شاعر روہان بھی موجود تھا۔ ایوان کے ہاتھ اور پاؤں اب آزاد تھے۔

ڈاکٹر کو دیکھتے ہی نجانے کیوں روہان کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے دھیمی آواز میں ڈاکٹر کو سلام کیا۔ ڈاکٹر اس کی جانب توجہ دیئے بغیر ذرا سا جھک کر ایوان پر نظریں مرکوز کیئے کھڑا ہو گیا۔

ایوآن بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے، کرب اور نفرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہونے کے باوجود خاموش اور ساکت تھا۔

''جناب ڈاکٹر صاحب!'' روہآن دبی دبی آواز میں ایوآن پر خوف زدہ نظریں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''یہ مشہور شاعر ایوان بے گھر صاحب ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ یہ الکوحل کے زیر اثر ذہنی خلل کا شکار ہو گئے ہیں''۔

''بہت زیادہ مے نوشی کرتا ہے کیا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں۔ پیتا تو ہے لیکن اتنی نہیں کہ۔۔۔۔۔''

''چوہے، لال بیگ، اود بلائیں یا آوارہ کتے پکڑنے کا دعویٰ تو نہیں کرتا؟''

''جی نہیں''۔ روہان سر کو دائیں بائیں جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں کل شام اور آج صبح بھی اسے ملا تھا۔ یقین کیجئے ایوآن بالکل ٹھیک حالت میں تھا''۔

''اچھا تو اس نے زیر جامہ کیوں پہن رکھا ہے؟ اسے بستر سے نکال کر لائے ہو کیا؟''۔

''جی نہیں۔ یہ دراصل اسی حالت میں ریستوران پہنچ گیا تھا''۔

''آ ہاں۔ آ ہاں۔'' ڈاکٹر شائید اب محظوظ ہو رہا تھا۔ ''اچھا تو یہ چہرے پر زخم اور خراشیں کیسی ہیں؟ ہاتھا پائی ہوئی ہے کسی سے کیا؟''۔

''جی یہ باڑ پھلانگتے وقت زخمی ہوا ہے۔ ادھر ریستوران میں اس نے ایک آدمی کو گھونسہ بھی مارا تھا۔ شائید دو ایک کسی اور کو بھی جڑ دی ہوں''۔

''خوب، بہت خوب''۔ ڈاکٹر دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے ایواؔن سے مخاطب ہوا۔ ''آداب جناب عالی''۔

''آداب موذی حضرت''۔ ایوان غصیلی آواز میں بولا۔

روہان اتنا شرمسار ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر سے نظریں ملانے سے بھی کترا رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر پر ایواؔن کے رویے کا کسی طرح بھی منفی اثر نہیں پڑا تھا اور وہ اسی پہلے جیسی مسکراہٹ کے ساتھ شفقت بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔

''آپ کی عمر کتنی ہوگی؟''

''دفعان ہو جاؤ تم سب۔ بخش دو میری جان''۔ یہ کہنے کے بعد ایواؔن نے ڈاکٹر کی جانب پشت کر لی۔

''آپ اتنا ناراض کیوں ہو رہے ہیں؟ میں نے تو آپ کو تکلیف دینے والی کوئی بات نہیں کہی''۔

''میری عمر تیئیس سال ہے''۔ بیزار لہجے میں ایواؔن بولا۔ ''میں تم لوگوں کے خلاف شکایت درج کراؤں گا۔ خصوصاً تمہارے خلاف''۔ انگلیوں کا اشارہ روہان کی طرف تھا۔

''کس بات کی شکایت کریں گے آپ؟'' ڈاکٹر بولا!

''اس بات کی کہ مجھے۔ ایک بالکل صحت مند انسان کو زبردستی اٹھا کر پاگل خانے پہنچا دیا گیا ہے''۔ غصیلی آواز میں ایوان نے جواب دیا۔

روہان نے ایواؔن کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کا جسم یکدم سرد پڑ گیا۔ کیونکہ ایواؔن کی آنکھوں میں اس وقت کسی قسم کی دیوانگی کا نام ونشان نہیں تھا۔ کچھ دیر قبل گیری باد میں ایواؔن کی آنکھوں میں پائی جانے والی کیفیت یکسر غائب ہو چکی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے صرف دانش اور عقل مندی جھلک رہی تھی۔

''اوخدایا''۔ خوف زدہ روہان سوچ رہا تھا۔ ''یہ تو بالکل نارمل لگ رہا ہے۔ یہ کیا تماشہ ہے؟ واقعی ہم لوگ کیوں اسے یہاں گھسیٹ لائے ہیں؟ نارمل ہے۔ یہ کم بخت تو بالکل نارمل ہے۔ صرف چہرہ قدرے زخمی ہے''۔

''آپ اس وقت محترم۔آہنی سٹول پر براجمان ہوتے ہوئے ڈاکٹر بولا۔'' پاگل خانے میں نہیں ہیں۔ یہ ایک کلینک ہے۔ اور یقین کیجئے, اگر آپ کی صحت کے لئے ضروری نہ ہوا تو ہم آپ کو یہاں ایک پل بھی نہیں روکیں گے''۔

''شکر ہے۔'' ایوان بولا۔'' آخر کاران بے وقوفوں کی محفل میں ایک تو عقل مند نکلا ہے۔ اور ان بے وقوفوں کا سرغنہ ثابت ہوا ہے روہان''۔

''یہ بے وقوفوں کا سرغنہ روہان کون ہے؟''۔ ڈاکٹر نے پوچھا

''یہ جو یہاں بیٹھا ہوا ہے''۔ ایوان نے روہان کی طرف اشارہ کیا۔

''عجیب تماشہ ہے۔ یہ میرا شکریہ ادا کرنے کی بجائے مجھ پر غلاظت اچھال رہا ہے''۔ کڑوے گھونٹ نگلتے ہوئے روہان سوچ رہا تھا۔'' شائید اس لئے کہ میں نے اس تمام کاروائی میں حصہ لیا ہے؟ خدایا میں کیسی احمقانہ صورتحال میں پھنس گیا ہوں؟

''یہ جہالت کا ایک طمانچہ ہے دانش کے منہ پر''۔ ایوان بول رہا تھا۔'' یہ طمانچہ چلانے کا آج بہت اچھا موقعہ ملا ہے روہان کو۔ اور ہاں اس طمانچے نے پرولتاری لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ ذرا اس کی مکروہ شکل تو ملاحظہ کیجئے۔ اور پھر کیم تاریخ کو شائع ہونے والی اس کی نظم کو پڑھیئے۔ آپ پر واضح ہوجائے گا کہ ظاہر کیا ہے اور باطن کیا ہے۔ آپ کو ابکائی آنے لگے گی''۔ زہر آلود مسکراہٹ ایوان کے چہرے پر ناچ رہی تھی۔

روہان کے لئے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ ایک ہی بات اس کے ذہن میں گھوم رہی تھی کہ وہ کس سپولے کی مدد کر بیٹھا ہے؟ یہ تو میرا اولین دشمن نکلا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اب کچھ کیا بھی نہیں جاسکتا۔ ایک ذہنی مریض کے ساتھ بحث کرنا تو صریحاً بے کار ہے۔

''اچھا یہ بتایئے کہ آپ کو ہماری کلینک پر ہی کیوں لایا گیا ہے؟ انتہائی انہماک سے ایوان کی تقریر سننے کے بعد ڈاکٹر نے استفسار کیا۔

''خانہ خراب ہو ان اندھے بلوانوں کا۔ بس پکڑ لیا۔ جکڑ لیا۔ باندھ لیا اور گاڑی میں ڈال کر یہاں لے آئے''۔ ایوان نے جواب دیا۔

''اچھا تو یہ بتایئے کہ آپ ریستوران میں صرف زیر جامہ پہنے کیوں آئے تھے؟''

''یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ دراصل میرا دریا میں نہانے کو دل چاہا تو میں نے دریائے ماسکو میں چند غوطے لگا لیئے۔ جب کنارے پر واپس پہنچا تو کوئی بدبخت میرے کپڑے چرا لے گیا تھا۔ یہی چند چیتھڑے میرے کپڑوں کی جگہ پڑے تھے۔ اب میں انہیں زیب تن نہ کرتا تو کیا ننگا ہی شہر کی گلیوں میں نکل پڑتا اور ویسے بھی مجھے گیری باد پہنچنے کی جلدی تھی''۔ ایوان ڈاکٹر کو سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''آپ کو گیری باد یا ریستوران پہنچنے کی کیا جلدی تھی؟''۔

''وہ، میں اس مشیر کو قابو کرنے کی کوشش میں تھا''۔

''آپ کس مشیر کی بات کر رہے ہیں؟''۔ ڈاکٹر نے پوچھا

''آپ بیرلی کو جانتے ہو کیا؟'' ایوان نے ڈاکٹر سے پوچھا

''آپ غالباً موسیقار بیرلی کی بات کر رہے ہیں؟''۔ ڈاکٹر بولا

''ارے نہیں۔ کون سا موسیقار؟''۔ ایوان بولا۔ ''یہ غالباً ہمارے مائیکل بیرلی کا کوئی ہم نام ہوگا''۔

روہان بولنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے بادلِ ناخواستہ گفتگو میں مخل ہونا پڑا۔ اور وہ گویا ہوا۔ ''آج شام پریس کلب کے صدر مائیکل بیرلی شہر کے وسط میں ایک ٹرام کے پہیوں تلے آ کر کچلے گئے ہیں''۔

''جھوٹ مت بکو''۔ غصے میں آگ بگولا ایوان بولا۔ ''جس حقیقت کے بارے میں جانتے نہیں ہو اس کا ذکر کیوں کر رہے ہو۔ جائے حادثہ پر میں موجود تھا نہ کہ تم۔ مائیکل کو انہی لوگوں نے ٹرام کے نیچے پہنچایا تھا''۔

''دھکیلا تھا؟''۔

''یہ دھکیلا بیچ میں کہاں سے آ گیا؟'' لوگوں کی ناسمجھی پر ایوان غصہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس خبیث کو دھکیلنے وکیلنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایسے ایسے شعبدے دکھا سکتا ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔ اس کم بخت کو پہلے سے ہی علم تھا کہ مائیکل ٹرام کے نیچے کچلا جائے گا''۔

''آپ کے علاوہ بھی اس مجرم کو کسی نے دیکھا ہے کیا؟''

''یہی تو مصیبت ہے۔ میرے علاوہ صرف مائیکل نے اسے دیکھا تھا''۔

''اچھا تو آپ نے اس قاتل کو پکڑنے کے لئے کیا کاروائی کی؟۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ اور اسی دوران اس نے کونے میں بیٹھی خاتون کی جانب آنکھوں سے کچھ اشارہ کیا۔ خاتون نے فوراً سامنے رکھے کاغذ پر لکیریں کھینچنی شروع کر دیں۔

''کاروائی؟ میں نے باورچی خانے سے موم بتی اٹھائی''۔

''کون سی موم بتی؟ وہ والی؟ ڈاکٹر نے ٹوٹی ہوئی موم بتی کی طرف اشارہ کیا جو یسوع کی شبیہ والے کاغذ کے ساتھ خاتون کے سامنے میز پر پڑی تھی۔

''ہاں بالکل وہی والی اور۔۔۔۔۔۔''

''نہ تو، یہ یسوع کی شبیہ کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟'' ڈاکٹر ایوان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''اوہ یہ شبیہ''۔ ایوان کا چہرہ شائید شرمندگی کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا۔''جی ہاں، اسی شبیہ نے ہی تو ان لوگوں کو''۔ اشارہ روہان کی طرف تھا،۔خوف زدہ کر دیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ حقیقت سے نظریں نہیں چرائی جا ہیں۔ وہ مشیر مافوق الانسان کالے علم کی قوتوں کا حامل ہے اور ظاہر ہے کہ اسے خالی ہاتھوں قابو کرنا ممکن نہیں ہے۔

ہسپتال کے سیکورٹی ملازمین نے اپنے ہاتھ بغلوں کے نیچے سے نکال لیئے تھے اور ایوان پر نظریں مرکوز کر دی تھیں۔

''جی ہاں''۔ ایوان گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔''حقیقت مسلمہ ہے اور ناقابل تردید ہے۔ وہ بذات خود پونتی پلات سے مل چکا ہے اور اس سے ہم کلام بھی ہو چکا ہے۔ ۔مجھے اس طرح گھورنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ اونچے ستونوں والا محل۔ وہ بلند قامت پام کے پودے۔ وہ وسیع وعریض میدان۔ قصہ مختصر۔ وہ واقعی پونتی پلات کے ہاں گیا تھا۔ میں قسم کھاتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ یہ بات سچ ہے''۔

''ہت تیرے کی''۔ ڈاکٹر بڑبڑایا۔

''ہاں تو میں نے شبیہ کو سینے سے چپکایا اور دوڑ لگادی''۔

اس دوران گھڑیال نے رات کے دو بجنے کا اعلان کیا۔

''ارے دو بج گئے ہیں''۔ ایوان پریشانی کے عالم میں بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ کیوں وقت ضائع کر رہا ہوں؟ معافی چاہتا ہوں۔فون۔ برائے کرم مجھے فون کرنے دیں''۔

''کرنے دو۔محترم کو فون کرنے دو''۔ ڈاکٹر نے عملے کو حکم دیا۔

ایوان جیسے ہی فون کی جانب بڑھ رہا تھا خاتون نے دھیمی آواز میں روہان سے پوچھا''شادی شدہ ہے کیا؟''۔

''نہیں۔غیر شادی شدہ ہے''۔

''پریس کلب کا رکن ہے؟''

''ہاں''

''پولیس؟''۔ ایوان فون پر چیخا۔''ہاں تو محترم ڈیوٹی آفیسر فوری طور پر حکم دیجیئے کہ پانچ مسلح موٹر سائیکل سوار غیر ملکی مشیر کو پکڑنے کے لئے فوراً روانہ کئے جائیں۔کیا؟ کہاں؟ آپ میرے پیچھے پیچھے آ ئیں۔ میں مشہور شاعر ایوان بے گھر پاگل خانے سے بول رہا ہوں۔ پتہ کیا ہے تمہارا؟''ایوان ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے ڈاکٹر سے پوچھ رہا تھا۔ اور پھر فون پر دوبارہ بولنے لگ گیا۔''ہیلو، ہیلو! ہاں تو آپ سن رہے

ہیں؟ کیا بے ہودگی ہے؟ ایوان اچانک غصے سے لال پیلا ہوگیا اور اس نے فون دیوار پر دے مارا۔ پھر ڈاکٹر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا ''اچھا خدا حافظ'' اور بیرونی دروازے کی جانب چل پڑا۔

''معاف کیجئے گا آپ رات کے اس پہر کہاں جائیں گے؟ اور وہ بھی زیر جامہ پہنے ہوئے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ ہمارے ہاں رک جائیں''۔ ڈاکٹر انتہائی شائستگی سے بولا۔

''جانے دو مجھے''۔ ایوان دروازے کے ساتھ چپکے سیکورٹی ملازمین سے کہہ رہا تھا ''جانے دو مجھے کمینو!'' اچانک ایوان ہذیانی انداز میں چلانے لگ گیا۔

روہان کانپ اٹھا۔ خاتون نے میز پر لگا ایک بٹن دبا دیا اور اس کے سامنے ایک چھوٹا سا چمکدار دھاتی ڈبہ اور کاغذ میں لپٹی ٹیکے کی ایک شیشی نمودار ہوگئی۔

''اچھا تو یہ بات ہے''۔ ایوان دیوانگی کے عالم میں چیخا۔ ''لو پھر سنبھالو اپنا کلینک۔ میں جا رہا ہوں''۔ اور کسی محو پرواز پرندے کے مانند اس نے اپنا سر پورے زور سے کھڑکی میں دے مارا۔ لیکن کھڑکی کا شیشہ اتنا ڈھیٹ تھا کہ اس پر ضرب کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا۔ سیکورٹی والوں نے ایوان کو اپنے مضبوط شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ وحشت سے غرا رہا تھا، کاٹنے کی کوشش بھی کر رہا تھا اور بس ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ ''چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو''۔

ڈاکٹر نے سرنج ہاتھ میں لے لی۔ خاتون نے ایوان کا بازو برہنہ کرنے کے بعد پوری طاقت سے دبوچ لیا۔ سپرٹ کی بدبو پورے کمرے میں پھیل اٹھی۔ ایوان چار مردوں کے آہنی ہاتھوں میں ڈھیلا پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے موقعہ غنیمت جانتے ہوئے سوئی ایوان کے بازو میں اتار دی۔ ایوان کو چند لمحے مزید پکڑے رکھا گیا اور پھر آزاد کر دیا گیا۔

''اچکے۔ چور''۔ ایوان بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن اسے فوراً ہی واپس دھکیل دیا گیا۔ وہ دوبارہ چیختا ہوا اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس مرتبہ وہ خود ہی واپس بیٹھ گیا۔ وہ اب خاموش ہوگیا تھا اور اچانک جمائیاں لینے لگ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک غصیلی مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔

آخر قابو کر ہی لیا۔ ایوان نے پھر جمائی لی اور لیٹ گیا۔ اس نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا اور ہاتھ بچگانہ انداز میں چہرے کے نیچے۔ وہ نیند بھری آواز میں بڑبڑایا۔ اچھا تو ٹھیک ہے۔ بعد میں خود ہی بھگتو گے۔ میں نے تو بروقت خبردار کر دیا تھا۔ مجھے اس وقت جس شخصیت میں زیادہ دلچسپی ہے وہ ہے پلات۔ پونتی پلات''۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

''ایک سو سترہ نمبر۔ علیحدہ کمرہ۔ اور کوئی تگڑا سا نگہبان''۔ ڈاکٹر نے حکم دیا۔

روہان کو پھر ایک مرتبہ جھرجھری آ گئی۔ سفید دروازہ بے آواز کھل گیا تھا۔ اس کے پیچھے ایک

طویل راہداری نیلگوں روشنی میں خوف ناک منظر پیش کر رہی تھی۔ راہداری سے ایک ربڑ کے پہیوں والی ٹرالی برآمد ہوئی۔ ایوان کو اس ٹرالی پر لادا گیا اور راہداری کے سفر پر روانہ کردیا گیا۔ دروازہ اس کے راہداری میں داخل ہوتے ہی خود سے بند ہوگیا۔

''ڈاکٹر''۔ روہان نے رازداری کے انداز میں پوچھا۔''اس کا مطلب ہے کہ وہ واقعی بیمار ہے''۔

''جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہے''

''اسے کس قسم کی بیماری ہے؟'' روہان نے پوچھا

''حرکات اور گفتار میں اشتعال.سوچ کی ہیجانیت اور غیرفطری چیزوں کا نظرآنا۔ کافی الجھی ہوئی صورت حال ہے۔ شائید مالیخولیا کی بگڑی ہوئی قسم ہے۔ ہاں اوراوپر سے مےنوشی''۔

روہان کو ڈاکٹر کی باتوں کی ذرابرابر بھی سمجھ نہیں آئی۔ البتہ اس پر یہ ضرورعیاں ہوگیا تھا کہ ایوان کے گھر کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔

''وہ بار بار کسی مشیر کا ذکر کیوں کر رہا تھا؟'' روہان نے ڈرتے ہوئے استفسار کیا۔''

اس نے غالبًا کسی کو دیکھا ہے۔ شائید اس کی پریشان حالت پر کوئی گہرا اثر ڈالنے والی شخصیت۔ یا پھر ممکن ہے کہ یہ سب اس کے اپنے دماغ کی اختراع ہو''۔

روہان ہسپتال سے واپسی پر ہچکولے کھاتی گاڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔۔۔ یہ زندگی بھی کیا عجیب وغریب چیز ہے؟۔ چند سطریں لکھیں۔ کچھ اشعار جوڑے اور بس۔ زندگی کا سورج تیزی سے اندھیرے کی گہرائیوں میں غرق ہونے لگ گیا۔ یہ بھلا کیا ہوا؟۔ سوچ کے یہی تانے بانے بنتے روہان کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ رات کی تاریکی تو چھٹنی شروع ہوگئی تھی اور نئی صبح کا سورج روشنی بکھیرنے لگ گیا تھا۔

باب ۷

آسیب زدہ فلیٹ

اگلی صبح اگر ستیپاں سے کہا جاتا کہ فوراً اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ تمہیں گولی مار دی جائے گی تو دھیمی آواز میں جواب ملتا۔ "مار دو گولی۔ میرے ساتھ جو جی چاہے کر لو لیکن میں کسی صورت اٹھنے والا نہیں ہوں"۔

اٹھنا تو درکنار اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آنکھیں بھی نہیں کھول سکتا۔ کیونکہ اس نے اگر ایسا کیا تو فوراً بجلی چمکے گی اور اس کا سر دھماکے سے کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ اس کے دماغ میں ایک ازیت ناک گھنٹی بج رہی تھی۔ اس کی پلکوں اور آنکھوں کی پتلی کے درمیان رنگدار دائرے گھوم رہے تھے۔ اور سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی۔۔ متلی،۔ شدید متلی۔ لگتا تھا کہ معدہ اور آنتیں منہ کو آ رہی ہیں۔

ستیپال آنکھیں بھینچ کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور یادوں کی دھند میں اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی نامانوس جگہ پر ہاتھ میں رومال لئے کھڑا ہے اور کسی خاتون کا بوسہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ وعدہ کر رہا ہے کہ اگلے روز ٹھیک دوپہر کے بارہ بجے وہ اس کے گھر آئے گا۔ جبکہ خاتون اسے منع کر رہی تھی۔۔ میں دوپہر کے وقت گھر پر نہیں ہوتی۔ لیکن ستیپال بضد تھا کہ وہ اس سے ملنے ضرور آئے گا۔

کون تھی وہ خاتون؟ کون سا تھا وہ دن؟ کونسا تھا وہ مہینہ؟ ستیپال کو کچھ یاد نہیں آ رہا تھا اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس ازیت ناک کیفیت سے نکلنے کے لئے اس نے بائیں پلک کے بوجھ کو بصد مشکل اپنی آنکھ سے ہلکا سا اٹھایا تو اسے لگا کہ وہ کسی مانوس جگہ پر ہے۔ ہت تیرے کی۔۔ وہ تو اپنے کمرے میں اپنے ہی پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔

معاملہ دراصل یوں ہے کہ ستیپال ایک مشہور تھیٹر کا ڈائریکٹر تھا۔ اس فلیٹ میں وہ مرحوم مائیکل بیرلی کا ہمسایہ تھا۔ یہ فلیٹ نمبر ۵۰ شہر کے وسط میں ایک مشہور شاہراہ پر واقع تھا۔ اس فلیٹ کے متعلق عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں۔ دو سال قبل اس فلیٹ کی مالکہ ایک مشہور سنار کی بیوہ تھی۔ فلیٹ کے دو کمرے اس

کے ذاتی استعمال میں تھے جبکہ باقی ماندہ تین کمرے اس نے کرائے پر دے رکھے تھے۔ ٹھیک دو سال قبل اس فلیٹ میں عجیب وغریب واقعات رونما ہونے لگ گئے۔ اس کے مکین یکے بعد دیگرے غائب ہوتے جا رہے تھے۔

ایک دن ایک پولیس والا فلیٹ میں وارد ہوا اور کرائے داروں میں سے ایک کو یہ کہہ کر ساتھ لے گیا کہ تھانے میں کچھ کاغذات پر دستخط کروانے ہیں۔ کرایہ دار جاتے ہوئے صفائی والی اور مالکن کو ہدایت کر گیا کہ اگر کوئی فون آئے تو کہہ دیا جائے کہ میں دس منٹ تک واپس آ جاؤں گا۔ لیکن یہ شخص کبھی لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ ظاہر ہے کہ پولیس والا بھی دوبارہ وہاں نظر نہیں آیا۔ صفائی والی کا کہنا تھا کہ یہ کام شیطانی طاقتوں کا ہے اور یہ شیطانیت ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو رکنے کا نام نہیں لیتی۔ سوموار کو دوسرا کرائے دار غائب ہو گیا۔ اور بدھ وار کو تیسرا موٹی ناک والا۔ ہمیشہ کی طرح اس روز بھی گاڑی صبح اسے کام پر لیجانے کے لئے آئی لیکن اس بار ایسی گئی کہ نہ تو خود کبھی واپس لوٹی اور نہ ہی موٹی ناک والے کو واپس لائی۔

چند دن بعد فلیٹ کی مالکہ سیر سپاٹے کے لئے روانہ ہوئی۔ اور کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ وہ بھی کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئی۔ اس طرح فلیٹ بالکل خالی ہو گیا۔ تقریباً ایک ہفتہ یہی کیفیت رہی۔ پھر یہاں مائیکل بیرلی، اس کی بیوی اور وہی تھیٹر والا آدمی ستیپال اپنی بیوی سمیت منتقل ہو گئے۔ کچھ ہی عرصہ گزرا ہو گا کہ فلیٹ کے مکینوں کو پھر ایک دھچکا لگا۔ پہلے مائیکل کی بیوی اور پھر ستیپال کی بیوی غائب ہو گئی۔ لیکن ہاں، ان کے بارے میں بعد ازاں یہ خبر ملی کہ مائیکل کی بیوی ایک ناکام فلم ایکٹر کے ساتھ بھاگ گئی تھی جبکہ ستیپال کی بیوی غالباً کسی پادری کے چکر میں غائب ہو گئی تھی۔

ستیپال سر درد سے کراہ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ملازمہ کو آواز دے اور اسپرین منگوا کر نگل لے تو شائید اس کی اذیت میں کچھ کمی ہو جائے۔ لیکن ملازمہ اس وقت کہاں۔ ہاں مائیکل شائید اس کی مدد کر سکے۔ اس نے دو مرتبہ کراہتے ہوئے پکارا۔ ''مائیکل ۔ مائیکل''۔ لیکن ظاہر ہے کہ مائیکل بھی اب اس فلیٹ پر کبھی واپس آنے والا نہیں تھا۔ فلیٹ میں ایک افسردہ سی خاموشی چھا گئی تھی۔

ستیپال پر بالآخر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ وہ اس منحوس فلیٹ کی دنیا میں تنہا رہ گیا ہے اور یہاں کوئی اس کی مدد کو آنے والا نہیں ہے۔ اس نے اپنی بچی کھچی توانائی کو اکٹھا کیا اور اپنے ٹوٹتے پھوٹتے جثے کو پلنگ سے اٹھایا۔ جب آخر کار وہ اپنی بوجھل پلکوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو سامنے دیوار پر لگے آئینے میں جس شخص کا عکس اسے نظر آیا اس کے بالوں کی کھچڑی بنی پڑی تھی، چہرے پر بڑھی ہوئی شیو نمایاں تھی اور آنکھیں کسی قمقمے کے بلب کی مانند باہر کو ابلی پڑی تھیں۔ قمیض پر اتنی سلوٹیں پڑی تھیں کہ جیسے کسی بیلنے میں سے گذری ہے۔ مسلے ہوئے کالر میں جھولتی ٹائی پر کسی جانور کے گلے میں

بندھی رسی کا گمان ہوتا تھا۔ یہ تھی وہ ہیئت جس میں ستپال نے اپنا عکس دیکھا۔ آئینے کے قریب ہی کرسی پر سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک نامانوس شخص براجمان تھا۔ ستپال پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی سرخ ڈوروں سے آراستہ آنکھیں اس اجنبی پر مرکوز کر دیں۔

کچھ دیر بعد اجنبی نے فضا پر طاری سکوت کو توڑا۔ ''آداب عرض ہے محترم ستپال صاحب''۔ اس کی آواز قدرے بھاری اور لہجہ غیر ملکیوں والا تھا۔ کچھ دیر کے لئے دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ پھر ستپال اپنی تمام تر قوت کو یکجا کرنے کے بعد بولا۔

''آپ کو کیا چاہیئے؟ ستپال خود اپنی آواز کی اجنبیت پر حیران تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر لفظ الگ الگ راگ میں الاپا گیا ہے۔

اجنبی دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ اس نے اپنی جیب سے گھڑی نکالی۔ یہ سونے کی خوبصورت گھڑی تھی جس کا ڈھکن ہیروں سے جڑی مثلث سے مزین تھا۔ گھڑی سے ٹھیک گیارہ مرتبہ گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

''گیارہ۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے آپ کی آنکھ کھلنے کا انتظار کر رہا ہوں محترم۔ کیونکہ آپ نے مجھے دس بجے ملاقات کا وقت دیا تھا۔ اور وقت کی پابندی میں اپنا مقدس فریضہ سمجھتا ہوں''۔

ستپال نے پلنگ کے نزدیک گری اپنی پتلون اٹھائی اور بصد مشکل اسے پہنتے ہوئے بولا۔ ''معاف کیجئے گا۔ ذرا اپنا نام تو بتائیں؟'' ستپال بے چارہ بمشکل بول پا رہا تھا۔ ادھر کوئی لفظ اس کے منہ سے نکلتا تو ادھر ایک بھاری بھرکم ہتھوڑا اس کے دماغ پر ضرب لگاتا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ درد کی شدت سے اس کا سر دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

''یہ کیا؟ آپ میرا نام بھی بھول گئے ہیں؟'' اجنبی مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں معذرت خواہ ہوں''۔ ستپال کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ اسے لگ رہا تھا کہ رات کی بلا نوشی نے اس کے جسم اور دماغ کو مفلوج کر دیا ہے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پلنگ کے آس پاس کا فرش غائب ہو گیا ہے اور اس کی جگہ دور دور تک چھائی تاریکی نے لے لی ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سر کے بل اس تاریکی میں چھلانگ لگا دے اور ہمیشہ کے لیئے زندگی کی اذیتوں سے دور اس تاریکی میں غوطے لگاتا رہے۔

''محترم ستپال صاحب!'' اجنبی بولا ''اسپرین آپ کی اذیت ناک کیفیت کا علاج نہیں ہے۔ پرانے داناؤں کا آزمودہ نسخہ استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ کہاوت ہے کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ اس وقت واحد دوا جو آپ کے لئے اکسیر ہے وہ ہے ووڈکا۔۔ دو تین پیگ ووڈکا اور اس کے ساتھ ترش اور تیز

مصالحے دار کھانا''۔

ستیپال ایک سمجھدار آدمی تھا۔ باوجود اپنی خستہ حال طبیعت کے وہ فوراً سمجھ گیا کہ اجنبی نے جس ابتر حالت میں اسے پایا ہے بہتر یہی ہے کہ وہ خود اسے گزشتہ رات کی تمام روئیداد سنا دے۔

''بات دراصل یہ ہے کہ۔۔ ناقابل حد تک وزنی زبان کو گھماتے ہوئے ستیپال بولا'' میں کل کچھ۔۔۔۔۔''

''آگے ایک لفظ نہیں''۔ اجنبی ستیپال کی بات کاٹتے ہوئے بولا اور کرسی سمیت دائیں جانب گھسٹتا چلا گیا جہاں میز پر ایک ٹرے پڑی تھی۔ ٹرے میں ایک تازہ ڈبل روٹی، سرکے میں تیار کردہ نہایت قیمتی کھمبیاں، سلیقے سے کٹی مچھلی، ڈھکن بند ایک دیگچی اور وسط میں ووڈکا سے بھری ایک خوبصورت رنگدار شیشے کی صراحی رکھی تھی جو برف سے بھرے تھرماس کی ٹھنڈک سے دھندلی ہوئی جا رہی تھی۔ میز کو انتہائی سلیقے سے سجایا گیا تھا۔

اجنبی نے ستیپال کی حیرت کو دردناک انتہا تک پہنچنے کا موقعہ نہیں دیا اور فوراً ووڈکا کا ایک پیگ میں انڈیل کر ستیپال کو پیش کر دی۔

''اور آپ؟'' ہچکتی ہوئی آواز میں ستیپال بولا۔

''کیوں نہیں۔ کیوں نہیں''۔ اجنبی اپنے لئے بھی پیگ بناتے ہوئے بولا۔

ستیپال نے گلاس ابھی ہونٹوں سے لگایا ہی تھی کہ اجنبی ایک ہی جھٹکے میں اپنا گلاس ڈکار گیا۔

ستیپال ووڈکا کے بعد خوش ذائقہ مچھلی چباتے ہوئے اجنبی سے بولا'' جناب آپ بھی تو کچھ کھائیے''۔

''ارے نہیں۔ میں پینے کے بعد کچھ نہیں کھاتا''۔ یہ کہتے ہوئے اجنبی نے دیگچی کا ڈھکن اٹھا دیا اور ٹماٹروں میں تیار کردہ گوشت کی خوشبو پورے کمرے میں پھیل گئی۔ فوراً ہی اس نے گلاس دوبارہ ووڈکا سے بھر دیئے۔

چند ہی لمحوں میں ستیپال کی آنکھوں پر چھائے سبز بادل چھٹنے لگ گئے اور اسے کچھ کچھ یاد آنے لگ گیا۔ گزشتہ رات وہ ایک نکمے سے ادیب ''کھوسہ'' کے فارم ہاؤس پر تھا۔ اور اسے یاد آ گیا کہ کس طرح اس نے ایک آرٹسٹ کے ساتھ کرائے کی گاڑی پر سفر کیا تھا۔ اس آرٹسٹ نے ایک بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔۔ جی ہاں۔ جی ہاں فارم ہاؤس۔ کھوسہ کا فارم ہاؤس اور اس آرٹسٹ کے بریف کیس پر نگاہیں جمائے نجانے کیوں آس پاس کے کتے بھونکنے لگ گئے تھے۔ اور وہ خاتون جسے ستیپال چومنے کی کوشش کر رہا تھا کچھ واضح نہیں ہو رہی تھی۔ شائید وہ ریڈیو سٹیشن پر ملازم تھی یا پھر کسی اور سٹیشن پر۔ بہر حال گذشتہ روز کی حماقتیں دھیرے دھیرے ستیپال پر عیاں ہونے لگ گئی تھیں۔ لیکن ستیپال کے لئے اصل حیران کن تو آج کا

دن تھا۔ بالخصوص یہ اجنبی جو ووڈ کا اور کھانے پینے کی میز پر سجائے بیٹھا تھا۔

''جی جناب!'' امید ہے اب تو آپ کو میرا نام یاد آ گیا ہوگا؟''۔

ستپال نے شرمندگی سے مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلا دیئے ''میرا خیال ہے کہ آپ نے کل ووڈ کا کے بعد ایک سستی سی دیسی شراب شروع کر دی تھی۔ یہ تو انتہائی احمقانہ حرکت ہوئی نا۔ آپ کے مرتبے کا آدمی اور اس طرح کی گری ہوئی حرکت۔ چھی۔ چھی۔

''دیکھئے محترم۔ براہ کرم یہ بات اب آپ اپنے تک ہی محدود رکھئے گا''۔

''جی ہاں۔ جی ہاں۔ بالکل۔ لیکن یہ جو آپ کا میزبان تھا کھوسہ، اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہے''۔

''آپ کھوسہ کو کیسے جانتے ہیں جناب؟''

''کل آپ کے دفتر میں اس پر نظر پڑی تھی۔ ویسے اس منحوس شخص کو دیکھتے ہی میں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ آدمی ایک خنزیر ہے۔۔ چاپلوسی۔ چغل خوری۔ دروغ گوئی اس کا شیوا ہیں''۔

''بالکل ٹھیک''۔ کھوسہ کی اتنی صحیح تعریف سن کر ستپال حیران ہو رہا تھا۔ اب ستپال کو ایک ایک کر کے گزرے ہوئے کل کے واقعات یاد آ رہے تھے لیکن ان واقعات میں کہیں کہیں تاریکی کا پہرہ تھا۔ یہ اجنبی جو آج اس سے تعلقات بنا رہا تھا کسی صورت بھی گزشتہ روز اس کے دفتر میں نہیں آیا تھا۔

''پروفیسر ولانڈ۔ ماہر کالا علم''۔ ستپال کو مشکل میں ڈوبے دیکھ کر اجنبی نے اپنا تعارف کرایا اور گزرے دن کی تفصیل یکے بعد دیگرے بیان کرنے لگ گیا۔۔۔

''وہ کل ہی بیرون ملک سے ماسکو پہنچا تھا۔ اور فوراً شہر کے مشہور تھیٹر ورائٹی کے ڈائریکٹر ستپال کے دفتر حاضری دینے پہنچ گیا تھا جہاں اس نے ستپال کو تھیٹر میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی پیش کش کی تھی۔ ستپال نے فوراً ہی وزارت ثقافت سے اس کی اجازت بھی حاصل کر لی تھی۔ (ستپال کا رنگ سفید پڑ گیا)۔ ڈائریکٹر ستپال اور کالے علم کے ماہر پروفیسر نے تھیٹر میں لگاتار سات دن فن کا مظاہرہ کرنے کے معاہدے پر دستخط بھی کر دیئے تھے۔ (ستپال کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا)۔ اور یہ طے پایا تھا کہ مزید تفصیلات جاننے کے لئے ولانڈ صبح دس بجے ستپال کے گھر پہنچ جائے گا۔ اور ملاحظہ کیجئے ولانڈ حاضر ہے۔

یہاں پہنچنے پر پروفیسر کا استقبال گھر کی نوکرانی گورتی نے کیا تھا۔ گوری کے مطابق وہ خود تھوڑی دیر قبل یہاں پہنچی تھی۔ اور مائیکل اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔ جبکہ ستپال گہری نیند سو رہا تھا۔ اور اس کے لئے ڈائریکٹر کو جگانا ممکن نہیں تھا۔ ہاں اگر مہمان کے لئے اس سے ملاقات ضروری ہے تو وہ خود جا کر اسے جگا سکتا ہے۔ ستپال کو اس اذیت ناک حالت میں پا کر پروفیسر نے گورتی کو بازار سے ایک بوتل ووڈ کا اور کھانے پینے کی اشیاء لانے کے لئے بھیج دیا تھا۔

''میں ابھی ان چیزوں کا بل آپ کو ادا کر دوں گا''۔ ستپال اپنا پرس ڈھونڈنے لگ گیا۔

''ارے نہیں۔ بالکل نہیں۔ یہ آپ کیا غضب کرنے لگے ہیں؟۔ اجنبی اس موضوع پر مزید کچھ سننے کو تیار نہیں تھا۔ ستپال کی حالت زار قابل دید تھی۔ یہ شراب نوشی اور کھانا پینا تو سمجھ میں آ رہا تھا لیکن معاہدے والی بات اس کے حلق سے کسی بھی طرح نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ گزرے ہوئے دن میں کھوسہ تو اسے یاد تھا لیکن پروفیسر والآند اس کی یادداشت میں کہیں بھی نہیں تھا۔

''آپ ذرا وہ معاہدہ مجھے عنایت کریں گے؟'' ستپال بولا۔

''بڑے شوق سے، بڑے شوق سے''

ستپال نے جونہی ہاتھ میں تھمائے گئے کاغذ پر نظر دوڑائی اس کے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگ گئیں۔ اجنبی کا کہنا بالکل درست تھا۔ تحریر کے نیچے لمبی لمبی دم دار لکھائی میں سو فیصدی ستپال کے اپنے ہی دستخط تھے اور ایک کونے میں ہدایت کار روقن کے ہاتھ کی لکھی تحریر بھی درج تھی۔ جس کے مطابق پروفیسر کے ساتھ پینتیس ہزار روبل کے عوض معاہدہ طے پایا تھا۔ جن میں سے دس ہزار روبل اسے ایڈوانس کے طور پر ادا کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ساتھ ہی پروفیسر والآند نے دس ہزار روبل کی وصولی کی رسید بھی تحریر کر رکھی تھی۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ بدنصیب ستپال سوچ رہا تھا۔ اس کا سر بری طرح چکرانے لگ گیا تھا۔ یادداشت نے اسے بری طرح دھوکہ دینا شروع کر دیا تھا۔ اب ظاہر تھا کہ معاہدے کی تحریر دیکھنے کے بعد ستپال کے لئے حیرانگی ظاہر کرنا بالکل نامناسب تھا۔ ستپال نے مہمان سے دو تین منٹ کے لئے معذرت چاہی اور ننگے پاؤں ہی فلیٹ کی راہداری کی جانب لپکا۔ باورچی خانے کے دروازے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے بلند آواز میں ملازمہ کو پکارا۔ لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ جونہی اس کی نظر مائیکل کے بند دروازے پر پڑی تو تالے پر لگی سرکاری مہر دیکھ کر اس کے جسم میں رینگنے والی چیونٹیوں نے اسے بری طرح کاٹنا بھی شروع کر دیا تھا۔

ستپال کے دماغ میں بھونچال برپا ہو گیا۔ اس کی تمام تر سوچ ایک دو رویہ پٹڑی پر بھاگے جا رہی تھی اور جیسا کہ عموماً حادثات کے وقت ہوتا ہے صرف ایک ہی سمت میں اور نجانے کس منزل کی جانب۔ ستپال کے دماغ میں اس وقت جو کھچڑی پک رہی تھی اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ ایک طرف یہ کالے علم والا پروفیسر اور اس کے ساتھ تحریری معاہدہ۔ دوسری جانب مائیکل کے دروازے پر لگی سرکاری مہر۔ مطلب یہ ہوا کہ مائیکل نے کوئی غیر قانونی حرکت کی ہے۔ ناممکن۔ ناممکن۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن دروازے پر لگی سرکاری مہر بھی اپنی جگہ مسلمہ حقیقت تھی۔

انہی الجھنوں کے تانے بانے بنتے ہوئے ستپال نے ہدایت کار روفن کے دفتر کا فون ملایا۔ ستپال کی حالت اس وقت یقیناً قابل رحم تھی۔ ایک طرف اگر وہ معاہدے کی تصدیق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو مہمان ناراض ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف یہ پوچھنا بھی غیر مناسب تھا کہ آیا اس نے کسی کالے علم کے ماہر پروفیسر کے ساتھ پینتیس ہزار روبل کا معاہدہ کیا تھا یا نہیں۔

''ہیلو!'' فون میں روفن کی آواز گونجی۔

''آداب عرض ہے'' ۔''میں ستپال بول رہا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ کالے علم کا پروفیسر ولاند اس وقت میرے پاس بیٹھا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آج شام کا پروگرام کیا ہے؟''۔

''آہا۔ کالے علم والا! روفن چہکتے ہوئے بولا'' ہم نے تو اس کی تشہیر بھی شروع کر دی ہے''۔

''اچھا ٹھیک ہے''۔ نحیف سی آواز میں ستپال نے جواب دیا۔

''خدا حافظ''

''آپ کب تک آرہے ہیں؟' روفن نے پوچھا۔

''یہی کوئی آدھ گھنٹے تک'' ۔ستپال نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ابلتے ہوئے سر کو تھام لیا۔ یہ تو انتہائی شرمندگی کی بات ظاہر ہو رہی تھی۔ ۔ایسی یادداشت یادداشت۔

فون بند کرنے کے بعد ستپال کی نظر داخلی دروازے کے قریب لگے آئینے پر پڑی جس میں اسے ایک عجیب الخلقت شخص کا عکس نظر آیا۔ دھاری دار پتلون میں ملبوس۔ دبلا۔ لمبا سا (کاش، ایوان یہاں ہوتا تو وہ اسے فوراً پہچان لیتا) یہ عکس فوراً ہی غائب ہوگیا۔ ستپال نے پلٹ کر دیکھا تو راہداری سنسان پڑی تھی۔ اس نے آئینے میں دوبارہ دیکھا تو عقل مزید ماؤف ہوتی محسوس ہوئی۔ کیونکہ اس مرتبہ آئینے میں دکھائی دینے والا عکس ایک سیاہ بلے کا تھا۔ ستپال کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کیا میں پاگل ہونے جا رہا ہوں؟ یہ شبیہیں مجھ پر کہاں سے نازل ہونے لگ گئی ہیں؟ اس نے راہداری میں دوبارہ نظر دوڑائی اور خوف زدہ آواز میں چلایا۔

''گوری، گوری۔ یہ بلا گھر میں کہاں سے گھس آیا ہے؟۔ اور اکیلا بلا ہی نہیں۔ بلکہ یہاں کوئی اور بھی ہے''۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے محترم ستپال صاحب'' ۔گوری کی بجائے مہمان پروفیسر کی آواز سنائی دی۔'' یہ بلا میرا ہے اور گوری یہاں نہیں ہے۔ اسے میں نے گاؤں بھیج دیا ہے۔ وہ آپ لوگوں کی شکایت کر رہی تھی کہ آپ اس کی چھٹیاں عرصہ دراز سے ہضم کئے جا رہے ہیں''۔

پروفیسر کا یہ اعلان اتنا غیر متوقع اور عجیب تھا کہ ستپال کو اپنے کانوں پر دھوکہ ہونے لگا تھا۔ اس

نے یکا یک اپنے کمرے کی جانب دوڑ لگا دی لیکن دہلیز پر وہ حیرانگی کے عالم میں کسی مجسمے کی مانند ساکت ہوکر رہ گیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگ گئیں۔

کمرے میں مہمان پروفیسر اکیلا نہیں تھا۔ دوسری کرسی پر وہی کریہہ الوجود لمبو براجمان تھا جس کا عکس تھوڑی دیر قبل ستپال نے آئینے میں دیکھا تھا۔ لیکن اس بار وہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اس کی مونچھیں کسی پرندے کے پروں سے مشابہہ تھیں۔ آنکھوں پر ٹکے چشمے کا ایک جا بجا ٹوٹا شیشہ چمک رہا تھا جبکہ دوسرا غائب تھا۔ اور دیوان پر ٹانگیں پھیلائے غیر معمولی طور پر جسیم سیاہ رنگ کا بلا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک پنجے میں ووڈکا کا گلاس تھام رکھا تھا اور دوسرے میں ایک کانٹا جس میں اس نے مچھلی کا ایک ٹکڑا شکار کر رکھا تھا۔ کمرے میں روشنی پہلے ہی کچھ مدھم تھی۔ اوپر سے پروفیسر اور اس کے ساتھیوں نے جو ماحول پیدا کر رکھا تھا اسے دیکھ کر ستپال چکرا گیا۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات گونج رہی تھی۔ پاگل، پاگل، میں پاگل ہو رہا ہوں۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں''۔ ولاند بولا۔ ''محترم پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ حضرات دراصل میری ٹیم کا حصہ ہیں''۔

اس دوران بلا ووڈکا کا پیگ غٹا غٹ چڑھانے کے بعد اپنی مونچھیں سہلا رہا تھا۔

''اور ہاں میری ٹیم کے ارکان کو رہنے کے لئے جگہ درکار ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ اس فلیٹ میں کوئی شخص فالتو ہے۔ اور غالباً یہ فالتو شخص آپ ہی ہیں۔۔میرے محترم

''جی ہاں۔ ایسا ہی ہے۔ یقیناً ایسا ہی ہے''۔ دھاری دار پتلون والا بکرے جیسی منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اور ویسے بھی یہ حضرت کافی عرصہ سے لچر بازی کا کچھ زیادہ ہی مظاہرہ کر رہے ہیں۔ شراب ہے تو پیتے نہیں ڈکارتے ہیں۔ اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے خواتین کے ساتھ غیر اخلاقی تعلقات قائم کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک ٹکے کا کام نہیں کرتے اور ہاں کر بھی نہیں سکتے۔ جو کام انہیں سونپا گیا ہے وہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اپنے اعلیٰ حکام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہتے ہیں یہ حضرت''۔

اس دوران آئینے میں ایک اور یعنی چوتھا عجوبہ نمودار ہوا۔ آگ کی مانند لال بھبھوکا۔ ناٹے قد کا لیکن غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا۔ اس کا سر ایک بڑی سی کڑاھی کے مانند اور ادھ کھلے منہ سے دو لمبے بدنما دانت باہر جھانک رہے تھے۔ وہ چیختی ہوئی منحوس سی آواز میں بولا۔ ''میں تو حیران ہوں کہ یہ تھیٹر کا ڈائریکٹر کیسے بن گیا؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے مجھے کوئی جنت کا داروغہ لگا دے''۔

''ابے او عزازیل۔ اپنی شکل تو دیکھ۔ چلا ہے جنت کا داروغہ بننے''۔ بلا زور سے غراتے ہوئے بولا۔

''ابے میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں''۔ عزازیل نے جواب دیا اور ولآند کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب والا اجازت ہو تو اس لعین کو ماسکو سے غائب کر دیا جائے''۔

بلے کی دم اچانک پھول گئی اور وہ غرایا۔ ''دفع دور''

ستپال کے اردگرد چیزیں بہت تیزی سے گھومنے لگ گئیں۔ اس کا سر ایک زور دار دھماکے کے ساتھ فرش سے ٹکرا گیا۔ اس کا دماغ رفتہ رفتہ تاریکی میں ڈوبنے لگ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔۔ مر رہا ہوں۔ میں مر رہا ہوں''۔

لیکن وہ مرا نہیں۔ حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے دیکھا کہ وہ سمندر کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھا تھا۔ شور مچاتی سمندر کی لہریں اس کے پاؤں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ کانپتی ٹانگوں سے ہولے ہولے ساحل کی طرف بڑھنے لگ گیا۔ کچھ دور اسے ایک شخص نظر آیا جو سگریٹ پی رہا تھا اور بار بار پانی میں تھوک رہا تھا۔ ستپال کو دیکھ کر وہ شخص ایک بت کی مانند ساکت ہو گیا اور اس نے تھوکنا بند کر دیا۔ ستپال اس کے قریب پہنچ کر اچانک گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا ''خدارا بتائیے یہ کون سی جگہ ہے؟''۔

اجنبی تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''واہ بھئی واہ۔ یہ بھی کیا خوب سوال ہے''۔

''دیکھیے''۔ ستپال روہانسی آواز میں بولا۔ ''میں نشے میں نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کچھ عجیب ماجرا پیش آیا ہے۔ میں بہت سخت بیمار ہوں۔ براہ کرم مجھے بتا دیجئے۔۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ کون سا شہر ہے؟''۔

''ارے بھائی تم مشہور بندرگاہ یالٹا میں ہو''۔ اجنبی بولا۔

ستپال کا سر چکرانے لگ گیا اور وہ زوردار آواز کے ساتھ ریت پر پڑے ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

باب ۸

پروفیسر اور شاعر کی مڈبھیڑ

ٹھیک اسی وقت یعنی دن کے ساڑھے گیارہ بجے جب ستپال سمندر کنارے اپنے ہوش کھو رہا تھا ایوان بے گھر ذہنی امراض کے کلینک میں لمبی نیند کے بعد ہوش میں آ رہا تھا۔ وہ تعجب سے اس نامانوس کمرے کو دیکھ رہا تھا جس میں ہر چیز سفید دودھیا رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سفید دیواریں، سفید بستر، سفید چھت، سفید فرش اور سفید پردے جن کی درمیانی درزوں سے سورج کی کرنیں جھانک رہی تھیں۔

ایوان نے سر کو دو تین مرتبہ جھٹکا اور یہ یقین ہوجانے کے بعد کہ سر درد اب اس کا پیچھا نہیں کر رہی وہ اطمینان کے ساتھ گذشتہ روز کے واقعات کو یاد کرنے لگ گیا۔ سب سے پہلے مائیکل بیرلی کی موت کا منظر اس کے ذہن میں آیا لیکن آج اس سانحہ کی یاد نے ایوان کو کچھ زیادہ حواس باختہ نہیں کیا۔ اس کے سوچنے کا انداز بھی کافی سدھر گیا تھا۔ سفید آرام دہ بستر پر لیٹے ایوان کی نظر قریبی گھنٹی نما بٹن پر پڑی۔ ہمیشہ کی طرح نامانوس چیزوں کو بلاوجہ چھیڑنے کی عادت سے مجبور ایوان نے بٹن کو دبا دیا۔ انتظار کے باوجود نہ تو گھنٹی کی آواز سنائی دی اور نہ ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ ہاں ٹھیک ایک منٹ کے بعد بستر کے دائیں جانب ایک سلنڈر رضرور روشن ہوگیا۔ اس کے اوپر سرخ رنگ میں لکھا لفظ ''مشروب'' جلنے بجھنے لگ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس لفظ کی جگہ ''ڈاکٹر'' روشن ہوگیا اور اس کے بعد لفظ ''نرس''۔ ایوان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس سلنڈر کے ساتھ کیا کرے کہ اس کا ہاتھ اچانک اسی بٹن پر دوبارہ جا پڑا۔ سلنڈر نے فوراً ایک ہچکی لی اور مدھم سی گھنٹی بجا کر خاموش ہوگیا۔ چند ہی لمحوں بعد سفید گاؤن اور سکرٹ پہنے ایک جسیم لیکن خوش شکل خاتون کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ نہایت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''صبح بخیر بے گھر صاحب''۔

چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے خاتون نے کھڑکی کا پردہ کھول دیا اور کمرے میں سورج کی اجلی کرنیں اپنی روشنی بکھیرنے لگ گئیں۔ ایوان نے خاتون کو جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے

رنج تھا کہ ایک اچھے خاصے صحت مند آدمی کو اس طرح علاج گاہ میں زبردستی داخل کرنا انتہائی واہیات حرکت تھی۔ اور اب زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے ہر کوئی مسکرا مسکرا کر اسے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جیسے ہر کام قاعدے قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔

خاتون نے غسل خانے کا دروازہ کھولتے ہوئے ایوان کو نہانے کی دعوت دی۔ غسل خانہ نہایت صاف ستھرا اور قیمتی ساز و سامان سے مزین تھا۔ ایوان سخت رنجیدہ ہونے کے باوجود چہک اٹھا۔ ''ارے واہ! یہ تو ہوٹل میٹروپول کا باتھ روم لگ رہا ہے''۔

''جی نہیں'' خاتون نے فخریہ انداز میں کہا ''اس سے بھی کہیں بہتر۔ جناب ہمارے کلینک میں جس معیار کے آلات اور ساز و سامان ہے ویسا آپ کو روس میں تو کیا کسی دوسرے ملک میں بھی نہیں ملے گا۔ پوری دنیا سے سائنس دان اور محقق ہمارے ہاں آتے رہتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ہمارا کلینک غیر ملکیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے''۔

لفظ غیر ملکی سن کر ایوان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ غصیلے انداز میں بولا'' یہ جو غیر ملکیوں سے تم لوگوں کو لگاؤ ہے نا۔ یہ ایک دن تمہیں لے ڈوبے گا۔ تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان غیر ملکیوں میں اکثر لوگ ملعون بھی ہوتے ہیں۔ مجھے کل ہی ایک ایسے غیر ملکی سے ملنے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ کہنے کو وہ پروفیسر، محقق اور مشیر تھا لیکن حقیقت میں پرلے درجے کا شیطان تھا''۔

ایوان کا دل چاہ رہا تھا کہ خاتون کو پونتی پلات والی کہانی بھی سنا دے لیکن یہ سوچ کر کہ علم کی باتیں ان کم عقلوں کی سمجھ میں کہاں آنے والی ہیں، وہ پونتی پلات کو حلق سے ہی واپس نگل گیا اور خاموشی سے غسل خانے میں چلا گیا۔ نہانے کے بعد اسے سلیقے سے استری کی ہوئی قمیض، پاجامہ، جرابیں اور گاؤن پیش کیا گیا۔ ایوان بے چارہ اس قسم کے رویے کا عادی نہیں تھا، اس لئے کچھ شرمندہ شرمندہ دکھنے لگا تھا۔

غسل کے بعد ایوان کو ایک بہت کشادہ دفتر نما کمرے میں لایا گیا۔ یہ کمرہ مختلف قسم کے ان گنت آلات سے بھرا پڑا تھا۔ میز پر رکھا کسی خاص دھات سے بنا ایک بہت بڑا لیمپ کسی امیر آدمی کی رہائش گاہ کے آرائشی سامان کا حصہ لگ رہا تھا۔ ایوان کے پیچھے پیچھے سفید گاؤن میں ملبوس دو خواتین اور ایک مرد بھی دفتر میں داخل ہو گئے۔ ایوان کو چھوٹے سے گول سٹول پر بٹھا دیا گیا۔ ظاہر تھا کہ اب ایوان پر سوالات کی بوچھاڑ ہو گی۔

ایوان اس صورت حال کا بڑے انہماک سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں پے چیدہ حالات سے نکلنے کے تین ممکنہ حل تھے۔ ایک نسبتاً آسان اور ایوان کے نزدیک صورت حال کے عین مطابق حل تو یہ تھا کہ وہ اٹھے اور ان قیمتی لائٹس اور دوسرے ان جانے آلات کو اٹھائے اور دیواروں سے پٹخ کر توڑ

پھوڑ ڈالے اور یوں ایک تندرست آدمی کو زبردستی ذہنی امراض کی علاج گاہ میں قید رکھنے پر اپنے احتجاج کا مظاہرہ کرے۔ لیکن آج کا ایوان کل کے ایوان سے قطعی مختلف تھا۔ یہ پہلا راستہ اسے کچھ دانش مندانہ نہیں لگا۔ کیوں کہ اس قسم کے رویے کے بعد ان لوگوں نے اسے پکا پکا مشتقل ذہنی مریض قرار دے دینا تھا۔ لہٰذا ایوان نے یہ حل مسترد کر دیا۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ بغیر کسی تمہید کے غیر ملکی مشیر اور پونتی پلات والی کہانی سنانا شروع کر دے۔ لیکن گذشتہ روز کا تجربہ بتا رہا تھا کہ اس کہانی پر یا تو یقین ہی نہیں کیا جائے گا یا پھر صحیح طور پر اسے سمجھا ہی نہیں جائے گا۔ لہٰذا ایوان نے یہ حل بھی ترک کر دیا۔ اس نے تیسرے حل کو اپنانا ہی بہتر سمجھا۔ اور تیسرا حل یہ تھا کہ وہ اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لے۔ خاموش بیٹھا رہے اور کسی سوال کا جواب نہ دے۔

لیکن ایوان اپنی اس خواہش کا عملی مظاہرہ مکمل طور پر نہ کر سکا۔ اسے طوعاً کرہاً بہت سارے سوالوں کے جواب دینے ہی پڑے تھے۔ ایوان سے اس کے ماضی سے متعلق بہت تفصیلی سوالات پوچھے گئے۔ یہاں تک کہ پندرہ سال قبل اسے جو نمونیہ ہوا تھا اس کے بارے میں بھی ایوان کی یادداشت کو کریدا گیا۔ رشتہ داروں کے بارے میں تفتیش کی گئی۔۔ مردوں کو بھی معاف نہیں کیا گیا۔ کیوں مرا؟ کیسے مرا؟ شراب پیتا تھا یا نہیں؟ کسی جنسی بیماری میں مبتلا تو نہیں تھا؟ اور اس طرح کے مزید بیسیوں سوال۔

آخر میں گذشتہ روز کے واقعات کی تفصیل پوچھی گئی اور پونتی پلات کے ذکر پر کسی قسم کی حیرت کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ یہ تمام جوابات ایک خاتون بڑی مہارت کے ساتھ فائل میں لگے اوراق پر رقم کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد خاتون کی جگہ مرد نے لے لی۔ اس نے ایوان کے جسم کا درجہ حرارت چیک کیا۔ نبض کی رفتار گنی۔ اس کی آنکھوں میں روشنی ڈال کر کچھ دیکھا۔ پھر ایک ہتھوڑی سے اس کے گھٹنوں پر وار کئے گئے جس کے نتیجے میں ٹانگیں خود سے جھٹکے کھانے لگ گئیں۔ انگلی سے اور کہنی کے جوڑ کی نس سے خون نکالا گیا۔

ایوان کڑوے گھونٹ نگلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیسی عجیب و غریب اور شرمناک صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ وہ تو صرف اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہ رہا تھا جو اس غیر ملکی مشیر کی شکل میں معصوم شہریوں کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ وہ تو اس کم بخت کو قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ ذہنی امراض کی علاج گاہ میں قید ہو کر رہ گیا تھا اور کسی کم عقل گدھے کی طرح ان لوگوں کو اپنے مرحوم چچا فیروز کی کہانی سنانے پر مجبور تھا کہ وہ کیسے شراب کے نشے میں دھت ننگا برفانی جھیل میں جا گھسا تھا۔

آخر کار ایوان کو واپس اس کے کمرے میں لایا گیا۔ ناشتے میں کافی کا کپ، دو ابلے ہوئے انڈے، ڈبل روٹی کے دو سلائیس اور مکھن دیا گیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ایوان نے ٹھان لی کہ اب وہ کسی

بڑے ڈاکٹر ہی سے بات کرے گا اور اسے سمجھائے گا کہ اس کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی گئی ہے کہ اس جیسے صحت مند آدمی کو اس زنداں میں ڈال دیا گیا ہے۔

ناشتے کے کچھ ہی دیر بعد ایواَن کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سفید کوٹوں میں ملبوس لوگوں کا ایک جم غفیر اندر داخل ہوگیا۔ اس مجمع کے آگے آگے ایک پنتالیس سالہ خوش شکل مرد تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس کی حرکات وسکنات ایک منجھے ہوئے اداکار کے مانند تھیں۔ تمام لوگ اسے احترام سے دیکھ رہے تھے۔ شائید اسی لئے ایواَن کو گمان ہوا تھا کہ جیسے پونتی پلات اس کے کمرے میں آ گیا ہے۔

صاف ظاہر تھا کہ یہی بڑا ڈاکٹر تھا۔ غالبًا پروفیسر۔ ایواَن کو اسی کا تو انتظار تھا۔ ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنا تعارف کرایا ''مجھے ڈاکٹر ستارَین کہتے ہیں''۔ اس نے ایواَن سے ہاتھ ملایا اور انتہائی دوستانہ اور شفقت بھری مسکراہٹ سے ایوان کے پست حوصلوں کو یکا یک توانائی سے بھر دیا۔ ایک دوسرے ڈاکٹر نے ایواَن کی فائل پروفیسر کو تھما دی۔ وہ اسے بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا اور کبھی کبھار ''آ ہاں، ہوں، ہوں'' کے نعرے بھی بلند کر رہا تھا۔ دوسرے ڈاکٹروں سے کچھ مکالموں کا تبادلہ بھی کر رہا تھا اور ہاں وہ کوئی عجیب سی زبان بول رہا تھا۔ غالبًا لاطینی، جی ہاں لاطینی، بالکل لاطینی ہی تھی۔ وہی لاطینی جو پونتی پلات بھی بولا کرتا تھا۔ ایواَن کے ذہن میں مسابقت کا خیال زور پکڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر کے بولے ایک لفظ غالبًا ''مالیخولیا'' نے ایواَن کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہی لفظ ایواَن نے گذشتہ روز اس ملعون غیر ملکی مشیر کی زبان سے بھی سنا تھا۔ اس کم بخت کو اس مالیخولیا کا بھی پتہ تھا۔۔ خوف میں مبتلا ایواَن سوچ رہا تھا۔

''زبردست۔ زبردست۔ مریض کے بارے میں خوب تفصیل اکٹھی کر لی ہے''۔ پروفیسر فائل اپنے نائب کو واپس دیتے ہوئے بولا۔

''اچھا تو آپ شاعر ہیں؟''۔ وہ ایواَن سے مخاطب ہوا۔

''جی ہاں۔ شاعر''۔ انتہائی کرب کے ساتھ ایواَن بولا اور اسے یکا یک نجانے کیوں شاعری سے نفرت محسوس ہونے لگ گئی۔ اپنے ہی کہے ہوئے اشعار اسے برے لگنے لگے تھے۔ چہرے پر مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ایواَن نے پوچھا۔ ''آپ پروفیسر ہیں کیا؟''۔

جواب میں ڈاکٹر نے مودبانہ انداز میں سر خم کر دیا۔

''اور آپ یہاں کے انچارج ہیں؟'' ایوان نے اپنا سوال جاری رکھا۔

جواب میں ڈاکٹر نے پھر سر خم کر دیا۔

''مجھے آپ کے ساتھ بہت ضروری گفتگو کرنی ہے''۔ ایوان بولا۔

''جناب میں اسی لئے تو حاضر ہوا ہوں''۔ پروفیسر نے جواب دیا۔

''قصہ یہ ہے جناب''۔ایوان نے بولنا شروع کیا''کہ مجھے یہاں پاگل قرار دے دیا گیا ہے۔ اور کوئی بھی میری بات سننے کو تیار نہیں ہے''۔

''بالکل نہیں جناب''۔ پروفیسر بولا۔''ہم آپ کی بات پورے انہماک کے ساتھ سنیں گے۔اورا س بات کی تسلی رکھیں کہ کسی کو بھی آپ کو پاگلوں کی صف میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی''۔

''اچھا تو سنئے۔کل شام میری ملاقات ایک اجنبی شخص سے ہوئی تھی۔وہ ایک غیر ملکی تھا یا شاید غیر ملکی ہونے کا ناٹک کر رہا تھا۔اسے مائیکل بیرلی کی موت کا پہلے سے علم تھا اور وہ پونتی پلات سے بھی مل چکا تھا''۔

''پلات؟ اچھا! یہ آپ اس پلات کی بات کر رہے ہیں جو حضرت عیسٰی کے زمانے میں تھا''۔ پروفیسر انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''جی ہاں''۔ایوان نے کہا۔

''اور یہ مائیکل ٹرام کے نیچے کچلا گیا تھا؟''۔ پروفیسر نے پوچھا۔

''جی بالکل ایسا ہی ہے۔میری آنکھوں کے سامنے ٹرام کے آہنی پہیے نے اس کا سرتن سے جدا کر دیا تھا اور یہ جو غیر ملکی ملعون ہے''۔

''کون ملعون؟'' پروفیسر نے پوچھا۔''اچھا وہ جو پونتی پلات کا شناسا ہے؟''

یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایوان کی کہانی نے پروفیسر کو بہت حد تک متاثر کر دیا ہے۔

''جی ہاں وہی''۔ایوان نے تائید کی۔''اس کم بخت نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ انوشکا نے سورج مکھی کا تیل گرا دیا ہے۔اور یہی وہ جگہ تھی جہاں سے مائیکل پھسلا تھا۔اب آپ کو میری بات کچھ سمجھ آ رہی ہے نا؟''ایوان نے پوچھا۔

''یہ انوشکا کون ہے؟''۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

ایوان کو یہ سوال بالکل پسند نہیں آیا اور وہ تلملا کر بولا''انوشکا کون ہے۔اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔ ہوگی کوئی وہیں آس پاس کی رہنے والی کم عقل لڑکی۔اہم بات تو یہ ہے کہ اس غیر ملکی ملعون کو پہلے ہی سے سورج مکھی کے تیل کے بارے میں علم تھا۔آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی بالکل سمجھ رہا ہوں'' ڈاکٹر سنجیدہ چہرے کے ساتھ ایوان کا گھٹنا دباتے ہوئے بولا''آپ بالکل فکر نہ کریں اور تفصیل سے آگے کے واقعات سنائیں''۔

''جی پروفیسر صاحب''۔ایوان اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ماضی کے تلخ تجربے سے آشنا ایوان پرسکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔''ہاں تو وہ خطرناک غیر ملکی غالباً جھوٹ بول رہا تھا کہ وہ مشیر ہے۔

اس کم بخت کے پاس کوئی مافوق الفطرت غیر انسانی قسم کی قوت ہے۔ آپ اسے پکڑنے کے لئے دوڑ لگاتے ہو لیکن وہ چھلاوے کی طرح آپ سے مزید دور ہوتا جاتا ہے۔ اور ہاں اس کے دو ساتھی بھی ہیں۔ اور وہ دونوں بھی خوب ہیں۔ ایک تو لمبا دھاری دار پتلون والا، چہرے پر ٹوٹا پھوٹا چشمہ لگائے اور دوسرا۔۔ایک ناقابل یقین حد تک جسیم سیاہ رنگ کا بلا۔ اور ذرا ملاحظہ کیجئے کہ یہ بلا ٹرام پر ایک مہذب شہری کی طرح سفر بھی کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ جناب"۔ ایوان اب خوب روانی کے ساتھ جذبات سے بھرپور انداز میں بول رہا تھا۔ "یہ غیر ملکی یقیناً بنفس نفیس پونتی پلات کو بھی مل چکا ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ سب کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی بڑا حادثہ رونما ہو اس ملعون کو گرفتار کرنا بہت ضروری ہے"۔

"اچھا تو آپ بس یہ چاہتے ہیں کہ اس غیر ملکی کو گرفتار کرلیا جائے؟ میں آپ کی بات ٹھیک سمجھا ہوں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"یہ شخص تو واقعی عقلمند ہے" ایوان سوچ رہا تھا۔ "اچنبھے کی بات ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں میں بھی کبھی کچھ عقلمند نکل آتے ہیں"۔

"جناب آپ بالکل صحیح سمجھے ہیں۔ ایوان بولا" آپ خود ہی سوچئے کہ میں بھلا اس ملعون کی گرفتاری کا مطالبہ کیسے نہ کروں۔ اور یہاں آپ کے لوگوں نے مجھے زبردستی روک رکھا ہے۔ آنکھوں میں لائٹیں مارتے ہیں۔ زبردستی غسل دلواتے ہیں۔ مرحوم چچا فیروز کے متعلق اوٹ پٹانگ سوالات کرتے ہیں۔ میں پرزور مطالبہ کرتا ہوں کہ مجھے یہاں سے فوراً رہا کردیا جائے"۔

"خوب، بہت خوب" ڈاکٹر بولا "اب تمام معاملہ مجھے سمجھ آ گیا ہے۔ واقعی ایک صحت مند آدمی کو اس طرح علاج گاہ میں روکے رکھنا انتہائی نامناسب بات ہے۔ میں ابھی اسی وقت آپ کو یہاں سے چھٹی دے دونگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اپنی زبان سے یہ کہیں کہ آپ بالکل نارمل ہیں۔ ثابت نہیں کرنا صرف کہنا ہے کہ آپ بالکل نارمل ہیں"۔

ڈاکٹر کے اس اعلان کے بعد کمرے میں سکوت طاری ہوگیا۔ وہ موٹی نرس جو صبح ایوان کی دیکھ بھال کر رہی تھی منہ کھولے پروفیسر کو بے وقوفوں کی طرح گھورے جا رہی تھی۔ جبکہ ایوان پھر ایک مرتبہ سوچ رہا تھا۔ "یہ ڈاکٹر واقعی عقلمند ہے"۔

ایوان کو ڈاکٹر کی بات بہت پسند آئی تھی۔ لیکن جواب دینے سے قبل وہ ماتھے پر شکنیں ڈالے کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا اور بالآخر دوٹوک انداز میں کہنے لگا "نارمل ہوں۔ میں بالکل نارمل ہوں"۔

"زبردست، یہ ہوئی نا بات" ڈاکٹر بولا "لیکن آپ اگر واقعی نارمل ہیں تو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آپ نے کل دن بھر میں کیا کچھ کیا ہے"۔ ہاتھ بڑھا کر ڈاکٹر نے ایوان کی فائل پکڑی اور اس میں

درج کہانی پڑھنا شروع کر دی۔ ''تو ایسا ہے محترم کہ کل اس پونتی پلات سے میل جول والے غیر ملکی کی کھوج میں آپ نے درج ذیل کاروائیاں کی تھیں۔ سینے پر آپ نے یسوع مسیح کی شبیہ سجا رکھی تھی۔ کیوں ہوا تھا نا؟''

''جی ہاں۔ ہوا تھا''۔ ایوان نے جواب دیا۔

باڑ میں گھس کر چہرہ زخمی کر لیا تھا۔ آں؟ ریستوران میں جلتی موم بتی ہاتھ میں لئے اور صرف زیر جامہ پہنے وارد ہوئے تھے۔ ریستوران میں آپ نے کچھ لوگوں کے ساتھ مار پیٹ بھی کی تھی۔ ہمارے ہاں آپ کو رسیوں میں جکڑ کر لایا گیا تھا۔ یہاں سے آپ نے فون پر پولیس کو مشین گن بھیجنے کو کہا تھا۔ پھر آپ نے کھڑکی توڑ کر یہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اس طرح کی حرکتیں کرنے سے کسی مجرم کو پکڑا جا سکتا ہے۔ اگر آپ نارمل انسان ہیں تو خود سے کہیں گے۔ نہیں۔ آپ یہاں سے جانا چاہتے ہیں تو جناب بصد شوق۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ یہاں سے جائیں گے کہاں؟''۔

''پولیس سٹیشن۔ سیدھا پولیس سٹیشن جاؤں گا یہاں سے'' ایوان بولا۔

''نہ تو پہلے اپنے گھر نہیں جائیں گے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں۔ گھر جانے کی اس وقت مجھے بالکل فرصت نہیں ہے۔ مزید تاخیر کرنے پر وہ غیر ملکی ملعون غائب ہو سکتا ہے''۔ ایوان نے جواب دیا۔

''اچھا تو آپ پولیس والوں کو کیا بتائیں گے؟''۔ ڈاکٹر نے پوچھا

''پونتی پلات کے بارے میں''۔ ایوان کی آواز میں اب وثوق کی کمی نمایاں ہونے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے جناب۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو ایسا ہی سہی''۔ ڈاکٹر اپنے نائب سے مخاطب ہوا۔ ''چھٹی دے دیجئے جناب ایوان بے گھر کو، لیکن جس کمرے میں یہ مقیم ہیں اسے خالی ہی رہنے دیجئے گا کیونکہ ٹھیک دو گھنٹے بعد یہ محترم واپس تشریف لے آئیں گے۔ میں ان صاحب کو کسی صورت کامیابی کی دعا نہیں دوں گا کیونکہ کامیاب تو یہ ہو ہی نہیں سکتے۔ اچھا جناب شاعر صاحب، مجھے پورا یقین ہے کہ آپ سے جلد ہی دوبارہ ملاقات ہو گی''۔ یہ کہنے کے بعد ڈاکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں کہ میں یہاں واپس لوٹ آؤں گا''۔ پریشان حال ایوان نے استفسار کیا۔

''جناب اس بنیاد پر کہ آپ صرف زیر جامہ پہنے جب پولیس سٹیشن پر اعلان کریں گے کہ آپ اس شخص سے مل کر آئے ہیں جو خود پونتی پلات سے ملتا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ پولیس والے آپ کو فوراً ہمارے ہاں پہنچا دیں گے''۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"یہ زیر جامہ بیچ میں کہاں سے آ گیا؟" ۔ ایوان نے پوچھا

"اصل مسئلہ تو پونتی پلات کی وجہ سے ہوگا" ڈاکٹر بولا۔ "لیکن اس وقت زیر جامہ بھی اہم ہوگا کیونکہ ہسپتال کے کپڑے جو آپ نے اب پہن رکھے ہیں یہاں سے رخصت ہونے پر ہم اتروا لیں گے اور رہ جائیں گے آپ صرف زیر جامہ میں۔ اب آپ گھر بھی نہیں جانا چاہتے تو ظاہر ہے آپ زیر جامہ ہی میں پولیس سٹیشن جائیں گے"۔

یہ سب سننے کے بعد ایوان پر اچانک شدید نقاہت غالب آنے لگ گئی تھی۔ وہ خود کو انتہائی کمزور محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات گونج رہی تھی۔ "مجھے مدد کی ضرورت ہے، مجھے مدد کی ضرورت ہے"۔

اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "اچھا تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"یہ ہوئی نا بات" ڈاکٹر چہکتے ہوئے بولا۔ "اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کل آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کل آپ کو کسی نے شدید خوف زدہ کر دیا تھا۔ اور پونتی پلات والی کہانی سنا کر الجھا بھی دیا تھا۔ نتیجتاً آپ شدید اعصابی دباؤ کا شکار ہو گئے تھے۔ قدرتی سی بات ہے کہ اس کے بعد آپ کی جو حرکات رہی ہیں انہیں دیکھ کر ہر کوئی یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ پاگل ہو گئے ہیں۔ آپ کی نجات اب صرف مکمل آرام میں ہے۔ آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ آپ چند دنوں کے لئے ہمارے مہمان بن کر رہیں"۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن اس بلوان کو پکڑنا بھی تو بہت ضروری ہے" ایوان روہانسی آواز میں بولا۔

"جی میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں"۔ ڈاکٹر نے کہا "لیکن اس کے لئے آپ کو خود دوڑ دھوپ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اپنے تمام تحفظات اور شکایات ایک کاغذ پر درج کر دیں۔ ہم فوراً آپ کی درخواست متعلقہ لوگوں تک پہنچا دیں گے اور جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ ہمارا واسطہ ایک مجرم سے ہے تو یقین کیجئے کہ وہ بہت جلد قانون کے شکنجے میں ہوگا۔ لیکن ایک شرط ہے کہ آپ اب اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالیں گے۔ بالخصوص پونتی پلات کے بارے میں کم سے کم سوچیں گے۔ لوگ تو ہر طرح کے قصے گھڑ لیتے ہیں لیکن آپ جیسے دانش وروں کو ان پر فوراً یقین نہیں کر لینا چاہیے"۔

"سمجھ گیا"۔ انتہائی بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایوان بولا۔ "لایئے کاغذ اور پنسل"۔

"لائیں بھی جلدی سے کاغذ اور پنسل ایوان بے گھر کی خدمت میں پیش کریں"۔ ڈاکٹر نے اپنے نائبین سے کہا۔ "لیکن میرا مشورہ ہے کہ آج آپ آرام کریں اور یہ کام کل کر لیجئے گا"۔

"نہیں۔ نہیں۔ آج۔ یہ کام آج ہی کرنا بہت ضروری ہے"۔ ایوان چیختے ہوئے بولا۔

"چلیں ٹھیک ہے" ڈاکٹر نے کہا "لیکن آپ براہ کرم اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ یہ مسئلہ

اگر آج حل نہیں ہوتا تو کل لازماً ہو جائے گا"۔

"وہ بھاگ جائے گا"۔ایوان کسی جاسوس کے انداز میں دھیرے سے بولا۔

"ارے نہیں۔ وہ کہیں نہیں بھاگ سکتا۔ اس کی میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں اور یاد رکھیں کہ ہمارے یہاں آپ کی ہر طرح سے مدد کی جائے گی۔لیکن آپ کو بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔اس کے بغیر کسی بہتری کی امید رکھنا بے کار ہے۔آپ سن رہے ہیں نا؟"۔

ڈاکٹر نے اچانک ایوان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔"براہ کرم یہ مت بھولنا کہ یہاں سب لوگ آپ کی مدد کرنے کے لئے ہیں۔ یہاں آپ کو آرام اور سکون ملے گا"۔

"جی ہاں، جی ہاں"۔ایوان دھیمی سی آواز میں بولا۔

"تو لیں جناب"۔ڈاکٹر بولا"تمام معاملات بخوبی طے ہو گئے ہیں۔ میں اب اجازت چاہوں گا"۔دروازے میں اچانک رکتے ہوئے ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو ہولے سے کہا"آکسیجن اور گرم پانی کا غسل جاری رکھیں"۔

چند ہی لمحوں میں ایوان کمرے میں اکیلا رہ گیا۔کھڑکی سے سورج کی سنہری کرنیں چھن رہی تھیں۔کھڑکی کے عین نیچے دریا مستی بھری لہروں کے ساتھ بہہ رہا تھا۔دریا کے اس پار سرسبز درختوں کا جھنڈ انتہائی دل کش نظارہ پیش کر رہا تھا۔

باب ۹

ترجمان کی شرارتیں

سرکاری عمارت نمبر ۳۰۲ جس میں مرحوم مائیکل بیرلی رہا کرتا تھا ماسکو شہر کے وسط میں پارک لین کے عین بیچوں بیچ واقع تھی۔ اس سرکاری عمارت کا انچارج نکانور بوس بدھ کی رات سے کچھ افراتفری میں مبتلا تھا۔

آدھی رات کے وقت۔ جیسا کہ ہم پہلے سے جانتے ہیں۔ ایک سرکاری کمیٹی اس عمارت میں آئی تھی۔ جس نے نکانور کو بلا کر فلیٹ نمبر ۵۰ کے رہائشی مائیکل بیرلی کی موت کی اطلاع دی تھی۔

مائیکل کے تحریر کردہ تمام مسودے سرکاری تحویل میں لے لئے گئے اور اس کی تمام ذاتی اشیاء ڈبوں میں بند کرنے کے بعد سربمہر کر دی گئیں تا کہ قانونی ورثا کے سپرد کی جاسکیں۔ فلیٹ کے وہ کمرے جو مائیکل کے زیر استعمال تھے بلڈنگ انچارج نکانور بوس کے صوابدیدی اختیار میں دے دیئے گئے تھے۔

مائیکل کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح اس سرکاری رہائش گاہ کے مکینوں میں پھیل چکی تھی۔ جمعرات کی صبح سات بجے سے نکانور کو فون پر اور بالمشافہ مرحوم کا فلیٹ حاصل کرنے کے لیئے بتیس درخواستیں موصول ہو چکی تھیں۔ نکانور کو کئی مرتبہ بالکونی میں بلا کر کان میں کچھ کہا گیا۔ کبھی آنکھ ماری گئی اور کبھی فلیٹ میں رہائش کے عوض لمبے چوڑے وعدے کئے گئے۔

یہ عذاب دن کے تقریباً بارہ بجے تک جاری رہا۔ آخر تنگ آ کر نکانور اپنے فلیٹ سے بھاگ نکلا اور عمارت کے داخلی گیٹ کے قریب واقع اپنے دفتر میں جا پہنچا۔ لیکن وہاں بھی ایک بہت بڑا ہجوم اس کا منتظر تھا۔ نکانور وہاں سے بھی بھاگ اٹھا۔ کچھ لوگوں نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت ہوشیاری سے انہیں چکمہ دے کر پانچویں منزل پر پہنچ گیا جہاں یہ منحوس فلیٹ نمبر ۵۰ واقع تھا۔

نکانور کچھ دیر فلیٹ کے سامنے کھڑا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا اور پھر اپنی گنڈیری نما انگشت شہادت سے دروازے پر لگی گھنٹی کو دبا کر انتظار کرنے لگ گیا۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے گھنٹی

دوبارہ بجائی اور زیرِ لب مغلظات بکنے لگ گیا۔ لیکن دروازہ اس بار بھی نہیں کھلا۔ نکانور کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے جیب سے ڈپلیکیٹ چابیوں کا گچھا نکالا اور فلیٹ نمبر ۵۰ کی چابی اپنے سرکاری ہاتھ سے فلیٹ کے تالے میں گھسا کر اپنے عہدے کی پوری طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

''ہیلو، ہیلو، ہے کوئی؟'' نکانور چلا رہا تھا۔ ارے یہ صفائی والی کا کیا نام ہے؟۔ ہاں یاد آیا گورتی۔ اس نے گوری کو آوازیں دینا شروع کر دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

نکانور نے اپنے بیگ سے چاقو نکالا اور مائیکل بیرلی کے کمرے پر لگی سرکاری مہر کاٹنے کے بعد اندر داخل ہو گیا۔ داخل ہونے کو تو وہ داخل ہو گیا لیکن کمرے میں نگاہ پڑتے ہی وہ دروازے کے عین بیچوں بیچ ساکت ہو کر رہ گیا اور اس کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ اٹھی۔ مرحوم مائیکل کی میز پر کہنیاں ٹکائے ایک لمبے قد کا دبلا پتلا اجنبی بیٹھا تھا۔ اس نے دھاری دار پتلون پہن رکھی تھی اور سر پہ گھڑ سواروں والی ٹوپی سجا رکھی تھی۔

''آپ کون صاحب ہیں جناب؟'' نکانور نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

''ارے واہ! نکانور بوس''۔ پہاڑی بکرے جیسی آواز میں منمناتا ہوا اجنبی بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے یکا یک نکانور کا ہاتھ تھام لیا اور پرجوش انداز میں مصافحہ کرنے لگ گیا۔

نکانور کو اس کا یہ انداز یکسر پسند نہیں آیا۔ ''میں معذرت چاہتا ہوں جناب'' نکانور شک و شبہ سے پر انداز میں بولا۔ ''آپ کون صاحب ہیں؟ کوئی سرکاری عہدیدار ہیں کیا؟''۔

''ارے نکانور، نکانور، کیا بات کرتے ہو؟'' اجنبی پرمزاح انداز میں بولا۔ ''یہ سرکاری اور غیر سرکاری بھلا کیا چیز ہے۔ سب آپ کے دیکھنے اور سمجھنے کے انداز پر منحصر ہے۔ آج میں غیر سرکاری ہوں۔ کل ہو سکتا ہے سرکاری ہو جاؤں۔ ویسے الٹ بھی ہو سکتا ہے۔ آج کا سرکاری کل غیر سرکاری بھی ہو سکتا ہے''۔

نکانور کو اجنبی کی لفاظی بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ اس کا شک اب یقین میں بدل چکا تھا کہ یہ اجنبی یقیناً غیر سرکاری آدمی ہے۔ اور ممکن ہے کہ مجرمانہ خصوصیات بھی رکھتا ہو۔

''بھائی صاحب آپ ہیں کون؟ کیا نام ہے آپ کا؟'' نکانور کا خوف اب غصے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

''میرا نام؟'' اجنبی تمسخر سے بولا ''نام، نام، ارے بھائی کاروآن کہہ لو۔ اچھا بولو کچھ کھاؤ پیو گے؟ بلا تکلف بتاؤ''۔

''معاف کیجئے۔ کھانا پینا کیسا؟ مرحوم کے کمرے میں داخل ہونا ویسے ہی غیر قانونی ہے۔ آپ

یہاں کیا کر رہے ہو؟''۔

اجنبی اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک کرسی گھسیٹ کر لے آیا اور نکانور کو بیٹھنے کی پیش کش کرنے لگ گیا۔

نکانور اب غصے میں آگ بگولا ہو چکا تھا۔ کرسی کو واپس دھکیلتے ہوئے وہ زور سے چلایا ''ارے تم ہو کون؟''۔

''میں جناب والا ترجمان ہوں ۔۔ان مہربان غیر ملکی سیاح کے لئے جو اس فلیٹ میں رہائش رکھتے ہیں''۔اپنے غلیظ جوتے کی ایڑی فرش پر رگڑتے ہوئے اجنبی بولا۔

یہ خبر نکانور کے لئے انتہائی غیر متوقع تھی۔ غیر ملکی اور وہ بھی ترجمان کے ساتھ۔۔اس فلیٹ میں؟ یہ بات اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔

اجنبی ترجمان نہایت جوشیلے انداز میں بیان کر رہا تھا کہ غیر ملکی آرٹسٹ پروفیسر والاند کو تھیٹر کے ڈائریکٹر جناب ستپال نے خود ایک ہفتے کے لئے اس فلیٹ میں مہمانداری کی عزت بخشنے کے لئے مدعو کیا ہے اور اس بارے میں انہوں نے اس رہائشی عمارت کی کمیٹی کے سربراہ جناب نکانور بوس کو تحریر بھی کر دیا تھا, کہ اس غیر ملکی کو یہاں وقتی طور پر رہنے کی اجازت دے دی جائے۔خود ڈائریکٹر ستپال صاحب سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے یالٹا چلے گئے ہیں۔

''کچھ نہیں لکھا مجھے اس نے''۔نکانور غصیلی آواز میں بولا۔

''جناب آپ ذرا اپنے بیگ میں تو جھانکیں'' ترجمان نے مشورہ دیا۔

نکانور نے غیر یقینی کے عالم میں شانے اچکاتے ہوئے اپنا بیگ کھولا تو اس کی عقل دنگ رہ گئی۔ اوپر ہی ایک کھلے لفافے میں ستپال کا دستخط شدہ خط پڑا تھا۔

''یہ کیا؟ میں کیسے اس بارے میں بھول گیا؟'' نکانور بڑبڑایا۔

''حواس باختہ۔حواس باختہ ہیں جناب آپ'' تھکن سے چور اور ہاں آپ کا بلڈ پریشر بھی تو بڑھا رہتا ہے۔ میں خود آج کل انتہا کا حواس باختہ ہوں۔کسی وقت وسکی کا گلاس لے کر بیٹھیں گے تو میں آپ کو اپنی زندگی کی داستان سناؤں گا۔ایسے ایسے قصے ہیں کہ آپ کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑنے لگیں گے''۔

''یہ ستپال کب یالٹا جا رہا ہے''۔نکانور نے پوچھا

''وہ تو چلا بھی گیا ہے جناب۔اس وقت سمندر میں کشتی رانی کے مزے لے رہا ہے''۔ترجمان بولا

نکانور نے اعلان کیا کہ وہ بنفس نفیس خود غیر ملکی پروفیسر سے ملنا چاہتا ہے۔

''ناممکن'' ترجمان بولا ''اس وقت تو کسی صورت نہیں۔ کیونکہ اس وقت وہ بلّے کو سدھا رہے ہیں۔ ہاں اگر آپ دلچسپی رکھتے ہیں تو بلّے سے ملاقات کرا سکتا ہوں''۔ لیکن بلّے کو ملنے سے نکانور نے خود ہی انکار کر دیا۔

ترجمان نے نکانور کو اچانک ایک عجیب الجھن میں ڈال دیا۔ وہ کہہ رہا تھا ''جناب یہ غیر ملکی پروفیسر دراصل بہت امیر آدمی ہے اور کشادہ عمارات میں رہنے کا عادی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ یہ سارا فلیٹ چند دنوں کے لئے ان کے حوالے کر دیں۔ میرا مطلب ہے کہ مرحوم مائیکل کے کمرے بھی۔ دیکھئے نا وہ کمرے اب مائیکل کے کسی کام کے نہیں رہے''۔

''غیر ملکیوں کو جناب ہوٹل میٹروپول میں رہنا چاہیے نہ کہ لوگوں کی ذاتی رہائش گاہوں میں''۔

''جی میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ صاحب ہوٹلوں میں رہنا پسند نہیں کرتے''۔

''یہ غیر ملکی میرے حلق میں پھنسے رہتے ہیں۔ آ جاتے ہیں اور نخرے دکھاتے ہیں یا پھر جاسوسی شروع کر دیتے ہیں۔ ہماری کوئی بھی چیز انہیں سیدھی نہیں لگتی''۔

''آپ گھبرائیں نہیں''۔ ترجمان نکانور کے کان میں ہولے سے بولا۔ ''اس کے پاس پیسے بہت ہیں۔ آپ کو پشیمان نہیں ہونے دے گا''۔

ترجمان کی پیسوں والی بات نے نکانور کو ہلا کر رکھ دیا۔ باوجودیکہ ترجمان کی ہیئت اور انداز اسے ایک آنکھ نہیں بھائے تھے لیکن اس کی بات سننے کے بعد اچانک اس کے دماغ میں اپنے ادارے کے خستہ مالی حالات گھومنے لگ گئے تھے۔ سردیوں میں پانی گرم کرنے کے لئے کوئلہ تک خریدنے کے پیسے نہیں تھے۔ شائد اس غیر ملکی سے ملنے والے پیسے ادارے کے مالی حالات کو بہتر کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔

''ٹھیک ہے لیکن پہلے مجھے یہ بات غیر ملکیوں کے معاملات کی وزارت سے کرنی پڑے گی''۔ نکانور نے جواب دیا۔

''میں سمجھ رہا ہوں جناب'' ترجمان بولا۔ ''سرکاری اہلکار بالکل ناک کی سیدھ میں ہی چلیں تو ٹھیک رہتے ہیں۔ آپ جناب عالی فون اٹھائیں اور جس ادارے سے چاہیں بات کر لیں''۔ وہ نکانور کو راہداری میں پڑے ٹیلیفون کے پاس لے گیا اور جناب یہ بھی یاد رکھیے گا کہ یہ غیر ملکی کروڑوں کا مالک ہے اور ہاں اگر کبھی اس کے آبائی شہر جانا ہوا تو ضرور بتائیے گا۔ ایکڑوں پر محیط محل ہے اس کا۔ دیکھو گے تو دنگ رہ جاؤ گے''۔

نکانور نے وزارت کا فون ملا کر متعلقہ افسر سے اس غیر ملکی مشیر کی مرحوم مائیکل کے فلیٹ میں رہائش کی بابت بات کی تو اس کی عقل ماؤف ہو کر رہ گئی کیونکہ اجازت نامہ بلا تامل جاری کر دیا گیا تھا۔

فون بند کرنے کے بعد نکانور ترجمان سے مخاطب ہوا۔ ''لو جناب غیر ملکیوں کے امور کی وزارت نے فلیٹ میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ دراصل ان لوگوں کو کسی نے پیشگی آگاہ کر رکھا تھا''۔

''واہ۔ زبردست۔ یہ ہوئی نا بات''۔ ترجمان بولا

''ہاں تو ایسا ہے جناب''۔ نکانور کہنے لگا۔ ''سرکاری رہائشی سکیموں کا ادارہ فلیٹ نمبر ۵۰ غیر ملکی فن کار ولانَد کو ایک ہفتے کے لئے کرائے پر دینے کی منظوری دیتا ہے۔ ایک دن کا کرایہ ہوگا پانچ سو روبل''۔

ترجمان نے نکانور کو آنکھ مارتے ہوئے اس کمرے کی جانب اشارہ کیا جہاں سے بلّے کی اچھل کود کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور بولا ارے، پانچ سو کے حساب سے تو کل سا ڑے تین ہزار بنیں گے۔ بھلا یہ بھی کوئی رقم ہے۔ جناب پانچ ہزار کی بات کریں، پانچ ہزار کی۔ دیدے گا وہ''۔

نکانور اتنی بڑی رقم کا سن کر بوکھلا گیا اور شائید اسی بوکھلاہٹ کے عالم میں وہ مرحوم مائیکل کی میز پر جا بیٹھا جہاں پہلے سے موجود ترجمان بڑی عجلت سے فلیٹ میں رہائش کا کرائے نامہ لکھ رہا تھا۔ اس نے کرائے نامہ کی دو نقول تیار کی تھیں۔ دوسرے کمرے میں جا کر چند لمحوں میں وہ ولانَد کے دستخط کرا لایا۔ نکانور نے بھی بلا تامل کرائے کے معاہدہ پر دستخط کر دیے۔

''بس جناب اب پانچ ہزار کی رسید بھی بنا دیں''۔ نئے کڑ کڑ کرتے نوٹوں کی گڈیاں میز پر سجاتے ہوئے ترجمان بولا۔

نکانور نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹوں کو گنا۔ ترجمان سے غیر ملکی کا پاسپورٹ لیا اور سلیقے سے اپنے بیگ میں رکھنے کے بعد قدرے شرمندگی سے بولا۔ ''یہ جو آپ لوگ تھیٹر میں فن کا مظاہرہ کرنے والے ہیں اس کا کوئی پاس وغیرہ مل سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں، کیوں نہیں، فرمائیے کتنے پاس چاہیں آپ کو، پانچ، دس، پندرہ؟''

''نہیں، نہیں صرف دو۔ میرے اور میری بیوی کے لئے''۔

ترجمان نے فوراً ہی دو پاس بنائے اور نکانور کے بائیں ہاتھ میں تھما دیئے اور ایک نئے نوٹوں کی گڈی اس کے دائیں ہاتھ میں رکھ دی۔

نکانور یہ رقم دیکھ کر اچانک سخت مشتعل ہوگیا۔ ''نہیں، نہیں یہ آپ کیا کر رہے ہیں، میں رشوت نہیں لیتا''۔

''یہ رشوت نہیں ہے۔ یہ تو آپ کا حق ہے۔ دیکھیں نا آپ نے کتنی محنت کی ہے۔ یہ اسی محنت کا معاوضہ ہے۔ ہمارے ہاں تو اس قسم کی روایت نہیں ہے لیکن ان غیر ملکیوں کے ہاں اسکو بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ یہ لوگ تو انکار کرنے پر اکثر ناراض ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جناب آپ کی محنت کا جو شکریہ ادا کیا

جارہا ہے یہ تو آپ کو وصول کرنا ہی پڑے گا۔ اور ویسے بھی یہاں بھلا کون دیکھ رہا ہے؟۔ ہے کوئی؟

اور اچانک (جیسا کہ بعد ازاں نکانور نے بیان کیا) ایک غیر معمولی واقعہ رونما ہوا۔ نوٹوں کی گڈی خود سے ہی نکانور کے بیگ میں گھس گئی۔ اس وقت نکانور کی حالت ناقابل دید تھی۔ وہ خود کو پرلے درجے کا احمق محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ اس منحوس فلیٹ میں ایک پل بھی رکنا نہیں چاہتا تھا۔

چند ہی لمحوں میں وہ فلیٹ سے باہر نکل آیا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کا ذہن آج کے واقعات میں غوطے کھا رہا تھا۔ اسے تصور میں غیر ملکی فنکار کا محل نما گھر نظر آرہا تھا۔ ایک جانب بلا اچھل کود کر رہا تھا اور دوسری جانب اس کے ذہن میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ گواہ تو واقعی کوئی نہیں تھا۔ تھیٹر کے پاس۔ بیگم کا خوشی سے تمتماتا چہرہ۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ خیالات کا یہ تانا بانا بے ربط ہونے کے باوجود خوشگوار تھا۔ لیکن دور کہیں گہرائی میں نکانور کو ایک کانٹے کی چبھن محسوس ہو رہی تھی اور یہ چبھن ایک انتہائی ناخوشگوار بے چینی کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ نکانور کے ذہن میں اچانک ایک اور خیال آن ٹپکا جس نے بھونچال جیسی کیفیت پیدا کر کے رکھ دی۔ اسے یکا یک یاد آیا کہ مائیکل کے کمرے پر تو سرکاری مہر سے سیل شدہ قفل پڑا تھا۔ پھر یہ کم بخت ترجمان اندر کیسے داخل ہوا؟ نکانور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کا دھیان اس حقیقت پر پہلے کیوں نہیں گیا۔ وہ کچھ دیر تک کسی بکرے کے مانند سیڑھیوں کو گھورتا رہا پھر اپنی تمام سوچوں پر مٹی ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے، بلند آواز میں ''تھو، تھو'' کرتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگ گیا۔

جیسے ہی نکانور فلیٹ سے باہر نکلا بند کمرے سے دھیمی لیکن واضح آواز سنائی دی۔ ''یہ نکانور مجھے پسند نہیں آیا۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ شخص آئندہ اس فلیٹ میں کبھی نہ آئے؟''

''میرے آقا آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ کہیں دور سے ترجمان کی گونجدار آواز سنائی دی۔ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اس نے فوراً راہداری میں پہنچ کر فون اٹھایا اور نمبر ملانے کے بعد بولا۔ ''جناب میں اپنا قومی فریضہ سمجھتا ہوں کہ حکومتی اداروں کو آگاہ کردوں کہ ہمارے علاقے کی باغ والی گلی میں واقع سرکاری رہائش گاہ کی عمارت نمبر ۳۰۲ کا انچارج نکانور ایک انتہائی ملک دشمن اور قوم دشمن آدمی ہے۔ غیر ملکیوں سے جائز و ناجائز کام کرنے کی رشوت لیتا ہے۔ اس وقت بھی اس کے فلیٹ نمبر ۳۵ کے غسل خانے کی الماری کے بائیں دراز میں اخبار میں لپٹے چارسو ڈالر پڑے ہیں۔ جی میرا نام تیمیس ہے اور میں اسی عمارت کے فلیٹ نمبر گیارہ میں رہتا ہوں۔ لیکن خدارا میرا نام پوشیدہ رکھیے گا کیونکہ میں نکانور سے بہت ڈرتا ہوں''۔ یہ کہنے کے بعد اس خبیث نے فون بند کردیا۔

اس کے فوراً بعد فلیٹ نمبر ۵۰ میں کیا کچھ ہوا؟ ہم نہیں جانتے۔ ہاں البتہ نکانور کے فلیٹ میں رو پذیر ہونے والے واقعات سے ہم بخوبی واقف ہیں۔۔

گھر پہنچنے کے بعد نکانور سیدھا غسل خانے میں گیا۔ بیگ سے ترجمان کے زبردستی تھمائے گئے چار سو روبل نکالے، انہیں ایک اخبار میں لپیٹا اور الماری کے بائیں دراز میں احتیاط سے رکھ دیا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد نکانور کھانے کی میز پر بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی نے ایک سلیقہ شعار خاتون خانہ کی مانند باریک ٹکڑوں میں کٹی، سرکے میں تیار کردہ، تازہ سبز پیاز سے ڈھکی مچھلی پیش کی۔ نکانور نے ووڈکا کا پیگ اٹھایا اور حلق میں انڈیل لیا۔ فوراً ہی دوسرا پیگ بنایا اور اسے بھی ڈکار گیا۔ اس نے کانٹے سے مچھلی کے تین ٹکڑے شکار کئے اور منہ میں ڈالنے ہی لگا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس دوران نکانور کی بیوی بھینی بھینی خوشبو والی بھاپ اگلتی سوپ سے بھری دیگچی خاوند کو پیش کر چکی تھی۔

''خانہ خراب ہو تمہارا''۔ نکانور غصے سے کانپتا ہوا بولا۔ ''کھانا تک نہیں کھانے دیں گے۔، سنو''۔ وہ بیوی سے مخاطب ہوا''۔ جاؤ دیکھو کون ہے۔ گھر کے اندر کسی کو نہ آنے دینا۔ اگر خالی فلیٹ کے بارے میں پوچھیں تو کہنا اس معاملے پر میٹنگ ایک ہفتہ بعد ہوگی۔ میرا پوچھیں تو کہنا گھر پر نہیں ہے''۔

نکانور کی بیوی تیز تیز قدموں سے دروازے کی جانب چل پڑی۔ نکانور نے چمچ پکڑا اور سوپ کی دھواں اڑاتی جھیل سے ران کی ہڈی کا ٹکڑا قابو کر لیا۔ اس دوران دو اجنبی باورچی خانے میں داخل ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی نکانور کا رنگ سفید پڑ گیا اور ہڈی چمچ سے اچھل کر فرش پر جا گری۔

''غسل خانہ کس طرف ہے؟'' سفید کوٹ میں ملبوس نو وارد نے پوچھا۔

''ادھر ہے، ادھر ہے'' نکانور کی بیوی انہیں راستہ دکھا رہی تھی۔

''مسئلہ کیا ہے بھئی؟''۔ نکانور نے دھیمی آواز میں پوچھا۔'' ہمارے ہاں تمہیں کوئی ایسی ویسی چیز نہیں ملے گی۔ اور ہاں تم لوگ ذرا اپنی شناخت تو کراؤ''۔

ایک اجنبی نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور نکانور کو پیش کر دیا۔ دوسرا غسلخانے میں سیدھا الماری کی جانب گیا اور بائیں دراز سے اخبار میں لپٹا پیکٹ برآمد کرنے کے بعد فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگ گیا۔

پیکٹ دیکھ کر نکانور کے اوسان خطا ہو گئے۔

سفید کوٹ والے نے آہستہ آہستہ اخبار کو کھولا تو اندر سے نوٹوں کی گڈی برآمد ہوئی۔ نکانور کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کیونکہ روبل کے نوٹوں کی جگہ کوئی عجیب وغریب سے نوٹ برآمد ہوئے تھے۔ ان نوٹوں کا رنگ سبز تھا، یا شائید نیلا تھا۔ نوٹوں پر ایک جانب چھپی کسی بوڑھے کی تصویر نکانور کا منہ چڑا رہی تھی۔ نکانور کی آنکھوں کے سامنے دائرے گھومنے لگ گئے۔

''ڈالر ہیں جناب''۔ سفید کوٹ والے نے اعلان کیا۔'' یہ پیکٹ آپ ہی کا ہے نا؟'' اس نے نکانور کو انتہائی احترام کے ساتھ مخاطب کیا۔

''نہیں۔ بالکل نہیں۔'' روہانسی آواز میں نکانور بولا۔''کسی دشمن کی حرکت لگتی ہے''۔
''ممکن ہے۔ممکن ہے۔ہوجاتا ہے ایسا بھی''۔سفید کوٹ والا نے کہا۔اوزآواز مزید دھیمی کرتے ہوئے بولا۔''اگر اور ہیں تو وہ بھی دے دیجئے''۔
نہیں ہیں۔خدا کی قسم نہیں ہیں۔میں نے تو آج تک غیر ملکی نوٹ کبھی چھوئے تک نہیں''۔نکانور آگ بگولہ ہوکر بولا اور دوڑتا ہوا کمرے سے اپنا بیگ اٹھالایا۔''ابھی دکھاتا ہوں۔یہاں اس بیگ میں غیر ملکی فن کار کے ساتھ کرائے نامہ کا معاہدہ موجود ہے۔اس کا پاسپورٹ بھی میرے پاس ہے اور پانچ ہزار روبل بھی ہیں جن کے عوض میں نے اسے سرکاری عمارت میں رہائش دی ہے''۔یہ دیکھو، یہ دیکھو''اس نے بیگ کھولا اور اس میں ہاتھ ڈال دیا۔یکا یک نکانور کا چہرہ سفید، پھر نیلا اور بعد میں سیاہ ہوگیا۔بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سوپ والی دیگچی میں جاگرا۔بیگ بالکل خالی تھا۔نہ معاہدے کی کاپی، نہ غیر ملکی کا پاسپورٹ، نہ نوٹوں کی گڈیاں، نہ تھیٹر کے پاس، کچھ بھی نہیں تھا۔
''دوستو۔پکڑو۔پکڑوانہیں۔ہمارے گھر میں کوئی آسیب گھس آیا ہے''۔
دیر سے خاموش نکانور کی بیوی خاوند سے مخاطب ہوئی،''گھبراؤ نہیں۔تمہاری اتنی خدمات ہیں۔مجھے یقین ہے کہ تمہاری سزا میں نرمی برتی جائے گی''۔
نکانور کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔وہ بیوی کی جانب مکا لہراتے ہوئے غرایا۔''الو کی پٹھی، خبیث عورت''۔شاید کچھ اور مغلظات بھی امڈ آنے کو تھے لیکن نکانور کی ہمت اب واضح طور پر جواب دیتی جارہی تھی۔وہ پسینے میں شرابور کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔
اس دوران تیمیس نامی ایک ہمسایہ نکانور کے دروازے سے کان لگائے اندر ہونے والی گفتگو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔اور ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ عمارت کے مکینوں کو سرگوشیوں میں کہانی سنا رہا تھا۔
۔۔سنا ہے کہ نکانور کا چہرہ فق تھا۔وہ شرابیوں کی طرح ڈگمگاتا ہوا چل رہا تھا اور زیرلب کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔
تقریباً ایک گھنٹہ بعد فلیٹ نمبر گیارہ میں ایک اجنبی داخل ہوا۔اس وقت تیمیس چسکے لے لے کر نکانور کی کہانی سنا رہا تھا۔اجنبی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے باہر بلایا اور ساتھ لے کر کہیں غائب ہوگیا۔

باب ۱۰

یالٹا کی خبریں

جس دوران نکانور کے ساتھ یہ ناخوشگوار واقعہ پیش آ رہا تھا، اس رہائشی عمارت سے کچھ ہی فاصلے پر تھیٹر کے فنانس ڈائریکٹر کے دفتر میں دو آدمی محوِ گفتگو تھے۔۔ فنانس ڈائریکٹر رمیش اور تھیٹر کا ایڈمنسٹریٹر وریام۔

یہ وسیع و عریض دفتر تھیٹر کی دوسری منزل پر واقع تھا۔ اس کی کشادہ کھڑکیاں تھیٹر سے ملحق خوبصورت باغیچے میں کھلتی تھیں، جہاں ایک چھوٹا سا ریستوران بھی موجود تھا۔ باغیچے کے عین بیچوں بیچ سنگ مر مر کے چھوٹے چھوٹے مجسموں سے آراستہ مدھم سُروں میں گنگناتا فوارہ جنت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ دفتر میں معمول کے فرنیچر کے علاوہ تھیٹر میں پہلے سے منعقدہ مختلف ثقافتی پروگراموں کے اشتہارات کے انبار لگے تھے۔ ایک کونے میں خوبصورت شیشے سے آراستہ میز پر پانی کا جگ اور اس کے گرد چار خوش نما آرام دہ کرسیاں پڑی تھیں۔ فنانس ڈائریکٹر کی میز کے بائیں جانب کرنسی نوٹ محفوظ کرنے کے لئے ایک فائر پروف قدآور آہنی سیف رکھی تھی۔

اپنی میز کے پیچھے بیٹھا فنانس ڈائریکٹر رمیش آج صبح سے ایک عجیب کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کے برعکس وریام انتہائی خوش گوار موڈ میں تھا۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی اندرونی توانائی جسم کے مختلف حصوں سے باہر پھوٹ رہی تھی۔

ایڈمنسٹریٹر وریام فنانس ڈائریکٹر کے دفتر میں ان مفت خوروں سے چھپ کر بیٹھا تھا جو پروگرام شروع ہونے سے پہلے پاس مانگنے کے لئے تانتا باندھ لیتے تھے۔ جونہی ٹیلیفون بجتا وریام اسے اٹھا کر بڑی صفائی کے ساتھ جھوٹ بولنا شروع کر دیتا تھا۔ ''جی کون؟ وریام نہیں ہے۔ وہ تو تھیٹر سے باہر نکل گیا ہے''۔

سنو، خدا کے لئے ستپال کو فون کرو۔ تقریباً کراہتے ہوئے رمیش بولا۔

''ارے بابا وہ گھر پر نہیں ہے۔ میں بیسیوں مرتبہ فون کر چکا ہوں۔ چوکیدار کو بھی وہاں بھیج چکا

ہوں۔ فلیٹ خالی پڑا ہے۔ وہاں کوئی بھی نہیں ہے''۔ وریام نے جواب دیا۔

''میری تو عقل ماؤف ہوگئی ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟''۔ رمیض انگلیوں سے میز کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

اتنے میں دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک گٹھے ہوئے جسم کا ملازم اشتہاروں کا پلندہ اٹھائے اندر داخل ہوا۔ سبز رنگ کے کاغذ پر سرخ روشنائی سے یہ عبارت درج تھی۔

''آج سے تھیٹر ورائٹی میں غیر ملکی پروفیسر ولاند روزانہ اپنا شو'' کالا علم اور اس کی خباثتیں'' پیش کریں گے۔

وریام اشتہار کی عبارت اور ڈیزائن سے بہت محظوظ ہوا۔ اس نے ملازم کو یہ اشتہار فوری طور پر سارے شہر میں لگانے کو کہا۔

''زبردست اشتہار بنا ہے'' وہ رمیض سے مخاطب ہوا۔

''پتہ نہیں کیوں۔ مجھے تو یہ سارا گورکھ دھندہ ایک آنکھ نہیں بھا رہا۔ میں تو حیران ہوں کہ اس غیر ملکی بلوان کو اس قسم کے فن کا مظاہرہ کرنے کی اجازت کیسے ملی ہے''۔ رمیض نے جواب دیا۔

گفتگو کے دوران واضح ہوا کہ رمیض کی طرح وریام نے بھی اس کالے علم کے ماہر کو نہیں دیکھا تھا۔ گذشتہ روز ستپال معاہدہ لئے رمیض کے پاس آیا تھا اور غیر ملکی فن کار کو معاوضے کی پہلی قسط جاری کرنے کا حکم دینے کے بعد تھیٹر سے غائب ہوگیا تھا۔ اور یہ کالے علم والا پروفیسر تو شائید ستپال کے جانے سے پہلے ہی تھیٹر سے کھسک گیا تھا۔ یوں ستپال کے سوا تھیٹر کے کسی کارکن سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

رمیض نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تو دن کے دو بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ گہری سوچ میں غرق اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ ستپال نے تقریباً گیارہ بجے اسے فون کیا تھا اور آدھ گھنٹے میں تھیٹر پہنچنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ نہ تو تھیٹر پہنچا تھا اور نہ ہی فلیٹ میں اس کا نام ونشان تھا۔

اپنے سامنے رکھے کاغذوں کے پلندے کو ٹٹولتے ہوئے رمیض بولا۔ ''دیکھو نا ڈائریکٹر کی وجہ سے میرے تمام معاملات لٹک گئے ہیں۔ اس کے دستخط کے بغیر ان کاغذات کی حیثیت ردی کے ٹکڑوں کے برابر ہے''۔

وریام ایک بار پھر ستپال کے گھر کا نمبر ملا کر فون کی گھنٹی سنتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ کہیں مائکل کی طرح ستپال بھی تو ٹرام کے نیچے نہیں آ گیا؟

''کیا ہی اچھا ہوتا اگر واقعی ایسا ہو جاتا''۔ رمیض دانت پیستے ہوئے بولا۔

اس دوران یونیفارم میں ملبوس ایک خاتون فنانس ڈائریکٹر کے دفتر میں وارد ہوئی۔ اپنے سیاہ رنگ کے بیگ سے اس نے ایک ڈائری نکالی اور بولی۔ ''ورائٹی تھیٹر کا ایڈمنسٹریٹر کون ہے؟ یہاں دستخط کر دیں اور یہ تار وصول کرلیں''۔

وریام نے ڈائری میں دستخط کرنے کے بعد لفافہ وصول کرلیا۔

جیسے ہی خاتون دفتر سے باہر نکلی وریام لفافہ کھول کر تار پڑھنے گیا۔ جوں جوں وہ تار پڑھتا جا رہا تھا توں توں اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ تار پڑھنے کے بعد اس نے فی الفور رمیض کے ہاتھ میں دے دیا اور خود رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگ گیا۔

تار میں درج تھا۔''یالٹا سے ماسکو کے تھیٹر ورائٹی کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ آج صبح ساڑھے گیارہ بجے ایک مخبوط الحواس شخص ننگے پاؤں فقط پتلون اور بنیان میں ملبوس بندرگاہ یالٹا کے پولیس سٹیشن پہنچ کر دعویٰ کر رہا تھا کہ وہ ماسکو کے مشہور تھیٹر ورائٹی کا ڈائریکٹر ستیپال ہے۔ براہ کرم تھیٹر کے ڈائریکٹر سے ماسکو میں رابطہ کیا جائے اور ہمیں ان کی موجودگی اور خیریت سے آگاہ کیا جائے''۔

یہ لو۔ ایک اور۔ نئی مصیبت۔ رمیض بولا۔

وریام فون پر یالٹا کے پولیس سٹیشن سے رابطہ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد اب ماسکو میں جہاں جہاں ممکن ہوسکتا تھا تھیٹر کے ڈائریکٹر ستیپال کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد دفتر کا دروازہ دوبارہ کھلا۔ وہی ٹیلیگرام والی خاتون دوبارہ وارد ہوئی اور وریام کے ہاتھ میں ایک نیا لفافہ تھما کر چلتی بنی۔

''اب کیا ہے؟''۔ کانپتی آواز میں رمیض نے پوچھا۔ وریام نے ٹیلیگرام خاموشی سے رمیض کی جانب بڑھا دی۔

تار کا متن تھا۔۔''میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میرا یقین کیا جائے۔ مجھے اس غیر ملکی پروفیسر نے ہپناٹزم کے زور سے یالٹا پہنچا دیا ہے خدارا یالٹا کی پولیس کو میری اصلیت بتائی جائے''۔

''سنو تمہاری تو ستیپال سے گیارہ بجے کے قریب فون پر بات ہوئی تھی نا؟''۔ وریام نے پوچھا۔

''بالکل ایسا ہی ہے''۔ رمیض بولا۔''یہ عجیب تماشہ ہے۔ وہ اس وقت یالٹا میں کیسے ہوسکتا ہے؟ ناممکن۔ ناممکن''۔

''شراب پی رکھی ہے کیا؟'' وریام نے پوچھا

''کس نے؟'' رمیض برہم ہوتا ہوا بولا

''ارے بھائی۔ اسی پاگل نے جس نے یالٹا سے یہ ٹیلیگرام بھیجا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی

بہروپیا ہے۔ لیکن ایک بات ہے کہ اس کم بخت کو یالٹا میں بیٹھے اس کالے علم والے پروفیسر وولاند کے بارے میں کیسے علم ہوا ؟ اور پھر ستپال اور وولاند کے درمیان تعلق کا اسے کیسے پتہ چلا؟ ہپناٹزم۔ ہپناٹزم۔ وریام ٹیلیگرام میں درج یہ لفظ بار بار دہرا رہا تھا اور آنکھیں الو کی طرح چاروں طرف گھما رہا تھا۔

''ناممکن۔ ناممکن۔ سب بکواس ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ کم بخت وولاند ٹھہرا کہاں ہے؟''۔ رمیض نے پوچھا۔

وریام نے فوراً غیر ملکیوں کے معاملات کی وزارت میں فون کیا اور انتہائی حیرت کے عالم میں رمیض کو بتایا کہ کالے علم کا پروفیسر وولاند تو ستپال ہی کے فلیٹ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس نے فوراً ہی ستپال کے فلیٹ کا نمبر ملایا اور دیر تک فون کی گھنٹی سنتا رہا۔ نجانے اسے کیوں یوں محسوس ہوا کہ جیسے فون میں کوئی گا رہا ہے۔۔۔ پتھر کے صنم۔۔۔

کوئی نہیں اٹھا رہا فون۔ لگتا ہے کہ فلیٹ میں کوئی نہیں ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ٹیلیگرام والی خاتون ہاتھ میں ایک نیا لفافہ لئے آن دھمکی۔

''ارے واہ۔ یہ معاملہ تو اب زیادہ ہی دل چسپ اور پے چیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ وریام دانت پیستے ہوئے بولا۔ لفافے سے برآمد ہونے والے تار کی عبارت کچھ یوں تھی۔۔

''اپنی شناخت کے ثبوت کے طور پر اپنے دستخط اور تحریر کے نمونے بھیج رہا ہوں۔ خدارا انہیں پہچانو اور یالٹا کی پولیس کو تصدیق کردو۔ اور اس شیطانی علم والے پروفیسر وولاند پر بلا تامل خفیہ پولیس کا پہرہ لگوادو۔

وریام بار بار اپنی پیشانی کو ٹھونکتے ہوئے ایک ہی بات دہرا رہا تھا ''یہ نہیں ہوسکتا''۔ یہ نہیں ہوسکتا۔

الجھنوں میں غرق رمیض اپنی کرسی سے اٹھا اور اس نے دروازے کے باہر بیٹھے قاصد کو ہدایت کی کہ ڈاکیئے کے سوا کسی کو بھی میرے دفتر کے قریب نہ پھٹکنے دیا جائے۔ یہ کہنے کے بعد اس نے دروازے کو اندر سے مقفل کر دیا اور اپنی دراز سے کاغذوں کا پلندہ نکال کر ستپال کے دستخط اور تحریر کا ٹیلی گرام والے نمونے کے ساتھ موازنہ کرنے لگ گیا۔ کچھ دیر بعد گہرے گہرے سانس لیتا ہوا فنانس ڈائریکٹر کسی ہارے ہوئے جواری کے انداز میں بولا۔ ''اوہ خدایا! یہ تو اسی کی لکھائی ہے اور دستخط بھی یقیناً اسی کے ہیں''۔

یہ سنتے ہی حیرت زدہ وریام بھی بول اٹھا۔ ''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو''۔

رمیض کی حالت قابل دید تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات یکے بعد دیگرے تبدیل ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اچانک ہی دبلا اور کئی سال بوڑھا ہوگیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے مخصوص چمک

غائب ہوگئی اور اس کی جگہ اداسی اور خوف نے لے لی۔

دریام کا ردعمل قدرے مختلف تھا۔ وہ عالم بے قراری میں عظیم مفکروں کے مانند دو تین مرتبہ دفتر کے چکر لگا چکا تھا۔ وہ ہاتھ ہوا میں ہلا ہلا کر کچھ پکڑنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ پانی کا جگ وہ تقریباً ختم کر چکا تھا اور ایک ہی بات دہراتا جا رہا تھا۔ ''میری سمجھ سے یہ باہر ہے۔ میری سمجھ سے یہ باہر ہے''۔

رمیض کی کیفیت یکسر مختلف تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر خلا میں گھورے جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں مختلف متضاد الفاظ کی گردان جاری تھی۔ اس کے لئے سب سے مشکل کام مروجہ علوم کے ذریعے ان غیر معمولی واقعات کی وضاحت کرنا تھا۔ وہ خلا میں گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ورائٹی تھیٹر کا ڈائریکٹر ستپال آج دن کے ساڑھے گیارہ بجے پتلون اور بنیان پہنے ننگے پاؤں ایک برق رفتار ہوائی جہاز میں سوار ہوا ہوگا اور پھر ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ہی دور افتادہ بندرگاہ یالٹا کے ایئرپورٹ پر بھی کھڑا ہوگا۔ سر کو دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ ''یہ کیا فضول سی بات ہے''۔

ممکن ہے جس شخص کے ساتھ آج فون پر اس کی بات ہوئی تھی وہ ستپال نہیں کوئی اور تھا۔ لیکن نہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ ستپال کی آواز بخوبی پہچانتا ہے۔ بالکل نہیں۔ وہ سو فیصد ستپال ہی تھا۔ گذشتہ شام جب وہ پروفیسر ولانڈ کے ساتھ کئے گئے معاہدے کی کاپی فنانس ڈائریکٹر کو دینے آیا تھا اسی وقت رمیض کو دال میں کچھ کالا لگا تھا۔ اور ہاں اگر ستپال کل شام ہی یالٹا کے لئے روانہ ہوگیا ہوتا تو بمشکل آج دن کے وقت وہاں پہنچ پاتا۔

سنو۔ یالٹا یہاں سے کتنے کلومیٹر دور ہے؟ رمیض نے پوچھا۔

سوچا ہے۔ سوچا ہے۔ اس کے متعلق بھی سوچا ہے۔ دریام بولا۔ ''یہاں سے تقریباً ڈیڑھ ہزار کلو میٹر بنتا ہے''۔

ڈیڑھ ہزار؟ ڈیڑھ ہزار کلومیٹر۔ رمیض سوچ رہا تھا۔ یہ بات تو اٹل ہے کہ ریل گاڑی یا عام ہوائی جہاز پر یہ سفر اتنی قلیل مدت میں ممکن نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ستپال کسی فوجی جہاز پر گیا ہوگا۔ لیکن فوجی جہاز پر سفر کی اجازت اسے بھلا کس نے دی ہوگی؟ ویسے بھی۔ فوجی جہاز بھی اگر یہاں سے اڑے تو۔۔۔ خدایا یہ میں کیا لغویات سوچ رہا ہوں؟ ٹیلیگرام میں لکھا ہے کہ یہ شخص دن کے ساڑھے گیارہ بجے یالٹا کے پولیس سٹیشن میں وارد ہوا تھا اور جب اس کی یہاں۔ ماسکو میں میرے ساتھ فون پر بات ہوئی تھی اس وقت گھڑی پر بھلا کیا بجا تھا؟ اچانک رمیض کی آنکھوں کے سامنے گھڑی کی سوئیاں ساکت ہوگئیں اور اسے واضح طور پر یاد آ گیا کہ اس وقت دن کے گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ٹھیک دس منٹ بعد وہ یہاں سے ڈیڑھ ہزار کلومیٹر دور یالٹا کے ساحل پر کھڑا تھا۔ ناممکن۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ واحد

دانش مندی کی بات تو یہی لگتی ہے کہ ستپال سرے سے یالٹا گیا ہی نہیں تھا۔ یا پھر شائید وہ۔۔ کیا کہتے ہیں اسے۔۔ ہپناٹزم۔ لیکن دنیا میں ایسی کوئی مثال تو سنی نہیں کہ ہپناٹزم کسی انسان کو پانچ دس منٹ میں ڈیڑھ ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر پہنچا دے۔ ستپال کو کہیں وہم کی بیماری تو نہیں ہوگئی؟ بیٹھا کہیں اور ہو اور سمجھ رہا ہو کہ یالٹا میں ہے۔ لیکن یہ یالٹا کے پولیس سٹیشن والے۔ کیا وہ بھی وہم کی بیماری میں مبتلا ہیں؟ یہ لوگ تو بار بار وہاں سے ٹیلیگرام بھیج رہے ہیں۔ رمیض کا چہرہ اس وقت شدید اندرونی کرب کی عکاسی کر رہا تھا۔

دفتر کے دروازے کو لوگ بار بار باہر سے کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قاصد کی خبردار، خبردار، کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ''کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ انتہائی اہم میٹنگ ہو رہی ہے''۔

رمیض نے اس دوران اپنے آپ پر کافی حد تک قابو پالیا تھا۔ اس نے فون اٹھایا اور آپریٹر سے کہا۔ مجھے فوراً یالٹا کے پولیس سٹیشن میں بات کرنی ہے۔ بدقسمتی سے یہ رابطہ ممکن نہ ہوسکا کیونکہ ٹیلیفون کی لائن اچانک خراب ہوگئی تھی۔ لائن کی خرابی نے اسے پھر ایک بار بے چین کر دیا اور شائید کچھ خوفزدہ بھی۔ اس نے دوبارہ فون اٹھایا اور تار گھر کا نمبر ملانے کے بعد بولا۔ براہ کرم ایک ایمرجنسی ٹیلیگرام یالٹا کے پولیس سٹیشن والوں کو بھیج دیجئے۔ رمیض جو کچھ بول رہا تھا وہ ساتھ ہی ساتھ ایک کاغذ پر بھی لکھتا جا رہا تھا۔ ہاں تو لکھیئے۔ ''ورائٹی تھیٹر ماسکو۔ آج دن کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تھیٹر کا ڈائریکٹر ستپال میرے ساتھ ٹیلیفون پر اپنے ماسکو میں واقع فلیٹ سے بات کر رہا تھا۔ نقطہ ڈالیں۔ لکھائی اور دستخط کی تصدیق کرتا ہوں۔ نقطہ ڈالیں۔ آپ کے ٹیلیگرام میں جس فن کار کا ذکر ہے اس پر خفیہ پولیس کی نگرانی لگوانے کا بھی بندوبست کر رہا ہوں۔ نقطہ ڈالیں۔ فنانس ڈائریکٹر ورائٹی تھیٹر ماسکو۔ رمیض''۔

یہ ہوئی نا عقلمندی کی بات۔ وریام بہت مثبت انداز میں رمیض کے ٹیلیگرام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن اس کی سوچ ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی کہ نجانے کہاں سے اس کے ذہن میں لفظ ''جاہل'' گونج اٹھا۔ ستپال کسی بھی صورت یالٹا میں نہیں ہوسکتا۔

رمیض نے اس دوران سارے ٹیلیگرام اکٹھے ایک ہی لفافے میں ڈال دیے۔ لفافے پر چند الفاظ تحریر کرنے کے بعد اسے گوند لگا کر سربمہر کر دیا۔

یہ لفافہ وریام کے سپرد کرتے ہوئے رمیض نے کہا' 'یہ لو اور اسے فوراً خفیہ پولیس کے دفتر پہنچا کر آؤ۔ اب باقی ماندہ الجھنوں سے انہیں نمٹنے دو۔ اور ہاں سنو یہ کام خود ہی کرنا۔ کسی دوسرے کے سپرد نہ کر دینا۔

وریام نے یہ سوچتے ہوئے کہ رمیض تو آج عقلمندی کی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔ لفافہ اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

دفتر سے نکلنے سے قبل اس نے احتیاطاً ایک مرتبہ پھر فون اٹھایا اور ستپال کے فلیٹ کا نمبر ملایا۔ فون سے کسی کی آواز سنتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے بائیں آنکھ دبا کر رمیض کو اس خوشی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

وریام کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر نجانے کیوں اس کی گردن پہلے سے کچھ لمبی دکھنے لگی تھی۔

''غیر ملکی فن کار پروفیسر ولاند سے بات ہو سکتی ہے؟'' ۔وریام ایک ایک لفظ کا مزہ لیتے ہوئے بولا۔

''وہ اس وقت مصروف ہیں'' ۔ایک مترنم آواز نے جواب دیا'' ۔آپ کون صاحب ہیں؟''

''ورائٹی تھیٹر کا ایڈمنسٹریٹر وریام'' ۔''

ارے واہ۔ وریام صاحب'' ٹیلیفون پر مسرت انداز میں چیخا۔''آپ کی آواز سن کر مجھے جوراحت ہوئی ہے آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔آپ کی صحت کیسی ہے؟''

شکریہ، بہت شکریہ جناب۔ لطف اندوز ہوتے ہوئے وریام نے جواب دیا۔کون صاحب مجھے گفتگو کا شرف بخش رہے ہیں؟

جی میں ان کا اسسٹنٹ بھی ہوں اور ترجمان بھی۔ ٹیلی فون سے جواب ملا۔ میں ہمہ تن آپ کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔آپ حکم کر کے تو دیکھیں۔

'' تکلیف دہی کی معذرت چاہتا ہوں۔کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہمارے ستپال صاحب اس وقت گھر پر ہیں یا نہیں؟''

''نہیں ہیں، بالکل نہیں ہیں'' ۔ ٹیلی فون چیخا۔''وہ کہیں گئے ہوئے ہیں'' ۔

'' کہاں؟''

گاڑی میں سیر کرنے۔شہر سے کہیں باہر گئے ہیں۔

کیا؟ سیر کرنے؟ گاڑی میں؟ واپس کب تک آئیں گے؟

کہہ رہے تھے کہ تازہ ہوا میں کچھ سانسیں لیں گے اور لوٹ آئیں گے۔

اچھا تو یہ بات ہے! وریام بولا۔''بہت شکریہ جناب۔ اور ہاں پروفیسر ولاند صاحب کو پیغام دے دیجئے گا کہ آج ان کے شو کا پہلا دن ہے'' ۔

''جی جناب۔ ابھی۔ فوراً۔ ایک منٹ سے پہلے۔ پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ رہا ہوں'' ۔ ٹیلیفون بولا۔

''جی ۔جی بہت بہت مہربانی'' ۔حیرت زدہ وریام بولا۔

''جناب میری طرف سے''۔ ٹیلیفون بول رہا تھا۔''آپ کے لئے بہت بہت نیک تمنائیں۔ خدا کرے کہ آپ کی زندگی ہمیشہ کامرانیوں، کامیابیوں اور خوشیوں سے مالا مال رہے۔ خدا حافظ''۔

''دیکھا میں کہہ رہا تھا نا''۔ فرط جذبات سے چیختا ہوا ایڈمنسٹریٹر بولا۔

''کوئی یالٹا والٹا نہیں گیا۔ وہ کم بخت یہیں کہیں شہر کے آس پاس ہے۔

اور اگر ایسا ہے''۔ غصے سے لال پیلا ہوتا ہوا ایڈمنسٹریٹر بولا۔''تو یہ یقیناً سؤر پن کی انتہا ہے۔ جس کا لغت میں شاید کوئی نام بھی نہیں ہے''۔ اچانک ایڈمنسٹریٹر اپنی جگہ سے یوں اچھلا اور چلایا کہ رمیض کو خوف سے جھرجھری آ گئی۔

''یاد آیا، یاد آیا۔ ماسکو کے جنوبی علاقے میں ایک نیا کلب یالٹا کے نام سے کھلا ہے۔ یہ کم بخت یقیناً وہاں پہنچ گیا ہے اور وہیں سے ٹیلیگرام بھیج رہا ہے''۔

''بھئی یہ تو انتہا ہوگئی''۔ رمیض کے چہرے کی ایک ایک رگ پھڑکنے لگی تھی۔ غصے کے عالم میں اس کی آنکھیں کسی بھٹی کے مانند دہک اٹھی تھیں۔

''اب دیکھنا یہ سیر اسے کتنی مہنگی پڑے گی''۔ اتنا کہنے کے بعد وہ اچانک ٹھٹکا اٹھا اور بولا۔ ''لیکن یہ جو یالٹا کے پولیس سٹیشن والا معاملہ ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟''۔

یہ اسی کے دماغ کا خلل ہے۔ وہ خود ہی یہ سب کر رہا ہے۔ ایڈمنسٹریٹر بولا۔

اب اس پیکٹ کا کیا کروں؟ لے جاؤں کیا؟

ہاں۔ ہاں۔ اب تو یہ کام اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔

اچانک دروازہ کھلا اور پھر وہی ٹیلیگرام والی خاتون اپنے مخصوص یونیفارم میں ملبوس دفتر میں داخل ہوئی۔

یا خدا! اب یہ کون سی نئی آفت کی اطلاع لائی ہے! رمیض عجب اداسی کے عالم میں سوچ رہا تھا۔

دونوں ٹیلیگرام والی خاتون کی جانب لپکے۔

اس مرتبہ ٹیلیگرام میں یہ عبارت درج تھی۔

''لکھائی اور دستخط کی تصدیق کرنے کا شکریہ۔ مجھے فوراً ہی پانچ سو روبل یالٹا کے پولیس سٹیشن بھیج دو۔ کل صبح کی فلائٹ سے ماسکو آ رہا ہوں''۔

اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ دھیمی آواز میں وریام بولا۔

رمیض نے چند لمحے سوچا پھر تجوری کھول کر پانچ سو کے نئے نوٹ نکالے اور قاصد کو بلا کر یہ رقم فوری طور پر یالٹا بھیجنے کا حکم دیا۔

''یہ تم ادارے کے ساتھ بہت ناانصافی کر رہے ہو''۔ آنکھوں اور چہرے پر غیر یقینی کیفیت طاری کرتے ہوئے وریام بولا۔ ''میرے خیال میں تو تم بھیجنے کا کوئی جواز نہیں ہے''۔

''تم پریشان نہ ہو۔ ایک مرتبہ اسے واپس آ لینے دو''۔ مدہم آواز میں رمیض بولا۔ ''پھر دیکھنا اس کی یہ پکنک ہم یہاں کیسے مناتے ہیں''۔ اور وریام کے بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''یار تم دیر نہ کرو۔ یہ پیکٹ فوراً منزل پر پہنچاؤ''۔

یہ سنتے ہی وریام بیگ بغل میں دبائے تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ بھاگم بھاگ پہلی منزل تک پہنچا اور تھیٹر کی ٹکٹ والی کھڑکی کے پاس جم غفیر کو دیکھ کر فوراً ٹکٹ جاری کرنے والی خاتون کے پاس گیا اور اس کے کان میں بولا۔ ''سب سے اچھی جگہ والی تیس ٹکٹیں مت بیچنا''۔ یہ کہنے کے بعد وہ ٹکٹ گھر سے باہر نکلا اور پاس مانگنے والے مفت خوروں کی نظروں سے بچتا بچاتا اپنے دفتر سے ٹوپی لینے چلا گیا۔ اسی دوران اس کے دفتر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

جی؟؟ وریام ٹیلی فون میں چیخا۔

وریام صاحب؟؟ ایک منحوس سی آواز نے پوچھا

''وہ تھیٹر میں نہیں ہے''۔ وریام دوبارہ چیخا۔

بکواس مت کرو۔ میں جانتا ہوں تم وریام ہی بول رہے ہو۔ اور یہ جو تم ٹیلیگرام کا پیکٹ اٹھائے پھر رہے ہو اسے کسی کو دینے یا دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

''آپ کون بول رہے ہو؟ وریام وحشت سے چلایا۔ ''بند کرو یہ بے ہودہ مذاق۔ تمہارا اتا پتا ابھی ڈھونڈ نکالا جائے گا۔ کیا نمبر ہے تمہارا؟''۔

''وریام! وریام'' وہی خباثت بھری آواز پھر سنائی دی۔ ''تمہیں میری زبان سمجھ نہیں آ رہی؟ یہ ٹیلیگرام تم کہیں لے کر نہیں جاؤ گے''۔

''یہ تمہاری خام خیالی ہے''۔ ایڈمنسٹریٹر کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔ اور ہاں غور سے سنو۔ یہ جو بدتمیزی تم میرے ساتھ کر رہے ہو اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ میں تمہیں۔۔۔۔'' وہ مزید کوئی دھمکی دینے والا ہی تھا کہ اسے اچانک احساس ہوا کہ ٹیلیفون کے دوسری جانب سننے والا اب کوئی نہیں ہے۔

وریام ٹیلی فون غصے سے میز پر پٹخنے کے بعد بغلی دروازے سے تھیٹر سے باہر نکل آیا۔ ایڈمنسٹریٹر اس وقت سخت مشتعل تھا۔ اس کا دل ابل ابل کر کسی کی گردن مروڑنے کو چاہ رہا تھا۔ اس دھمکی آمیز ٹیلیفون کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ کچھ بدمعاشوں کا ٹولہ ان سب معاملات کے پیچھے ہے۔ غالباً ستپال کے غائب ہونے میں بھی اسی ٹولے کا ہاتھ ہے۔ ان بدمعاشوں کو جوتوں تلے روندنے کی خواہش ایڈمنسٹریٹر کے سینے سے پھوٹ

پھوٹ کر باہر نکلنے کو تھی۔ اس کے اندر ایک عجب سی خوشی کا لطیف احساس سرایت کرتا جارہا تھا۔

باہر باغیچے میں تیز ہوا کے تھپیڑوں نے ایڈمنسٹریٹر کا استقبال کیا اور کچھ گرد اڑ کر اس کی آنکھوں میں پڑ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی غیر مرئی طاقت اس کا راستہ روک رہی ہے۔ دوسری منزل پر ایک کھڑکی کے پٹ اس زور سے ٹکرائے کہ غالباً ایک شیشہ بھی نہیں بچا ہوگا۔ ایک عجب منحوس تاریکی کا پردہ چھا رہا تھا۔ ہوا کی تیزی اور تندی سے برپا ہونے والے شور پر کسی میت کے پاس بیٹھی خواتین کے بین کرنے کا گمان ہو رہا تھا۔ ایڈمنسٹریٹر نے آنکھوں کو ملتے ہوئے کھولا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ آسمان پر ایک انجان اداسی کی کیفیت لئے بادلوں کا جھرمٹ اکٹھا ہو رہا ہے۔ کہیں دور موسلا دھار بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ وریام نے باغیچے میں بنی بیت الخلا کا رخ کیا۔ وہ غالباً آنکھوں میں چھینٹے مارنا چاہتا تھا۔

مردانہ بیت الخلا کے باہر بلب پر لگی آہنی جالی دیکھ کر ایڈمنسٹریٹر کو بے انتہا خوشی ہوئی کہ اس کے ملازمین چیزوں کی حفاظت احسن طریقے سے کر رہے ہیں لیکن اندر داخل ہوتے ہی جب اس کی نظر بیت الخلا کے چاروں اطراف میں پنسل اور کوئلے سے درج کلمات پر پڑی تو چند لمحے قبل ہونے والا راحت کا احساس کڑوی گولی بن کر اس کے حلق میں اٹک گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' ایڈمنسٹریٹر خود سے ہمکلام ہوا۔ اسی دوران اسے ایک مکروہ سی آواز سنائی دی۔

''یہ تم ہو وریام؟؟''

وریام کا پورا جسم لرز اٹھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اندھیرے میں اسے ایک میالا سا ہیولا نظر آیا جو کسی جسیم بلی سے مشابہہ تھا۔

''ہاں میں ہی ہوں'' خوف زدہ وریام نے کہا۔

''بہت خوشی ہوئی جناب آپ سے مل کر''۔ قدرے غیر انسانی آواز میں اس بلی نما موٹے نے جواب دیا۔ اور اچانک ایک پاؤں پر گھومتے ہوئے اس نے وریام کی بائیں کنپٹی پر ایک زوردار مکہ جڑ دیا۔

ایڈمنسٹریٹر کی ٹوپی اڑتی ہوئی کموڈ میں غرق ہو گئی۔

موٹے کا مکہ پڑنے کے بعد اجابت گاہ تیز روشنی میں نہا گئی تھی۔۔ آسمانی بجلی نے اچانک طبل جنگ بجا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ ایک روشنی کا جھماکا ہوا اور ایڈمنسٹریٹر کو ایک نیا ہیولا دکھائی دیا۔ ناٹے قد لیکن چوڑے شانوں والا جس کے بال ناریل کے ریشوں کی طرح تھے۔ اس کی ایک آنکھ مکمل طور پر سفید تھی اور منہ سے شکاری کتوں جیسے دانت جھانک رہے تھے۔ یہ شخص غالباً بائیں ہاتھ کا استعمال کرتا تھا کیونکہ اس نے ایڈمنسٹریٹر کے دوسری جانب مکہ رسید کیا تھا۔ جواباً آسمانی بجلی نے دوبارہ شور بپا کیا اور بیت الخلا کی چھت پر شدید بارش کا حملہ ہو گیا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کامریڈ''۔لیکن فوراً ہی وریام کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔۔ایک اہم سرکاری عہدیدار پر اجابت گاہ میں حملہ آور ہونے والے بدمعاشوں کے لیئے لفظ کامریڈ کسی صورت مناسب نہیں تھا۔وہ بھینچی ہوئی آواز میں بولا۔''معزز شہریو!'' یک دم اسے خیال آیا کہ ان لوگوں کے لئے یہ انداز تخاطب بھی کسی صورت مناسب نہیں ہے۔اسی دوران ان بلوانوں کی طرف سے ایک تیسرا گھونسہ اس کی کنپٹی پر آن پڑا۔اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔

''ہاں تو یہ تمہارے بیگ میں کیا ہے؟'' منہ سے جھاگ اڑاتا ہوا بلی نما بولا۔ٹیلیگرام؟تمہیں فون پر خبردار کیا گیا تھا تا کہ یہ ٹیلی گرام کہیں لے کر مت جانا۔

''ہاں کہا تھا،کہا تھا''۔وریام بمشکل سانس اندر کھینچتے ہوئے بولا۔

''لیکن تم پھر بھی نکل پڑے ہو۔لاؤ یہ بیگ مجھے دے دو۔ٹیلیفون پر سنی گئی منحوس آواز میں دوسرا شخص بولا اور اس نے وریام کے لرزتے ہاتھوں سے بیگ چھین لیا۔

ان دونوں خبیثوں نے ایڈمنسٹریٹر کو شانوں سے جکڑ لیا اور باغیچے سے باہر سڑک پر لے آئے۔ بارش کا طوفان پوری شدت کے ساتھ شہر پر برس رہا تھا۔شور مچاتا، بلبلے بناتا پانی سیورتج کے تمام پائپوں سے ابل ابل کر باہر اُمڈ رہا تھا۔ پانی کی لہریں جوش میں آئے سمندر کا منظر پیش کر رہی تھیں۔عمارتوں کی چھتیں آبشاریں بن گئی تھیں۔گلیوں میں جھاگ اڑاتی لہریں اچھل رہی تھیں۔سڑک پر کسی ذی روح کا نام ونشان نہیں تھا۔وریام کی مدد کو آنے والا کوئی نہیں تھا۔

دونوں بدمعاش گدلے پانی کا دریا عبور کرتے ہوئے اور آسمانی بجلی کی روشنی میں کبھی ظاہر اور کبھی غائب ہوتے ہوئے وریام کو عمارت نمبر ۳۰۲ میں لے آئے۔کچھ ہی لمحوں بعد نیم مردہ وریام تھیٹر کے ڈائریکٹر ستیپال کے فلیٹ میں فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔

دونوں بدمعاش وہاں سے غائب ہوگئے۔ان کی جگہ ایک نیم عریاں سنہری بالوں والی لڑکی نے لے لی ۔اس کی آنکھیں فاسفورس کے پیالوں جیسی تھیں۔وریام کو احساس ہوگیا کہ اس کے ساتھ زندگی کا سب سے خوف ناک واقعہ پیش آنے والا ہے۔اس نے چہرہ دیوار کی جانب کرلیا۔لڑکی ایڈمنسٹریٹر کے قریب آ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔وریام کے جسم کے تمام بال سرکنڈوں کی مانند کھڑے ہوگئے۔اس کے بھیگے جسم پر رکھے گئے زنانہ ہاتھ برف کے بنے محسوس ہو رہے تھے۔

ادھر دیکھو نا۔ میں ذرا تمہارے لبوں کو چوم لوں۔ نشے میں مخمور لڑکی بولی اور وریام کی آنکھوں میں چندھیا دینے والی روشنی کے دو قمقمے جل اٹھے۔وریام ہر قسم کے احساس سے عاری ہوگیا اور اسے بوسے کا بھی احساس نہیں ہوا۔

باب ۱۱

ایوان کی شخصیت کا دوہرا پن

دریا کے اس پار درختوں کا خوبصورت جھنڈ جو ایک گھنٹہ قبل مئی کے سورج کی روشنی میں کسی نئی نویلی دلہن کی طرح چمک دمک رہا تھا اب بتدریج دھندلا ہوتا ہوا بالکل غائب ہو گیا تھا۔
بارش اتنی شدید تھی کہ کھڑکی کے باہر دھوئیں کا گمان ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کسی نے آسمان پر دھاگوں کا بے ترتیب ڈھیر بکھیر دیا ہے۔ آسمانی بجلی کبھی کبھی مریض کے کمرے کو چکا چوند کر دیتی تھی۔
ایوان ہولے ہولے رو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں دریا کے پانی پر مرکوز تھیں جس کی سطح پر بننے والے بلبلے ابلتے ہوئے پانی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ جونہی آسمان پر بادل گرجتے ایوان اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیتا اور کمرے میں ایک درد بھری آہ پھیل جاتی۔ ایوان کے تحریر کردہ کاغذ کمرے میں ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ اس خوفناک غیر ملکی مشیر کے بارے میں درخواست لکھنے کی اس کی تمام تر کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔ وہ بیچارہ کاغذ پنسل ملتے ہی اس کام میں جٹ گیا تھا۔ اس نے درخواست کی ابتدا تو خوب کی تھی۔۔۔''منجانب ایوان بے گھر۔ رکن پریس کلب۔
گذارش ہے کہ گذشتہ شام میں مرحوم مائیکل بیرلی کے ہمراہ شہر کے مشہور چوک میں سیر کر رہا تھا''۔
یہ لکھتے ہی ایوان کچھ الجھن کا شکار ہو گیا۔ اسے لفظ مرحوم اچھا نہیں لگ رہا تھا اور یہ جملہ بھی کچھ عجیب لگ رہا تھا کہ وہ مرحوم کے ساتھ سیر کر رہا تھا؟۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ کسی مرحوم کے ساتھ سیر تو نہیں کی جا سکتی نا۔ یہ پڑھنے کے بعد تو حتماً اسے پاگل قرار دے دیا جائے گا۔ ایوان نے یہ سطر کاٹنے کے بعد نئی شروع کر دی۔'' میں مائیکل بیرلی کے ساتھ جو کہ بعد ازاں مرحوم ہو گیا۔۔۔۔ یہ فقرہ بھی ایوان کو کچھ ٹھیک نہیں لگا۔ تیسری مرتبہ ابھی اس نے اتنا ہی لکھا تھا کہ گذشتہ شام ٹرام کے پہیوں تلے آ کر بیرلی۔۔۔تو نجانے کہاں سے مائیکل بیرلی کا ہم نام موسیقار اچانک ایوان کے پہلے سے ہی منتشر شدہ ذہن میں آن ٹپکا۔ اس غریب کی اذیت اور بھی شدید ہو گئی۔

کچھ دیر تک اپنی تمام منتشر شدہ تخلیقی صلاحیتوں کو بظاہر یک جا کرنے کے بعد ایوان نے دوبارہ پنسل اٹھا لی۔ اب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ درخواست کچھ ایسے زور دار واقعات سے شروع کی جائے کہ پڑھنے والا فوراً ہی متوجہ ہو جائے۔ اس نے لکھنا شروع کیا کہ کیسے ایک بھاری بھرکم سیاہ رنگ کا بلا ٹرام میں سوار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ٹرام کے پہیوں تلے مائیکل کا سر کٹنے کا خوفناک منظر تحریر کر ڈالا۔ کٹا ہوا سر اور اس غیر ملکی پروفیسر یا مشیر کی پیش گوئیاں ایوان کو پونتی پلات کے حضور لے پہنچیں۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ کیسے یہ رومن جلاد خون میں رنگی آستین والا سفید گاؤن پہنے محل کی بالکونی پر نمودار ہوا تھا۔ یہ تمام تفصیلات ایوان انتہائی انہماک کے ساتھ تحریر کرتا جا رہا تھا۔ نامناسب الفاظ کاٹ کر ان کی جگہ زیادہ موزوں الفاظ لکھے جا رہا تھا۔ اس کاوش میں وہ کچھ ایسا مگن ہوا کہ اس نے پونتی پلات اور پچھلے پنجوں پر براجمان بلّے کا خاکہ بھی بنا ڈالا۔ لیکن یہ تمام محنت رائیگاں جا رہی تھی۔ کیونکہ ایوان جوں جوں واقعات کے تانے بانے کو آگے بڑھا رہا تھا توں توں یہ کہانی مزید الجھن اور بے ربطی کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔

جس لمحے بادلوں نے اپنی شدت رحمت سے زمین کو دھواں اگلنے پر مجبور کر دیا تھا عین اسی وقت ایوان کی ہمت جواب دینے لگ گئی تھی۔ اسے شدید تھکن کا احساس ہو رہا تھا اور اسے اس انتہائی غمناک خیال نے آن گھیرا تھا کہ یہ درخواست لکھنا اب اس کے بس میں نہیں ہے۔ فرط جذبات میں اس نے پنسل کہیں دور کمرے کے کونے میں دے ماری۔ اور تمام اوراق مسل مسل کر فضا میں اچھال دیئے۔ کانپتے ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر ایوان سسکیاں بھرتے ہوئے کڑوے کسیلے آنسوؤں سے رو پڑا۔

ہسپتال کی سب سے شفیق نرس فہمیدہ طوفان کے دوران ایوان کی خیریت معلوم کرنے اس کے کمرے میں آ پہنچی۔ مریض کو آنسوؤں اور آہوں میں سسکتا دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے دم بخود ہو گئی۔ پھر اس نے فرش پر بکھرے اوراق سمیٹے، کھڑکی کے پردے گرائے تاکہ آسمانی بجلی اور طوفان کی گھن گرج مریض کے کمزور اعصاب پر مزید بوجھ نہ ڈالے۔ اور جلدی سے ڈاکٹر کو بلانے دوڑ پڑی۔

ڈاکٹر نے آتے ہی ایوان کو ایک ٹیکہ لگوایا اور اسے دلاسہ دیتے ہوئے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اب اسے مزید رونا نہیں پڑے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈراؤنے خیالات اور خواب آئندہ ایوان کا پیچھا نہیں کریں گے۔

ڈاکٹر کی بات ٹھیک نکلی۔ کچھ ہی دیر بعد دریا کے پار درختوں کا جھنڈ دوبارہ واضح ہو گیا۔ بارش میں نہائے درختوں کی قطرے ٹپکاتی شاخوں پر کسی حسینہ کی بھیگی زلفوں کا گمان ہو رہا تھا۔ دریا کا پانی بھی اب پرسکون ہو گیا تھا۔ ٹیکے کے فوراً بعد اداسی اور بے قراری نے بالآخر ایوان کا پیچھا چھوڑ دیا تھا اور وہ چہرے پر دودھ سے پیٹ بھرے شیر خوار کا سکون لئے آسمان پر نمودار ہونے والی قوس قزح پر ٹکٹکی جمائے لیٹا تھا۔

یہ منظر شام تک موجود رہا اور ایوان کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب قوس قزح تحلیل ہوگئی۔ بڑھتی ہوئی تاریکی نے ماحول کو پھر ایک مرتبہ غمگین کر دیا تھا۔

گرم گرم دودھ کا گلاس پینے کے بعد ایوان دوبارہ لیٹ گیا۔ اس کے اندر ایک نیا جوش، ایک نیا ولولہ جنم لے رہا تھا۔ اس کی سوچ یکسر تبدیل ہو رہی تھی۔ اس منحوس پلّے کا ہیولا اپنے خدوخال کھونے لگا تھا اور کٹا ہوا سر بھی اب ایوان کو خوف زدہ نہیں کر رہا تھا۔ ان تمام خیالات کو جھٹکتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ یہ نفسیاتی امراض کا ہسپتال کچھ ایسی بری جگہ بھی نہیں ہے۔ ہسپتال کا انچارج ڈاکٹر ستارین واقعی انتہائی عقلمند اور صحیح معنوں میں کامیاب پیشہ ور ماہر نفسیات ہے۔ شام کی نمی سے بھرپور شفاف ہوا اسے مسحور کئے جا رہی تھی۔

ہسپتال کی فضا پر خاموشی غالب آنے لگی تھی۔ راہداریوں میں سفید روشنی کی جگہ اب مدھم نیلگوں روشنی نے لے لی تھی۔ پلاسٹک سے آراستہ فرش پر نرسوں کے پاؤں پھسلنے کی آوازیں کم سے کم ہوتی جا رہی تھیں۔

ایوان اب بالکل پرسکون تھا۔ وہ انہماک کے ساتھ کبھی چھت میں لگے نیلی روشنی والے بلب کو دیکھ رہا تھا اور کبھی دریا کے پار درختوں کے جھنڈ کے عقب سے جھانکتے ہوئے چاند کو گھور رہا تھا۔ اور خود سے ہم کلام بھی ہو رہا تھا۔

''سوچنے کی بات یہ ہے کہ میں مائیکل بیرلی کے اس طرح ٹرام تلے کچلے جانے سے اسقدر متاثر اور پریشان کیوں ہوں''۔ شاعر سوچ رہا تھا۔ ''آخر وہ میرا کون تھا؟ نہ بھائی، نہ باپ نہ سسر۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ میں تو اسے اچھی طرح جانتا بھی نہیں تھا۔ مجھے تو بس یہی معلوم تھا کہ وہ گنجا ہے اور انتہا کا شعلہ بیان ہے''۔ ہاں تو مزید برآں۔۔۔۔ اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے ایوان بولا۔ ''یہ میں اس سیاہ بے جان آنکھوں والے کالے علم کے ماہر غیر ملکی مشیر میں کیوں الجھ کر رہ گیا ہوں؟ زیر جامہ پہنے اور موم بتی ہاتھوں میں لئے میں کیوں اس کا پیچھا کر رہا تھا اور پھر پریس کلب کے ریستوران میں ہنگامہ۔ کیا ضرورت تھی مجھے یہ سب کرنے کی؟''۔

''ارے، رے، رے''۔ اچانک ایوان کے اندر سے پرانے والے ایوان کی کرختگی سے بھری آواز ابھری اور نئے ایوان سے مخاطب ہوئی۔

''مائیکل کی گردن کٹنے کا تو اسے پہلے سے علم تھا نا؟ تو پھر الجھن بھلا کیسے نہیں ہوگی؟''۔

'' آپ کیوں الجھنوں میں پھنسے ہو جناب؟'' پرانے ایوان نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''سیدھی سی بات ہے کہ یہ معاملہ یقیناً شیطانی قوتوں سے وابستہ ہے۔ یہ پروفیسر سو فیصد غیر انسانی اور مافوق الفطرت شخصیت کا حامل ہے اور اس تمام کہانی میں سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ حضرت ذاتی طور پر پونتی پلاطس سے بھی مل چکے ہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ اور تم بجائے ہنگامہ

کرنے کے اگر عقل مندی کا مظاہرہ کرتے تو اس جہاندیدہ شخصیت سے پونتی پلاٹ اور قیدی عیشوا کے درمیان ہونے والی گفتگو کی تفصیل سن سکتے تھے''۔

تم خدا جانے کن معاملات میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ بات برحق ہے کہ ہفت روزہ میگزین کے ایڈیٹر مائیکل کی موت ایک بہت بڑا المیہ تھی۔ لیکن آگے کیا؟ اب کیا ہوسکتا ہے؟ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن مرنا تو ہے اور موت ہوتی بھی ناگہانی ہے۔ میگزین کو نیا ایڈیٹر مل جائے گا اور ممکن ہے وہ مائیکل سے بھی زیادہ شعلہ بیان ہو۔

ایک مختصر وقفے کے بعد نئے ایوان نے پرانے ایوان سے پوچھا۔''نہ تو پھر اس تمام کہانی میں میری کارگذاری کے متعلق تم کیا کہو گے؟''

''گدھے ہو تم''۔ ایک بھاری بھرکم آواز نے اعلان کیا۔ یہ آواز یقیناً ایوان کی نہیں تھی۔ بلکہ بہت حد تک اس غیر ملکی مشیر کی آواز سے مشابہہ تھی۔

ایوان کو گدھے کے خطاب پر بالکل خفگی نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ تو شائید محظوظ ہو رہا تھا۔ غنودگی کے عالم میں اس کے چہرے پر ایک بچگانہ سی مسکراہٹ تھی اور اسے پام کے پودوں کے درمیان دندناتے چلے سے نہ تو خوف اور نہ ہی نفرت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ نیند کی وادی میں کھونے کو ہی تھا کہ کھڑکی کی جالی اچانک خود بخود سرک گئی اور خود کو چاندنی سے بچاتے ہوئے ایک ہیولا نمودار ہوا۔ جس نے اپنا ہاتھ دھمکی آمیز انداز میں ایوان کی جانب اٹھا رکھا تھا۔

ایوان بلا خوف اٹھ کھڑا ہوا اور کیا دیکھتا ہے کہ نیم روشن بالکونی میں ایک آدمی کھڑا ہے۔ اس آدمی نے انگلی اپنے لبوں پر رکھتے ہوئے ایوان کو اشارہ کیا۔''ہش، ش، ش''۔

باب ۱۲

کالا علم اور اس کی خباثتیں

ورائٹی تھیٹر کے سٹیج پر ایک ناٹے قد کا آدمی نمودار ہوا۔ وہ سرخ ستاروں سے جڑے پیلے رنگ کے فراک میں ملبوس تھا جبکہ اس نے سر پر لمبی پھندنے والی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کی ناک ناشپاتی سے مشابہہ لیکن سرخی مائل تھی۔ اس کے جوتے چمکدار سفید اور سیاہ دھاریوں سے مزین تھے۔

یہ آدمی ایک عام سی دو پہیوں والی سائیکل پر سوار تھا۔ تالیوں کی گونج میں اس نے سٹیج کا ایک چکر لگایا اور پھر اچانک ایک جھٹکے سے سائیکل کا اگلا پہیہ ہوا میں بلند کر دیا۔ اس نے خود بھی گھوم کر سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر لیں۔ اس دوران اس نے بڑی ہوشیاری سے سائیکل کا اگلا پہیہ الگ کر دیا جو گھومتا ہوا سٹیج کے عین وسط میں آن گرا۔ اب یہ فن کار صرف ایک پہیے پر سوار تھا جبکہ پیڈل وہ اپنے ہاتھوں سے چلا رہا تھا۔

ایک سنہری بالوں والی خاتون فن کارہ انتہائی بلند ایک پہیے والی سائیکل پر سوار سٹیج پر نمودار ہوئی۔ وہ سیاہ رنگ کی قمیض اور سکرٹ میں ملبوس تھی، جن پر چاندی رنگ کے ستارے چمک رہے تھے۔ اس نے بھی سٹیج کا ایک چکر لگایا۔ سر کے بل سائیکل چلانے والے فن کار نے اس خاتون کا چیخ چیخ کر استقبال کیا اور پاؤں سے اپنی ٹوپی بار بار اتار کر اچھالنے کا مظاہرہ کرتا رہا۔ آخر میں ایک غالباً آٹھ سالہ بچہ نما شخص جس کا چہرہ بوڑھوں کے مانند جھریوں سے اٹا پڑا تھا ایک چھوٹی دو پہیوں والی سائیکل پر نمودار ہوا۔ سائیکل کے آگے اس نے ٹرک کا ہارن نصب کر رکھا تھا جسے وہ بار بار بجا کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔

یہ تینوں فن کار اچھل کود کرتے ہوئے سٹیج کے چند چکر لگانے کے بعد آرکسٹرا کے ڈرم کی خوف زدہ کرنے والی دھمک کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے اور پھر انتہائی تیزی کے ساتھ اچانک سٹیج کے اس کنارے تک آ پہنچے جہاں آرکسٹرا کے سازندے بیٹھے تھے۔ ایک لمحے کے لئے یوں لگا کہ یہ تینوں سازندوں کے اوپر آن گریں گے۔ یہ دیکھ کر پہلی قطار میں بیٹھے تماشائیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لیکن سائیکل سوار انتہائی مہارت کے ساتھ سٹیج کنارے پہنچ کر رک گئے۔ تینوں نے یک زبان ہو کر ''او'' ''پا'' کا نعرہ بلند کیا اور جھک

کر تماشائیوں کی پر جوش تالیوں کا جواب دیا۔ سنہری بالوں والی حسینہ ہاتھوں سے تماشائیوں کی جانب ہوائی بوسے لٹا رہی تھی۔ ناٹے قد والا بار بار سائیکل کا ہارن بجائے جا رہا تھا۔ تالیوں کی گونج سے لگتا تھا کہ تھیٹر کی چھت بھک سے اڑ جائے گی۔ آہستہ آہستہ آسمانی رنگ کا پردہ سٹیج کے اطراف سے برآمد ہوا اور اس نے فن کاروں کو تماشائیوں سے اوجھل کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد خارجی دروازوں کے اوپر سرخ بتیاں روشن ہو گئیں۔ تھیٹر کے اندر بھی روشنی کی چادر پھیل گئی۔ یہ تھیٹر کے دوسرے شو کا اختتام تھا۔

وہ واحد شخص جسے سائیکل سواروں کے کرتب میں کوئی دل چسپی نہیں تھی فنانس ڈائریکٹر رمیض تھا۔ وہ اپنے دفتر میں تنہا بیٹھا ہونٹ چبا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے مختلف حصے بار بار پھڑپھڑا رہے تھے۔ ابھی ستیاپال کے ماسکو سے غیر معمولی انداز میں غائب ہو جانے کی گتھیاں نہیں سلجھی تھیں کہ اب اچانک ایڈمنسٹریٹر وریام بھی غائب ہو گیا تھا۔ رمیض کو یہ تو معلوم تھا کہ وریام کہاں گیا ہے لیکن اطلاع یہ تھی کہ جہاں اسے پہنچنا تھا وہاں وہ پہنچا نہیں۔ اور نہ ہی وہ لوٹ کر واپس آیا تھا۔ رمیض بار بار شانے اچکاتا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ ''کیوں۔ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟''۔

اچنبھے کی بات ہے کہ فنانس ڈائریکٹر جیسا ذی ہوش اتنی دیر تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس جگہ جہاں وریام پہنچ نہیں پایا تھا، فون کرے اور ان تمام معاملات کا بوجھ اپنے سر سے ہلکا کرے۔ آخر کار رات کے دس بجے رمیض نے ہمت کر ہی لی اور ٹیلیفون اٹھا لیا لیکن ٹیلی فون مردہ پڑا تھا۔ اس کے قاصد نے بتایا کہ تھیٹر کے تمام ٹیلی فون خراب پڑے ہیں۔ یہ اطلاع حیران کن ضرور تھی لیکن کوئی ایسی ناممکن بات بھی نہیں تھی۔ فنانس ڈائریکٹر انتہائی اضطراب کے عالم میں تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے کسی قدر خوشی بھی ہو رہی تھی کہ اب فون کرنے یا نہ کرنے کے عذاب سے رہائی مل گئی ہے۔

فنانس ڈائریکٹر کی کرسی کے عقب میں لگی سرخ بتی بار بار جل بجھ کر شو کے ختم ہونے کا عندیہ دے رہی تھی۔ اس دوران قاصد دفتر میں داخل ہوا اور رمیض کو اطلاع دی کہ غیر ملکی فن کار کالے علم کا ماہر پروفیسر اور اس کے ساتھی آن پہنچے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی نجانے کیوں فنانس ڈائریکٹر سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ اس کا چہرہ ایک مٹیالے بادل کے آوارہ ٹکڑے کی طرح انتہائی اداس دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بادل ناخواستہ اپنی کرسی سے اٹھا اور غیر ملکی بلوان کا استقبال کرنے کے لئے دفتر سے باہر نکل گیا۔

راہداری کے آخری سرے پر وہ کمرہ تھا جہاں رمیض کو غیر ملکی فن کار کا استقبال کرنا تھا۔ تجسس کے مارے تھیٹر کے ملازمین اور دوسرے فن کار بار بار حیلے بہانے سے کمرے میں جھانک رہے تھے۔ ان میں شوخ رنگ فراک والا شعبدہ باز، میک اپ کرنے والا عملہ اور پاؤڈر سے چونے جیسا سفید چہرہ بنائے تھیٹر کا مشہور میزبان بھی شامل تھا۔ غیر ملکی مہمان ایک غیر معمولی طور پر لمبا سیاہ رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ حیران کن ہیئت اس کے ساتھیوں کی تھی۔ ان میں سے ایک نے دھاری دار لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ دوسرا ایک سیاہ رنگ کا جسیم بلا تھا جو کمرے میں داخل ہوتے ہی پچھلے پنجوں پر چلتا ہوا کسی معزز شخصیت کی طرح صوفے پر براجمان ہو گیا تھا اور آنکھیں سکیڑ کر دروازے سے جھانکنے والوں کا منہ چڑا رہا تھا۔

رمیض نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی لاکھ کوشش کی لیکن نتیجتاً اس کے چہرے سے یہ تاثر جھلکتا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے حلق میں تیزاب انڈیل دیا ہے۔ تاہم اس نے فن کار کے اعزاز میں سر تھوڑا سا خم کر دیا۔ ہاتھ ملانے کے لئے اس کا حوصلہ نہیں بن رہا تھا۔ دھاری دار کوٹ والا پروفیسر کا ساتھی جھکتے ہوئے بولا "ہم ہیں ان کے معاون، یعنی اسسٹنٹ"۔ یہ اسسٹنٹ والی بات رمیض کے حلق میں اٹک کر رہ گئی کیونکہ غیر ملکی فن کار کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس میں "اسسٹنٹ" کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

فنانس ڈائریکٹر نے بادل ناخواستہ اس چرب زبان اسسٹنٹ سے پوچھا۔ "آپ لوگوں کا ساز و سامان کہاں ہے؟"۔

"میرے پیارے بیش قیمت ہیروں سے بھی قیمتی عظیم فنانس ڈائریکٹر صاحب"، کالے علم کے ماہر کا اسسٹنٹ بولا۔ "ہمارا ساز و سامان ہمیشہ ہمارے پاس ہی ہوتا ہے۔ یہ دیکھیں، ایک، دو، تین۔۔۔" رمیض کے سامنے اپنی خم دار انگلیاں نچاتے ہوئے اس نے اچانک بلّے کے کان سے سنہری زنجیر لگی ایک گھڑی برآمد کر لی۔ اور رمیض کو یہ گھڑی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "لیجئے جناب! یہ گھڑی آپ ہی کی ہے"۔ رمیض کا ہاتھ فوراً اپنے بند کوٹ کی اندرونی جیب میں چلا گیا۔ اس کی پیشانی پر حیرت اور خوف سے پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اس کی گھڑی واقعی جیب سے غائب تھی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ کبھی گھڑی کو اور کبھی بلّے کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوران ایک زوردار قہقہہ لگانے کے بعد اسسٹنٹ نے اپنی غلیظ ہتھیلی پر گھڑی رکھتے ہوئے رمیض سے کہا۔ "یہ لیجئے جناب! اپنی امانت وصول کیجئے۔ یہ شعبدہ دیکھنے والوں کی آہیں اور کراہیں نکل گئیں۔ چوتا لگے چہرے والا اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔۔ ایسے شخص کے ساتھ ٹرام میں سواری احتیاط کے ساتھ کرنی پڑے گی"۔

لیکن بلّے نے اچانک ایسی حرکت کی کہ لوگ گھڑی والے شعبدے کو بھول گئے۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور پچھلے پنجوں پر چلتا ہوا آئینے کے نیچے رکھی میز تک جا پہنچا۔ جہاں سے اس نے پانی سے بھری صراحی دار بوتل اٹھائی۔ بڑی نفاست کے ساتھ اپنے اگلے پنجے سے اس کا ڈھکن کھولا اور پانی گلاس میں انڈیل کر غٹاغٹ پی گیا اور میز پر پڑے رومال سے اس نے بڑے شاہانہ انداز میں اپنی مونچھیں صاف کیں۔ اس مرتبہ نہ تو کوئی آہ سنائی دی اور نہ ہی کوئی کراہ۔ ہاں البتہ سب کے منہ کھلے رہ گئے تھے۔

اس دوران تیسری مرتبہ شو شروع ہونے کی گھنٹیاں بج اٹھیں اور کالے علم کے مظاہرے سے متاثر فن کاروں نے تھیٹر ہال کی جانب دوڑ لگا دی۔ چند منٹوں بعد ہال کی بتیاں گل ہو گئیں۔ سٹیج پر لٹکے پردے کے پیچھے مدہم سی روشنی میں پھولوں سے آراستہ سرخ و سفید رنگ کے فراک میں ملبوس پورے شہر کا شناسا میزبان بینگالی نمودار ہوا۔

اس نے بولنا شروع کیا۔۔میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارا آج کا شو دیکھنے کے لئے آدھا شہر امڈ آیا ہے۔ ابھی چند دن پہلے میری ایک عزیز سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا تم ہمارے تھیٹر میں کیوں نہیں آتے؟ ہمارے شو پر تو ہر روز آدھا شہر پہنچا ہوتا ہے تو اس نے مسکرا کر جواب دیا ''میرا تعلق شہر کے اس حصے سے ہے جو تمہارے تھیٹر میں نہیں آتا''۔ یہ کہنے کے بعد بینگالی نے اس انتظار میں کچھ توقف کیا کہ لوگ اس کے مزاح سے محظوظ ہو کر ہنسیں گے۔ لیکن ہنسی تو درکنار کسی کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہ تھی۔ چنانچہ بینگالی نے دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔۔

تو جناب ایسا ہے کہ آج ہمارے ہاں عالمی شہرت یافتہ کالے علم کے ماہر غیر ملکی فن کار جناب ولآند اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ ایک تضحیک آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بینگالی نے کہا ''ہم سب اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ کالے علم کا درحقیقت کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ محض انسانی ذہن کی اختراع ہے۔ جناب ولآند انتہائی اعلیٰ پائے کے شعبدہ گر ہیں اور آپ کو ایسے ایسے جادو دکھائیں گے کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کا ان شعبدوں میں بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ بہرحال ان باتوں سے متاثر ہوئے بغیر، آیئے، پروفیسر ولآند کے شہرہ آفاق فن کا مظاہرہ دیکھتے ہیں۔ یہ اعلان کرنے کے بعد بینگالی نے زور سے تالی بجائی اور استقبالی انداز میں اپنے دونوں ہاتھ پردے کی جانب اٹھا دیئے۔ پردہ ہولے ہولے سرکنے لگ گیا۔

کالے علم کا ماہر ولآند اپنا لمبا فراک پہنے اور آدھے چہرے پر نقاب اوڑھے اپنے دونوں معاونین کے ساتھ جب سٹیج پر نمودار ہوا تو ان کی پر اثر ہیئت کو دیکھ کر تماشائیوں نے زوردار تالیوں سے اپنی پسندیدگی اور مہمان نوازی کا اظہار کیا۔

مجھے کرسی پیش کی جائے۔ ولآند دھیرے سے بولا۔ فوراً ہی نجانے کہاں سے سٹیج پر ایک آرام دہ کرسی نمودار ہو گئی اور وہ اس پر براجمان ہو گیا۔ ''ہاں تو محترم فاگوٹ''، ولآند دھاری دار کوٹ والے سے مخاطب ہوا'' لگتا ہے کہ ماسکو کے شہری کچھ بدل گئے ہیں۔ بلکہ شائید از خود شہر بھی تبدیل ہو گیا ہے''۔

''بالکل درست فرما رہے ہیں آپ میرے آقا'' فاگوٹ نے برجستہ جواب دیا۔ ''صحیح بات ہے''۔ ولآند بولا۔ ''لیکن لگتا ہے کہ یہ لوگ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بدل گئے ہیں۔ ان کے لباس ہی لے

لو۔ پہلے کبھی اس طرح کے فیشن نہ دیکھے نہ سنے۔ ان ذرائع آمدورفت کو دیکھو۔۔ ٹرام۔ کاریں اور، اور ۔۔۔'' ''بسیں'' فاگوٹ نے جلدی سے لقمہ دیا۔

تماشائی بغور یہ گفتگو سن رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شعبدہ گر اپنا تماشہ شروع کرنے سے قبل اپنی گفتگو سے تمہید باندھ رہا ہے اور غالباً لوگوں کی توجہ کو بھی منتشر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سٹیج کا عقبی حصہ تھیٹر کے کارکنوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا اور انہی کے درمیان کسی مردے کے مانند سفید چہرہ لئے رمیض بھی کھڑا تھا۔

بینگالی، جو کہ اب سٹیج کے ایک کونے میں کھڑا تھا یہ تمام گفتگو سن کر کچھ بیزار سا لگ رہا تھا اور بھنویں سکیڑے ان کالے علم کے ماہرین پر ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا۔ فن کاروں کی گفتگو میں جونہی کچھ وقفہ ہوا تو وہ موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بول پڑا۔ ''غیر ملکی فن کار ہمارے پیارے شہر کی ترقی دیکھ کر انتہائی متاثر لگ رہے ہیں''۔ یہ کہہ کر بینگالی دو مرتبہ مسکرایا اور اس نے فاتحانہ انداز میں والاند پر نظریں مرکوز کر دیں۔

والاند۔ فاگوٹ اور بلا بیک وقت مڑ کر بینگالی کو دیکھنے لگ گئے۔

''میں نے کب کہا ہے کہ میں متاثر ہوا ہوں''۔ والاند فاگوٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''بالکل نہیں۔ میرے آقا۔ بالکل نہیں۔ آپ نے ایسی کوئی بات نہیں کی''۔ فاگوٹ بولا۔

تو پھر یہ شخص کیا بکواس کر رہا ہے؟

''جھوٹا ہے، جھوٹا ہے یہ شخص''۔ فاگوٹ بولا۔ ''اسے لفاظی کرنے کا شوق ہے اور جھوٹ بولنے کا بھی۔ کیوں بے جھوٹوں کے سردار''۔ وہ بینگالی سے مخاطب ہوا۔

تماشائیوں نے بینگالی کی درگت ہوتے دیکھ کر طویل قہقہے بلند کئے۔

بینگالی کی آنکھیں باہر کو ابل پڑی تھیں۔

''مجھے اس شہر کی عمارتوں، گاڑیوں، بسوں وغیرہ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اندر سے۔ یہاں سے''۔ اپنے سینے کے بائیں جانب وہ زور سے مکا مارتے ہوئے بولا۔ ''یہ لوگ تبدیل ہوئے ہیں یا نہیں؟''

''جی ہاں۔ جی ہاں۔ میرے آقا یہ تو ایک بنیادی سا سوال ہے''۔

سٹیج کے عقب میں کھڑے رمیض کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا۔ باقی لوگ بھی کچھ الجھے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ البتہ بینگالی کا چہرہ غصے اور شرمندگی سے تمتما رہا تھا۔

غالباً تماشائیوں کی اضطرابی کیفیت کو بھانپتے ہوئے پروفیسر فاگوٹ سے مخاطب ہوا۔۔

''لگتا ہے کہ ہم باتوں میں کچھ زیادہ ہی الجھ گئے ہیں۔ تماشائی بے چارے بوریت کا شکار ہو

رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تم انہیں کوئی دلچسپ کرتب دکھاؤ''۔

فاگوٹ اور بلّا ایک دوسرے کے آمنے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ فاگوٹ نے فضا میں ہاتھ بلند کئے اور نعرہ لگایا ''تین، چار''۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فضا سے تاش کی ایک گڈی اچک لی۔ بعد ازاں اس نے گڈی کے پتوں کو بلّے کی جانب کچھ اس طرح اچھالا کہ فضا میں تاش کے پتوں کا ایک سانپ سا بن گیا۔ بلّے نے جس مہارت سے ان پتوں کو اچک لیا، تماشائی اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ فاگوٹ اپنی جگہ پر منہ کھولے اس طرح بیٹھ گیا جیسے کسی چڑیا کے بچے نے ماں سے خوراک حاصل کرنے کے لئے چونچ کھول لی ہو۔ بلّے نے فضا میں دوبارہ تاش کے پتوں کا سانپ بناتے ہوئے گڈی فاگوٹ کی جانب اچھال دی۔ اور تماشائیوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب فاگوٹ نے پوری کی پوری گڈی نگل لی۔ اس کے بعد بلّا اپنے پچھلے پنجوں پر کھڑا ہوگیا اور اپنا اگلا دائیاں پنجہ سینے سے لگاتے ہوئے اس نے سرخم کردیا۔ تالیوں کی گونج سے پورا ہال لرز اٹھا۔ ''بہت خوب، بہت خوب، واہ واہ'' کے نعرے بلند ہورہے تھے۔ فاگوٹ نے گیلری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ تاش کی یہی گڈی ساتویں قطار میں بیٹھے میرے قابل احترام دوست پارسؔ کے کوٹ کی اندرونی بائیں جیب میں پڑی ہے''۔ گیلری میں ہلچل مچ گئی اور وہ صاحب جن کا نام پارسؔ پکارا گیا تھا اپنی نشست پر کھڑے ہوگئے اور کوٹ کی نشان دہی کردہ جیب سے تاش کی گڈی نکالنے کے بعد اسے پرمسرت انداز میں لہراتے ہوئے پوچھا۔ ''اب میں اس کا کیا کروں؟''۔

''جناب یہ اب آپ کے پاس ہماری جانب سے اس شو کی یادگار کے طور پر رہے گی''۔ فاگوٹ زور سے بولا۔ ''دیکھو نا آپ تو کل رات کے کھانے پر فرما رہے تھے کہ اگر تاش نہ ہوتی تو یہ زندگی کیسے گذرتی؟''۔

گیلری سے ایک آواز آئی۔ ''پرانا کرتب ہے۔ یہ پارس بھی انہی کا ساتھی ہے''۔

اچھا تو آپ کا یہ خیال ہے؟ فاگوٹ اس شخص کی جانب دیکھ کر چلایا۔ ''یہ بات ہے تو پھر آپ بھی ہمارے ساتھی ہیں کیونکہ ایک گڈی آپ کی جیب میں بھی موجود ہے''۔

گیلری میں دوبارہ ہلچل شروع ہوگئی۔

اس شخص نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چیختا ہوا بولا ''ارے ہاں۔ ہے''۔ اور جب یہ گڈی جیب سے برآمد ہوئی تو وہ پاگلوں کی طرح اچھلنے لگ گیا کیونکہ گڈی میں تاش کے پتوں کی جگہ دس دس کے نئے نوٹ تھے۔ اس شخص نے بہت غور سے نوٹوں کو پرکھا، دو تین مرتبہ سونگھا اور بلند آواز میں نعرے لگانے لگ گیا۔ ''اصلی ہیں۔ اصلی ہیں''۔

ہال کے وسط میں بیٹھے ایک موٹے نے آواز لگائی۔ ''بھائی شعبدہ باز ایک پیکٹ میری جیب میں

بھی ڈال دو"۔

فاگوٹ نے فوراً جواب دیا۔" کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ صرف آپ ہی کی جیب میں کیوں؟ میں تمام تماشائیوں کی جیب میں ایک ایک پیکٹ کیوں نہ بھیج دوں؟"

اس دوران ایک آواز آئی "اور جس کی جیب ہی نہ ہو؟"۔

"یہ بھی ٹھیک ہے" فاگوٹ نے جواب دیا۔"لیں جناب آپ سب لوگ چھت کی طرف دیکھیں"۔

چھت سے نیلگوں روشنی میں اچانک نوٹوں کی بارش شروع ہوگئی۔ تمام تماشائی اچھل اچھل کر نوٹ پکڑنے لگ گئے۔

کئی سو ہاتھ فضا میں اٹھے ہوئے تھے جو ان کاغذوں پر جھپٹ رہے تھے۔ کچھ لوگ سٹیج کی تیز روشنی میں نوٹوں کے اصلی ہونے کی چھان پھٹک کر رہے تھے جبکہ کچھ نئے نوٹوں کی مسحور کن مہک سے نشے کی سی کیفیت میں مبتلا ہو رہے تھے۔ تماشائیوں میں خوش کن حیرت، بے یقینی، اور زیادہ سے زیادہ نوٹوں پر جھپٹنے کی خواہش کے ملے جلے جذبات نے ایک کھلبلی کی صورت حال پیدا کردی تھی۔ چاروں طرف "میرے نوٹ، تیرے نوٹ، اس کے نوٹ" اور ہاہا کار مچ گئی تھی۔ کچھ لوگ کرسیوں کے نیچے گھسے زمین پر گرے نوٹ اکٹھے کر رہے تھے۔ جبکہ بیشتر کرسیوں پر کھڑے ان نازک، شرمیلے، ہرجائی کاغذوں کو اچکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہال میں موجود چند پولیس والوں کے چہروں پر حیرانگی کے تاثرات واضح دکھائی دے رہے تھے۔ تھیٹر کے کارکن بھی آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے ہال میں پہنچ رہے تھے۔ بالکونی سے ایک آواز آئی۔" یہ تم کدھر ہاتھ بڑھا رہے ہو؟ یہ تو میرا ہے۔ میری طرف اڑا آ رہا تھا۔"ایک دوسری آواز آئی۔" یہ تم نے کیا دھکم پیل مچا رکھی ہے؟ میں نے ایک ہاتھ جڑ دیا تو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا"۔ اور پھر اچانک بالکونی میں کھلبلی سی مچ گئی کیونکہ پولیس والے وہاں سے کسی کو پکڑے لیئے جا رہے تھے۔

قصہ مختصر۔ اس سے قبل کہ ہال میں برپا افراتفری اور کھلبلی نجانے اور کیا رنگ دکھاتی۔ فاگوٹ نے چھت کی جانب زور سے پھونک ماری اور نوٹوں کی بارش رک گئی۔

دو نوجوان جنہوں نے کافی سارے نوٹ لوٹ لئے تھے، مسکراتے ہوئے اور ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی نشستوں سے اٹھے اور خراماں خراماں کینٹین کی جانب چل پڑے۔

تھیٹر کا ہال اس وقت مچھلی منڈی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ افراتفری کا یہ عالم شائید اسی طرح جاری رہتا اگر بینگالی ہمت کر کے اٹھ کھڑا نہ ہوتا۔ اس نے اپنی خفگی اور بے تابی پر کافی حد تک قابو پا لیا تھا۔ اس

نے اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔

''مہربانو! قدر دانو۔۔۔۔آپ نے ابھی اجتماعی ہپناٹزم کا ایک اعلیٰ مظاہرہ ملاحظہ کیا ہے۔ آپ اور ہم سب ترقی کے اس دور میں بخوبی جانتے ہیں کہ معجزوں اور کالے علم کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اب ہم جناب ولانَد صاحب سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ اس کیفیت کے سحر سے لوگوں کو آزاد کر دیں اور پھر ہم دیکھیں گے کہ یہ نوٹ اسی طرح غائب ہو جائیں گے جس طرح یہ ظاہر ہوئے تھے''۔

اس نے اکیلے ہی تالی بجا کر خود کو داد دی اور فاتحانہ انداز میں فن کاروں کی طرف دیکھنے لگ گیا۔ اس کے چہرے سے مکمل اعتماد جھلک رہا تھا جبکہ آنکھوں سے ابھی بھی خوف اور بے یقینی عیاں ہو رہی تھی۔

تماشائیوں کو بینگالی کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ ہال میں چند لمحوں کے لئے مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر اچانک فاگوٹ بول اٹھا۔۔

''تم نے پھر اپنی بکواس شروع کر دی ہے؟ میرے معزز مہمانو یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ سب نوٹ بالکل اصلی ہیں''۔

''زندہ باد''۔ ہال میں شور بلند ہوا۔

''ویسے اب میں اس منحوس آدمی سے تنگ آ گیا ہوں''۔ فاگوٹ بینگالی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔''یہ ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑا دیتا ہے۔ جہاں اس کی ضرورت نہیں ہوتی وہیں گھسا چلا آتا ہے۔ اپنی جھوٹی نوک جھونک سے اب ہمارا شو خراب کر رہا ہے۔ مجھے پہلے اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ ہے کوئی تجویز؟ کیا کروں اس کے ساتھ؟؟''

''گردن اڑا دو اس کی''۔ گیلری سے ایک آواز آئی۔

''کیا کہا آپ نے؟'' فاگوٹ اب چہکنے لگ گیا تھا۔''گردن اڑا دی جائے؟ واہ کیا زبردست تجویز ہے۔ کیوں بھئی میرے پیارے بلے۔ بیگموت۔ ہو جائے پھر؟''

''ایک۔ دو۔ تین''۔

اور پھر سٹیج پر جو رونما ہوا وہ اس سے پہلے دنیا میں نہ تو کسی نے دیکھا اور نہ ہی سنا تھا۔ بلے کے سیاہ بال سرکنڈوں کے مانند کھڑے ہو گئے۔ اس کی دم واضح طور پر حالت جنگ کا اعلان کر رہی تھی۔ اس نے خوف ناک انداز میں ''میاؤں'' کا نعرہ بلند کرنے کے بعد اچانک بینگالی کے سینے پر جست لگا دی۔ پچھلے پنجوں سے اس نے سینے کو جکڑ لیا اور اگلے پنجوں سے اس کی گردن دبوچ کر دو مرتبہ دائیں بائیں کچھ اس طرح گھمایا کہ سر تن سے جدا ہونے کے بعد بلے کے پنجوں میں لٹک گیا اور بینگالی کا دھڑ زمین پر آن

گرا۔

ہال میں موجود اڑھائی ہزار تماشائیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بینگالی کے کٹے ہوئے دھڑ سے خون کسی فوارے کی طرح سٹیج کو رنگین کر رہا تھا۔ بلے نے کٹا ہوا سر فاگوٹ کے سپرد کر دیا جس نے سر کو بالوں سے لٹکا کر تماشائیوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اس دوران کٹا ہوا سر اچانک چیخ اٹھا۔۔

''ڈاکٹر۔ ڈاکٹر''

''تم آئندہ اس طرح کی بدتمیزی کرو گے؟'' فاگوٹ نے تحکمانہ لہجے میں اس روتے ہوئے سر سے پوچھا۔

''نہیں کروں گا۔ آئندہ کبھی نہیں کروں گا''۔ خرخراہٹ کی سی آواز میں سر بولا۔

''خدا کے لئے اسے مزید اذیت مت دو''۔ ہال سے اچانک ایک زنانہ آواز بلند ہوئی اور شعبدہ گر نے اپنی تمام توجہ اس خاتون پر مرکوز کر دی۔

''جی جناب؟؟ کیا کہتے ہیں آپ لوگ؟ کر دیا جائے اس کو معاف؟''۔ فاگوٹ نے تماشائیوں سے پوچھا۔

''معاف کر دو۔ معاف کر دو'' پہلے اکا دکا زنانہ آوازیں آئیں۔ بعد ازاں سارا ہال یک زبان ہو کر چلانے لگ گیا۔

''جی کیا حکم ہے میرے آقا؟'' فاگوٹ نے اپنے نقاب پوش ساتھی سے پوچھا۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں''۔ ولانڈ بولا۔ ''کہ یہ لوگ آخر انسان ہی ہیں۔ عام سے انسان۔ پیسوں سے انہیں پیار ہے۔ اور یہ تو ازل سے ایسے ہی چلا آ رہا ہے۔ انسانوں نے ہمیشہ ہی پیسے سے پیار کیا ہے۔ خواہ وہ چمڑے کے ہوں، تانبے کے ہوں یا سونے چاندی کے۔ لیکن ان کی سوچ ہمیشہ چھوٹی رہی ہے۔ اور ہاں رحم دلی ہمیشہ سے ان کا خاصہ رہی ہے۔ یہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے ان سے پہلے والی نسلیں ہوا کرتی تھیں''۔ اس نے زوردار آواز میں حکم دیا۔۔

''سر کو واپس پہنا دیا جائے''۔

بلّے نے اس مرتبہ کٹے ہوئے سر کو بہت احتیاط کے ساتھ سنبھالا اور دھڑ پر اس مہارت کے ساتھ جوڑ دیا کہ زخموں کا نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا پھر اس نے اپنے پنجوں سے بینگالی کے لباس اور سٹیج کی خون آلود جگہ کو اس طرح تھپتھپایا کہ اگلے ہی لمحے خون کے دھبے وہاں سے غائب ہو گئے۔

فاگوٹ نے بینگالی کو پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دی اور دس دس کے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اب یہاں سے کھسک جاؤ۔ تمہارے بغیر یہ محفل زیادہ پر لطف رہے گی''۔

ہر قسم کے تاثر سے عاری نگاہیں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے اور کسی نشئی کی طرح ڈگمگاتے قدموں سے بے چارہ بینگالی بمشکل سٹیج کے بیرونی دروازے تک پہنچا اور انتہائی کرب کے عالم میں کراہتے ہوئے بولنے لگ گیا۔۔

''میرا سر۔۔۔۔۔ہائے میرا سر''۔

رمیض اور کچھ دوسرے لوگ فوراً اس کی جانب لپکے۔

بینگالی زور زور سے رو رہا تھا اور ہاتھوں سے فضا میں کچھ پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''دے دو میرا سر۔ خدا کے لئے میرا سر واپس دے دو۔ میرا فلیٹ لے لو۔ میری تمام پینٹنگز لے لو۔ لیکن خدارا میرا سر واپس دے دو''۔

قاصد فوراً ڈاکٹر کو بلانے دوڑ پڑا۔

بینگالی کو صوفے پر لٹانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ لیٹنے کو کسی صورت تیار نہیں تھا۔ بلکہ وہ سخت مشتعل ہو گیا تھا اور ایک عجیب ہیجانی کیفیت میں ہر کسی کو مارنے اور کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے بہت تگ و دو کے بعد قابو کیا گیا اور بمشکل ایمبولینس میں لٹا کر ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔

رمیض بینگالی کو ہسپتال روانہ کرنے کے بعد سٹیج پر واپس آیا تو کالے علم کے ماہرین نت نئے شعبدے دکھا رہے تھے۔ البتہ ان کا سربراہ ولانْد اس دوران اپنی کرسی سمیت چپکے سے غائب ہو گیا تھا۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ تماشائیوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

فاگوٹ نے بینگالی کو رخصت کرنے کے بعد اعلان کیا۔ ''اب جبکہ ہم نے اس منحوس آدمی سے چھٹکارہ پا لیا ہے تو آیئے ہم اپنی مہمان خواتین کے لئے ایک شاپنگ سنٹر کھولتے ہیں۔

یہ اعلان کرنے کے بعد فاگوٹ نے ایک زوردار تالی بجائی۔ اسی لمحے سٹیج ایرانی غالیچوں سے سج گیا اور دیواروں پر قد آدم خوشنما آئینے آویزاں ہو گئے۔ ان آئینوں کے درمیان خریداری کے لئے سٹال نمودار ہو گئے۔ ایک سٹال فرانس کے بنے رنگ برنگے بیش قیمت زنانہ کرتوں اور سکرٹوں سے اٹا پڑا تھا۔ دوسرے سٹال پر مختلف ڈیزائنوں کی درجنوں زنانہ ٹوپیاں اور ہیٹ پڑے تھے۔ تیسرے سٹال پر رنگ برنگے زنانہ جوتوں کی بھرمار تھی۔ چوتھے سٹال پر دنیا جہاں کی عطریات۔ مسحور کر دینے والی خوشبوئیں اور میک اپ کا بیش قیمت سامان خواتین کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔

نجانے کہاں سے ایک سنہری بالوں والی خوبصورت خاتون چہرے پر مسکراہٹ لئے اچانک سٹیج پر نمودار ہو گئی۔ اور تماشائیوں کو اشاروں سے سٹیج پر آنے کی دعوت دینے لگ گئی۔

فاگوٹ نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اعلان کیا کہ سٹیج پر موجود تمام اشیاء بالکل مفت

ہیں۔ آپ لوگ شوق سے یہاں آئیں، اپنے پرانے جوتے، کپڑے اور بیگ ہمیں دے دیں اور بدلے میں یہاں سے اپنی پسند کی 'امپورٹڈ' چیزیں لے جائیں۔

بیگموت سٹیج کی سیڑھیوں کے قریب بیٹھا کچھ ایسی حرکات کر رہا تھا کہ جیسے دروازہ کھول اور بند کر رہا ہے اور ہر آنے جانے والے کا جھک کر استقبال کر رہا ہے۔

سنہری بالوں والی دوشیزہ نے کسی غیر ملکی زبان میں گانا شروع کر دیا تھا۔ گانے کے بول تو کسی کو سمجھ نہیں آ رہے تھے البتہ حسینہ کی آواز اور انداز سے سبھی متاثر لگ رہے تھے۔

''آیئے جناب آیئے'' فاگوٹ دعوت دے رہا تھا۔ ''شرمانے اور ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے''۔

تماشائی متحرک تو ہوئے لیکن ابھی تک کسی کو سٹیج پر جانے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ آخر کار قطار نمبر دس سے ایک سرخ بالوں والی دوشیزہ اٹھی اور تالیوں کی گونج میں خراماں خراماں سٹیج پر جا پہنچی۔

''بہت خوب۔ بہت خوب''۔ لڑکی کو سٹیج پر چڑھتے دیکھ کر فاگوٹ خوشی سے چلا اٹھا۔ ''بیگموت! مادام کو کرسی پیش کی جائے۔ آیئے مادام سب سے پہلے جوتوں سے شروع کرتے ہیں'' بلے نے انتہائی مودبانہ انداز میں خاتون کو کرسی پیش کی اور فاگوٹ نے اس کے سامنے رنگ برنگ کے جوتوں کا ڈھیر لگا دیا۔

سرخ بالوں والی نے اپنا دایاں جوتا اتارا اور جامنی رنگ کا خوبصورت موتیوں سے سجا۔ جگمگ جگمگ کرتا نیا جوتا پہن لیا۔ قالین پر تین چار قدم چلنے کے بعد اس نے فاگوٹ سے پوچھا۔ یہ نیا جوتا میرے پاؤں کو کاٹے گا تو نہیں؟

یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟۔ ناراضگی کے لہجے میں فاگوٹ بولا۔

بیگموت نے تو غصے میں زور سے میاؤں کا نعرہ بھی لگا دیا۔

ٹھیک ہے۔ یہ جوتے مجھے پسند ہیں۔ سرخ بالوں والی بایاں جوتا بھی پہنتے ہوئے بولی۔

خاتون کے پرانے جوتے پردے کے پیچھے پھینک دیئے گئے اور سنہری بالوں والی دوشیزہ چار پانچ خوبصورت سکرٹ اٹھائے سرخ بالوں والی لڑکی کو بھی پردے کے پیچھے لے گئی۔ بلا اس وقت انتہائی مصروف نظر آ رہا تھا۔ کبھی ادھر اور کبھی ادھر چھلانگیں لگا رہا تھا اور زیادہ معتبر لگنے کے لئے اس نے ماپ لینے والا فیتہ بھی گلے میں لٹکا رکھا تھا۔

چند لمحوں کے بعد پردے کے عقب سے سرخ بالوں والی حسینہ ایک دل کش سکرٹ میں ملبوس نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر تماشائیوں کے منہ ادھ کھلے رہ گئے۔ یہ پراعتماد دوشیزہ حیران کن حد تک خوبصورت

نظر آنے لگی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے رک کر خود کو فخریہ انداز میں دیکھنے لگ گئی۔ اپنی زلفوں کو اس نے ہولے سے تھپتھپایا اور قدرے خم ہو کر اپنی برہنہ کمر کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگ گئی۔

کمپنی کیطرف سے یہ بیش قیمت تحفہ بھی قبول کیجئے۔ فاگوٹ سرخ بالوں والی حسینہ کو پرفیوم کی شیشی تھماتے ہوئے بولا۔ شکریہ کے ساتھ تحفہ وصول کرنے کے بعد دوشیزہ کسی حسینہ عالم کی طرح مٹکتی ہوئی جب اپنی نشست کی جانب جارہی تھی تو تمام تماشائی اسے اچک اچک کر دیکھ رہے تھے۔ تماشائی خواتین کا ایک ہجوم اب سٹیج کی طرف لپکنے لگ گیا تھا۔ دھکم پیل کرتی ہوئی خواتین پردے کے پیچھے جارہی تھیں۔ اپنے پرانے لباس وہیں چھوڑ کر نئے مہنگے ترین کپڑے پہن کر جلوہ افروز ہورہی تھیں۔ پرانے جوتے اتار کر وہ نئے رنگ برنگ کے جوتے پہنے سٹیج کے ایرانی غالیچوں پر گویا محو پرواز تھیں۔ فاگوٹ بار بار گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کسی منجھے ہوئے دوکاندار کی طرح میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا اور بلاّ کسی مصروف تانگہ کی طرح پنجوں میں اٹھائے، کبھی بیگ، کبھی جوتے اور کبھی میک اپ کا سامان پیش کررہا تھا۔ سنہری بالوں والی دوشیزہ بار بار پردے کے پیچھے غائب ہوجاتی اور پھر سٹیج پر نمودار ہوجاتی تھی۔ وہ تماشائی خواتین کے ساتھ فرانسیسی زبان میں بات کررہی تھی۔ خواتین اس انداز سے سر ہلا رہی تھیں کہ جیسے سب سمجھ رہی ہیں۔

اچانک سب کی توجہ اس آدمی پر مبذول ہوگئی جو خواتین کے درمیان سٹیج تک آ پہنچا تھا۔ اس نے بلند آواز میں اعلان کیا کہ اس کی بیوی یہاں موجود نہیں ہے۔۔

میری خواہش ہے کہ مجھے بھی اس کے لئے کوئی تحفہ دیا جائے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں شادی شدہ ہوں۔ ثبوت کے طور پر نکاح نامہ پیش کرسکتا ہوں۔

اس کی بات سن کر ہال میں قہقہے بلند ہونے لگ گئے۔ فاگوٹ نے قہقہوں کے درمیان کہا۔ ''ہمیں آپ کی زبان پر پورا یقین ہے۔ کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے ایک سکرٹ اٹھا کر اس آدمی کے حوالے کردی۔ بلّے نے اپنی طرف سے اس آدمی کو میک اپ کے سامان کا ایک ڈبہ تھما دیا۔

ابھی خواتین کی دھکم پیل جاری تھی کہ فاگوٹ نے اچانک اعلان کیا۔ ''وقت زیادہ ہوجانے کی وجہ سے شاپنگ سنٹر اب بند کیا جاتا ہے۔ جو مہربان آج کچھ حاصل نہیں کرسکے وہ کل شام دوبارہ تشریف لے آئیں''۔

ٹھیک ایک منٹ بعد پستول سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ آئینے غائب ہوگئے، سٹال، کرسیاں اور غالیچے ہوا میں تحلیل ہوگئے۔ سب سے آخر میں جوتوں کا انبار، میک اپ کا سامان، کرتے، سکرٹ بیگ اور پرفیوم غائب ہوئے۔ سٹیج یکدم بے رونق ہوگیا اور ایک عجیب افسردگی کا عالم چھا گیا۔

ہال سے اچانک اٹھنے والی ایک مردانہ آواز نے اس ناخوشگوار خاموشی کے تسلسل کو توڑ دیا۔

بالکونی نمبر دو سے ایک پاٹ دار بلند مردانہ آواز کہہ رہی تھی۔۔

''جناب۔ محترم شعبدہ باز صاحب! آپ کی یہ ذمے داری ہے کہ اب آپ اپنے تمام شعبدے اور اس دوران ہونے والی غیر معمولی خباثتوں کی تماشائیوں کے سامنے وضاحت پیش کریں۔ بالخصوص یہ جو نوٹوں والا تماشہ تھا اور ہاں ہم یہ بھی چاہیں گے کہ ہمارے ہردل عزیز میزبان بینگالی کو بھی فوراً ہمارے سامنے سٹیج پر پیش کیا جائے کیونکہ ہم لوگ ان کی صحت اور سلامتی کے بارے میں انتہائی فکرمند ہیں اور مختلف وسوسوں کا شکار ہیں۔

یہ آواز انتہائی معتبر شخصیت ۔ ماسکو کے تھیٹروں کی کونسل کے صدر اپالون کی تھی۔ اپالون بالکونی میں دو خواتین کے درمیان بیٹھا تھا۔ ایک خاتون ادھیڑ عمر تھی اور بیش قیمت لباس پہنے ہوئے تھی جبکہ دوسری ایک انتہائی خوش شکل نوجوان خاتون جو قدرے سادہ لباس میں ملبوس تھی۔ پہلی خاتون ۔ جیسا کہ کچھ دیر بعد انکشاف ہوا۔ اپالون کی بیوی تھی اور نوجوان لڑکی اپالون کی دور کی رشتہ دار تھی۔ اس کا تعلق ایک چھوٹے شہر سے تھا۔ اور وہ ایکٹریس بننے کے شوق میں اپالون کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی۔

''معذرت کے ساتھ''۔ فاگوٹ جواباً گویا ہوا۔ یہاں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے اور ہرگز ہرگز کسی قسم کی کوئی خباثت نہیں ہے۔ جو کچھ آپ لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا بالکل شفاف اور حقیقی ہے''۔

جی نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ سب شعبدے ہیں۔ کسی صورت شفاف یا حقیقی نہیں ہیں۔ آپ براہ کرم ان کی وضاحت کیجئے۔

ہم سے مراد اگر باقی ماندہ تماشائی ہیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے پیش کردہ شو کے متعلق آپ کے سوا کسی کو ابہام نہیں ہے۔ جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے تو آپ کا ابہام میں ابھی دور کئے دیتا ہوں اور آپ کی خباثت بھی بیان کئے دیتا ہوں۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اپالون غصیلے انداز میں بولا۔

''سنیئے ۔ سنیئے جناب۔ تحمل سے سنیئے۔ ذرا یہ تو فرمایئے کہ گذشتہ شام آپ کہاں تشریف فرما تھے؟''

یہ غیر متوقع سوال سن کر اپالون تلملا اٹھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگ گئے۔

''یہ گذشتہ شام تھیٹر کونسل کی میٹنگ پر گئے تھے''۔ اپالون کی بیوی نے لقمہ دیا۔ ''لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ اس بات کا آپ کے شعبدوں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

''آپ کے بھولپن کے صدقے جاؤں مادام''۔ فاگوٹ چہکا۔ ''گذشتہ شام تھیٹر کونسل کی کوئی میٹنگ ویٹنگ نہیں تھی۔ گھر سے تو یہ صاحب آپ کو میٹنگ کا کہہ کر نکلے تھے لیکن تھیٹر پہنچنے پر انہوں نے

اپنے ڈرائیور کو چھٹی دے دی تھی اور وہاں سے بس پکڑنے کے بعد یہ صاحب تھیٹر کی ناکام لیکن بلا کی خوبصورت اداکارہ پارو کے ہاں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں چار گھنٹے انہوں نے کس طرح گزارے اور کیا کیا خباثتیں گھولیں؟ میرے محترم اپالون صاحب خود اپنی زبان سے بہتر طریقے سے بیان فرمائیں گے"۔

اوئے، ہوئے! ہال سے کسی نے نعرہ بلند کیا۔

نوجوان عزیزہ اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکی۔ اور بولی۔"اب بات سمجھ آئی ہے۔ میں تو پہلے ہی حیران تھی کہ اس نکمی اداکارہ کو کس خدمت کے عوض رومیو جولیٹ میں رول ملا تھا اور اس نے ہاتھ میں پکڑی چھتری یکا یک اپالون کے سر پر دے ماری۔

فاگوٹ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ طاری کیئے بولا۔"تو مہربانو۔ قدردانو! یہ ہے خباثت کی ایک مثال جسے جاننے کے لئے اپالون صاحب اتنے بے چین ہو رہے تھے"۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی بدبخت؟ اپالون کی بیوی اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چیختی ہوئی بولی۔"تم نے اپالون پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کیسے کی؟"

"کس نے؟ میں نے؟ لڑکی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔"کوئی دوسرا تو شاید ہمت نہ کر سکے لیکن میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے"۔ اور اس نے دوبارہ چھتری اپالون کے سر پہ جڑ دی۔

"پولیس۔ پولیس۔ پکڑو اس حرافہ کو"۔ اپالون کی بیوی کچھ ایسے وحشت ناک انداز میں چلائی کہ اکثر تماشائیوں کے دل دھڑکنا بھول گئے۔

رہی سہی کسر بلے نے نکال دی۔ وہ آرکسٹرا کو مخاطب کرتے ہوئے انسانی آواز میں بولا۔"جنگی ترانہ۔ جنگی ترانہ بجاؤ"۔

میوزک ڈائریکٹر نے، جو کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا، اپنی چھڑی سے سازندوں کو نچانے کیا اوٹ پٹانگ اشارے دیئے کہ انہوں نے جنگی ترانہ تو کیا لگتا تھا کہ باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔

یہ کئی سو سال پرانے جنگی ترانے کی دھن تھی جس کے بول نہ تو جنگ سے متعلق تھے۔ اور نہ ہی ان میں ترانے والی کوئی بات تھی۔

بول کچھ یوں تھے۔

بادشاہ سلامت کو پسند تھیں

گھریلو مرغیاں

آغوش میں وہ بٹھائے رکھتے تھے

خوبصورت لڑکیاں

یہ بول اصلی نہیں ہیں۔ کیونکہ اصلی بول کچھ زیادہ ہی لچر تھے۔ اور انہیں یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

بہرکیف تھیٹر ورائٹی کا ہال اس وقت حقیقتاً میدان جنگ کا منظر پیش کرر ہا تھا۔ اپالون کی سیٹ والی بالکونی میں پولیس پہنچ چکی تھی اور ہال میں جو طوفان بدتمیزی برپا تھا اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ قہقہوں، چیخوں، آہوں اور گالیوں کا شور جنگی ترانے کی دھن میں ضم ہوتا محسوس ہورہا تھا۔

سٹیج پر 'ہو' کا عالم تھا۔ ولاند کی تقلید کرتے ہوئے فاگوٹ اور بلا بھی ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔

باب ۱۳

ہیرو کی آمد

ایوان کے کمرے کی بالکونی میں کھڑے اجنبی نے انگلی لبوں پر رکھتے ہوئے ایوان کو اشارہ کیا
''شش، شش''۔

ایوان اجنبی پر ٹکٹکی باندھے واپس بستر پر بیٹھ گیا۔

اس شخص کی عمر اڑتیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے سر کے بال سیاہ اور چہرہ بڑی صفائی سے منڈا ہوا تھا۔ ناک آگے سے نوکدار اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر لٹک رہی تھی۔

یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ ایوان کمرے میں تنہا ہے اجنبی بڑے محتاط انداز سے کمرے میں داخل ہوگیا۔ جب وہ روشنی میں آیا تو ایوان نے دیکھا کہ اجنبی نے مریضوں والے کپڑے پہن رکھے تھے۔

بالکونی سے وارد ہونے والے اجنبی نے ایک آنکھ بھینچتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑا چابیوں کا گچھا جیب میں ڈال لیا اور سرگوشی کے انداز میں ایوان سے بیٹھنے کی اجازت مانگی۔ ایوان نے ہاتھ سے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اجنبی کو بیٹھنے کی دعوت دی۔'' آپ بالکونی سے کیسے وارد ہوئے ہیں؟'' انگلی سے بالکونی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایوان نے پوچھا۔'' جہاں تک مجھے علم ہے بالکونی پر تو قفل پڑا رہتا ہے''۔

'' جی ہاں بالکونی پر لگی جالی ہمیشہ مقفل ہی رہتی ہے''۔ اجنبی نے تصدیق کی۔ لیکن وہ جو ہسپتال کی سب سے رحمدل نرس فہمیدہ ہے نا۔ اس کے صدقے جاؤں۔ میں نے ایک مہینہ پہلے چابیوں کا گچھا اس کی جیب سے نکال لیا تھا۔ اس طرح پوری منزل کی بالکونیوں سے میرا آنا جانا لگا رہتا ہے''۔

'' اگر آپ بالکونی پر جاسکتے ہیں تو یہاں سے بھاگ بھی سکتے ہیں۔ یا پھر عمارت کی بلندی زیادہ ہے؟'' ایوان نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے''۔ اجنبی مہمان نے دوٹوک جواب دیا۔ ''بلندی کا میرے نہ بھاگنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں سے بھاگ کر میں جاؤں گا کہاں؟''۔ پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ''ایک بات بتاؤ۔ آپ مشتعل ہو کر مار پیٹ پر تو نہیں اتر آتے؟ کیونکہ شور۔ زور زبردستی۔ اور جسمانی اذیت سے میری جان جاتی ہے۔ خاص کر مجھے انسانی چیخ و پکار سے سخت نفرت ہے۔ خدارا مجھے اطمینان دلائیں کہ آپ میں ایسی کوئی بد عادت نہیں ہے''۔

''پچھلی رات میں نے ریستوران میں کسی کے تھوبڑے پر ایک مکا ضرور جڑ دیا تھا''۔ ایوان نے صاف گوئی سے تسلیم کیا۔

''بالوجہ یا بلاوجہ؟''۔ اجنبی مہمان نے پوچھا۔

''جی میں اعتراف کرتا ہوں کہ بلاوجہ''۔ ایوان نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

''یہ تو بہت بری حرکت ہے۔ اور آپ انسانی اعضا کے نام تو ٹھیک طرح لیا کریں۔ انسانوں کا چہرہ ہوتا ہے۔ تھوبڑا نہیں۔ اور اس پر مکا نہیں جڑنا چاہیئے۔ میرا آپ کو مشورہ ہے کہ آئندہ اس طرح کی برائیوں سے پرہیز کیا کریں۔ ہاں تو آپ کا پیشہ کیا ہے؟

''جی میں شاعر ہوں''۔ ایوان نے انتہائی اداسی کے عالم میں کہا۔

''اوہو۔ پیشوں کے معاملے میں میری قسمت ہمیشہ ہی خراب رہی ہے''۔ اس نے فوراً ہی ایوان سے معذرت کرلی اور اس کا تخلص پوچھا۔

''بے گھر''۔ ایوان نے جواب دیا۔

''اوں، ہوں'' اجنبی پیشانی پر تیوریاں ڈالتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ کو میرا کلام پسند نہیں ہے؟''

''جی بالکل پسند نہیں ہے''۔

''آپ نے میرا کون سا کلام پڑھا ہے؟''

''جناب۔ میں نے آپ کا کوئی کلام نہیں پڑھا''۔

''تو پھر آپ کیسے ناپسندیدگی کا فیصلہ کر سکتے ہیں؟''

''پڑھنے یا نہ پڑھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے آپ کے علاوہ کیا دوسرے شاعروں کو نہیں پڑھا؟ ویسے آپس کی بات ہے شعر تو سارے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ چلیں میں آپ کی بات یونہی مان لیتا ہوں کہ آپ اچھا لکھتے ہوں گے۔ بہت اچھا لکھتے ہوں گے۔ ذرا اپنے منہ سے تو کہیئے کہ آپ اچھا لکھتے ہیں۔''

''اچھا ہی نہیں جناب بہت اچھا''۔ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے ایوان نے جواب دیا۔

''مزید مت لکھو۔ خدا کے لئے آئندہ مت لکھنا''۔ اجنبی مہمان ملتجیانا انداز میں بولا۔

''وعدہ رہا جناب۔ بلکہ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آئندہ بالکل نہیں لکھوں گا''۔ نجانے کیوں ایوان عجیب سی خوشی محسوس کرتے ہوئے بولا۔

اس عہد کو دونوں نے ہاتھ ملا کر پختہ کیا۔ اس دوران راہداری میں قدموں کی چاپ اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔

مہمان نے لبوں پر انگلی رکھتے ہوئے پہلے کی طرح 'شش، شش' کیا۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح بالکونی میں واپس کود گیا اور اس نے بالکونی کا دروازہ بند کر لیا۔

ایوان کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سٹاف فہمیدہ نے اس کی خیریت دریافت کی۔ کمرے کی لائٹ بند کرنے کا پوچھا۔ لیکن ایوان نے اسے منع کر دیا اور وہ رحمدل خاتون ایوان کو آرام کرنے کی تاکید کرتے ہوئے شب بخیر کہنے کے بعد چلی گئی۔

نرس کے جانے کے بعد اجنبی مہمان کمرے میں واپس آ گیا۔

''میں تو جناب بڑے بڑے شاعروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا''۔ اجنبی نے بولنا شروع کیا۔

''اوہ۔ میں بھی کیا شاعری کی باتیں لے بیٹھا ہوں۔ گولی مارو شاعری کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں ہسپتال کیسے پہنچے؟''

''پونتی پلات کی وجہ سے''۔ ایوان نے فرش پر نظریں گاڑ دی تھیں۔

''وہ کیسے؟؟'' اجنبی مہمان تمام تر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے چیخ اٹھا۔

''یہ کیسا حسن اتفاق ہے؟ میری التجا ہے ذرا تفصیل سے سنائیں''۔

ایوان کو اس اجنبی پر اعتماد ہوتا جا رہا تھا۔ وہ شروع میں کچھ جھجکا۔ لیکن کچھ دیر بعد کامل خود اعتمادی اور بلند حوصلے کے ساتھ وہ گذشتہ روز پیش آنے والے واقعات پوری تفصیل کے ساتھ اجنبی مہمان کو سنانے لگ گیا۔

جوں جوں کہانی آگے بڑھ رہی تھی توں توں ایوان کا انہماک اور چابی چور مہمان کا اشتیاق شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ مہمان اس کہانی سے بے حد متاثر ہو رہا تھا اور بار بار اپنی خوشی اور دل چسپی کا اظہار بلند آواز میں کرتے ہوئے بعض تفصیلات دوبارہ سنانے کے لئے کہہ رہا تھا۔

ایوان کوئی معمولی تفصیل بھی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اس طرح اسے واقعات کا تسلسل رکھنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ جب خونی آستین والے سفید گاؤن میں ملبوس پونتی پلات کا تذکرہ ہوا تو اجنبی مہمان اچانک

پرجوش انداز میں اچھل پڑا۔ "میرا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ میں نے ہر چیز کا پہلے سے ہی اندازہ لگا لیا تھا"۔ مائیکل کی ہولناک موت کی منظر کشی نے اجنبی مہمان کے تاثرات یکسر بدل دیئے۔ فرط جذبات سے اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔ لیکن اس نے اپنے جذبات کا اظہار بہت ہی عجیب انداز میں کیا۔

مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ مائیکل کی جگہ وہ کم بخت مشہور نقاد لاٹو یا پھر وہ دو ٹکے کا لکھاری لاتیا کیوں نہیں تھا۔ لیکن یہ قصہ ہے بہت دل چسپ۔ جاری رکھو۔ جاری رکھو۔

بلے کا ٹرام میں سفر کرنا اور پھر کنڈکٹر سے ٹکٹ خریدنے کا سن کر مہمان بے حد محظوظ ہوا بلکہ اس کی دبی دبی ہنسی بھی سنائی دینے لگی تھی۔

ایوان کو بھی کہانی سنانے میں کچھ نشہ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اسقدر محو ہوگیا تھا کہ کہانی سناتے سناتے بلے کی نقل اتارنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد ایوان نے ریستوران کے واقعات کی کہانی ختم کرتے ہوئے کہا۔ "پھر نتیجتاً مجھے اس ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔

مہمان نے اس آہ کے پیچھے چھپے کرب کو محسوس کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑے خلوص کے ساتھ اس کے شانے پر رکھا اور بولا "اجی بدنصیب شاعر صاحب دیکھو نا غلطی تو آپ نے ہی کی تھی۔ آپ کو اس کم بخت کے ساتھ احتیاط سے پیش آنا چاہیئے تھا اور اس کے پیچھے فضول میں دھول اڑانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اب جو کچھ بھگت رہے ہو یہ اسی غلطی کا نتیجہ ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ قسمت کا شکر ادا کرو سستے میں چھوٹ گئے ہو"۔

"نہ تو آخر یہ کمبخت ہے کون؟" مشتعل ہو کر ہوا میں مکا لہراتے ہوئے ایوان نے پوچھا۔

مہمان کچھ دیر تک ایوان کی جانب دیکھتا رہا اور پھر بولا "آپ جواب سن کر مشتعل تو نہیں ہو جاؤ گے؟ ہم سب لوگ یہاں دراصل قابل اعتبار نہیں ہیں۔ چیخیں مارنا، دوسروں کو کاٹنا، منہ پر تھوکنا، لوگوں کو گھونسے مارنا، پھر ڈاکٹروں اور نرسوں کا آکر سُوئیاں چبھونا یہاں کا شیوہ ہے"۔

"نہیں۔ بالکل نہیں"۔ ایوان بولا۔ "خدارا مجھے بتاؤ وہ کون ہے"

"اچھا تو پھر حوصلے سے سنو"۔ مہمان نے پراسرار انداز میں بولنا شروع کیا۔ "کل جو آدمی تمہیں ملا تھا وہ دراصل شیطان ہے"۔

ایوان اپنے وعدے کے مطابق مشتعل تو نہیں ہوا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات قابل دید اور حالت ناگفتہ بہہ تھی۔ "نہیں۔ نہیں۔ یہ ناممکن ہے شیطان کا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے"۔

"معاف کیجئے گا جناب۔ آپ کو تو ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔ آپ غالباً ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہیں اس نے بالمشافہ مل کر نقصان پہنچایا ہے۔ دیکھیں نا اس نے آپ کی کیا حالت کر دی ہے۔ آپ کو

پاگلوں کے ہسپتال پہنچا دیا ہے اور آپ ہو کہ اب بھی اس کے وجود سے انکار کر رہے ہو۔ بہت عجیب سی بات ہے!''

الجھن میں مبتلا ایوان خاموش ہو کر رہ گیا۔

''آپ نے جیسے ہی اس کا حلیہ بیان کرنا شروع کیا''۔ مہمان گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے فوراً اندازہ ہو گیا تھا کہ کل آپ کو کس نے ملاقات کا شرف بخشا تھا۔ مجھے تو مائیکل پر حیرانگی ہوئی ہے۔ وہ تو اچھا خاصہ پڑھنے لکھنے والا آدمی تھا۔ اسے کیونکر یہ اندازہ نہیں ہوا کہ یہ شخص کون ہے۔ جہاں تک آپ کی شخصیت کا تعلق ہے۔ معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ طفلانہ مزاج واقع ہوئے ہیں۔ لہٰذا آپ سے تو شکوہ کرنا نہیں بنتا''۔

''جی ٹھیک ہے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں''۔ ایوان فوراً ہی مہمان سے متفق ہو گیا۔

''اب دیکھئے نا آپ نے اس کے چہرے کی جو خصوصیات بیان کی ہیں۔۔۔۔۔ مثلاً اس کی آنکھوں کا ایک دوسری سے مختلف ہونا، اس کی بھوئیں! اس کی ناک! معاف کیجئے گا کیا آپ نے مشہور میوزیکل ڈرامہ، فاؤسٹ کبھی پڑھا ہے؟''۔

ایوان ذہنی طور پر منتشر ہو گیا تھا۔ اس کی سوچ ماؤف ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ لاوا اگلتے آتش فشاں کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ وہ نجانے کیوں بندرگاہ یالٹا کے ریسٹ ہاؤس کے بارے میں زیر لب بڑبڑانے لگ گیا تھا۔

''بالکل۔ بالکل۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ لیکن میں پھر دہرا رہا ہوں کہ مجھے مائیکل کی شخصیت سے سخت گلہ ہے۔ وہ نہ صرف انتہا کا پڑھا لکھا بلکہ بلا کا ہوشیار آدمی تھا۔ ہاں ایک بات اس کے حق میں ضرور جاتی ہے کہ جس شخصیت کے ساتھ آپ لوگوں کا واسطہ پڑا تھا وہ انسانوں سے کہیں زیادہ جہاں دیدہ اور چالاک ہے''۔

''کیا؟ وہ کیسے؟'' ایوان بڑبڑا کر بولا۔

''آہستہ۔ آہستہ بولو۔

سمجھ رہا ہوں۔ اب میں سب سمجھ رہا ہوں۔ اس کم بخت نے اپنے کارڈ پر "W" لکھا رکھا تھا۔ آئے ہائے۔ کیسے میں اس بلوان کو نہیں پہچان سکا''۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور بالکونی کے باہر بادلوں کے آنچل سے جھانکتے ہوئے چاند کو بغور دیکھنے لگ گیا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بد بخت حقیقتاً پونتی پلات سے مل چکا ہے۔ وہ شائید اسی دور میں پیدا ہوا تھا''۔ ''اور یہ کم بخت مجھے پاگل سمجھتے ہیں''۔ دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایوان بولا۔

مہمان کے ہونٹوں کے گرد کڑواہٹ سے بھری سلوٹ ابھر آئی تھی۔ ''ہمیں سچ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا پڑے گا''۔ مہمان نے اپنا چہرہ بادلوں میں روشنی بکھیرتی مشعل کی جانب موڑ لیا۔ ''میں اور آپ بھی اس وقت پاگلوں کی صف میں شامل ہیں۔ اس حقیقت سے کیا بھاگنا۔ دیکھئے تو سہی اس کم بخت نے آپ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اور آپ کچھ کھسک بھی گئے ہو۔ غالباً آپ کے اندر پہلے ہی سے اس قسم کے جراثیم موجود تھے لیکن جو واقعہ آپ نے بیان کیا ہے وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ اور یہ کس قدر اچنبھے کی بات ہے کہ ستارین جیسے عظیم ماہر نفسیات نے بھی آپ کی بات پر یقین نہیں کیا۔ اس نے دیکھا تھا نا آپ کو؟''

ایوان نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

''آپ سے ہمکلام ہونے والا شخص یقیناً پونتی پلات سے بھی ملا تھا۔ اس نے مشہور فلسفی کانت کے ساتھ ناشتہ بھی کیا تھا اور اب وہ ماسکو پر نازل ہوگیا ہے''۔

''جی ہاں۔ دیکھو نا اب وہ یہاں نجانے کیا کیا گل کھلائے گا۔ اسے کسی نہ کسی طرح قابو کرنا بہت ضروری ہے''۔ اعتماد سے عاری پرانے ایوان نے نئے ایوان کے اندر دوبارہ سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

''آپ پہلے بھی کوشش کر چکے ہونا''۔ مضحکہ خیز انداز میں اجنبی بولا ''آئندہ ایسی غلطی کرنے کا مشورہ نہ تو آپ کو اور نہ ہی کسی اور کو دوں گا۔ اب وہ کیا گل کھلاتا ہے یہ آپ اسی پر چھوڑ دیں''۔

مہمان ایک لمبی سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ '' مجھے بہت افسوس ہے کہ اس کے ساتھ آپ کی بجائے میری ملاقات کیوں نہیں ہوئی۔ حالانکہ میرا سب کچھ جل کر خاک ہو چکا ہے۔ دہکتے ہوئے کوئلے راکھ میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ پھر بھی میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس ملاقات کے عوض میں چابیوں کا گچھا سٹاف فہمیدہ کو واپس کرنے کو تیار ہوں کیونکہ میرے پاس کسی کو دینے کے لئے اب اور کچھ بھی نہیں بچا۔ میں انتہائی مفلس اور بے یار و مددگار ہو چکا ہوں''۔

''آپ کو اس سے ملنے کی کیا ضرورت آن پڑی ہے؟''

مہمان کافی دیر تک انتہائی افسردگی کے عالم میں آگے پیچھے جھولتا رہا اور بالآخر بولا۔

''دیکھو نا کیا عجیب اتفاق ہے کہ ہم دونوں کے اس علاج گاہ میں پہنچنے کی وجہ ایک ہی ہے۔ اور وہ وجہ ہے پونتی پلات''۔ یہ کہنے کے بعد مہمان نے خوف زدہ انداز میں دائیں بائیں دیکھا اور بولا۔۔

''بات دراصل یہ ہے کہ میں نے گذشتہ سال پونتی پلات کی سوانح عمری لکھی تھی''۔

''اوہو۔تو آپ لکھاری ہیں؟'' انتہائی دل چسپی کے ساتھ شاعر نے پوچھا۔

مہمان کا چہرہ سفید پڑ گیا اور پھر سرخ ہوگیا۔ مکا ہوا میں لہراتے ہوئے وہ ایوان سے مخاطب ہوا۔۔

''میں ۔۔۔۔۔۔ ماسٹر ہوں''۔ اس نے اپنے گاؤن کی جیب سے ایک بوسیدہ سیاہ رنگ کی ٹوپی نکالی جس پر زرد رنگ کے دھاگے سے حرف "M" کشیدہ تھا۔ اس نے ٹوپی سر پر ایسے سجالی کہ جیسے ایوان کو اپنے ماسٹر ہونے کا ثبوت پیش کر رہا ہو۔ یہ ٹوپی اس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے میرے لئے تیار کی تھی''۔ اس نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' ایوان نے پوچھا

''میرا اب کوئی نام نہیں ہے''۔ افسردگی اور بے بسی میں ڈوبی آواز میں مہمان نے جواب دیا۔ ''میں نے خود سے متعلق ہر چیز بشمول نام ترک کر دی ہے''۔

اچھا۔ چلیں آپ کم از کم اپنی کتاب کے متعلق تو کچھ بتائیں''۔ ایوان نے التجا کی۔

معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میری زندگی ابتدا سے ہی پیچیدگیوں میں مبتلا رہی ہے۔ میں تعلیم یافتہ تاریخ دان ہوں۔ دو سال پہلے تک میں ماسکو کے مشہور عجائب گھر سے منسلک تھا۔ علاوہ ازیں ترجمے کا بھی کام کرتا رہا ہوں''۔

''کون کونسی زبان جانتے ہیں آپ؟'' ایوان نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

محترم! مادری زبان کے علاوہ میں پانچ زبانیں جانتا ہوں۔ اور ہاں تھوڑی بہت اطالوی بھی سمجھ لیتا ہوں۔

''ارے واہ''۔ ایوان بے حد متاثر ہو رہا تھا۔

''یہ تاریخ دان تنہا رہنے کا عادی تھا۔ ماسکو میں نہ تو کوئی اس کا دوست تھا اور نہ ہی رشتہ دار۔ اندازہ فرمائیں کہ اس حضرت نے ایک دن ایک لاکھ روبل کی لاٹری جیت لی۔ آپ اس شخص کی حیرت کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں کہ جب اس نے میلے کپڑوں کی ٹوکری میں ہاتھ ڈال کر لاٹری کا ٹکٹ نکالا تو کیا دیکھتا ہے کہ اخبار میں جلی ہندسوں میں یہی نمبر درج تھا۔ یہ ٹکٹ اسے عجائب گھر میں کسی نے تحفے میں دی تھی''۔

ایک لاکھ کی لاٹری جیتنے کے بعد اس پراسرار شخص کی زندگی کچھ یوں تبدیل ہوئی کہ اس نے اپنا رہائشی کمرہ چھوڑ کر شہر کے وسط میں دو کمروں کا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ عجائب گھر کی نوکری کو خیر باد کہہ دیا۔ ڈھیر ساری کتابیں خرید لیں اور پونتی پلاطس کی سوانح لکھنا شروع کر دی۔ واہ۔ کیا سنہری وقت تھا وہ بھی۔ دمکتی آنکھوں کے ساتھ اجنبی نے گفتگو جاری رکھی۔

۔۔۔۔ یہ انتہائی آرام دہ فلیٹ تھا جس میں کمروں کے علاوہ مختصری ڈیوڑھی بھی تھی جس میں ہاتھ دھونے کا بیسن بھی تھا۔

اور نجانے کیوں اس نے بہت پرجوش انداز میں ان دو کھڑکیوں کا ذکر کیا جو باغیچے میں کھلتی

تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔ ان کھڑکیوں کے نیچے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی کا گزر تھا۔ کھڑکی کے مخالف سمت میں سیب اور آلوچے کے پیڑوں کے علاوہ عنابی رنگ کے خوبصورت پھولوں کے بہت سارے پودے تھے۔ سردیوں میں مجھے کبھی کبھار یہاں سے سیاہ جرابوں والی ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔ تازہ برف پر پڑنے والے قدموں کی دل کش سی آہٹ سنائی دیتی تھی۔ دیوار کے ساتھ انگیٹھی میں ہمیشہ شعلے رقص کرتے رہتے تھے۔ پھر اچانک موسم تبدیل ہوگیا۔ کھڑکی کے دھندلے شیشوں سے پہلے خشک ٹہنیاں اور کچھ عرصہ بعد عنابی پھولوں سے لدے سرسبز پودے فضا میں اپنی رعنائیاں بکھیرتے نظر آنے لگ گئے۔ یہ پچھلے موسم بہار کی بات ہے جب میری زندگی میں ایک لاکھ روبل جیتنے کی خوشی سے بھی زیادہ اہم اور خوش گوار واقعہ رونما ہوا۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ایک لاکھ روبل بہت بڑی رقم ہوتی ہے''۔

''جی ہاں۔ آپ ٹھیک فرما رہے ہیں''۔ ایوان نے تائید کی۔

''میں کھڑکی کھولے چھوٹے کمرے میں بیٹھا تھا''۔ اجنبی مہمان اشاروں سے کمرے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہاں ایک صوفہ پڑا تھا۔ اس کے بالکل سامنے ایک اور صوفہ تھا۔ ان کے درمیان ایک میز رکھی تھی جس پر ایک خوش نما ٹیبل لیمپ پڑا تھا۔ کھڑکی کے نزدیک ایک دوسری خوبصورت میز تھی جس پر کچھ کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ دوسرا کمرہ پہلے سے کئی گنا بڑا تھا اور کتابوں سے اٹا پڑا تھا۔ اور ہاں انگیٹھی بھی اسی کمرے میں تھی۔ واہ! میرے حالات ان دنوں واقعی قابل رشک تھے۔ عنابی پھولوں کی خوشبو مجھے پاگل کئے جارہی تھی۔ میں خود کو ہوا کے دوش پر تیرتا ہوا محسوس کرتا تھا اور ۔۔۔۔ پلاٹ تقریباً مکمل ہونے والا تھا''۔

''ہم مم ۔۔۔۔ وہ خونی آستین والا سفید گاؤن!! میں سمجھ سکتا ہوں''۔ ایوان پھڑک کر بولا۔

''جی ہاں۔ جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہے۔ پلاٹ اپنے اختتام کی جانب رواں تھا میں نے پہلے ہی فیصلہ کر رکھا تھا کہ کتاب کا اختتام ان الفاظ پر ہوگا''۔

''یروشلم کا پانچواں قاضی ۔۔۔۔ پونتی پلاط''

میں اکثر سیر کے لئے باہر نکلا کرتا تھا۔ ایک لاکھ روبل بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ میرے پاس سلیٹی رنگ میں ایک نفیس قسم کا سوٹ بھی تھا۔ بسا اوقات میں کسی نزدیکی ریستوران میں کھانا کھانے بھی نکل جایا کرتا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ گلی کے کونے میں ایک چھوٹا سا مگر نہایت عمدہ ریستوران ہوا کرتا تھا۔ خدا جانے، اب وہ وہاں ہے یا نہیں!!

اس وقت مہمان کی آنکھیں کچھ پھٹی پھٹی لگ رہی تھیں۔ وہ چاند کو بغور دیکھتے ہوئے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔۔

''وہ ہاتھوں میں زرد رنگ کے بدشکل سے پھول اٹھائے جا رہی تھی۔ خدا جانے ان پھولوں کو کیا کہتے ہیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں موسم بہار میں سب سے پہلے یہی پھول کھلتے ہیں۔ اس نے سیاہ رنگ کا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ جس کے پس منظر میں یہ پھول کچھ زیادہ ہی نمایاں لگ رہے تھے۔ ہاں تو وہ پیلے رنگ کے پھول اٹھائے ہوئے تھی! نفرت ہے مجھے پیلے رنگ سے!!

جس ریستوران کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ وہ اس کے سامنے سے ہوتی ہوئی گلی سے ملحقہ چوک تک جا پہنچی۔ اس وقت چوک سے ہزاروں لوگ گزر رہے تھے۔ لیکن میں حلفاً کہتا ہوں کہ اس کی نظر صرف مجھ پر پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں نہ صرف غم زدہ تھیں بلکہ کسی کرب میں بھی مبتلا تھیں۔ مجھے اس کے حسن نے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا اس کی آنکھوں سے جھلکنے والی تنہائی نے۔

میں اس پیلے پھولوں والی حسینہ کے پیچھے پیچھے چوک سے ہوتا ہوا بغل والی گلی میں پہنچ گیا۔ اس ٹیڑھی میڑھی گلی میں ایک عجیب بے چینی کا عالم تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس وقت گلی میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ گلی کی ایک طرف چل رہی تھی۔ جب کہ میں دوسری جانب اس سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ میں تڑپ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرا اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی کھائے جا رہا تھا کہ میں اس سے ایک لفظ بھی نہ کہہ پاؤں گا۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی جائے گی۔ لیکن میری حیرت کا اندازہ کیجئے کہ جب اس نے اچانک میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

''آپ کو میرے پھول اچھے لگے ہیں نا''۔

''اس کی آواز آج بھی میرے کانوں میں سرسرا رہی ہے۔ وہ مدھم سی آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ آپ شائید مجھے بے وقوف کہیں لیکن مجھے اس لمحے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کی آواز دیواروں سے ٹکرا رہی ہے اور فضا میں اس کی بازگشت گردش کر رہی ہے۔ میں جلدی سے گلی پار کر کے اس کے نزدیک پہنچ گیا اور جواب دیا''۔

''نہیں!''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور اچانک اپنے وجود میں سرائیت کرتی اس کی نگاہوں کی تپش سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ تو وہی عورت ہے جس سے میں ساری عمر پیار کرتا رہا ہوں۔ کیسی عجیب لگتی ہے یہ بات! آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ میں پاگل ہوں۔

''قطعاً نہیں۔ قطعاً نہیں''۔ ایوان فوراً بولا۔ ''میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہا۔ خدارا۔ رکو نہیں۔ جاری رکھو۔ بولتے رہو''۔

مہمان بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جی ہاں۔ وہ حیرت زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے پوچھا۔'' لگتا ہے کہ آپ کو کسی قسم کے بھی پھول پسند نہیں ہیں۔'' اس کی آواز سے بیزاری عیاں ہو رہی تھی۔ میں اب اس کے نزدیک رہنے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملائے چل رہا تھا۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ مجھے کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

''جی نہیں۔ پھول مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے نہیں''۔

میں نے اس کے زرد پھولوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کون سے پھول آپ کو اچھے لگتے ہیں؟''

''جی مجھے گلاب پسند ہے''۔

گلاب کی پسندیدگی کا ذکر کرنے پر مجھے ملال ہونے لگا تھا کیونکہ اس کی مسکراہٹ میں شرمندگی جھلکنے لگی تھی۔ اس نے اپنے پھول اچانک ایک مکان کی دہلیز پر پھینک دیئے۔ مجھے اپنے تئیں بہت افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے اس کے پھینکے ہوئے پھول اٹھا کر اسے واپس دینے کی کوشش کی لیکن اس نے انہیں لینے سے انکار کر دیا۔ میں اپنے اندر چھوٹے پن کا احساس لئے اپنے ناپسندیدہ پھول تھامے اس کے ساتھ چلنے لگ گیا۔

ہم کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر یکایک اس نے پھول مجھ سے چھین لیئے اور سڑک کنارے رکھے کوڑے دان میں پھینک دیئے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے سیاہ رنگ کا دستانہ اتارا اور میرا ہاتھ تھام کر چلنے لگ گئی۔

''آگے کیا ہوا؟'' ایوان نے اشتیاق سے پوچھا۔'' براہ کرم کوئی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی نہیں بھولنا''۔

''آگے کیا ہوا؟'' ماسٹر ایوان کی بات دہراتے ہوئے بولا۔

''آگے آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیا ہوا ہوگا''۔ اجنبی مہمان اپنی دائیں آستین سے گالوں پر بہنے والے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

ہمارے دلوں میں ایسا پیار کا طوفان اُمڈ آیا جس نے ہمیں ششدر کر کے رکھ دیا تھا۔ بالکل ایسے کہ جیسے آسمانی بجلی اچانک آپ کو حیران کر کے رکھ دیتی ہے۔ یا کسی اندھیری گلی میں زمین یکایک ایک چھرا تھامے قاتل کو آپ کے سامنے اگل دیتی ہے۔ ویسے بعد ازاں وہ بضد تھی کہ ہم ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوئے بھی عرصہ دراز سے دنیا کے اس خوبصورت ترین رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ حالانکہ اس سے قبل

ہم نے ایک دوسرے کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ کسی اور شخص کے ساتھ رہتی تھی اور میں ان دنوں اس کے ساتھ۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔ کیا نام ہے اس کا؟''۔

''کس کے ساتھ؟''۔ بے گھر نے پوچھا۔

''ارے بھئی اسی کے ساتھ۔ کیا نام ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟''

اجنبی مہمان ہتھیلی سے اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔

''تب آپ بھی شادی شدہ تھے؟''۔ ایوان نے لقمہ دیا۔

''جی ہاں۔ میں اس کا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شائید وانیکا۔۔۔۔ یا شائید مانیکا۔ نہیں۔ میرا خیال ہے وانیکا۔ وہ ہمیشہ دھاری دار سکرٹ پہنے رکھتی تھی۔ غالباً عجائب گھر میں۔۔۔ خیر چھوڑو۔ مجھے اب کچھ یاد نہیں آ رہا۔ ہاں تو وہ کہہ رہی تھی کہ اس روز ہاتھوں میں زرد رنگ کے پھول لئے وہ یہ ارادہ کر کے گھر سے نکلی تھی کہ آخر کار آج مجھے ڈھونڈ ہی لے گی۔ اگر ایسا نہیں ہو سکا تو وہ زہر کھا لے گی کیونکہ وہ اس کھوکھلی زندگی سے تنگ آ چکی تھی۔

جی ہاں۔ پیار کے اس طوفان نے ہمیں ایک ہی لمحے میں حیرت زدہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ہم اس خدائی نعمت کے نشے میں سرشار نجانے کتنی گلیاں ناپتے ہوئے صدارتی محل کے پاس جا پہنچے تھے۔ ہم کچھ اس طرح محو گفتگو تھے کہ جیسے ابھی کل ہی بچھڑے ہوں اور جیسے کہ سال ہا سال سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ہم نے اگلے دن دریائے ماسکو کے کنارے دوبارہ ملنے کا عہد کیا اور مل بھی بیٹھے۔ ماہ مئی کا روشنی سے بھرپور ماہتاب ہمارے لئے کرنیں بکھیر رہا تھا۔ اور پھر یہ خاتون بہت جلد خفیہ طور پر میری بیوی بن گئی۔

وہ ہر روز میرے گھر آنے لگی۔ میں پو پھٹتے ہی اس کا انتظار کرنے لگتا تھا۔ انتظار کے یہ پل کیسے گزرتے تھے۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کھانے کی میز پر میں چیزیں کبھی ترتیب دیتا اور کبھی اٹھا دیتا۔ بار بار ان کی جگہ بدلتا رہتا۔ کئی کئی منٹ کھڑکی کے سامنے اس آس میں بیٹھا رہتا کہ ابھی خوش نما عنابی پھولوں میں بلبل اپنا پیار بھرا گیت گنگنائے گی اور میری محبوبہ کے قدموں کی چاپ فضا کو مقدس کر دے گی۔ اور ہاں۔ اس سے ملاقات سے پہلے ہمارے باغیچے میں شائید ہی کسی نے کبھی قدم رکھا ہوگا۔ مگر اب مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ جیسے سارا شہر ہمارے باغیچے میں اُمڈ آیا ہے۔ بلبل کا سہانا گیت شروع ہوتے ہی میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگتی۔ آپ ذرا اندازہ کریں کہ اس وقت اگر کوئی شخص میرے سپنوں کی اس دنیا میں مخل ہوتا تو میری حالت کیا ہو جاتی ہوگی۔

جب وہ پہلی بار میرے باغیچے میں آئی تو میرے دل کی دھڑکن۔۔۔۔۔ اوہ خدایا۔۔۔۔ وہ دھڑکن تھی یا لوہار کی دھونکنی کا پھٹنے سے قبل احتجاج؟ جوں جوں وقت گذرتا گیا اس کی آمد کا وقت میرے لئے

گھڑی کے درست ہونے کا پیمانہ بن گیا۔ جیسے ہی اس کی آمد کا وقت قریب آتا میرا دل گھڑی کی سوئیوں کے مانند وقت کی رفتار سے الجھنے لگتا تھا۔ جب دنیا کی خوبصورت ترین نوکیلی ناک میری کھڑکی کے شیشے سے ہمکلام ہوتی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ جاتا تھا۔ میں کیسے کواڑ گراتا تھا۔ کیسے دروازہ کھولتا تھا۔ وہ کیسے میرے آنگن میں آتی تھی۔۔۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔

حالانکہ اس دنیا میں ایسا ہوا نہیں کرتا لیکن میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ ہمارے تعلقات کے بارے میں کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ نہ ہی اس کے شوہر کو اور نہ ہی اس کے ملنے والوں کو۔ ہاں اس پرانے گھر کے مکین جس کے تہہ خانے میں میری رہائش ہوا کرتی تھی اتنا ضرور جانتے تھے کہ میرے ہاں کسی خاتون کا آنا جانا ہے۔

''آخر وہ تھی کون؟ کیا نام تھا اس کا؟'' ایوان نے اس محبت کی کہانی میں دل چسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

اجنبی مہمان نے اشارے سے باور کرایا کہ اس نے اپنی محبوبہ کا نام آج تک کسی کو نہیں بتایا اور نہ ہی کبھی بتائے گا۔

اب ایوان پر یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ ماسٹر اور اجنبی حسینہ ایک دوسرے کی محبت میں اس شدت سے گرفتار تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت انہیں جدا نہیں کر سکتی تھی۔ ایوان کو وہ باغیچہ، اس باغیچے میں کھلنے والی کھڑکیاں اور تہہ خانے کے دو کمرے یوں واضح طور پر نظر آنے لگے تھے کہ جیسے وہ خود وہاں رہ چکا ہو۔ سرخ رنگ کا فرنیچر، دیوار پر آویزاں گھڑیال جو ہر آدھ گھنٹے بعد آواز دیتا تھا۔ فرش سے چھت تک لگا کتابوں کا پہاڑ اور انگیٹھی پر رکھی تمام چیزیں ایوان کو شناسا سی لگنے لگی تھیں۔

اس پر یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ مہمان اور اس کی محبوبہ خاتون پہلی ہی ملاقات میں یہ سمجھ گئے تھے کہ ان کا ملاپ قدرت کی طرف سے مقرر تھا۔ قدرت نے انہیں پیدا ہی ایک دوسرے کے لئے کیا تھا۔ اس کہانی سے ایوان کو یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ یہ پیار کرنے والے اپنا دن کیسے گزارتے تھے۔ وہ صبح ماسٹر کے گھر آتے ہی سب سے پہلے ناشتہ تیار کرتی تھی۔ اکثر اوقات اپنے ہاتھ سے محبوب کے منہ میں نوالے بھی ڈالتی تھی اور جب مئی کی طوفانی بارش باغیچے میں جل تھل کر دیتی تھی تو محبت کرنے والے اپنے دلوں میں دہکتی آگ کی مانند انگیٹھی کو بھی روشن کر دیتے تھے۔ انگیٹھی میں دم پخت کیئے گئے سالم آلو سیاہ چھلکا اتارنے پر جب کمرے کی فضا کو اپنی مسحور کن بھاپ سے معطر کر دیتے تو کھڑکی کے باہر پیار کرنے والوں کی ہنسی سنائی دیا کرتی تھی۔ بارش کے ختم ہونے پر باغیچے کے درختوں کی ٹہنیوں سے ٹپکتی بوندیں دیکھ کر ماسٹر کو اپنی محبوبہ کے بھیگے گیسوؤں کا گمان ہوتا تھا۔

ہاں کبھی کبھار اس کا انہماک دیکھ کر مجھے اپنی کتاب سے حسد ہونے لگتا تھا۔ ماسٹر اپنی کہانی جاری رکھے ہوئے کہہ رہا تھا۔۔

وہ اکثر اوقات اپنی مخروطی انگلیوں سے میرے بال سنوارتے ہوئے میری کتاب کا مسودہ اپنی گود میں لیئے پونتی پلاٹ کی دنیا میں گم ہوجایا کرتی تھی۔ کتاب سے فارغ ہو کر وہ یہ ٹوپی (اپنی ٹوپی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا) سینے میں مصروف ہوجایا کرتی تھی۔ کبھی فرش کی صفائی میں مصروف ہوجاتی اور کبھی کرسی پر کھڑے ہو کر دیواروں اور ان پر لگی چیزوں کی جھاڑ پونچھ کرنے لگتی۔ مجھے وہ اس ناول کے علاوہ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی۔ اسی نے میرا نام ماسٹر رکھا تھا۔ وہ انتہائی بے صبری کے ساتھ اس کتاب کے مکمل ہونے کا انتظار کرتی تھی اور بسا اوقات اس کتاب سے اپنی پسندیدہ سطور دہرایا کرتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ یہ کتاب اس کی زندگی ہے!

کتاب اگست کے مہینے میں مکمل ہوگئی اور اسے ایک غیر معروف ٹائپسٹ کے حوالے کردیا گیا جس نے اس کی پانچ نقول تیار کردیں۔ آخر کار وہ گھڑی آن پہنچی جب گوشہ نشینی کو خیر باد کہہ کر واپس زندگی کے دھارے میں شامل ہوا جاسکتا تھا۔ میں اپنے ناول کا مسودہ ہاتھوں میں اٹھائے زندگی میں واپس لوٹ آیا۔ لیکن وہیں اس مسودے سمیت۔۔۔۔۔ میری زندگی ختم بھی ہوگئی۔ افسردگی کے عالم میں سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے ماسٹر دھیمے سے بولا۔ اس کی سیاہ ٹوپی جس پر پیلے دھاگے سے حرف M منقش تھا، ایک ٹوٹے ہوئے خشک پتے کی مانند اس کے سر پر جھول رہی تھی۔ اس نے اپنی کہانی کو آگے بڑھایا۔ لیکن اب وہ بے ربطگی کا شکار ہوتی جارہی تھی۔ واضح طور پر سمجھ آنے والی واحد بات یہ تھی کہ ایوان کے اس اجنبی مہمان کے ساتھ کوئی بہت بڑا حادثہ ہوگیا تھا۔

''میں نے زندگی میں پہلی بار ادبی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ اب جبکہ سب کچھ ختم ہوچکا ہے اور موت کا پروانہ میرے چہرے پر چسپاں ہوچکا ہے تو میں انتہائی خوف اور کرب کے ساتھ اس کم بخت کو یاد کرتا ہوں''۔ ماسٹر واویلا کرنے کے انداز میں ہاتھ ہوا میں ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''جی ہاں اس بدبخت نے پہلی ملاقات ہی میں مجھے حیرت زدہ کردیا تھا''۔

''کون! کون تھا وہ؟'' مشتعل شدہ داستان گو کے خوفزدہ ہوجانے کے ڈر سے ایوان نے انتہائی دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کون۔ کون۔ ارے بھائی وہی ادبی سوسائٹی کا ایڈیٹر۔ میرا مسودہ پڑھنے کے بعد وہ مجھے کچھ اس طرح گھور رہا تھا کہ جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔ بلکہ کچھ دیر بعد کسی لقوہ زدہ مریض کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ 'ہی، ہی' بھی کرنے لگا تھا۔ اس نے میرا مسودہ بلاوجہ توڑ مروڑ کر

رکھ دیا۔ جو سوال اس نے مجھ سے پوچھے ان سے صریحاً یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شخص پاگل ہے۔ نجانے کیوں اس نے میرے ناول کے بارے میں گفتگو کرنے کی بجائے مجھے بے معنی سے سوالات میں الجھائے رکھا۔ جیسا کہ ''تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیسے آئے ہو؟ کب سے لکھ رہے ہو؟ کیوں لکھ رہے ہو؟ میں نے تمہارے متعلق پہلے تو کبھی نہیں سنا''۔ اور میرے نزدیک ایک سب سے بے ہودہ سوال جو اس نے پوچھا وہ یہ تھا کہ اس عجیب وغریب موضوع پر لکھنے کا مشورہ مجھے کس نے دیا تھا۔

آخر کار میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ میری کتاب شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں یا نہیں؟ میرے سوال پر کچھ بے چین ہو کر اس نے دو تین مرتبہ پہلو بدلا اور اعلان کیا کہ وہ تنہا کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہ مسودہ ایڈیٹوریل کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے گا جو بغور مطالعہ کرنے کے بعد حتمی فیصلہ کرے گی۔ اس کمیٹی میں مشہور نقاد لاتبا اور لاٹو شامل تھے۔ ایڈیٹر نے مجھے دو ہفتے بعد رابطہ کرنے کو کہا۔

میں ٹھیک دو ہفتوں کے بعد ایڈیٹر کے دفتر میں حاضر ہوگیا۔ وہاں میرا استقبال ایڈیٹر کی سیکرٹری نے کیا جس کی آنکھیں غالباً مستقل جھوٹ بول بول کر ناک کی جگہ لیتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

وہ یقیناً لانشکا ہوگی۔ ادبی دنیا سے شناسا شاعر ایوان بے گھر نے بڑے وثوق سے کہا۔

''ممکن ہے، ممکن ہے''، ماسٹر ایوان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''اس خاتون نے میرا مسودہ انتہائی خستہ حالت میں مجھے لوٹا دیا۔ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے وہ کہنے لگی کہ ان کے پاس چھپنے کے لئے اتنا مواد پہلے سے موجود ہے کہ میرے ناول کی باری دو سال سے پہلے نہیں آسکتی''۔

''یہ سننے کے بعد میرے ساتھ کیا ہوا''۔ اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے ماسٹر بڑبڑایا۔ ''ہاں مجھے یاد پڑتا ہے کہ میری کتاب کے سرورق پر سرخ دائرے گردش کرنے لگے تھے۔ ان دائروں کے درمیان میری محبوبہ کی آنکھیں تھیں۔ اداس آنکھیں، کرب سے بھری آنکھیں، محبت کی آنچ سے شعلے اگلتی آنکھیں۔

ایوان کے مہمان کی داستان اب مزید الجھتی جا رہی تھی۔ وہ کچھ عجیب وغریب اور بے تکی باتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ کسی عجیب سی بارش کا ذکر کر رہا تھا اور سرگوشیوں میں بول رہا تھا کہ دنیا کی وہ سب سے حسین عورت جس نے اسے یہ کتاب جلد از جلد مکمل کرنے کی ترغیب دلائی تھی، وہ بے قصور ہے۔ بالکل بے قصور ہے۔ خدا کی قسم وہ بے قصور ہے۔

اس کے بعد جیسا کہ ایوان کو سنائی دیا ماسٹر کی زندگی میں اچانک ایک تہلکہ بپا ہوگیا۔ ایک دن اس نے اخبار کھولا تو کیا دیکھتا ہے کہ نقاد لاتبا نے اس کی کتاب کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ مضمون کا

عنوان تھا۔ ''دشمن کی کارکردگی''۔ مضمون میں ماسٹر کے ناول اور ماسٹر کی ذات کا مذاق اڑانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ بلکہ صاحب مضمون نے ماسٹر کو پونتی پلاطس اور حضرت عیسیٰ کا جانشین قرار دے دیا تھا۔

''یاد ہے۔ یاد ہے۔ مجھے بالکل یاد ہے''۔ ایوان اچانک بولا ''لیکن آپ کا نام مجھے بھول گیا۔ کیا نام ہے آپ کا؟''

''نام کو رہنے دو۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرا اب کوئی نام نہیں ہے۔ نام میں بھلا کیا رکھا ہے''۔ ''اگلے دن دوسرے اخبار میں نقاد لاٹو نے بھی میرے مسودے پر ایک انتہائی شرمناک مضمون لکھ مارا۔ بلکہ اس کم بخت نے تو مجھے یہ ناول لکھنے کی جسارت کرنے پر سر بازار جوتے مارنے کی تجویز دی تھی۔ اس کے بعد تو کئی دنوں تک مختلف ادیبوں اور نقادوں نے (جن میں سے کچھ نے تو شائید میرا مسودہ پڑھا بھی نہیں تھا) میرا تمسخر اڑانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں اسی نوعیت کا ایک مضمون پڑھنے میں مصروف تھا کہ وہ اچانک میرے سامنے آن کھڑی ہوئی (میں غالباً دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا) اس کے ایک ہاتھ میں بھیگی ہوئی چھتری تھی اور دوسرے میں اس نے اخباروں کا ایک پلندہ اٹھا رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے جبکہ برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پہلے تو وہ مجھے والہانہ انداز میں چومتی رہی پھر فرط جذبات سے میز پر مکہ مارتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی۔ میں اس بلوان لاٹو کو زہر دے دوں گی''۔

ایوان مضطرب ہو کر اپنے پاؤں سے فرش کو بجانے لگ گیا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

''بارشوں کا موسم فضا میں ایک عجیب سی دیوانگی بکھیر رہا تھا''۔ مہمان اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے بدنصیبی اس کتاب کے ساتھ میری روح کو بھی لے اڑی ہے۔ حقیقتاً میرے پاس اب زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ شائید تازہ ہوا کا واحد جھونکا میری محبوبہ کے ساتھ ملاقاتیں تھیں۔ اس دوران میرے اندر ایک عجیب سا تغیر رونما ہو گیا تھا۔ خدا جانے کیا؟ ویسے میرا خیال ہے کہ پروفیسر ستارین غالباً اس سوال کا جواب بخوبی جان چکا ہے۔

مجھے ایک گھناؤنی اداسی نے گھیر لیا تھا۔ میں کچھ عجیب و غریب احساسات میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ اور ہاں اخباروں میں مضامین چھپنے کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان مضامین کی جانب بھی میرا رویہ تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ شروع شروع میں انہیں پڑھ کر میں ہنس دیتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے ان کی بہتات ہوتی گئی مجھ پر حیرت کا عالم غالب آنے لگ گیا۔ ان مضامین کی سطور میں جھوٹا پن، بے اعتمادی اور مصنوعی پن ظاہر ہونے لگے تھے۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ ان مضامین کے مصنف کہنا کچھ اور چاہتے

ہیں لیکن لکھتے کچھ اور ہیں۔ کچھ عرصہ بعد مجھے ایک شدید قسم کے خوف نے آن گھیرا۔ یہ خوف ان مضامین کا نہیں تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ خوف میرے ناول سے متعلق نہیں تھا۔ مجھے اندھیرے سے سخت خوف آنے لگا تھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میں نفسیاتی مریض بن چکا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں جونہی سونے لگتا ہوں ایک بہت بڑی مکڑی اپنی سرد نوکدار ٹانگیں میرے دل میں اتارنے کی کوشش کرتی ہے اور یوں میری رات دہکتے انگاروں پر کٹتی تھی۔

میری محبوبہ بہت تبدیل ہوگئی تھی۔مکڑی کے بارے میں میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔لیکن اس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میری اذیت کا ہر لمحہ محسوس کر رہی ہے۔ وہ کچھ دبلی ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت زردی مائل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ کہیں کھو چکی تھی۔ وہ ہر وقت مجھ سے ناول چھپوانے کا مشورہ دینے پر معافیاں مانگتی رہتی تھی۔ اس کی تجویز تھی کہ مجھے فی الحال سب کچھ چھوڑ کر بحیرہ اسود کے کنارے کسی پر فضا مقام پر چلے جانا چاہیے۔ اور ایک لاکھ کی لاٹری سے جو پیسے بچے ہیں وہ مجھے اپنی آسودگی کے لیئے استعمال کرنے چاہئیں۔ وہ میرے یہاں سے چلے جانے کے لئے بہت بضد تھی۔ میں نے کسی بحث میں الجھنے کے بجائے وعدہ کرلیا کہ ضرور چلا جاؤں گا۔ حالانکہ مجھے یہ احساس ہو چکا تھا کہ میرے بحیرۂ اسود جانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس نے کہا کہ میرے لیئے ٹکٹ وہ خود ہی خریدے گی۔ میرے پاس دس ہزار روبل بچ گئے تھے جو میں نے اس کے حوالے کردیئے۔

''اتنے زیادہ کیوں؟'' وہ حیرانگی سے بولی۔

میں نے غالباً جواب میں اس سے یہ کہا تھا۔۔ مجھے ڈر ہے کہ چوری نہ ہو جائیں۔ میری واپسی تک تم انہیں امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو۔ اس نے یہ رقم لے کر اپنے بیگ میں رکھ لی اور میرا بوسہ لینے کے بعد کہنے لگی۔ تمہیں اس حالت میں تنہا چھوڑنے پر میں مر جانے کو ترجیح دیتی ہوں۔ لیکن مجبور ہوں، میرا انتظار ہو رہا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے دن ہر صورت مجھے ملنے آئے گی۔ وہ بار بار دلاسہ دیتی رہی کہ مجھے کسی چیز سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس دن غالباً اکتوبر کی پندرہ تاریخ تھی۔ وہ چلی گئی۔ میں روشنی جلائے بغیر ہی صوفے پر دراز ہوگیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرے کمرے میں کوئی ہے۔ میں نے اندھیرے میں دیوار کو ٹٹولتے ہوئے بلب روشن کیا۔ گھڑی پر اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ میں جب لیٹا تھا تو لگتا تھا کہ میں بیمار ہو رہا ہوں۔ اب جاگنے پر احساس ہو رہا تھا کہ میں تو واقعی بیمار ہو چکا ہوں۔ مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ بارش کا طوفان ابھی کھڑکیوں کے شیشے توڑ کر کمرے میں گھس آئے گا اور میں اس بارش کے پانی میں ڈوب کر مر جاؤں گا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرے جسم کا پورا نظام اب میرے قابو

میں نہیں رہا۔ مجھے تنہائی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھاگ کر کسی کے پاس چلا جاؤں۔ میں دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کچھ لکڑیاں اٹھائیں اور انگیٹھی میں آگ جلائی۔ جب انگیٹھی میں انگارے دہکنے لگے اور چنگاریاں جگنوؤں کی طرح کمرے میں اڑنے لگیں تو مجھے قدرے سکون محسوس ہوا۔ میں نے ڈیوڑھی کی الماری سے وسکی کی بوتل نکالی اور یہ زہر اپنے حلق میں انڈیلنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد میرا خوف کچھ کم ہو گیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل جانے کی خواہش بھی کسی حد تک دب گئی۔ میں انگیٹھی کے اتنا قریب بیٹھ گیا کہ میرا چہرہ اور ہاتھ تپش سے جلنے لگے۔ میں بڑبڑا رہا تھا۔ خدا کرے وہ جان جائے کہ میں اس وقت کس کرب میں مبتلا ہوں۔

آ جا، آ جا، خدارا آ جا!

لیکن کوئی نہ آیا۔ انگیٹھی سے شعلے نکل رہے تھے اور کھڑکی کے باہر تیز بارش کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میری زندگی کا بدترین لمحہ آن پہنچا تھا۔ میں نے دراز سے اپنے ناول کا مسودہ نکالا اور اس کے اوراق کو انگیٹھی میں جلانا شروع کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں خود اپنی ہی بوٹیاں نوچ نوچ کر آگ میں جھونکتا جا رہا ہوں۔ یہ اوراق سیاہی سے نہیں، میرے خون سے لکھے گئے تھے۔ کاپیوں سے اوراق کو نوچتے وقت میرے ناخن زخمی ہو رہے تھے۔ جل جانے والے اوراق کی راکھ اڑ اڑ کر میرے ناول کی موت کا ماتم کر رہی تھی اور میری آنکھوں میں جھنس کر مجھے بھی رلا رہی تھی۔ یہی راکھ بسا اوقات آگ کے لپکتے شعلوں کو زیر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا ناول شدت سے مزاحمت کر رہا تھا لیکن وہ بدقسمت دھیرے دھیرے آگ کے شعلوں کی نظر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے مانوس الفاظ میری آنکھوں کے سامنے پیلے اور پھر سیاہ ہوتے ہوئے نظروں سے غائب ہو رہے تھے۔

اس دوران مجھے کھڑکی کے باہر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے جلدی سے آخری کاپی کو انگیٹھی میں پھینکا اور دوڑ کر داخلی دروازہ کھولا۔ باہر نکل کر میں نے پوچھا کون ہے وہاں؟ آواز آئی۔۔۔ وہی شناسا سی فضاؤں میں رنگ بکھیرنے والی آواز۔۔۔ ''میں ہوں''۔ وہ بارش میں بری طرح بھیگ چکی تھی۔ اس کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنی کانپتی ہوئی بانہوں کے حصار میں لے کر مجھے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ میں بمشکل کہہ سکا۔ ''تم۔۔۔ آ گئی تم؟'' میری آواز میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

ہم بھاگ کر نیچے کمرے میں آ گئے۔ اس نے اپنا برساتی کوٹ اتارا اور اپنے ہاتھوں سے میرے مسودے کی سلگتی ہوئی کاپی سے جو بچا تھا اسے شعلوں کے منہ سے چھین کر فرش پر پھینک دیا۔ کمرے میں دھواں بھرنے لگ گیا۔ میں نے اپنے پاؤں سے ان ادھ جلے اوراق کی وحشت کو قابو میں کیا۔ وہ

صوفے پر اوندھے منہ لیٹ کر بلک بلک کر رونے لگ گئی۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں بولا۔

مجھے اس ناول سے نفرت ہوگئی ہے۔ میں ڈر رہا ہوں۔ میں شدید بیمار ہوں۔ میں ایک بھیانک عذاب میں مبتلا ہوں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔'' کیا کہا؟ تم بیمار ہو؟ اوہ خدایا یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کس جرم کی سزا ہے؟ ۔تم ڈرو نہیں۔ میں تمہارے ہر مرض کی دوا ہوں۔ میں تمہیں بچا لوں گی''۔

وہ میرا سر اپنی آغوش میں لے کر اپنے سرد ہاتھوں سے میری پیشانی کو سہلانے لگ گئی۔ اس کی سوجی ہوئی غمزدہ آنکھوں سے بہنے والے میرے ہی خون جگر کے قطرے میرا چہرہ تر کر رہے تھے۔

میں تمہیں ٹھیک کردوں گی۔ بالکل ٹھیک کردوں گی۔ وہ بار بار کہے جارہی تھی۔ دیکھنا تم اپنے پاؤں پر دوبارہ کھڑے ہوجاؤ گے اور یہ ناول دوبارہ سے رقم کرو گے۔ اوہ خدایا میں بھی کتنی بیوقوف ہوں۔ مسودے کی ایک کاپی میں نے اپنے پاس کیوں نہ رکھ لی؟

وہ غم سے نڈھال ہوگئی تھی اور نجانے کیا کیا بڑبڑاتی جارہی تھی۔ پھر اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور فرش سے ادھ جلے اوراق سمیٹنے لگ گئی۔ یہ ناول کے درمیانے حصے کا کوئی باب تھا۔ کون سا۔ یہ مجھے یاد نہیں۔ اس نے احتیاط سے ادھ جلے اوراق کو جمع کیا اور ایک کاغذ میں لپیٹنے کے بعد دھاگے کی گرہ سے محفوظ کرلیا۔ اس کی تمام حرکات سے پراعتمادی جھلک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا ہے۔ اس نے میز پر پڑی وسکی کی بوتل اٹھائی اور چند گھونٹ پینے کے بعد اطمینان سے بولی۔

''جھوٹ بولنے کی قیمت آخر کار ایک دن چکانی ہی پڑتی ہے۔ میں اب مزید جھوٹ نہیں بول سکتی۔ میں ابھی اسی وقت تمہارے پاس رک سکتی ہوں۔ لیکن میں ایسا کسی بھدے طریقے سے نہیں کرسکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کے دل میں ہمیشہ کے لئے یہ خلش رہ جائے کہ میں رات کے اندھیرے میں اسے چھوڑ کر بھاگ آئی تھی۔ اس نے مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ اس کی فیکٹری میں آگ لگ گئی ہے اور اسے ایمرجنسی میں وہاں جانا پڑ گیا ہے۔ وہ جلد گھر واپس لوٹ آئے گا۔ میں اسے بتا دوں گی کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں اور ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس آجاؤں گی۔ بولو۔ جواب دو! ہوسکتا ہے تمہیں یہ ٹھیک نہ لگتا ہو؟''۔

''او، میری حسرتوں کی تعبیر۔'' میں بولا۔'' میں تمہیں کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ مرنے نہیں دوں گا''۔

وہ میرے بالکل نزدیک آگئی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بولی۔'''صرف اتنی سی بات ہے کیا؟''۔

''ہاں صرف اتنی سی بات ہے''۔ وہ زندگی سے بھی زیادہ زندہ لگنے لگی تھی۔ مجھ سے لپٹ گئی اور کہنے لگی۔

''میں تمہارے ساتھ ہی مروں گی۔ کل صبح میں تمہارے پاس ہوں گی''۔

مجھے اپنی زندگی کا جو آخری منظر یاد ہے وہ کچھ یوں ہے کہ ادھ کھلے دروازے سے داخل ہونے والی مدہم روشنی میں اس کی آنکھیں دمک رہی تھیں اور ان سے پر اعتمادی جھلک رہی تھی۔

میں تمہیں الوداع کہنے کے لئے خود دروازے تک ضرور آتا لیکن میں کیا کروں۔ میں لاچار ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ اگر میں سیڑھیاں چڑھ بھی گیا تو زندگی میں کبھی واپس نہیں لوٹ سکوں گا۔

''خدارا! تم بالکل نہ ڈرو۔ صرف چند گھنٹے اور برداشت کرلو۔ میں صبح ہوتے ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس آجاؤں گی''۔ یہ میری زندگی میں اس کے آخری الفاظ تھے۔

شش، ش، ش!! اچانک مہمان نے خود ہی اپنی بات کاٹتے ہوئے انگلی لبوں پر رکھ لی اور کہنے لگا ''آج کی چاندنی رات بھی کچھ زیادہ ہی اذیت ناک ہوگئی ہے''۔ یہ کہنے کے بعد وہ جلدی سے واپس بالکونی پر چلا گیا۔

ایوان کو راہداری سے ٹرالی کے پہیوں کے شور کے ساتھ ساتھ کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ جب کچھ دیر بعد فضا میں دوبارہ سکوت چھا گیا تو اجنبی مہمان واپس کمرے میں لوٹ آیا۔ اس نے ایوان کو بتایا کہ کمرہ نمبر ۱۲۰ کو نیا مکین مل گیا ہے۔ ایک مریض کو لے کر آئے ہیں جو بار بار کہہ رہا ہے ''میرا سر مجھے واپس کردو۔ میرا سر مجھے واپس کردو''۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اجنبی مہمان نے اپنی روئیداد دوبارہ سنانی شروع کردی۔ راہداری سے ابھی بھی کچھ شور وغل سنائی دے رہا تھا۔ مہمان ایوان کے بالکل قریب آن بیٹھا اور سرگوشیوں میں بولنے لگ گیا۔

''اس کے جانے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد کسی نے میرے گھر کی کھڑکی پر دستک دی''۔

مہمان اب جو واقعات بیان کر رہا تھا انہوں نے غالباً اس کی شخصیت پر بہت گہرے اثرات ڈالے تھے کیونکہ بولتے وقت اس کے چہرے کے پٹھے مختلف جگہوں سے پھڑپھڑانے لگے تھے۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور کرب عیاں تھا۔ اور وہ بار بار ہاتھ سے اس طرف اشارہ کر رہا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے چاند دکھائی دے رہا تھا۔ اسے جب اطمینان ہوگیا کہ اب راہداری میں کوئی نہیں ہے تو وہ ایوان سے پرے ہٹ کر بیٹھ گیا اور قدرے اونچی آواز میں بولنے لگ گیا۔

ہاں تو جنوری کا آدھا مہینہ گذر چکا تھا۔ میں اس برفانی رات میں اپنا لمبا کوٹ پہنے اپنے ہی باغیچے میں سرد ہوا سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میرے عقب میں عنابی پھولوں کے پودے برف سے

انے پڑے تھے۔ جبکہ سامنے میرے کمرے کی نیم روشن کھڑکیاں تھیں۔ میرے کمرے میں کچھ ہلچل سی مچی تھی لیکن مجھے واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں کچھ دیر وہیں رکنے کے بعد باہر گلی میں نکل آیا جہاں شدید برفانی طوفان جاری تھا۔ رہی سہی کسر میرے پاؤں تلے دب جانے والے کتے کی چیخوں نے نکال دی۔ شدید ٹھنڈ اور خوف نے مجھے ادھ موا کر دیا تھا۔ میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ میرے لئے غالباً سب سے آسان کام یہ تھا کہ میں دوڑ کر ٹرام کے نیچے سر دے دیتا۔

''دور سے مجھے ٹرام کے روشن ڈبے برف پوش پٹڑی پر خوف ناک آوازیں نکالتے، رینگتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہاں، لیکن میرے عزیز پڑوسی! میرا مسئلہ تو دراصل یہ تھا کہ شدید خوف سے میرے جسم کا ایک ایک رواں اس وقت کانپ رہا تھا۔ آوارہ کتوں کی مانند مجھے بھی ٹرام سے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ہسپتال میں مجھ سے زیادہ خوف ناک بیماری اور کسی کو نہیں ہے۔

''لیکن آپ اس خاتون سے تو رابطہ کر سکتے تھے''۔ ایوان نے کہا۔ ''اور ہاں آپ کے پیسے بھی تو اسی کے پاس تھے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس نے سنبھال کر ہی رکھے ہوں گے''۔

''جی ہاں۔ بالکل۔ سو فیصد۔ اس نے یقیناً سنبھال کر ہی رکھے ہوں گے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ مجھے سمجھ نہیں پا رہے یا پھر شائید میں ہی اپنی بات سمجھانے کی صلاحیت کھو چکا ہوں۔ کسی زمانے میں یہی صلاحیت میری پہچان ہوا کرتی تھی۔ ویسے مجھے اسکے کھو جانے کا کوئی خاص افسوس نہیں ہے''۔ اجنبی مہمان رات کے اندھیرے میں گھورتا ہوا بولا۔

''کیا خوب کہا آپ نے۔ میں کیا اسے پاگل خانے سے خط بھیجتا؟ کیا کسی کو پاگل خانے کے واپسی پتے کے ساتھ خط بھیجا جا سکتا ہے؟ یہ جان کر کہ اس کا محبوب ذہنی مریض بن چکا ہے اور پاگل خانے میں بند کر دیا گیا ہے کیا گزرتی اس معصوم پر؟ میں زندگی میں اسے اذیت دینے والی خبر دینے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے''۔

ایوان اس سے اختلاف نہ کر سکا۔ اسے دل ہی دل میں اس ذہنی مریض کی بدنصیبی پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس کے کرب اور اذیت کو محسوس کر رہا تھا۔

مہمان کالی ٹوپی سر پہ جمائے کربناک لہجے میں بولا۔ ''بے چاری عورت! ویسے مجھے ایک آس سی ہے کہ شائید وہ مجھے بھول چکی ہو''۔

''دیکھیں آپ کی بیماری ٹھیک بھی تو ہو سکتی ہے!'' ایوان تسلی دینے کے انداز میں بولا۔

''میں اب ناقابل علاج ہوں''۔ مہمان نے نہایت سکون سے جواب دیا۔ جب پروفیسر ستارین مجھے تسلی دیتا ہے کہ میں اپنی زندگی میں واپس لوٹ جاؤں گا تو مجھے اس کی بات کا ذرہ برابر بھی یقین نہیں

ہوتا۔ وہ صرف میرا دل رکھنے کے لئے مجھے طفل تسلیاں دیتا ہے۔ ویسے مجھے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہے کہ میں اب کافی بہتر ہوں۔ ہاں تو میں کہاں تک پہنچا تھا۔ ہاں یاد آیا۔ برفانی طوفان۔ اڑتی ہوئی ٹرام۔ میں نے ذہنی امراض کے اس ہسپتال کے بارے میں سن رکھا تھا۔ یقین کرو گے کہ میں پیدل ہی اس جانب چل پڑا تھا۔ ہے نا یہ پاگل پن؟ اگر ایک غیر متوقع واقعہ پیش نہ آتا تو میں اس طوفان میں یقیناً ٹھٹھر کر مر گیا ہوتا۔ میں شہر کے مضافات سے تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا کہ اچانک ایک ٹرک سڑک کنارے آن رکا۔ شائید اس کے انجن میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ میں ڈرائیور کے پاس پہنچا تو نجانے کیوں اسے میری حالت پر رحم آ گیا اور اس نے مجھے ٹرک میں سوار کرلیا۔ میری خوش قسمتی دیکھو کہ اس کی منزل بھی یہی ہسپتال تھا۔

کچھ دیر بعد انجن کا نقص دور ہوگیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈرائیور نے مجھے ہسپتال پہنچا دیا۔ مجھے یہاں آئے چار ماہ ہوگئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ جگہ کوئی ایسی بری بھی نہیں ہے۔ بس کوئی بڑے بڑے پلان بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ہی لے لو۔ ساری عمر یہ شوق رہا کہ پوری دنیا کا ایک چکر لگاؤں۔ لیکن کیا ہوسکتا ہے۔ قدرت کو یہ منظور ہی نہیں ہے۔ میری قسمت میں تو دنیا کا صرف یہ چھوٹا سا کونہ دیکھنا ہی لکھا تھا۔ یہ غالباً دنیا کی سب سے خوبصورت جگہ تو نہیں ہے۔ مگر اتنی بری بھی نہیں ہے۔ موسم گرما کی آمد آمد ہے اور جیسا کہ سٹاف فہمیدہ نے مجھے بتایا ہے ہسپتال کے باغیچے اور بالکونیاں رنگ برنگ کے پھولوں سے لد جائیں گے۔ یہ جو سٹاف کی چابیاں میں نے چرا رکھی ہیں انہوں نے میرا دائرہ آزادی کافی وسیع کردیا ہے۔ رات بالکونی سے خوبصورت چاند کا نظارہ کر سکتے ہو۔ اس نے بالکونی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ اوہ! یہ تو غائب ہوگیا ہے۔ لو جناب یہ تو آدھی رات ہونے کا عندیہ ہے۔ میں اب اپنے کمرے میں جارہا ہوں''۔

''اچھا مجھے یہ تو بتاتے جائیں کہ عیشوا اور پلات کا آگے کیا بنا؟'' ایوان نے منت کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، بالکل نہیں''۔ مہمان نے لرزتی آواز میں جواب دیا۔ ''میرا ناول مجھے یاد دلا کر میرے زخموں پر نمک مت چھڑکو۔ ویسے بھی گذشتہ روز تم سے متعارف ہونے والا اجنبی یہ کہانی مجھ سے بہتر طور پر جانتا ہے۔ میری دکھ بھری کہانی سننے کا شکریہ''۔ اس سے قبل کہ ایوان مزید کچھ کہتا اجنبی کسی چھلاوے کی طرح بالکونی سے غائب ہوگیا۔

باب ۱۴

مرغا زندہ باد

تھیٹر میں رونما ہونے والے واقعات نے رمیض کے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس وقت تھیٹر کے حسابات کے کھاتوں کو چھونے کو بھی تیار نہیں تھا۔ تمام ملازمین کافی دیر پہلے جا چکے تھے اور وہ تنہا اپنے دفتر میں بیٹھا میز پر بکھرے کالے علم کی قوت سے برسنے والے نوٹوں کو دہشت زدہ نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ فنانس ڈائریکٹر کا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ باہر سے شور وغل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تماشائی ایک ہجوم کی شکل میں تھیٹر کی عمارت سے باہر نکل رہے تھے۔ ہجوم کے شور کے علاوہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن اور سیٹیوں کی آوازیں بھی رمیض کے کانوں تک پہنچنے لگی تھیں۔ گلی میں ہونے والے شور کی نوعیت اچانک تبدیل ہونے لگ گئی تھی۔ کچھ حیرت زدہ آوازیں اور کچھ طنزیہ قہقہے بھی اس شور میں شامل ہو گئے تھے۔ فنانس ڈائریکٹر فوراً سمجھ گیا کہ باہر گلی میں کوئی نیا تماشہ کھڑا ہو گیا ہے۔ رمیض کا دل چاہ رہا تھا کہ ان تمام معاملات سے جان چھڑا کر کہیں دور چلا جائے۔ لیکن یہاں سے بھاگنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ تھیٹر میں اس کی پوزیشن اسے اپنی ذمے داریوں سے فرار اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ دور اندیش فنانس ڈائریکٹر کا شک درست نکلا۔ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہی وہ بے بسی کے عالم میں کرسی پر گر گیا اور پیشانی کو زور زور سے مکے مارتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا ہی ہو گا''

گلی میں نصب قمقموں کی تیز روشنی میں ایک سرخ بالوں والی دوشیزہ جم غفیر کے درمیان نیم برہنہ حالت میں کھڑی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو سب سے پہلے ماہرین کالے علم کے شاپنگ پلازہ پر گئی تھی۔ تھیٹر سے باہر نکلتے ہی اس بیچاری کے شاپنگ سٹیج سے حاصل کردہ تمام کپڑے غائب ہو گئے تھے اور وہ اس وقت صرف زیر جامہ میں تھی۔ ہاں اس کے سر پر ٹوپی اور دائیں ہاتھ میں چھتری ضرور موجود تھی۔ ان چیزوں کا غالباً کالے علم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ چند قدم دور ایک دوسری خاتون کو ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ وہ بے

چاری سرخ بالوں والی سے بھی ابتر حالت میں تھی کیونکہ اس نے تو لالچ میں آ کر اپنا زیر جامہ بھی تبدیل کروا لیا تھا۔ ایک بھلا مانس آدمی اپنا کوٹ خاتون کو پیش کرنے کی کوشش میں تھا مگر کوٹ کا ایک بازو بھی شائید کالے علم کی زد میں آ گیا تھا اور اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس ظالمانہ دھوکے کا شکار ہونے والی خواتین بے بسی کے عالم میں منتظر تھیں کہ کب زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ پولیس کی گاڑی اس دوران ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے آ پہنچی اور ان برہنہ اور نیم برہنہ خواتین کو اپنی پناہ میں لینے لگ گئی۔

رمیض سوچ رہا تھا کہ اب اپنی ذمہ داری نبھانے کا وقت آ گیا ہے۔ متعلقہ سرکاری محکمے کی مدد حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ ان تمام حالات کا سہرہ ستپال کے سر پر سجا دیا جائے۔ رمیض نے دو مرتبہ فون اٹھایا اور دونوں مرتبہ واپس رکھ دیا۔ جب تیسری مرتبہ اس نے ہاتھ ٹیلی فون کی جانب بڑھایا تو اس کی گھنٹی اچانک خود سے بجنے لگ گئی۔ فون کی گھنٹی سن کر رمیض خوف زدہ ہو گیا۔ کچھ لمحوں بعد اس نے حواس پر قابو پاتے ہوئے فون اٹھالیا۔ جب اس نے فون کان سے لگایا تو ایک کرخت زنانہ آواز بولی۔ ''خبیث آدمی اگر کہیں فون کیا تو بہت برا ہوگا''۔

ٹیلیفون رمیض کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔ خوف زدہ رمیض نے دائیں بائیں دیکھا تو نجانے کیوں اس کی تمام تر توجہ کھڑکی پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ کھڑکی کے باہر درخت کی شاخوں کی اوٹ سے جھانکنے والے چاند نے رمیض کے خوف میں مزید اضافہ کر دیا۔

آخر کار فنانس ڈائریکٹر نے ہمت کر کے اپنی نگاہیں کھڑکی سے ہٹا لیں۔ اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب کہیں بھی فون کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فنانس ڈائریکٹر کے دماغ میں اب صرف ایک بات گردش کر رہی تھی کہ کیسے جلد از جلد تھیٹر سے فرار ہوا جائے۔

تھیٹر کی عمارت کے اندر اس وقت ایک خوفناک سکوت طاری تھا۔ رمیض کو معلوم تھا کہ بالائی منزل میں وہ بہت دیر سے اکیلا ہی ہے۔ اکیلے پن کا خیال آتے ہی رمیض کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں دوڑنے لگی تھیں۔ راہداری اور پھر سیڑھیوں سے تنہا اترنے کا خیال اسے مزید خوفزدہ کئے جا رہا تھا۔ اس نے میز پر پڑے کالے علم والے نوٹ اٹھا کر بیگ میں رکھ لئے اور اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے کھانسنے لگ گیا لیکن خوف کی وجہ سے کھانسی کی آواز کچھ ایسے نکلی کہ جیسے کسی مرغی کے حلق میں دانہ پھنس گیا ہے۔

اسے اچانک ایسا محسوس ہوا کہ جیسے دفتر کے دروازے کے نیچے کسی مردار کی بدبو آنے لگی ہے۔ خوف کی لہریں مزید شدت کے ساتھ اس کے جسم میں دوڑنے لگ گئیں۔ اس موقعہ پر گھڑیال نے رات کے بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ گھڑیال کی آواز نے فنانس ڈائریکٹر کو مزید خوفزدہ کر دیا۔ اس کے دل کو آخری دھچکا اس وقت لگا جب اسے آفس کے دروازے میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ سرد پسینے میں شرابور ہاتھوں

میں بیگ دبوچے فنانس ڈائریکٹر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اگر یہ سلسلہ مزید کچھ لمحے جاری رہا تو اس کی چیخیں نکل جائیں گی۔

آخر کار تالے کے ساتھ زور آزمائی کرنے والے کی محنت رنگ لائی اور دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں داخل ہونے والا شخص ایڈمنسٹریٹر وریام تھا۔ رمیض کی ٹانگیں اب اس کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ وہ دھڑام سے کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''خدایا! تم نے تو میری جان ہی نکال دی ہے''۔

''جی ہاں۔ اس طرح کی پراسرار آمد کسی کو بھی خوف زدہ کر سکتی ہے''۔ لیکن رمیض کے لئے ایک خوش آئند بات یہ تھی کہ اب اسے خوف تنہائی کی وحشت سے چھٹکارہ مل گیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وریام سے ان پراسرار واقعات کی گتھی سلجھانے میں مدد ملے گی۔

''ہاں تو بولو نا جلدی سے''۔ رمیض بولا ''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''۔

''معذرت چاہتا ہوں''۔ دروازہ بند کرتے ہوئے ایک عجیب پاٹ دار آواز میں وریام بولا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم تھیٹر سے جا چکے ہو''۔

وریام آہستہ آہستہ چلتا ہوا میز کے دوسری جانب کرسی پر بیٹھ گیا۔ وریام کے جواب میں ایک عجیب سا مصنوعی انداز اور آواز میں کھوکھلا پن تھا۔ فنانس ڈائریکٹر کو اس بات کا فوری اندازہ ہو گیا تھا اور وہ اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ جب وریام کو یہ معلوم تھا کہ رمیض اپنے کمرے میں نہیں ہے تو پھر وہ اس کے کمرے میں کیوں آیا ہے۔ دوسری تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے دفتر میں کیوں نہیں گیا۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ رمیض کے آفس تک پہنچنے سے قبل اسے راستے میں کوئی ملازم نہ ملا ہو۔ سب ملازمین کو معلوم تھا کہ رمیض ابھی اپنے آفس میں موجود ہے۔ بہرحال فنانس ڈائریکٹر کے پاس فی الحال ان باتوں پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔

''تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟ رمیض نے پوچھا'' اور یہ یالٹا والی کہانی کا کچھ پتا چلا؟''۔

''میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا''۔ ایڈمنسٹریٹر اپنے دائیں جبڑے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس انداز میں بولا کہ جیسے کسی نے اس کا دانت نکال دیا ہے۔

''وہ تو جناب ماسکو میں ہی تھا۔ یالٹا نامی ریستوران میں نشے میں دھت پڑا تھا''۔

''کیا کہا؟ ماسکو میں ہی تھا؟ بالفرض اگر میں یہ مان بھی لوں تو جو ٹیلی گرام یالٹا سے آرہے تھے ان کے متعلق کیا کہو گے؟''

''کہاں کا یالٹا۔ کہاں کا سمندر۔ اس نے یہیں کیفے یالٹا میں محکمہ ٹیلیگراف کے ایک کلرک کو مفت

کی شراب کے لالچ میں قابو کر رکھا تھا اور وہی ہمیں جھوٹے ٹیلی گرام بھجواتا رہا ہے"۔

"اچھا۔اچھا۔چلو ٹھیک ہے"۔ یہ کہتے ہوئے رمیض کی آنکھیں روشن ہوگئی تھیں۔اس کے دماغ میں ایک فلم چلنے لگی تھی جس میں تھیٹر کے ڈائریکٹر ستپال کو بے عزت کر کے اس کے عہدے سے برطرف کیا جارہا تھا اور اس کی جگہ یہ منصب رمیض کو دیا جارہا تھا۔اس نے میز پر مکا مارتے ہوئے وریام سے کہا۔ "تفصیل سے۔ مجھے پوری تفصیل سے سارا واقعہ سناؤ"۔

وریام نے بڑی فراخدلی سے تفصیلات بیان کرنا شروع کردیں۔"میں یہاں سے سیدھا سیکرٹ پولیس کے آفس پہنچا تھا۔ان لوگوں نے بہت غور سے میری کہانی سنی اور ان ٹیلیگراموں کو پرکھا۔ وہاں کوئی بھی ستپال کی یالٹا والی کہانی پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا بلکہ وہ لوگ ٹیلی گراموں کے اس پلندے کو دیکھ کر ہنس رہے تھے اور مجھے کہہ رہے تھے کہ تمہارے ڈائریکٹر نے تم لوگوں کے ساتھ نہایت بھدا مذاق کیا ہے۔

فنانس ڈائریکٹر وریام کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو اس وقت وہ کہاں ہے؟"

"وہیں۔جہاں اسے ہونا چاہیے تھا"۔طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ وریام نے جواب دیا۔اس وقت پولیس اس کا نشہ اتارنے میں مصروف ہے"۔

"بہت خوب۔بہت خوب"۔ پرمسرت انداز میں رمیض نے جواب دیا۔

وریام اپنی کہانی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ جوں جوں ستپال کے کرتوت بیان ہورہے تھے توں توں رمیض کے تخیل میں اس کا چہرہ مکروہ سے مکروہ تر ہوتا جارہا تھا۔وریام چسکے لے لے کر سنا رہا تھا کہ کس طرح ستپال شراب کے نشے میں ریستوران میں ہنگامہ کرتا رہا۔ کیسے اس نے خواتین کے ساتھ دست درازی کی۔ ریستوران کی میزیں الٹا دیں۔ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ ہاتھا پائی کی۔ اس کی ٹیکسی کے شیشے توڑے۔

یہ کہانی صریحاً نشے میں دھت ایک جانور کی داستان لگتی تھی۔

ستپال اپنے حلقوں میں کسی حد تک قابل احترام شخصیت کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور سب کو معلوم تھا کہ کبھی کبھار وہ لچر پن کا مظاہرہ بھی کرسکتا ہے۔لیکن جو شعلہ بیانی ایڈمنسٹریٹر نے کی تھی وہ کسی صورت بھی ستپال کے مزاج اور شخصیت سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

رمیض نے ایڈمنسٹریٹر کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ رکھی تھی اور اس کی نظریں وریام کے آرپار ہوتی لگ رہی تھیں۔ جوں جوں ایڈمنسٹریٹر اپنی کہانی میں رنگ بھر رہا تھا توں توں فنانس ڈائریکٹر بے یقینی کا شکار ہوتا جارہا تھا اور جیسے ہی ایڈمنسٹریٹر نے یہ کہا کہ جب وہ لوگ ستپال کو شہر واپس لانے کے لئے اس کے

قریب پہنچے تو وہ ان کے ساتھ بھی دست و گریبان ہونے لگ گیا تو رمیض کو پختہ یقین ہو گیا کہ ایڈمنسٹریٹر کا ایک ایک لفظ جھوٹ پر مبنی ہے۔

وریام نہ تو پولیس سٹیشن گیا تھا۔ نہ ہی اس ریستوران میں گیا تھا جہاں بقول اس کے ستیپال شراب پی کر غل غپاڑہ کرتا رہا تھا۔ نہ ہی وہاں کوئی محکمہ ٹیلیگراف کا کلرک آیا تھا۔ نہ ہی وہاں شیشے ٹوٹے تھے اور نہ ہی ستیپال کو رسیوں سے باندھ کر وہاں سے لیجایا گیا تھا۔

جونہی فنانس ڈائریکٹر پر اس جھوٹ کی حقیقت عیاں ہوگئی تو اسے پھر ایک مرتبہ شدید خوف نے آن گھیرا۔ کچھ دیر پہلے محسوس ہونے والی مردار کی بدبو پھر اس کے حواس پر چھانے لگی تھی۔ وریام کچھ عجیب و غریب انداز میں بار بار اپنی کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہاتھ میں پکڑے اخبار سے ٹیبل لیمپ کی روشنی سے اپنے چہرے کو بچا رہا ہے۔ فنانس ڈائریکٹر کے ذہن میں ایک بڑا سا سوالیہ نشان ابھر آیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اتنی رات گئے وہ تھیٹر میں واپس کیوں آیا ہے اور اس سے مسلسل جھوٹ کیوں بولے جا رہا ہے؟

رمیض کے کانوں میں کسی نادیدہ خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اب وہ وریام کی کہانی بالکل نہیں سن رہا تھا۔ اس وقت اس کی نظروں کا محور صرف وریام کا چہرہ تھا جسے وہ اخبار سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رمیض کو اب یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ کہانی پیش کرنے کا انداز یقیناً وریام کا اپنا نہیں ہے۔

باوجودیکہ وریام نے ٹوپی اپنی پیشانی پر جھکا رکھی تھی اور بار بار اخبار سے اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فنانس ڈائریکٹر اس کے چہرے کی دائیں جانب ایک نیلا داغ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایڈمنسٹریٹر کا عمومی طور پر سرخی مائل چہرہ اس وقت کاغذ کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ فنانس ڈائریکٹر کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال ابھرا کہ یہ شخص وریام نہیں ہے۔

ان تمام چیزوں کے علاوہ بھی وریام کی شخصیت میں رونما ہونے والی تبدیلی کے متعلق رمیض کے دماغ میں کچھ کھٹک رہا تھا لیکن وہ اس بات کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

وریام اس دوران اپنی کہانی جاری رکھے ہوئے تھا۔ ''اور آخر کار اس پر قابو پا لیا گیا۔ رسیوں سے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے گاڑی میں پھینک دیا گیا''۔

رمیض نے اچانک ہاتھ بڑھا کر اپنی میز پر لگی الیکٹرک گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ رات کی اس خاموشی میں گھنٹی کی آواز پوری عمارت میں گونجنی چاہیے تھی۔ لیکن رمیض کی بدقسمتی کہ گھنٹی نے معمولی سی آواز بھی نہ نکالی۔

فنانس ڈائریکٹر کی یہ چالاکی وریام سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے شعلے اگلتی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔" یہ گھنٹی تم کس خوشی میں بجا رہے ہو؟"

میرا ہاتھ غلطی سے اس بٹن پر جا پڑا ہے۔لرزتی آواز میں فنانس ڈائریکٹر نے جواب دیا اور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔"یہ تمہارے چہرے پر کیا ہوا ہے؟"

نظریں چراتے ہوئے وریام نے جواب دیا۔ گاڑی برف پر پھسل گئی تھی۔ اس دوران میرا چہرہ دروازے کے ہینڈل سے ٹکرا گیا تھا۔

"جھوٹ بول رہا ہے" فنانس ڈائریکٹر سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اچانک باہر کو ابل پڑیں اور اسے تمام جسم پر دنیا بھر کے حشرات رینگتے محسوس ہونے لگے۔ اس کی نگاہیں وریام کی کرسی کے عقب میں پڑنے والے سائے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ کرسی کا سایہ تو واضح طور پر نظر آ رہا تھا لیکن جہاں وریام کے سر کا سایہ ہونا چاہیئے تھا وہاں لیمپ کی تیز روشنی میں خالی فرش چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔

رمیض سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر یہ اعلان کرے کہ وریام کا سایہ نہیں ہے۔

وریام فوراً بھانپ گیا کہ اس کا پول کھل چکا ہے۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فنانس ڈائریکٹر بھی فی الفور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میز سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اپنے بیگ کو اس نے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

کم بخت کو پتہ چل گیا ہے۔ یہ ہمیشہ ہی عقل کے معاملے میں مجھ سے دو قدم آگے رہا ہے۔ زہر آلود لہجے میں وریام بڑبڑایا اور اچانک چھلانگ لگا کر دروازے کے پاس جا پہنچا۔ اس نے دروازے کو اندر سے تالہ لگا دیا۔ فنانس ڈائریکٹر کی توجہ باغیچے کی جانب کھلنے والی کھڑکی پر مرکوز ہو گئی۔ کھڑکی کے باہر چاندنی میں نہائی ایک سنہری بالوں والی برہنہ دوشیزہ کھڑی تھی۔ جس نے اپنا بازو کھڑکی کے کھلے پاٹ میں گھسا رکھا تھا اور چٹخنی کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

رمیض کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ٹیبل لیمپ کی روشنی دھیمی پڑتی جا رہی ہے اور اس کی میز الٹنے کو ہے۔ ایک سرد لہر اس کے سر سے پاؤں تک مسلسل دوڑ رہی تھی۔ نجانے اس میں کہاں سے اتنی ہمت آ گئی تھی کہ وہ فرش پر گرا نہیں اور اس نے اپنی تمام قوت کو یکجا کرنے کے بعد پرزور آواز میں چیخنے کی کوشش کی۔"مدد۔ مدد"۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی آواز حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی۔

وریام جو کہ دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔ اچانک ہوا میں معلق ہو گیا اور تیرتا ہوا اس دوشیزہ کے پاس پہنچ گیا۔ رمیض کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ کسی نامانوس زبان میں بڑبڑایا۔"ناگ، ماگ،

ناگ''۔

وریام کی بات سننے کے بعد سنہری بالوں والی نے اپنا سر بھی کھڑکی کے اندر گھسا دیا۔ اس کا بازو اچانک سبزی مائل ہوگیا۔ اس کی رگوں میں سرخی کی بجائے سیاہی مائل سیال نمایاں تھا جس کے نقش و نگار پورے بازو پر نمایاں ہوگئے تھے۔ بازو اپنے آپ ہی لمبا ہونے لگ گیا۔ آخرکار جب اس نے کھڑکی کھول ہی لی تو رمیض کے حلق سے ایک ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔

کھڑکی کھلنے کے بعد کمرے میں تازہ ہوا کے جھونکے کی بجائے کسی گلے سڑے مردار کا تعفن پھیل گیا۔ سنہری بالوں والی مردہ دوشیزہ اب کمرے کے اندر گھس آئی تھی۔ رمیض کو اس کے سینے پر بڑے بڑے سیاہ۔ سبز اور نیلے داغ واضح طور پر نظر آرہے تھے۔

یہ مردہ حسینہ کسی منحوس سائے کی طرح رمیض کی جانب بڑھ ہی رہی تھی کہ باغیچے سے مرغے کی مسحورکن اذان نے فضا کو مترنم کردیا۔ اس آواز کے سنتے ہی سنہری بالوں والی مردہ حسینہ کا چہرہ ٹیڑھا ہوگیا۔ اس کے حلق سے بے ربط مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ دوسری طرف فضا میں معلق وریام دھڑام سے زمین پر آن گرا۔ ادھر مرغا بار بار بلند آواز میں سورج کی آمد کا اعلان کررہا تھا اور ادھر سنہرے بالوں والی دوشیزہ کی آواز مرغ کی اذان میں دبتی جارہی تھی۔ مرغ نے جب تیسری مرتبہ اذان بلند کی تو وہ دوشیزہ دھوئیں میں تحلیل ہوگئی اور کھڑکی سے باہر پرواز کرگئی۔ اس کی تقلید میں ہوا میں غوطے کھاتا ہوا وریام بھی کھڑکی کے راستے جہنم واصل ہوگیا۔

برف کی مانند سفید بالوں والا بوڑھا آدمی جس کا نام چند لمحے قبل رمیض تھا دوڑتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ راہداری کو پھلانگتا اور سیڑھیوں سے کسی فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا وہ باغیچے تک جا پہنچا۔ گھاس پر اوندھے منہ لیٹے ہوئے اس وقت اس کے خوف کی انتہا ناقابل بیان تھی جب وریام کا بدبودار مردہ جسم اس کے اوپر آن گرا۔ کچھ جدوجہد کے بعد رمیض نے اس مردہ جسم سے چھٹکارہ حاصل کرلیا اور کمان سے نکلے تیر کی مانند دوڑتا ہوا گلی میں پہنچ گیا۔

تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے کے بعد رمیض خود کو قدرے بہتر حالت میں محسوس کرنے لگ گیا۔ چوک میں کھڑی ٹیکسی کی سبز روشنی دیکھ کر رمیض کو لگا کہ اسے دنیا بھر کی راحتیں مل گئی ہیں۔ وہ بھاگم بھاگ اس نجات دہندہ کے پاس پہنچ گیا۔ ''ریلوے سٹیشن! میٹر کے علاوہ چائے کے پیسے بھی دوں گا''۔ دایاں ہاتھ دل پر رکھے اکھڑے اکھڑے سانسوں سے سفید بالوں والا بوڑھا ڈرائیور سے التجا کررہا تھا۔

''میں واپس گیراج جارہا ہوں''۔ ڈرائیور نے بیزاری سے جواب دیا۔

رمیض نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا بیگ کھولا اور پچاس کا نوٹ نکال کر ادھ کھلی کھڑکی سے ڈرائیور

کو تھماتے ہوئے وہ بولا۔ ''یہ سلامی قبول کیجئے''۔ چند لمحوں میں ٹیکسی ہوا کے دوش پر اڑی جا رہی تھی۔ ڈیش بورڈ کے اوپر آویزاں آئینے میں کبھی ڈرائیور کی مسکراتی آنکھیں اور کبھی رمیض کی وحشت سے بھری آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

ریلوے سٹیشن پہنچنے کے بعد رمیض دوڑتا ہوا ٹکٹ گھر کی کھڑکی کی جانب لپکا اور بولا۔ ''براہ کرم فرسٹ کلاس کی ایک ٹکٹ۔ کھڑکی میں دس دس کے نوٹ خاتون کے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ یہ سارے رکھ لو اور خدا کے لیئے مجھے ٹکٹ دے دو۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد پلیٹ فارم نمبر چار سے شور مچاتی ریل گاڑی رمیض کو اپنی آغوش میں چھپائے رات کے اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

کے حال بھی جانتا ہے۔ میں نے آج تک غیر ملکی کرنسی کو ہاتھ نہیں لگایا"۔ وہ بدحواسی میں قمیض کے بٹن کبھی کھولتا اور کبھی بند کرتا اور وقتاً فوقتاً سینے پر صلیب کا نشان بھی بنا رہا تھا۔

"لیتا ہوں۔ لیتا ہوں۔ رشوت لیتا ہوں"، نکانور گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔"لیکن صرف اپنی ملکی کرنسی روبل میں۔ خدا مجھے اسی کی سزا دے رہا ہے۔ خدا! مجھے معاف کر دے۔ یا خدا! مجھے معاف کر دے"۔ وہ دیوانوں کی طرح زور زور سے چیخنے لگ گیا۔"اور وہ ہمارا سیکرٹری! وہ بھی خوب ہے۔ مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ پوری انتظامی کمیٹی ہی چوروں سے بھری پڑی ہے۔لیکن یہ غیر ملکی کرنسی والی بات سراسر زیادتی ہے"۔

"زیادہ ڈرامہ بازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔سیدھی طرح بتاؤ کہ یہ ڈالر تمہارے پاس کہاں سے آئے ہیں؟"

یہ سنتے ہی وہ فرش پر گھٹنوں کے بل اکڑوں ہو گیا اور کسی تھکے ماندہ شکاری کتے کی مانند زبان منہ سے نکالے کمرے کے چکر لگانے لگ گیا۔

"چاہتے ہو تو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں نے غیر ملکی کرنسی نہیں لی کمرے کا فرش چاٹ کر دکھا دیتا ہوں اور خدارا میرا یقین کرو کہ وہ جو ترجمان ہے وہ یقیناً شیطان ہے"۔

میز کے عقب سے آواز آئی۔"دیکھو ہمارے صبر کا امتحان نہ لو۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم انسانوں کی زبان میں بولنا شروع کر دو"۔

نکانور کو اچانک ایک دورہ سا پڑ گیا۔ وہ الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چلانے لگ گیا۔ "وہ رہا۔ پکڑو۔ پکڑو۔ پکڑو اس کو"۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا اور سارا بدن رعشے کی حالت میں تھا۔ وہ بار بار ہوا میں صلیب کا نشان بناتا ہوا بلند آواز میں کوئی دعا پڑھ رہا تھا۔صورت حال سے اب واضح ہو چکا تھا کہ نکانور کسی قسم کی گفتگو کے قابل نہیں ہے۔ اسے ایک دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا جہاں وہ نسبتاً سکون میں آ گیا۔

سوالات کرنے والوں نے فوری طور پر فلیٹ نمبر ۵۰ کا ایک چکر بھی لگایا تھا۔ وہاں انہیں کسی ذی روح کا نشان نہیں ملا۔ اور نہ ہی کسی پڑوسی نے وہاں کسی کی موجودگی کی تصدیق کی۔ مرحوم مائیکل کا کمرہ سربمہر تھا۔ فلیٹ کی حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ وہاں گذشتہ کئی دنوں سے کسی کا آنا جانا نہیں ہوا۔

شام کے وقت نکانور کو پروفیسر ستارین کے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ہسپتال میں نکانور کا رویہ شدید جارحانہ صورت اختیار کر گیا۔ پروفیسر ستارین کے کہنے پر اسے دو مرتبہ ٹیکہ لگایا گیا۔ تب کہیں آدھی رات کے بعد کمرہ نمبر 119 میں وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ ہاں البتہ وہ کبھی کبھی اذیت سے کراہ ضرور رہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی اور جوں جوں اس کی نیند گہری ہوتی جا رہی تھی توں توں اس کا کراہنا بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر جب وہ گہری نیند سو گیا تو اسے کمرے میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔

نیند کی گہرائیوں میں تیرتا ہوا نکانور خوابوں کی دنیا میں جا پہنچا۔ وہ ایک خوبصورت مینا کاری سے منقش دروازے کے پاس کھڑا تھا اور اس کے پیچھے کچھ لوگ سنہری رنگ کے بگل اٹھائے شادی بیاہ والی کوئی دھن بجا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد موسیقی اچانک مدھم پڑ گئی اور چھت میں نصب لاؤڈ سپیکر سے بھاری بھرکم آواز نے اعلان کیا۔۔۔

''خوش آمدید نکانور! لاؤ نکالو غیر ملکی کرنسی''۔

نکانور کے سامنے دروازہ کھل گیا اور وہ خوبصورت جھومر نما فانوسوں سے روشن ایک تھیٹر کے ہال میں داخل ہو گیا۔ تھیٹر اگرچہ بہت بڑا نہیں تھا مگر انتہائی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سٹیج پر جامنی رنگ کا پردہ آویزاں تھا جس پر سنہری ستارے جا بجا چمک رہے تھے۔ ہال میں تماشائی بھی موجود تھے۔

اچنبھے کی بات یہ تھی کہ ہال میں موجود تمام تماشائی صرف مرد تھے۔ اور حیران کن طور پر سب کے سب باریش تھے۔ ایک اور عجیب بات یہ تھی کہ ہال میں بیٹھنے کو ایک بھی کرسی نہیں تھی۔ سب تماشائی فرش پر بیٹھے تھے۔

نکانور کچھ دیر احمقوں کی طرح منہ کھولے دائیں بائیں دیکھتا رہا اور پھر دوسروں کی تقلید کرتے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا۔ حاضرین میں سے کسی نے بھی نکانور پر دھیان نہیں دیا۔ گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی مسرور کن آواز سنائی دینے لگی اور ہال میں تاریکی چھا گئی۔ سٹیج پر لگا پردہ آہستہ آہستہ سرکنے لگ گیا۔ سٹیج تیز روشنی میں نہا گیا۔ گھنٹیوں کے مدھر سروں کی دھن اور سٹیج پر رکھی خوبصورت آرام دہ کرسی اور میز کسی شاہانہ باغیچے کا تاثر دے رہے تھے۔

سٹیج پر ایک خوبرو فن کار نیلے رنگ کا خوش وضع لباس پہنے نمودار ہوا۔ ہال میں بیٹھے تماشائیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ سب سٹیج کی جانب متوجہ ہو گئے۔ فن کار نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور ہونٹوں پر خوشگوار مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں بھئی۔ سب لوگ بیٹھے ہو نا؟''

''جی ہاں۔ بیٹھے ہیں'' تماشائیوں کی طرف سے متفقہ جواب آیا۔

''ہممممم''۔ بظاہر گہری سوچ میں ڈوبے فن کار نے کہا۔ ''یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ تم لوگ اکتا کیوں نہیں جاتے؟ جاؤ عام انسانوں کی طرح باہر نکلو۔ کسی باغیچے میں جاؤ قدرت کے حسین رنگوں کا مزہ لوٹو۔ کھچا کھچ بھرے اس ہال کے فرش پر بیٹھے تمہیں کیا مل رہا ہے؟ یا پھر ہمارے تھیٹر کا شو ہی ایسا دل

چسپ ہے کہ تم لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں کھنچے چلے آتے ہو؟ بہرحال میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ پسند تو آخر اپنی اپنی ہی ہوتی ہے نا''۔ وہ فلسفیانہ انداز میں بول رہا تھا۔ اچانک اس کی آواز بھاری ہوگئی۔ اس کے بولنے کا انداز بھی بدل گیا۔ اور اس نے مسکراتے ہوئے بلند آواز میں اعلان کیا۔

''ہاں تو جناب! ہمارے شو کے اگلے فن کار ہیں۔ جناب نکانور بوس ۔ جو انتظامی کمیٹی برائے سرکاری رہائش گاہ کے صدر اور ملک کے مشہور ڈائننگ کلب کے بھی اعزازی صدر ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ نکانور صاحب سٹیج پر تشریف لائیں۔

ہال پرجوش تالیوں سے گونج اٹھا۔ حیرت زدہ نکانور ہونقوں کی مانند تماشائیوں کو گھور رہا تھا۔ جبکہ سٹیج پر کھڑا فن کار نکانور کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے سٹیج پر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ نکانور یکسر سمجھ نہیں پایا کہ یہ کیسے ہوا۔ تاہم چند لمحوں بعد وہ سٹیج پر کھڑا تھا۔

سامنے اور نیچے سے آنے والی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پورا ہال تاریکی میں ڈوب گیا ہے۔

''ہاں تو میرے محترم نکانور! آؤ آگے بڑھو اور آج کی تاریخ میں ایک نئی مثال رقم کر ڈالو''۔ فن کار بول رہا تھا۔ ''لاؤ نکالو غیر ملکی کرنسی''۔ ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ نکانور نے ایک لمبی آہ بھری اور بولا۔ ''میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔''

وہ ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ہال میں چیخوں، قہقہوں اور مغلظات کا طوفان بپا ہوگیا۔ نکانور کو خاموش ہو جانا پڑا۔

نوجوان فن کار نے نکانور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ خدا کی قسم کھا کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غیر ملکی کرنسی آپ کے پاس نہیں ہے؟''

''جی! بالکل ٹھیک۔ نہیں ہے میرے پاس غیر ملکی کرنسی''۔ نکانور نے جواب دیا۔

''اچھا تو پھر اس سوال کا جواب دیجئے'' ۔ فن کار بولا'' ۔ کہ آپ کے فلیٹ کے غسل خانے سے جو چار سو ڈالر برآمد ہوئے وہ کہاں سے آئے تھے؟''۔

''کالے علم سے''۔ ہال سے ایک تمسخرانہ آواز آئی۔

''بالکل صحیح کہا۔ کالے علم کے زور سے''۔ نکانور فوراً بولا۔ ''وہ دھاری دار کوٹ والا ترجمان یقیناً شیطان کا کوئی روپ ہے۔ یہ اسی کی کرتوت ہے''۔

یہ سن کر ہال میں دوبارہ شور برپا ہوگیا۔

جب شور کچھ کم ہوا تو فن کار بولا۔

واہ بھئی واہ۔ کیا دل چسپ قصہ ہے۔ کسی دھاری دار کوٹ والے ترجمان نے کالے علم کے زور سے چار سوڈالر ان حضرت کے فلیٹ کے غسل خانے میں پہنچا دیئے۔ بہت خوب۔ بہت خوب۔ وہ ہال میں بیٹھے تماشائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ہاں تو آپ لوگ جو خود غیر ملکی کرنسی کے ماہر ہیں اس کہانی کے بارے میں کیا کہیں گے؟"۔

''ہم کسی غیر ملکی کرنسی کے ماہر و اہر نہیں ہیں''۔ غصے میں بھری کئی آوازیں ہال سے ابھریں۔ لیکن یہ کہانی یقیناً بڑی زبردست گھڑی گئی ہے۔

''جی بالکل ٹھیک کہا۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ سو فیصد متفق ہوں''۔ نوجوان فن کار بولا۔ ''اب میں آپ لوگوں سے پوچھنا چاہوں گا کہ کالے علم کے زور سے کسی کے گھر کیا بھیجا جاسکتا ہے؟''۔

''ناجائز بچہ!'' پورا ہال یک آواز ہو کر بول اٹھا۔

''شاباش! بالکل ٹھیک کہا آپ نے''۔ فن کار نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ناجائز بچہ۔ بے نام خط اور۔۔۔۔ شائید اور بھی بہت کچھ کالے علم کی طاقت سے کسی کے گھر بھیجا جاسکتا ہے۔ لیکن غیر ملکی کرنسی ۔۔کبھی نہیں۔۔فن کار اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے انتہائی افسوس کے عالم میں نکانور کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔۔

''آئے۔ ہائے نکانور۔ آپ نے تو میرا دل ہی توڑ دیا ہے۔ میں نے تو آپ سے بہت امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔۔ لیکن آپ؟؟؟''

ہال میں پھر سے شور مچ گیا اور سیٹیاں بجنے لگیں۔

''یہ رشوت خور ہے۔ غیر ملکی کرنسی کھاتا ہے''۔ ہال سے صدائیں آرہی تھیں۔ ''ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی ہم بے قصور بھی مارے جارہے ہیں''۔

''مت کہو اسے برا بھلا''۔ رقت آمیز آواز میں نوجوان فن کار بولا'۔'اسے سمجھ آ گئی ہے۔ یہ بہت جلد سچ اگل دے گا''۔ اس نے نکانور کی آنسوؤں بھری نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور اسے اپنی جگہ پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد فن کار نے میز سے گھنٹی اٹھائی۔ جسے بجاتے ہوئے اس نے اعلان کیا۔۔ وقفہ۔ وقفہ۔ اور زمین پر تھوکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ''الو کا پٹھا''۔

حیرت زدہ نکانور جسے اچانک تھیٹر کا فن کار بنا دیا گیا تھا، ہال کے فرش پر واپس جا بیٹھا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے پورے ہال میں دھند چھا گئی ہے اور دیواروں پر جا بجا سرخ شعلوں سے لکھی تحریر ''رشوت خور'' ابھر آئی ہے۔

کچھ دیر بعد پردہ دوبارہ اٹھ گیا۔ سٹیج پر وہی نوجوان فن کار نمودار ہوا اور اس نے اعلان کیا۔۔۔

''اب میں دعوت دیتا ہوں اپنے انتہائی محترم فن کار جناب دانیال صاحب کو''۔ دانیال کی عمر تقریباً پچاس برس تھی۔ لباس سے لگتا تھا کہ وہ سلیقہ شعار اور نفاست پسند شخصیت کا مالک ہے۔ سر کے بال اور داڑھی کچھ بے ہنگم انداز میں بڑھے ہوئے تھے۔

''ہاں تو میرے معزز دانیال صاحب''۔ نوجوان فن کار نے اسے مخاطب کیا۔ ''گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے یہاں مہمان بنے بیٹھے ہو اور ابھی تک تم نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ پرلے درجے کے رشوت خور اور ڈالر چور ہو۔ ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن تمہیں کیا؟ تمہارا اس سے کیا واسطہ؟ ملک رہے یا نہ رہے۔ تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''۔

''بدقسمتی سے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ نہ آپ کے لئے اور نہ ہی ملک کے لئے۔ کیونکہ غیر ملکی کرنسی میرے پاس نہیں ہے''۔ پرسکون لہجے میں دانیال نے جواب دیا۔

''تھوڑے بہت ہیرے تو ضرور ہوں گے''۔ فن کار نے پوچھا۔

''ہیرے بھی نہیں ہیں''۔ دانیال بولا۔

نوجوان فن کار نے منہ بسورتے ہوئے سٹیج کے عقبی حصے کی جانب اشارہ کیا اور دو مرتبہ تالی بجائی۔ سٹیج پر سادہ سے لباس میں ملبوس ایک درمیانہ قد کی خاتون نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات تھے۔ دانیال اسے پلک جھپکے بغیر دیکھتا جارہا تھا۔

''کون ہے یہ خاتون؟''۔ فن کار نے دانیال سے پوچھا۔

''میری بیوی''۔ دانیال نے ناپسندیدہ نگاہوں سے خاتون کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''مادام!'' خاتون سے مخاطب ہوتے ہوئے فن کار نے کہا۔

''ہم آپ کو تکلیف دینے کی معذرت چاہتے ہیں۔ دراصل ہم آپ سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ دانیال کے پاس رشوت کی کمائی کے ڈالر اور ہیرے جواہرات ہیں یا نہیں؟''۔

''نہیں ہیں۔ اس کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ اس نے سرکاری خزانے میں جمع کرادیا تھا''۔ پریشان حال خاتون نے جواب دیا۔

''اچھا۔ اگر ایسا ہے تو پھر ـــــــ۔ فن کار بولا۔ ''تو پھر ہمیں دانیال صاحب کو الوداع کہنا پڑے گا۔ وہ تھیٹر سے جاسکتے ہیں''۔ اس نے شاہی دربار کے کسی فراش کی طرح مودبانہ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دانیال نے ایک لمبی سانس بھری اور دروازے کی جانب چل دیا۔

''ایک منٹ۔ صرف ایک منٹ اور۔ نوجوان فن کار نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی اجازت سے ایک چھوٹا سا تماشہ پیش کرنا چاہتا ہوں''۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سٹیج کے عقبی حصے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تالی بجائی۔ سٹیج پر ایک نوجوان لڑکی بیش قیمت لباس اور زیورات پہنے نمودار ہوئی۔ اس نے ہاتھوں میں ایک سنہری رنگ کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ ٹرے پر رنگدار فیتے سے بندھا ایک پیکٹ اور ہیروں سے مرصع چند زیورات رکھے تھے۔ ہیروں سے سرخ اور زرد رنگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ دانیال کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

''لیجئے جناب! اٹھارہ ہزار ڈالر اور ہیروں سے جڑے یہ زیورات جن کی مالیت صرف چالیس ہزار ڈالر بنتی ہے''۔ قہقہے لگاتی آنکھوں کے ساتھ نوجوان فن کار نے اعلان کیا۔'' میرے محترم دانیال صاحب نے انہیں اپنی محبوبہ مائدہ کے فلیٹ میں چھپا رکھا تھا۔ محترمہ مائدہ نے ایک فرض شناس شہری ہونے کے ناطے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے۔ جس کے لیئے مادام! ہم آپ کے بے حد شکرگزار ہیں''۔ سرخم کرتے ہوئے نوجوان فن کار نے مائدہ کا شکریہ ادا کیا۔ دوشیزہ نے بھی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ جواباً شکریہ ادا کیا۔

''ہاں تو میرے محترم عزت مآب جناب دانیال صاحب''۔ فن کار دانیال سے مخاطب ہوا۔''اب آپ کے چہرے سے نقاب اتر چکا ہے اور ہم سب اس حقیقت کو جان چکے ہیں کہ آپ پرلے درجے کے جھوٹے، مکار اور رشوت خور انسان ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے ڈھٹائی کے ساتھ اپنی شرافت کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہے ہو۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے۔ واپس اپنے گھر چلے جاؤ۔ تمہاری بیوی گھر میں جو تمہارا حشر کرے گی وہی تمہاری سزا ہے''۔

دانیال لڑکھڑا کر گرنے ہی والا تھا کہ کسی نے اسے سہارا دے کر گرنے سے بچا لیا۔ سٹیج پر پردہ گر گیا اور شو میں حصہ لینے والے تمام فنکار اس پردے کے پیچھے روپوش ہو گئے۔

تالیوں کی گونج اتنی شدید تھی کہ چھت پر نصب فانوس لرزنے لگ گئے تھے۔ جب پردہ دوبارہ اٹھا تو نوجوان فن کار کے سوا سٹیج پر اور کوئی نہیں تھا۔ تالیوں کا شور مدھم ہونے پر وہ بولا۔۔۔

''ہاں تو حضرات ابھی ہم نے دانیال کی شکل میں آپ کے سامنے ایک رشوت خور گدھے کو پیش کیا۔ میں نے کل شام اس کو یہ بات سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ رشوت کی دولت، خصوصاً غیر ملکی کرنسی، آخر کار ایک نہ ایک دن پیٹ کو پھاڑتی ہوئی باہر آ ہی جاتی ہے۔ اس کم بخت کو اچھی خاصی تنخواہ ملتی ہے اور زندگی کی تقریباً ہر آسائش اسے میسر ہے۔۔ دو کمروں کا فلیٹ، بیوی، خوبصورت محبوبہ۔ لیکن اس ناعاقبت اندیش نے سکون کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹنے کی بجائے لالچ کے گھناؤنے پنجوں میں الجھ کر نہ صرف اپنی پیشہ ورانہ زندگی تباہ کر لی ہے بلکہ گھریلو زندگی میں بھی مجھے اس پر ہر طرف سے جوتے برستے نظر آ رہے

ہیں۔

''ہاں تو جناب ہے کسی میں اتنی ہمت کہ خود سے اپنا جرم قبول کرلے اور رشوت سے کمائی گئی غیر ملکی کرنسی سرکاری خزانے میں جمع کروا دے؟''۔

ہال میں خاموشی چھائی رہی۔فن کار نے کچھ لمحے انتظار کرنے کے بعد اعلان کیا کہ اب ملک کے مشہور فن کار کیرالہ ہمارے قومی شاعر پشکن کی مشہور زمانہ نظم آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔۔

سٹیج پر ایک جسیم مرد نمودار ہوا۔اس نے سیاہ رنگ کا لمبا کوٹ اور سفید ٹائی زیب تن کر رکھی تھی۔نو وارد فن کار کرب زدہ چہرہ لئے بھاری بھر کم لہجے میں کچھ یوں بولنا شروع ہوا۔۔

میں منکر نہیں کہ میری جوانی کا کچھ یوں امتحان ہوا

سو خرافوں سے ملا تب کہیں دل کو کچھ اطمینان ہوا

اس کے علاوہ بھی نجانے کیا کیا لوفر شاعری یہ فن کار پشکن مرحوم سے منسوب کرتا رہا۔نکانور کو یہ سن کر ابکائیاں آنے لگی تھیں اور اسے پشکن کا نام بھی کچھ ناگوار سا لگنے لگا تھا۔وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس فن کار کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی اور اس کے بیان کردہ اشعار میں سفلہ پن۔کمینگی اور بے حیائی انتہا کو چھونے لگی تھی۔وہ خود ہی سوال کر رہا تھا اور خود ہی جواب دے رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔۔۔

اوپر بھی میں۔نیچے بھی میں۔آگے بھی میں۔پیچھے بھی میں۔باپ بھی میں۔بیٹا بھی میں۔ہم بھی میں۔تم بھی میں۔جو تیرے پاس وہ بھی میرا۔جو مل گیا وہ بھی میرا۔جو نہ ملا وہ بھی میرا۔میری بیوی میری بیوی۔تیری بیوی میری بیوی۔

کچھ دیر بعد فن کار پر ایک عجیب ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی۔اس نے ٹائی کھول کر زمین پر دے ماری اور زور زور سے چلانے لگا!

چابیاں! میری چابیاں!! تیری چابیاں۔سب چابیاں۔میری چابیاں۔جب چیخ چیخ کر وہ تھک گیا تو نوجوان فن کار نے ہاتھ سے اسے سٹیج کے پچھلے دروازے کی جانب چلے جانے کا اشارہ کیا اور خود کہنے لگا۔۔۔

''ہم لوگوں نے ابھی مایہ ناز فن کار کیرالہ کی دل کش آواز میں ملک کے گمنام شاعروں کا وہ کلام سنا ہے جو وہ آج تک شرمندگی کے مارے خود پیش نہیں کر سکے تھے۔اس مجموعے کا عنوان ہے''بانگ خرافت''۔ان تمام شاعروں میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ ہر شے کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور بلا شرکت غیرے ہڑپ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔لیکن دوستو! عملی زندگی میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔دانیال کی درخشاں مثال آپ

کے سامنے ہے۔ میرا آپ سب لوگوں کو مشورہ ہے کہ رشوت اور بے ایمانی کا جتنا مال آپ نے اکٹھا کر رکھا ہے وہ خود ہی سرکاری مال خانے میں جمع کروا دیں اور دانیال پر نازل ہونے والے عذاب سے عبرت حاصل کریں۔

نجانے اس شاعری کا اثر تھا یا نوجوان کی اثر انگیز تقریر کا کمال کہ ہال سے ایک آواز آئی۔

''میں تیار ہوں۔ میں رشوت کا سارا مال لوٹانے کو تیار ہوں''۔

''ارے واہ! میں صدقے جاؤں آپ کے۔ آئیں جناب سٹیج پر تشریف لائیں''۔ فن کار نے اس آدمی کو مدعو کیا۔ سٹیج پر ایک چھوٹے قد کا سفید بالوں والا مرد نمودار ہوا جس نے غالباً تین ہفتوں سے شیو نہیں کی تھی۔

''کیا نام ہے جناب آپ کا؟'' فن کار نے پوچھا۔

''بندے کو عاشق کہتے ہیں''۔ مہذبانہ انداز میں سٹیج پر نمودار ہونے والے نے جواب دیا۔

''ارے واہ! کیا خوب نام پایا ہے اور غالباً کرتوت بھی خوب ہوں گے؟''۔

''میں سارا مال رضاکارانہ دے رہا ہوں''۔ سر جھکائے عاشق نے جواب دیا۔

''کیا لوٹا رہے ہو؟''

''ایک ہزار ڈالر اور سونے کے بیس سکے''۔

''زندہ باد! بس اتنے ہی ہیں یا اور بھی ہیں تمہارے پاس؟'' نوجوان فن کار عاشق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ نکانور کو ایسا لگا کہ جیسے فن کار کی آنکھیں شعلے اگل رہی ہیں۔ کچھ شعاعیں عاشق کو بھی اپنے جسم میں پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہال میں بیٹھے تماشائیوں نے اپنی سانسیں روک لیں۔

''یقین آ گیا! یقین آ گیا!''

فن کار نے بالآخر اپنی شعلہ فشاں نظریں عاشق سے ہٹا لیں اور بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہ آنکھیں جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ میں پہلے بھی کئی مرتبہ آپ لوگوں کی توجہ اس جانب دلا چکا ہوں کہ آپ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ آپ اپنی آنکھوں کی قدر نہیں کرتے۔ یہ جان لو کہ انسانی زبان حقیقت کو چھپا سکتی ہے لیکن آنکھیں کبھی نہیں۔ جب آپ سے اچانک کوئی سوال پوچھا جاتا ہے تو آپ ایک لمحے میں اپنے آپ پر قابو پا لیتے ہو اور جانتے ہو کہ سچ کو کیسے چھپانا ہے۔ چہرے پر ایک بھی شکن لائے بغیر تسلسل سے جھوٹ بولے چلے جاتے ہو اور اپنی لفاظی سے جھوٹ کو سچ ثابت کر دیتے ہو۔ لیکن آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں اور سچ سورج کی کرنوں کے مانند آنکھوں سے پھوٹ پڑتا ہے۔ ان پر ذرا سا غور کرنے کی

ضرورت ہوتی ہے اور جھوٹ وہیں پکڑا جاتا ہے"۔

اس اثر انگیز تقریر کے بعد نوجوان فن کار نے قدرے نرم انداز میں عاشق سے پوچھا۔" کہاں چھپا رکھے ہیں؟"۔

"اپنی چچی کے گھر میں"۔ عاشق نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔

"یہ وہی چچی تو نہیں جس کا نام کلاؤدی ہے؟"

"ہاں! وہی ہے"

"آ، ہاں! یاد آیا۔ چھوٹا سا خوبصورت گھر جس کے سامنے ایک باغیچہ بھی ہے۔ جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ تو رقم چچی کے گھر میں کہاں چھپا رکھی ہے؟"

"تہہ خانے کی انگیٹھی کے پیچھے ایک لکڑی کے ڈبے میں"۔

فن کار نے ہاتھ ہوا میں بلند کئے اور روہانسی آواز میں بولا۔" ذرا ملاحظہ کیجئے جناب! کیسا ظلم ہے یہ۔ کیا فائدہ ایسی جگہ پر نوٹ چھپانے کا؟ انگیٹھی کی تپش اور دھوئیں سے تو نوٹوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تم لوگوں پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔؟۔ بچے ہو تم لوگ۔ خدا کی قسم بالکل بچے ہو"۔

اپنی غلطی کا احساس ہو جانے پر عاشق غمگین سا چہرہ لیئے، سر جھکائے کھڑا تھا۔

"نوٹوں کی صحیح جگہ جناب والا"۔ فن کار گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ بینک میں ہوتی ہے جہاں ایک مخصوص درجہ حرارت ہوتا ہے اور آہنی الماریاں چاہت کے ساتھ نوٹوں کی آمد کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ چچی کے گھر کا تہہ خانہ تو کسی صورت مناسب جگہ نہیں ہے۔ ایسی جگہوں میں بے چارے نوٹ بسا اوقات چوہوں کا لقمہ بھی بن سکتے ہیں۔ کیوں جناب عاشق صاحب! ہے نا شرمندگی والی بات؟ بظاہر تو آپ کافی جہاندیدہ اور پختہ عمر کے لگتے ہو"۔

بے چارے عاشق کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کہاں منہ چھپائے۔

"خیر کوئی بات نہیں"۔ فن کار اپنا رویہ کچھ نرم کرتے ہوئے بولا۔" گڑے مردے اکھاڑنے کا اب کیا فائدہ"۔ پھر اچانک کچھ یاد آنے پر آواز بلند کرتے ہوئے کہنے لگا۔" مجھے بار بار گھوڑے نہ دوڑانے پڑیں۔ آپ یہ بھی فرما دیجئے کہ چچی جان نے خود سے تو رشوت کا کوئی مال نہیں چھپا رکھا؟"

عاشق یہ غیر متوقع سوال سن کر کچھ زیادہ ہی بدحواس ہو گیا۔ تھیٹر میں پھر ایک بار خاموشی چھا گئی۔

"آئے، ہائے عاشق صاحب"۔ فن کار انگلیاں نچاتے ہوئے بولا۔"میں تو آپ کی تعریفوں کے پل باندھنے کو تھا۔ مجھے تو آپ پر فخر ہونے لگا تھا۔ جناب میں نے آنکھوں کا ذکر بلاوجہ تو نہیں کیا۔ آپ کی آنکھوں میں اس وقت صاف صاف لکھا ہے کہ چچی نے بھی بے ایمانی کا مال چھپا رکھا ہے۔ اور

آپ پھر سے ہمارا الو کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں''۔

''چھپا رکھا ہے''۔ روئی آواز میں عاشق نے جواب دیا۔

''زندہ باد''۔ نوجوان فن کار نے نعرہ بلند کیا۔

''زندہ باد''۔ خوف ناک آواز میں تماشائی بھی یک زبان ہو کر بول اٹھے۔

جب شور ذرا تھما تو نوجوان فن کار نے عاشق کو مبارکباد دی۔ گرم جوشی سے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور گاڑی پر گھر پہنچانے کی پیش کش کی۔ اسی گاڑی پر جانے والے ایک اور شخص کو ہدایت کی کہ وہ پہلے چچی کے ہاں جائیں اور انہیں زنانہ تھیٹر کے شو میں شرکت کا دعوت نامہ پہنچا کر آئیں۔

''ہاں سچ! میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ چچی نے کبھی تذکرہ نہیں کیا کہ اپنا مال اس نے کہاں چھپا رکھا ہے؟'' فن کار نے نہایت مہذب انداز میں عاشق سے پوچھا۔ اسے سگریٹ پیش کیا اور سلگانے کے لئے دیا سلائی بھی جلائی۔

عاشق نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یقین ہے۔ بالکل یقین ہے مجھے آپ پر۔ وہ بوڑھی کھوسٹ بہت شاطر کھلاڑی ہے۔ وہ بھلا کیسے اپنا راز بھتیجے کو بتا سکتی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس بڑھیا کے اندر کی انسانیت کو جگایا جائے۔ ہوسکتا ہے ابھی پلوں کے نیچے سے زیادہ پانی نہ گزرا ہو۔ شائید ہم اس کی روح کو بھی جھنجھوڑنے میں کامیاب ہو جائیں۔ خدا حافظ! میرے محترم عاشق صاحب''۔

گناہوں کا بوجھ ہلکا ہونے کے بعد عاشق خود کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان محسوس کر رہا تھا۔ وہ تھیٹر سے باہر نکل گیا۔

نوجوان فن کار نے تماشائیوں سے دوبارہ پوچھا۔۔ ہے کوئی اور رضا کار، جو سٹیج پر آنا چاہتا ہو۔

جواب میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔

''خنزیر ہیں سارے''۔ فن کار بڑبڑایا اور پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

ہال میں اندھیرا چھا گیا۔ خاموشی میں کہیں دور سے ایک مدھم سی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔۔۔

میرا ہے، میرا ہے، میرا ہے
یہ سونے کا ڈھیر میرا ہے

زنانہ تھیٹر میں کوئی خاتون سرکاری خزانے میں ڈھیروں ڈھیر جمع کرا رہی ہے۔ نکانور کے دائیں جانب بیٹھا سنہری داڑھی والا اچانک بول اٹھا۔۔۔

''میں تو خواہ مخواہ رشوت خوروں کے اس مجمع میں پھنس گیا ہوں۔ گاؤں میں بطخیں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لئے کہہ رہا ہوں کہ بطخ دنیا کا حساس ترین پرندہ ہے۔ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہیں کہ میرے بغیر انہوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہوگا۔ یہ ناظلم کی بات؟''۔

تھیٹر کا ہال دوبارہ روشنی میں نہا گیا اور نکانور کے خواب میں سفید کوٹ اور ٹوپیاں پہنے درجنوں باورچی نمودار ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھوں میں کفگیر تھام رکھے تھے جبکہ چند ٹرالیوں پر سوپ کے بڑے بڑے مٹکے رکھے تھے۔ باورچی مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے تمام باریش مردوں کو جھک جھک کر کھانے کی دعوت دے رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ رشوت کا لوٹا ہوا مال سرکاری خزانے میں جمع کروانے کی تلقین بھی کرتے جا رہے تھے۔

ایک نوجوان باورچی نکانور کو سوپ دیتے ہوئے بولا۔

''ارے بڑے میاں تم تو کچھ خیال کرو۔ تمہارے بال سفید ہو رہے ہیں۔ ٹانگیں آخری سفر کی تیاری میں ہیں۔ اور تم؟''

''نہیں ہے، نہیں ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے''۔ نکانور ہذیانی کیفیت میں چلاتا ہوا بولا۔

''نہیں ہے؟'' بھاری بھرکم آواز میں باورچی بولا اور پھر یکایک شفیق زنانہ آواز میں ایک ہاتھ سے نکانور کا سر سہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں ہے۔ نہیں ہے۔ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے''۔ یہ کہتے ہوئے باورچی کے خدوخال تبدیل ہونے شروع ہو گئے اور اس کی جگہ ہسپتال کی نرس فہمیدہ نے لے لی۔ تمام باورچی تحلیل ہو گئے۔ سٹیج اور اس کا پردہ بھک سے اڑ گیا۔ نکانور کی آنکھ کھل گئی اور اسے آنسو بھری نگاہوں سے ہسپتال کے کمرہ نمبر 119 میں سفید کوٹ والے تین دھندلے سے ہیولے دکھائی دیئے۔ نرس فہمیدہ ایک ہاتھ سے اس کا سر سہلا رہی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ میں اس نے ایک سرنج اور سپرٹ میں نچڑی روئی پکڑ رکھی تھی۔

''یہ کیا مصیبت ہے؟'' ٹیکہ لگنے کے دوران نکانور بول رہا تھا۔ ''نہیں ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ خدا کی قسم کچھ بھی نہیں ہے''۔

''نہیں ہے۔ نہیں ہے''۔ رحمدل نرس فہمیدہ اسے دلاسہ دے رہی تھی۔

نکانور کی طبیعت آہستہ آہستہ بہتر ہوتی گئی اور کچھ دیر بعد وہ دوبارہ گہری نیند سو گیا۔

نکانور کے شور وغل کی وجہ سے کمرہ نمبر ۱۲۰ کا مریض بھی اٹھ بیٹھا تھا اور انتہائی جذباتی انداز میں اپنا سر تلاش کرنے لگ گیا تھا۔ جبکہ کمرہ نمبر ۱۱۸ میں گمنام ماسٹر بھی جاگ رہا تھا۔ اپنی کرب زدہ نگاہیں چاند پر لگائے وہ اپنی آزاد زندگی کی وہ آخری رات یاد کر رہا تھا جب اس کے تہہ خانے والے گھر میں پریشان گیسوؤں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا اس کی محبوبہ کا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ وہ چہرہ ماسٹر کی یادداشت میں منجمد

ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ چہرہ، اداسی میں ڈوبا، آنسوؤں سے تر چہرہ آج بھی اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

شور وغل کی لہر کمرہ نمبر ۱۱۸ سے ہوتی ہوئی ایوان تک جا پہنچی۔ اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ زور زور سے رونے لگ گیا۔

ڈاکٹر نے بڑی مہارت سے تمام مریضوں کو تسلی دی اور سبھی آہستہ آہستہ دوبارہ نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ سب سے آخر میں ایوان کو سکون نصیب ہوا۔ وہ پو پھٹنے تک جاگتا رہا تھا۔ تب تک دوا اس کے تمام جسم میں سرایت کر چکی تھی اور اس کے دماغ کو سکون سے بھرپور حدت کا نشہ ہونے لگ گیا تھا۔ آخری آوازیں جو اس کے کانوں تک پہنچیں وہ پرندوں کی چہچہاہٹ کے گیت تھے۔ لیکن جلد ہی یہ آوازیں بھی مدہم پڑ گئیں۔ اسے خواب میں کل وری پہاڑی نظر آ رہی تھی جس پر بکھری سورج کی زرد کرنیں ایک پر درد اداسی کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ پہاڑی کے گرد سپاہیوں نے دو حصار بنا رکھے تھے۔

باب ۱۶

پھانسی

کل وری پہاڑی پر بکھری سورج کی زرد کرنیں ایک پردرد اداسی کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ پہاڑی کے گرد سپاہیوں نے دو حصار بنا رکھے تھے۔

وہ فوجی دستہ جس نے دوپہر کے وقت قاضی کا راستہ کاٹا تھا اس وقت شہر کے جنوبی دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دستے کے مارچ کرنے کا راستہ پہلے سے تیار کیا جا چکا تھا۔ پیدل سپاہیوں نے راستے کے دونوں اطراف میں جمع ہونے والے انسانوں، اونٹوں اور خچروں کے ہجوم کو بمشکل پیچھے دھکیل رکھا تھا۔ گھڑ سوار فوجیوں کا دستہ آسمان تک دھول اڑاتا اس جگہ آن پہنچا جہاں راستہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ ایک جنوبی جو کہ وشلیم کو جاتا تھا۔ دوسرا شمال مغربی جو یفاء کی جانب جاتا تھا۔ دستہ شمال مغربی راستے پر گامزن ہو گیا۔ پیدل سپاہیوں کا دستہ گھڑ سواروں کے شانہ بشانہ آگے بڑھ رہا تھا اور راستے کے ارد گرد جمع ہونے والے کاروانوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے گھڑ سواروں کے لیئے راستہ صاف کرتا جا رہا تھا۔ تقریباً دو کلومیٹر کی مسافت طے کرنے کے بعد گھڑ سوار دستہ کل وری پہاڑی کے نیچے جا پہنچا۔ یہاں دستے کے کمانڈر نے تمام گھڑ سواروں کو ایک حصار کی شکل میں پہاڑی کے گرد نشیب و فراز میں کچھ اس طرح متعین کر دیا کہ صرف یفاء والا راستہ آمد و رفت کے لئے کھلا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد گھڑ سواروں کا ایک دوسرا دستہ بھی پہاڑی تک پہنچ گیا۔ اس دستے نے پہاڑی کے بالائی حصے پر چڑھنے کے بعد ایک دوسرا حصار بنا لیا۔

آخر کار کینٹر کے زیر کمان دستہ بھی پہاڑی تک آ پہنچا۔ اس دستے کے گھڑ سوار راستے کے دونوں جانب قطار میں چل رہے تھے۔ ان کے بیچوں بیچ ایک سپیشل دستے کی نگرانی میں پھانسی کے منتظر تینوں مجرموں کو لے جایا جا رہا تھا۔ ان کی گردنوں میں سفید رنگ کے تختے آویزاں تھے۔ جن پر دو زبانوں۔ عبرانی اور یونانی میں تحریر تھا۔

''بدمعاش اور باغی''۔

مجرموں کی سواری کے عقب میں چند گدھا گاڑیوں پر لکڑی کے صلیب نما قد آدم ستون، رسے، بیلچے، بالٹیاں اور کلہاڑے لیجائے جا رہے تھے۔ انہی گاڑیوں پر چھ جلاد بھی سوار تھے۔ اس قافلے کے عقب میں یروشلم کے قبرستان کا انچارج مارک گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے ساتھ صبح کے وقت قاضی نے محل کے نیم روشن کمرے میں ایک اہم ملاقات کی تھی۔ اس قافلے کو چاق و چوبند سپاہیوں کے ایک دستے نے اپنے حفاظتی حصار میں لے رکھا تھا۔ دستے کے پیچھے پیچھے قیامت خیز گرمی سے بے نیاز اس دلچسپ تماشے کا نظارہ کرنے کے مشتاق تقریباً دو ہزار تماش بینوں کا ایک ٹولہ چلا آ رہا تھا۔ اس ٹولے میں پوجا پاٹ کا سامان اٹھائے کچھ مذہب پرست لوگ بھی شامل تھے۔ فوجی دستے کے پہلے حصار نے اس ٹولے کے تمام شرکاء کو کل وری پہاڑی تک جانے دیا جبکہ دوسرے حصار کے سپاہیوں نے صرف پھانسی کے معاملات سے متعلق لوگوں کو پھانسی گھاٹ تک جانے کی اجازت دی۔ گھڑ سوار سپاہیوں کو پھانسی گھاٹ سے کچھ اوپر ایک مقام پر متعین کر دیا گیا۔ پیادہ دستے نے پھانسی گھاٹ سے نیچے ایک نشیب میں حصار بنا لیا۔ سپاہیوں کو کچھ اس طریقے سے تعینات کیا گیا تھا کہ پہاڑی کے نیچے کھڑے مجمع کے لئے پھانسی کا نظارہ بخوبی ممکن ہو گیا تھا۔

جلوس کو اپنی منزل پر پہنچے تین گھنٹے گذر چکے تھے۔ سورج پہاڑی کے عقب میں اپنی آرام گاہ کی جانب رواں ہو چکا تھا لیکن آسمان سے اب بھی آگ کی برسات جاری تھی۔ پھانسی گھاٹ کے گرد حصار بنائے سپاہی گرمی کی شدت سے بے حال ہو رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ان تینوں مجرموں کو کوس رہے تھے اور ان کی جلد از جلد موت کی دعا مانگ رہے تھے۔ دستے کا نوعمر کمانڈر پسینے میں شرابور بار بار اپنی چرمی چھاگل کو منہ لگاتا لیکن اس کے خشک حلق میں کانٹوں کی چبھن ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں بار بار بے رحم آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ سپاہیوں کو اپنے سخت جان ہونے کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش میں وہ تقریباً نیم جان ہو چکا تھا۔ پانی کی بالٹیاں خالی ہوتی جا رہی تھیں اور سپاہی بار بار پہاڑی کے نشیب میں ابلتے ہوئے چشمے سے انہیں بھرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کو پہنچا رہے تھے۔

سپاہیوں کی بے حالی اور مجرموں کی جانب ان کا مخاصمانہ رویہ بے جا نہ تھا۔ پھانسی کے موقعہ پر پونتی پلات کو یروشلم میں ممکنہ ہنگاموں کی تشویش غلط ثابت ہو رہی تھی۔ اس تمام کاروائی کا چوتھا گھنٹہ جاری تھا اور آسمان سے برسنے والی قیامت خیز آگ نے سپاہیوں اور تماشائیوں کو بدحال کر رکھا تھا۔ سپاہیوں کے بیرونی حصار کے پچھلی جانب نجانے کہاں سے دو کتے آن پہنچے تھے۔ وہ بھی گرمی کی شدت سے بے بس لمبی لمبی زبانیں نکالے پتھریلی زمین پر کچھ ایسے بے سدھ پڑے تھے کہ ان میں آس پاس رینگنے والے سانپوں کو

بھگانے کی بھی سکت نہیں تھی۔

نہ تو شہر میں اور نہ ہی کل وری پہاڑی کے آس پاس کسی ذی روح نے سزائے موت کے مجرموں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش کی۔ ہجوم نے آہستہ آہستہ شہر کی جانب واپس کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ اس شدید گرمی کے عالم میں یہ لوگ پھانسی کا تماشہ دیکھنے کی بجائے یروشلم میں منعقد ہونے والے ایسٹر کے میلے میں شامل ہونے جا رہے تھے۔

دوسرے حصار میں تعینات رومن سپاہیوں کا دستہ سب سے ابتر حالت میں تھا۔ ان کے کمانڈر کینٹر نے سپاہیوں کو صرف آہنی ہیلمٹ سروں سے اتارنے اور پانی میں بھیگی سفید رنگ کی پٹیاں سر پر باندھنے کی اجازت دی تھی۔ انہیں نیزے ہوا میں بلند رکھتے ہوئے اپنی جگہوں سے ہلنے کی اجازت نہیں تھی۔ کینٹر نے خود بھی سر پر سفید رنگ کا خشک رومال باندھ رکھا تھا۔ اس کی تلوار، ذرہ بکتر اور سینے پر سجائے تمغے بدستور اپنی جگہوں پر تھے۔

کینٹر کے مسخ شدہ چہرے پر نہ تو تھکن اور نہ ہی بیزاری کے تاثرات تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شائید مزید ایک دن اور رات یا شائید اس سے بھی زیادہ عرصے تک اسی حالت میں اس دو نیزوں کی بلندی سے آگ برساتے سورج کے نیچے کھڑا رہ سکتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے تانبے کے وزنی جڑاؤ سے بجی بیلٹ کو تھامے وہ لکڑی کی صلیبوں اور ان پر مسخ شدہ مجرموں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ چہل قدمی کے دوران اس کے وزنی جوتوں کے نیچے چھوٹے کنکروں اور جا بجا بکھری انسانی ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

سپاہیوں کے اس حصار سے باہر ماسوا ایک آدمی کے کسی ذی روح کا وجود نہیں تھا۔ یہ شخص سب لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ وہ پھانسی گھاٹ کے اس جانب موجود تھا جہاں سے پھانسی کا منظر کچھ زیادہ واضح نہیں تھا۔ یہ پہاڑی کا شمالی حصہ تھا۔ یہاں جا بجا سنگلاخ پتھروں کے درمیان جان لیوا کھائیاں تھیں۔ ان کھائیوں کے عین وسط میں خشک سالی کا شکار ایک انجیر کا درخت تنہا کھڑا اس بے ثمر و بے رحم زمین کا نوحہ کر رہا تھا۔ اس درخت کے نیچے وہ اکیلا تماشائی چار گھنٹوں سے ایک پتھر پر بیٹھا تھا۔ پھانسی کا نظارہ کرنے کے لئے یہ کوئی بہت مناسب جگہ نہیں تھی۔ تاہم صلیبوں کے ستون اور پھانسی گھاٹ پر تعینات سپاہیوں کے نیزے یہاں سے بہت واضح طور پر نہ سہی لیکن دکھائی ضرور دے رہے تھے۔ اس تماشائی کے لئے ,جو غالباً لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتا تھا, شائید اتنا ہی کافی تھا۔

چار گھنٹے قبل اس شخص کی سرگرمیاں بالکل مختلف تھیں اور وہ اپنی نقل و حرکت کی بنا پر ہر کسی کی توجہ کا مرکز تھا۔ شائید یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنا رویہ اب یکسر تبدیل کر لیا تھا اور ہجوم سے الگ تھلگ اکیلا ہی کل

وری پہاڑی کے اس مقام پر بیٹھا تھا۔

جب مجرموں کو پھانسی گھاٹ پر گدھا گاڑیوں سے اتارا جا رہا تھا اس وقت اس شخص نے ہر قسم کی احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سپاہیوں کے گھیرے سے نکل کر مجرموں تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس کوشش کے صلے میں ایک سپاہی نے نیزے کے دستے سے اس کے سینے پر ایک زوردار ضرب لگائی تھی۔ جواب میں اس نے جن نظروں سے سپاہی کو گھورا ان میں جسمانی تکلیف کا عنصر کم اور بے بسی کا عالم زیادہ تھا۔

ایک ہاتھ سے سینے کو دبائے وہ مسلسل کھانس رہا تھا۔ بمشکل سانس لیتے ہوئے وہ پھانسی گھاٹ کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ وہ اس آس میں تھا کہ شائید سپاہیوں کے حصار میں اسے کہیں سے پھانسی گھاٹ کے نزدیک پہنچنے کا موقعہ مل جائے۔ لیکن یہ کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ مجرموں کی گدھا گاڑی کے قریب پہنچنے کی خواہش اس کے دل میں ہی رہ گئی۔ آخر کار اسے اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا کیونکہ مزید کوشش کرنے پر وہ سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوسکتا تھا اور گرفتاری کسی صورت اس کے منصوبے کا حصہ نہیں تھی۔ وہ بالآخر پہاڑی کے شمالی حصے کی جانب نکل آیا جہاں وہ اب تن تنہا تھا اور اس کے ارادوں میں رکاوٹ ڈالنے والا کوئی نہیں تھا۔

قدرے گندمی رنگ کا یہ باریش آدمی آنکھوں میں کرب اور مایوسی لئے پتھر پر بیٹھا بار بار اپنے زخمی سینے کو سہلا رہا تھا اور منہ کھولے زیادہ سے زیادہ آکسیجن اپنے درد سے چور سینے میں کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا پورا جسم غلیظ بدبودار پسینے میں شرابور تھا۔ کبھی وہ بار بار اضطراب کے عالم میں آسمان میں منڈلاتے ان تین گدھوں کو دیکھ رہا تھا جو صلیب پر چڑھائے جانے والے مجرموں کا گوشت نوچنے کے منتظر تھے اور کبھی وہ بے بسی کے عالم میں اس زرد پتھریلی زمین کو گھور رہا تھا جس پر پڑی کسی مردہ جانور کی خستہ حال کھوپڑی اس کے کرب میں مزید اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ شدید اذیت میں مبتلا یہ شخص بار بار بڑبڑا رہا تھا۔۔

او خدایا! میں کیسا بے وقوف آدمی ہوں۔

عالم اضطراب میں سر دائیں بائیں ہلاتے اور غلیظ ناخنوں سے اپنے سینے کو نوچتے ہوئے وہ بول رہا تھا۔۔۔ ''بے وقوف ہوں میں۔ جاہل عورت ہوں میں۔ ڈرپوک ہوں میں۔۔ انسان نہیں راستے کا کوئی بے حس پتھر ہوں میں''۔ کچھ دیر خاموش رہنے اور چھاگل سے چند گھونٹ پی کر گلے کو تر کرنے کے بعد وہ اپنا واویلا دوبارہ شروع کر دیتا۔ کبھی اپنی قمیض کے اندر چھپائے چھرے کا دستہ اپنے ہاتھ سے تھپتھپاتا اور کبھی اپنے سامنے رکھے چمڑے کے ٹکڑے پر لکھنا شروع کر دیتا۔

اس ٹکڑے پر درج تھا۔۔''وقت گزرتا جا رہا ہے۔ میں میتھیو کل وری پہاڑی پر بیٹھا ہوں۔ لیکن موت ابھی تک یہاں نہیں پہنچی''۔ اگلی سطر کچھ اس طرح تھی۔''سورج ڈھلنا شروع ہو گیا ہے اور موت ابھی تک نہیں پہنچی''۔ اور آخر میں میتھیو نے یہ رقم کیا تھا۔''اے خدا سے کیوں اتنی خوفناک اذیت دے رہا ہے۔ اٹھا لے اس کو۔ بھیج دے موت اس کو''۔

یہ لکھنے کے بعد وہ دیوانوں کی طرح اپنا سینہ نوچنے لگ گیا۔

میتھیو کے اس طرح مایوس اور مضطرب ہونے کی وجوہ کچھ یوں تھی۔۔ اس کا خیال تھا کہ عیشوا کے اس طرح پکڑے جانے اور سزائے موت سنائے جانے میں اس (میتھیو) کی ایک بہت بڑی غلطی کا دخل تھا۔ دو دن پہلے عیشوا اور میتھیو یروشلم کے مضافات میں ایک چھوٹے سے باغیچے کے مالک کے ہاں ٹھہرے تھے۔ باغیچے کا مالک عیشوا کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوا تھا۔ تمام دن دونوں مہمان باغیچے کے کام کاج میں مالک کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ انہوں نے بعد از شام یروشلم جانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ لیکن نجانے اچانک عیشوا کو شہر جانے کی کیا جلدی پڑ گئی۔ وہ بعد دوپہر یہ کہہ کر کہ اسے یروشلم میں ایک بہت ضروری کام آن پڑا ہے باغیچے سے روانہ ہو گیا۔ میتھیو اسی بات کو لے کر بے چین تھا کہ اس نے عیشوا کو اکیلے کیوں جانے دیا۔

شام کو میتھیو کے یروشلم جانے کی نوبت نہیں آئی۔ برسرِ شام اس پر اچانک ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کا سارا جسم کانپنے لگ گیا، دانت زوردار آواز سے بجنے لگے اور منہ خشک ہونے لگ گیا۔ وہ پیاس کی شدت سے بے حال ہو رہا تھا۔ اس کیفیت میں وہ یقیناً کہیں جانے کے قابل نہیں تھا۔ وہ باغیچے میں بنی ایک سرائے میں لیٹ گیا اور جمعہ کی صبح تک وہیں پڑا رہا۔ جب وہ سو کر اٹھا تو اس کی تکلیف جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک غائب ہو چکی تھی۔ باوجودیکہ وہ شدید نقاہت کا شکار ہو گیا تھا اور اس کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں وہ باغیچے کے مالک سے اجازت لے کر یروشلم کو نکل پڑا کیونکہ اس کی چھٹی حس کسی ناگہانی آفت کا اشارہ دے رہی تھی۔ یروشلم پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ چھٹی حس نے اسے دھوکہ نہیں دیا تھا۔ آفت تو آ چکی تھی۔ طوفان تو برپا ہو چکا تھا۔

جس وقت قاضی عیشوا کو سزائے موت کا پروانہ پڑھ کر سنا رہا تھا اس دوران میتھیو بھی محل کے سامنے جمع ہجوم میں موجود تھا۔

جب مجرموں کو پہاڑی کی جانب لے جایا جا رہا تھا تو میتھیو سپاہیوں کی قطار کے ساتھ ساتھ اس امید میں دوڑ رہا تھا کہ شاید عیشوا کی نظر اس پر پڑ جائے اور اسے کم از کم یہ تسلی تو ہو جائے کہ میتھیو نے اسے آخری سفر پر اکیلا نہیں چھوڑا اور وہ دعا گو ہے کہ اس کی موت آسان ہو جائے۔ لیکن عیشوا تو چہرے پر حیران

کن سکون لئے کہیں دور خلاؤں میں گھورتا ہوا مقتل کی جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور نتیجتاً وہ میتھیو کی موجودگی سے لاعلم ہی رہا۔

جب یہ قافلہ تقریباً آدھ کلومیٹر کی مسافت طے کر چکا تو میتھیو کے ذہن میں ایک اچھوتے خیال نے سر اٹھایا اور اس نے فوراً خود کو کوسنا شروع کر دیا کہ اس کے ناکارہ ذہن کو اس سے پہلے یہ خیال کیوں نہیں سوجھا۔ تھوڑی سی ہوش مندی اور عقل کو استعمال کرتے ہوئے سپاہیوں کے درمیانی وقفے میں گھس کر مجرموں کی گدھا گاڑی کے قریب پہنچا جا سکتا تھا اور عیشوا کو کل وری پہاڑی پر نازل ہونے والے عذاب سے بچایا جا سکتا تھا۔

بات صرف ایک لمحے کی تھی اور چھرا عیشوا کی کمر میں گھونپنے کے بعد یہ کہا جا سکتا تھا۔۔۔

دیکھو عیشوا میں نے تمہیں بچا لیا ہے۔ اور میں تمہارا واحد سچا شاگرد میتھیو، اب تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔ اگر خدا مددگار ثابت ہوا اور اس نے مزید ایک لمحہ عنایت کر دیا تو صلیب کی اذیت سے بچنے کے لئے یہی چھرا میں اپنے سینے میں بھی اتار لوں گا۔ ویسے یہ دوسرا لمحہ میتھیو کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اسے اپنی موت کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اسے کامل یقین تھا کہ عیشوا نے اپنی تمام تر زندگی میں کبھی بھی کسی کو کبھی معمولی سا بھی گزند نہیں پہنچایا تھا۔ اب میتھیو کی زندگی کا واحد مقصد صرف اور صرف عیشوا کو موت سے قبل دی جانے والی ممکنہ اذیت سے بچانا تھا۔

یہ کام بظاہر مشکل نہیں لگ رہا تھا۔ تاہم مسئلہ یہ تھا کہ میتھیو کے پاس اس وقت نہ تو چھرا تھا اور نہ ہی اس کی جیب میں کوئی پیسہ تھا۔ خود کو ملامت کرتا ہوا میتھیو عالم اشتعال میں شہر کی جانب واپس دوڑ اٹھا۔ اب اس کے سر پر صرف یہ جنون سوار تھا کہ شہر میں جیسے تیسے وہ چھرا حاصل کرے اور دوبارہ جلوس میں شامل ہو جائے۔ وہ شہر کی جانب رواں کاروانوں میں سے بمشکل راستہ بناتا ہوا شہر کے داخلی دروازے تک پہنچ گیا۔ وہاں اس کی نظر روٹی کے ایک سٹال پر پڑی۔ کچھ دیر ستانے کے بعد جب اس کی سانس بہتر ہو گئی تو وہ سٹال پر جا پہنچا۔ اس نے دوکاندار کو سب سے بلند جگہ پر پڑی روٹی دکھانے کو کہا۔ جونہی دوکاندار نے روٹی اتارنے کے لئے اپنی پشت میتھیو کی جانب کی اس نے سامنے پڑی روٹی کاٹنے والی تیز دھار لمبی چھری اچک لی اور وہاں سے بھاگ اٹھا۔

چند ہی لمحوں میں میتھیو دوبارہ یفاء جانے والے راستے پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن کل وری پہاڑی کی جانب جانے والے جلوس کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے دیوانہ وار دوڑنا شروع کر دیا۔ راستے میں اپنی توانائی بحال رکھنے اور دھول سے بچنے کے لئے اسے بار بار زمین پر اوندھے منہ لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے پڑ رہے تھے۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن نہ صرف سینے میں بلکہ سر اور کانوں میں بھی سنائی دے

رہی تھی۔ کاروانوں میں چلتے پیدل اور خچر سوار مسافر حیرانی کے عالم میں اس دیوانے کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر سستانے کے بعد وہ دوبارہ دوڑنا شروع کر دیتا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار جب اسے جلوس دکھائی دینے لگ گیا تو اسے اپنی تمام محنت رائیگاں ہوتی محسوس ہونے لگی کیونکہ جلوس پہاڑی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

''اوہ خدایا''۔ اس نے آہ بھری۔ وہ بھانپ گیا تھا کہ اسے دیر ہو چکی ہے اور دیر تو واقعی ہو چکی تھی۔

جب پھانسی کے عمل کا چوتھا گھنٹہ بھی گزر گیا تو میتھیو کی بے تابی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چھرا زمین پر دے مارا کیونکہ اس کا اب کوئی مصرف نہیں رہا تھا۔ پانی کی چھاگل اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے کھائی میں دھکیل دی اور اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے خود کو کوسنے لگ گیا۔ اس دوران وہ کچھ بے معنی سے الفاظ بول رہا تھا۔ بار بار زمین پر تھوکتا اور اپنے ماں باپ کو برا بھلا کہتا کہ انہوں نے اس جیسے بے وقوف آدمی کو اس دنیا میں پیدا ہی کیوں کیا تھا۔

بے بسی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی جانب بلند کرتے ہوئے وہ چلانے لگا۔ ''یا خدا! بچا لے اس معصوم کو۔ بھیج دے اس کو موت۔ بھیج دے اس کو موت''۔

کچھ دیر جب اس نے پھانسی گھاٹ کی جانب نظر دوڑائی تو وہاں سب کچھ جوں کا توں ہی تھا۔ صلیبوں کے ستون فضا میں بلند کھڑے تھے اور سپاہیوں کی نقل و حرکت بھی پہلے کی طرح جاری تھی۔

ہیجانی کیفیت میں میتھیو نے خدا سے گلہ شکوہ شروع کر دیا۔۔

''یہ تو کیا کر رہا ہے؟ کیسا منصف ہے تو؟ ایک معصوم بے گناہ کو سولی پر لٹکایا جا رہا ہے اور تو خاموش ہے۔ بہرہ ہے تو۔ بہرہ ہے تو''۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

آنکھیں بھینچے میتھیو اس انتظار میں تھا کہ ابھی آسمان سے آگ کا شعلہ اس کے اوپر گرے گا اور اسے جلا کر راکھ کر دے گا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور میتھیو بنا پلک جھپکے اپنی زبان سے زہر آلود تیر آسمان کی جانب پھینکے چلا جا رہا تھا۔ وہ بلند آواز میں چیخ رہا تھا۔۔۔

''تو کیا اکیلا ہی خدا ہے؟ تیرے جیسے اور بھی بہت ہیں۔ اور بھی بہت سارے مذاہب ہیں اس دنیا میں۔ اور غالباً تجھ سے بہتر ہیں۔ کوئی بھی دوسرا خدا یہ ناانصافی ہرگز نہ ہونے دیتا۔ اس معصومیت کے پیکر عیشوا کو کبھی بھی صلیب کے بے رحم شکنجے میں نہ جانے دیتا''۔

''تیرے متعلق میری سوچ غلط تھی''۔ وہ چیخ رہا تھا۔ ''تو تو ظالموں کا خدا ہے۔ تیری آنکھیں تو مندروں سے اٹھنے والے دھوئیں نے بند کر دی ہیں۔ تیرے کان پنڈتوں کی گھنٹیوں کی آوازوں نے بہرے

کر دیئے ہیں ۔تُو ہر چیز پر قادر نہیں ہے۔ مجھے نفرت ہے تجھ سے ۔تو بدمعاشوں اور انسان دشمنوں کا خدا ہے''۔

اچانک میتھیو کے چہرے سے ایک لہر ٹکرائی اور پاؤں کے نیچے اسے کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ جب یہ لہر دوبارہ ٹکرائی تو میتھیو نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے دنیا تبدیل ہو رہی ہے۔ سورج جو ہر روز سمندر میں ڈوبا کرتا تھا آج ڈوبنے سے پہلے ہی غائب ہو گیا تھا اور مغرب کی جانب سے سیاہ بادلوں کے جھرمٹ نے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سورج کو اوجھل کرنے والی اس سیاہ چادر کے کنارے زردی مائل تھے اور بسا اوقات یہ چادر شعلے اگلتی سنہری لکیروں سے منقش ہوئے جا رہی تھی۔ اس چادر کی دل کو دہلا دینے والی غضب ناک گرج سے زمین کانپ اٹھتی تھی۔ تیز ہوا نے یفاء کو جانے والے راستے سمیت تمام وادی میں گرد و غبار کا زبردست طوفان برپا کر دیا تھا۔ میتھیو خاموش ہو گیا تھا۔ اسے کچھ آس لگ گئی تھی کہ شائید یہ طوفان عیشوا کی قسمت تبدیل کر دے۔ آسمانی بجلی کی گھن گرج سے مرعوب وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر گڑ گڑانے لگ گیا۔۔۔

''اے خدا! اس آگ کی لہر کو حکم دے کہ عیشوا کی صلیب کو جلا کر راکھ کر دے''۔میتھیو کو اب یہ پشیمانی کھائے جا رہی تھی کہ اس نے خدا سے شکوہ شکایت کرنے میں کچھ جلد بازی کر دی ہے اور اب یقیناً وہ اس کی کوئی دعا قبول نہیں کرے گا۔

پھانسی گھاٹ پر حالات تبدیل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سپاہی اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ انہوں نے بارش سے بچنے کے لئے برساتیاں اوڑھ لی تھیں۔صاف ظاہر تھا کہ سپاہیوں کے دستے اب وہاں سے کوچ کرنے کی تیاری میں ہیں۔اس دوران رومن فوج کا کمانڈر پھانسی گھاٹ پر پہنچ چکا تھا۔ اسے دیکھ کر میتھیو کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے امید ہو گئی تھی کہ آخرکار اب عیشوا کی اذیت ختم ہو جائے گی۔

مجرموں کو صلیبوں پر لٹکے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ یروشلم سے سیدھا پھانسی گھاٹ پہنچنے والے رومن کمانڈر نے کینٹر کو اپنے پاس بلا کر کچھ احکامات جاری کئے اور موسم کی شدت کو دیکھتے ہوئے فوراً ہی واپسی سفر شروع کر دیا۔ کینٹر زمین پر بکھرے اُن غلیظ چیتھڑوں کو جو کچھ دیر قبل مجرموں کے جسم ڈھانپے ہوئے تھے، پاؤں کی ٹھوکر سے ہٹاتے ہوئے پھانسی گھاٹ کے کنارے پر بیٹھے جلادوں کے پاس پہنچ گیا اور انہیں کمانڈر کے احکامات بجا لانے کا کہنے کے بعد اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا۔

پھانسی گھاٹ کے دائیں جانب صلیب پر لٹکا مجرم گیستاس ایک بے ربط اور بے معنی سا گیت گنگنا رہا تھا۔ صلیب پر لٹکے تین گھنٹے گزرنے کے بعد وہ گرمی کی شدت، مکھیوں، مچھروں اور بھڑوں کے کاٹنے سے حواس کھو چکا تھا اور اب انگور کی بیلوں کے بارے میں کچھ گا رہا تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنے سر کو دائیں بائیں

گھماتا تو اس کے چہرے پر چپکے حشرات ایک لمحے کے لئے فضا میں بلند ہو جاتے اور فوراً ہی دوبارہ اپنے شکار کو چپک جاتے۔

دوسری صلیب پر لٹکے دیسماس کی حالت سب سے ابتر تھی کیونکہ وہ ابھی تک ہوش میں تھا اور اذیت کا ہر لمحہ محسوس کر رہا تھا۔

سب سے خوش قسمت شائید عیشوا تھا۔ صلیب پر لٹکے ابھی ایک ہی گھنٹہ گزرا تھا کہ اس پر غشی کے دورے پڑنے لگ گئے تھے اور وہ جلد ہی پوری طرح بے ہوش ہو گیا تھا۔ مکھیاں اور بھڑیں بری طرح اس کے چہرے پر چپک گئی تھیں۔ اس کے سینے، پیٹ اور رانوں کے اندرونی حصے بھی ان موذی کیڑوں سے اٹے پڑے تھے۔

کمانڈر کا حکم بجا لاتے ہوئے جلاد نے نیزے پر پانی سے نچڑا ایک کپڑا لپیٹ لیا تھا۔ دوسرے نے نیزے سے عیشوا کے دونوں بازوؤں پر یکے بعد دیگرے ضربیں لگا کر اسے بیدار کر دیا۔ عیشوا کے جسم نے دو تین جھٹکے لئے. ڈھلکے ہوئے سر میں جنبش پیدا ہوئی اور اس کی حرکت کے نتیجے میں گذشتہ پانچ گھنٹوں سے چپکی مکھیاں اور بھڑیں اس کے چہرے سے علیحدہ ہو گئیں۔ اس کی عمومی طور پر روشن رہنے والی آنکھیں اب دھندلی پڑ چکی تھیں اور چہرہ سوج کر ناقابل شناخت ہو چکا تھا۔

عیشوا! جلاد نے آواز دی۔

پھنسی پھنسی نیم مردہ آواز میں عیشوا نے جواب دیا۔ ''کیا چاہیئے تمہیں؟ کیوں آئے ہو میرے پاس؟''۔

یہ لو پیئو! جلاد بولا۔ اور اس نے پانی سے بھیگا کپڑے کا ٹکڑا عیشوا کے ہونٹوں کو لگا دیا۔ عیشوا کی آنکھوں میں یکا یک رونق لوٹ آئی۔ اس نے گیلے کپڑے کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت جان کر چوسنا شروع کر دیا۔

دوسری صلیب سے دیسماس کی آواز آئی۔ ''یہ کیا ناانصافی ہے؟ میں بھی اسی کی طرح کا مجرم ہوں''۔ دیسماس نے اپنی بچی کھچی تمام قوت بروئے کار لاتے ہوئے جسم کو اکڑا لیا تھا۔ رسیوں میں جکڑے وجود کو ہر ممکنہ جگہ سے جنبش دیتے ہوئے وہ فرط جذبات میں اپنے ناخن صلیب کے ستون میں گاڑنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اس کے چہرے کا رخ عیشوا کی صلیب کی جانب تھا۔ اس کی آنکھیں نفرت اور غصے کے شعلے اگل رہی تھیں۔ گرد و غبار کے طوفان نے کچھ دیر کے لئے پھانسی گھاٹ کو بالکل تاریک کر دیا تھا۔ جب طوفان کی شدت کچھ کم ہوئی تو کیپٹن غصیلی آواز میں کڑکا۔

''صلیب نمبر دو۔ خاموش''۔

دیسماس خاموش ہو گیا۔

عیشوا نے پانی میں تر کپڑے سے اپنے ہونٹ ہٹا لئے اور چہرے پر مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''اس کو بھی پلاؤ''۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ غم و غصے سے گرجتے چمکتے بادلوں نے تقریباً پورے آسمان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اچانک پھانسی گھاٹ کے عین اوپر آسمانی بجلی اس زور دار دھماکے کے ساتھ لپکی کہ لگتا تھا کل ورتی پہاڑی جل کر راکھ ہو جائے گی۔ جلاد نے نیزے پر لپٹا کپڑا اتار کر پھینک دیا۔

''ظل الٰہی رومن قاضی کی عمر دراز ہو''۔ تعظیماً پر جوش نعرہ بلند کرنے کے بعد جلاد نے نیزہ عیشوا کے دل میں اتار دیا۔ عیشوا کے جسم نے ایک جھٹکا لیا اور شائید وہ زیر لب کچھ بڑبڑایا بھی تھا۔

خون اس کے پیٹ پر دھاریاں بناتا ہوا بے رحم پتھریلی زمین پر ٹپکنے لگ گیا۔ اس کے جبڑے نے دو تین مرتبہ جنبش کی اور اس کا سر سینے پر ڈھلک گیا۔

اس سے پہلے کہ آسمانی بجلی دوبارہ چمکتی جلاد دیسماس اور گیسٹاس کا بھی کام تمام کر چکا تھا۔ کینٹر نے دو ساتھیوں کے ہمراہ باری باری تینوں صلیبوں کے پاس جا کر مجرموں کی موت کی تصدیق کی اور سپاہیوں کو وہاں سے کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔

اس دوران شدید بارش شروع ہو چکی تھی۔ پانی کی بوچھاڑ اتنی شدید تھی کہ جب سپاہی پہاڑی سے نیچے اتر رہے تھے تو ان کے تعاقب میں پانی کی ندیاں بہنے لگی تھیں۔ سپاہی پھسلن کی وجہ سے بار بار گرتے ہوئے اس منحوس جگہ سے جلد از جلد نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد کل ورتی پہاڑی سنسان ہو گئی۔ اس خوفناک طوفان باد و باراں میں صرف ایک شخص پہاڑی پر ابھی تک موجود تھا۔ اور وہ تھا میتھیو، جو متعدد بار گرنے اور زخمی ہونے کے باوجود چھرا ہاتھ میں لئے پھانسی گھاٹ پر پہنچ گیا تھا۔

صلیب کے پاس پہنچنے پر وہ عیشوا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آسمان کے مانند پانی کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ کچھ توقف کرنے کے بعد اس نے عیشوا کی ٹانگوں پر لپٹی رسیاں کاٹ دیں۔ صلیب کے ستون کا سہارا لے کر اُس نے اپنا دائیاں ہاتھ بلند کیا اور عیشوا کے بازوؤں کے گرد بندھی رسیاں بھی کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ رسیوں کی قید سے آزاد ہونے کے بعد عیشوا کا بارش میں بھیگا برہنہ جسم میتھیو کے اوپر آن گرا اور وہ گیلی زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ بہر طور میتھیو فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ابھی عیشوا کا جسم اپنے کاندھوں پر لادنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے ذہن میں اچانک ایک اور خیال ابھرا۔۔

اس نے زمین پر گرا چھرا اٹھا لیا اور دوسرے دو مجرموں کے جسم بھی صلیب کی بندش سے آزاد کر دیئے۔

چند منٹ گذرنے کے بعد پھانسی گھاٹ پر بارش میں نہاتے صرف دو جسم پڑے تھے۔ میتھیو اور عیشوا کا مردہ جسم وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔

باب ۱۷

بے سکون دن

جمعے کی صبح۔ یعنی شیطانی شو کے اگلے دن ورائٹی تھیٹر کے تمام حاضر ملازمین جن میں خزانچی، ٹکٹ فروش، قاصد، سیکورٹی گارڈ اور صفائی کا عملہ بھی شامل تھا، اپنے متعلقہ دفاتر چھوڑ کر بالائی منزل کی کھڑکیوں سے چپکے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ورائٹی کی دیوار کے ساتھ ہزاروں افراد نے کئی میل لمبی دو قطاریں بنا رکھی تھیں۔ ان قطاروں میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی جن میں شہر کی کئی مشہور ہستیاں بھی شامل تھیں۔

شو کے ٹکٹوں کا منتظر ہجوم کافی اضطراب میں تھا۔ بیشتر خواتین گزشتہ دن کے واقعات کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کہانیاں سنا رہی تھیں۔ ایسی ہی کچھ کہانیوں نے خزانچی لاسچ کو بھی شدید مضطرب کر رکھا تھا۔ دراصل وہ گذشتہ روز شو کے دوران تھیٹر سے غیر حاضر تھا۔ جو ملازمین شو کے وقت موجود تھے وہ خدا جانے کیسے کیسے عجیب وغریب قصے سنا رہے تھے۔ ان کے مطابق کالےعلم کے غیرملکی ماہرین نے تماشائیوں کے ساتھ ناقابل بیان حد تک غیر اخلاقی حرکات کی تھیں۔ یہاں تک کہ کئی خواتین کو باہر سڑکوں پر برہنہ یا نیم برہنہ حالت میں چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کم گو، شریف النفس لاسچ اس قسم کی غیر معمولی کہانیاں سن کر شش و پنج کے عالم میں بار بار آنکھیں جھپک رہا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن اب تو اُسے ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ کیونکہ ڈائریکٹر، ایڈمنسٹریٹر اور فنانس ڈائریکٹر کی عدم موجودگی میں سب سے سینئر افسر وہی تھا اور تھیٹر کی تمام تر ذمہ داریاں اب اس کے کاندھوں پر آن پڑی تھیں۔

صبح دس بجے کا وقت ہوگا کہ ٹکٹ خریدنے کے منتظر تماشائیوں کے ہجوم میں بدنظمی کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ ممکنہ بدمزگی سے بچنے کے لئے پولیس کو بلا لیا گیا۔ پولیس کے پیدل اور گھڑ سوار دستوں نے بہت جلد ہجوم پر قابو پا لیا۔ یہ کلومیٹر سے زیادہ طویل قطار از خود شہریوں کے لئے کسی عجوبے سے کم نہیں تھی۔

تھیٹر کے باہر افراتفری کا عالم تو تھا ہی لیکن اندر کے حالات بھی کچھ زیادہ پرسکون نہیں تھے۔ ٹیلیفون بلاتوقف بج رہے تھے۔ شروع شروع میں تو خزانچی اور دوسرے ملازمین فون کا جواب دیتے رہے لیکن بعدازاں انہوں نے فون اٹھانے ہی بند کر دیئے کیونکہ بار بار پوچھے جانے والے سوالات۔۔ ڈائریکٹر ستیپال کہاں ہے؟ فنانس ڈائریکٹر رمیض کہاں ہے؟ ایڈمنسٹریٹر وریام کدھر ہے؟۔۔۔ کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

ایک خاتون کے بار بار استفسار کرنے پر خزانچی نے اسے فنانس ڈائریکٹر رمیض کی بیوی سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر خاتون کے اس انکشاف پر کہ وہ رمیض کی بیوی ہی بول رہی ہے وہ ایک آہ بھر کر رہ گیا۔ صفائی والی کوئی عجیب ہی قصہ سنا رہی تھی۔ اس کے مطابق جب وہ صبح صفائی کے لئے رمیض کے کمرے میں گئی تو دروازہ پہلے سے ہی کھلا تھا, باغیچے میں کھلنے والی کھڑکی ٹوٹی پڑی تھی, تمام بتیاں جل رہی تھیں, کرسیاں فرش پر اوندھی پڑی تھیں اور کمرے میں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔

تقریباً گیارہ بجے رمیض کی بیوی تھیٹر آن پہنچی۔ شدت جذبات سے الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے تھے۔ وہ زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر خزانچی کی عقل مکمل طور پر جواب دے گئی۔ وہ خاتون کو تسلی دینا چاہتا تھا لیکن اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے پولیس ملازمین تھیٹر پہنچ گئے۔ ان کا پہلا سوال بالکل مناسب اور متوقع تھا۔

یہ آپ کے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ آخر مسئلہ کیا ہے؟

''مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ بات کہاں سے شروع کروں''۔ خزانچی تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''عجب غیر معمولی حالات سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ تھیٹر کے ڈائریکٹر، فنانس ڈائریکٹر اور ایڈمنسٹریٹر کا پورے شہر میں نام و نشان نہیں ہے۔ تھیٹر شو کا مشہور میزبان بینگالی ذہنی امراض کے ہسپتال پہنچ چکا ہے۔ قصہ مختصراً یہ ہے کہ گزشتہ رات کے شو نے سکینڈل ہی سکینڈل کھڑے کر دیئے ہیں''۔

آہ و فغاں کرتی رمیض کی بیوی کو جھوٹی تسلیاں دے کر گھر واپس بھیج دیا گیا۔ رمیض کے کمرے کی حالت کے بارے میں صفائی والی کا بیان انتہائی توجہ کے ساتھ سنا گیا۔ تمام ملازمین کو اپنی اپنی جگہ لوٹ جانے اور روزمرہ کا کام جاری رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ کچھ دیر بعد پولیس کا سراغ رساں دستہ بھی تھیٹر پہنچ گیا۔ ان کے ساتھ بھورے رنگ کا لمبے بالوں والا ایک جسیم کتا بھی تھا۔ یہ پولیس کا مشہور سراغ رساں کتا طوزب تھا۔ اس کے منہ سے رال جبکہ آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ طوزب کی تھیٹر میں آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام ملازمین میں پھیل گئی۔ طوزب کی حرکات نے سب کو حیران کر کے رکھ دیا۔ فنانس ڈائریکٹر کے دفتر میں داخل ہوتے ہی اس نے غصیلے انداز میں بھونکنا شروع کر دیا اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا

کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اب اس کا غرانے کا انداز بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اُسے کسی نادیدہ طاقت نے خوف زدہ کر دیا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے خوف پر قابو پا لیا اور اچانک اگلے پاؤں کھڑکی پر ٹکا ئے دوبارہ غصیلے انداز میں بھونکنے لگ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے کھڑکی سے باہر کود جائے گا۔

پولیس اہلکار نے بمشکل طوزب کو قابو میں کر رکھا تھا۔ کھڑکی سے نیچے اُترنے کے بعد وہ راہداری سے ہوتا ہوا سیڑھیوں تک جا پہنچا۔ وہاں سے فرش کو سونگھتا ہوا وہ تھیٹر سے باہر نکل آیا اور چوراہے کے نزدیک ٹیکسی سٹینڈ پر رک گیا۔ اس نے منہ آسمان کی جانب بلند کر لیا اور بے بسی کے انداز میں بھونکنے لگ گیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ٹیکسی سٹینڈ سے آگے اُس کی سونگھنے کی صلاحیت جواب دے گئی ہے۔

سراغ رساں دستے کے اہلکار وریام کے دفتر میں جمع ہو گئے اور ملازمین کو باری باری وہاں بلا کر گذشتہ روز کے واقعات کی تفصیل سننے لگ گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پولیس اہلکاروں کی الجھن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کالےعلم کے ماہر پروفیسر کے ساتھ کئے گئے معاہدے کی کاپی ڈھونڈنے کے لئے تھیٹر کے تمام کاغذات کو چھان مارا گیا لیکن معاہدے کا کوئی نام ونشان نہ ملا۔

تھیٹر کے ملازمین تو اُس کم بخت کا نام تک بھول چکے تھے۔ البتہ ایک ٹکٹ فروش خاتون نے ذہن پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ پروفیسر کا نام غالباً ولانہ تھا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''نہیں ولانہ نہیں، شاید فلانہ تھا یا پھر بلانہ تھا''۔

غیر ملکیوں کی رجسٹریشن کرنے والے بیورو سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں ان کے ریکارڈ میں نہ کسی ولانہ، نہ فلانہ اور نہ ہی بلانہ کا اندراج ہے۔

ایک قاصد نے بتایا کہ کالےعلم کا پروفیسر، تھیٹر کے ڈائریکٹر ستپال کے فلیٹ میں رہائش پذیر ہے۔ اس اطلاع کی تصدیق کے لیئے فوری طور پر سراغ رساں پولیس کی ایک گاڑی روانہ کر دی گئی۔ کوئی غیر ملکی فن کار تو دور کی بات خود ستپال بھی اپنے گھر پر موجود نہیں تھا۔ گھر میں صفائی کرنے والی ملازمہ گورتی بھی غائب تھی۔ عمارت کی انتظامی کمیٹی کا صدر نکانور بھی غائب ہو چکا تھا۔

صورتحال ہر لحظہ مزید الجھتی جا رہی تھی۔ تھیٹر کی تمام انتظامیہ غائب تھی اور سکینڈلز سے بھرپور شو پیش کرنے والے فن کاروں کا بھی کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔

دن کے بارہ بجنے کو تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب ٹکٹوں کی فروخت شروع کی جاتی تھی۔ تاہم بارہ بج کر دس منٹ پر ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر ایک نوٹس چسپاں کر دیا گیا۔

''آج کا شو معطل کر دیا گیا ہے''۔

قطاروں میں لگے تماشائی بھڑک اٹھے لیکن ان کا احتجاج زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد تھیٹر کے باہر سناٹا طاری ہو گیا۔ سیکورٹی کے عملہ کے سوا تھیٹر کے تمام ملازمین کو چھٹی دے دی گئی اور تمام دفاتر کے دروازے مقفل کر دیئے گئے۔

پولیس اہلکاروں کا خیال تھا کہ تھیٹر میں مغز ماری سے انہیں اب مزید کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

خزانچی لاسچ کے ذمے اب دو کام آن پڑے تھے۔ ایک تو اسے شہر کے تھیٹروں کی انتظامی کمیٹی کے سامنے گذشتہ روز کے واقعات کی رپورٹ پیش کرنا تھی۔ دوسرا، اسے گذشتہ روز کے شو کی آمدن مبلغ اکیس ہزار سات سو گیارہ روبل بنک میں جمع کرانے تھے۔ خزانچی نے نوٹوں کے پیکٹ کو فیتے سے باندھنے کے بعد بمشکل اپنے بیگ میں ٹھونسا اور تھیٹر سے نکل کر وہ ٹیکسی سٹینڈ پر پہنچ گیا۔

سٹینڈ پر تین خالی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ لیکن نجانے کیوں خزانچی کو دیکھ کر تینوں ڈرائیوروں نے منہ بسور لیئے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لاسچ کی حیرت قابل دید تھی۔ کچھ دیر بعد ایک اور گاڑی آ کر رکی۔ خزانچی کے منہ کھولنے سے قبل ہی ڈرائیور بول پڑا۔

''پیسے ہیں تمہارے پاس؟''

''ہیں۔ بالکل ہیں''۔

''دکھاؤ''

خزانچی قدرے شرمندہ ہو گیا۔ تاہم اس نے اپنے بٹوے سے دس کا نوٹ نکال کر ڈرائیور کو دکھایا۔

نہیں چلے گا۔ ڈرائیور بولا۔ اگر پانچ پانچ کے نوٹ ہیں تو وہ دکھاؤ۔

خزانچی کی حیرت اب انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے بٹوے سے پانچ پانچ کے تین نوٹ نکال کر دکھائے تو ڈرائیور کا رویہ یکدم تبدیل ہو گیا۔ اپنے کرخت چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے اس نے لاسچ کو گاڑی میں سوار ہونے کی دعوت دی اور ٹیکسی کا میٹر چالو کرنے کے بعد اس نے گاڑی چلا دی۔

''آپ کے پاس کیا واپس کرنے کے لئے ریزگاری نہیں ہے؟'' لاسچ نے پوچھا۔

''ریزگاری کا ڈھیر ہے میرے پاس''۔ ڈرائیور چیخ کر بولا۔ غصے سے اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو گئی تھیں۔ ''میں آج دو مرتبہ حادثے کا شکار ہو چکا ہوں۔ پہلے مسافر نے منزل پر پہنچ کر مجھے دس کا نوٹ دیا۔ میں نے اسے ساڑھے چار واپس کیئے۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ دس کا نوٹ غائب ہو گیا اور اس کی جگہ بوتل کے نشان والے ایک زرد کاغذ نے لے لی۔ دوسرا واقعہ ریلوے سٹیشن کے قریب پیش آیا۔ پھر وہی دس

کا نوٹ۔ میں نے تین کا نوٹ واپس کیا۔ پانچ منٹ بعد احتیاطاً جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو جانتے ہو کیا ہوا؟ نوٹ غائب اور اُس کی جگہ ایک بھڑ۔جس (نا قابل اشاعت الفاظ) نے میری انگلی کاٹ کھائی اور غائب ہوگئی۔کل اُس (نا قابل اشاعت الفاظ) ورائٹی تھیٹر میں کسی خنزیر کی نسل کے جادوگر نے (نا قابل اشاعت الفاظ) دس دس کے نوٹوں کی بارش کر دی تھی''۔

خزانچی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ڈرائیور کو کیا جواب دے۔اس نے سر ہلا کر ڈرائیور کو کچھ اس طرح کا تاثر دینے پر اکتفا کی کہ جیسے لفظ ورائٹی تھیٹر اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ سنا ہے۔

منزل پر پہنچ کر خزانچی نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور کرایہ ادا کرنے کے دوران کوئی حادثہ پیش نہ آنے پر اس نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔

تھیٹر کی انتظامی کمیٹی کے دفتر پہنچنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ بہت غلط وقت پر وہاں آیا ہے۔ اس دفتر کی قاصد خاتون دیوانہ وار آنکھیں دائیں بائیں گھماتے ہوئے خزانچی کے نزدیک سے چیختی ہوئی گزری۔''نہیں ہے۔نہیں ہے وہ''۔نجانے وہ کسے مخاطب کرتے ہوئے بول رہی تھی۔''کوٹ اور پتلون موجود ہیں لیکن ان کے اندر کوئی نہیں ہے''۔

خاتون چلاتی ہوئی راہداری میں ایک دروازے کے پیچھے غائب ہوگئی۔اندر سے اس کی چیخوں کے علاوہ برتنوں کے ٹوٹنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔تھوڑی دیر میں انتظامی کمیٹی کے صدر کا دروازہ دوبارہ کھلا اور خزانچی کا شناسا ایک اہلکار انتہائی خستہ حالت میں کمرے سے برآمد ہوا۔اس کے بال بکھرے اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔وہ خزانچی پر نظر ڈالے بغیر راہداری میں دوڑے چلا جا رہا تھا۔

یہ سب دیکھنے کے بعد خزانچی کی اپنی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔رہی سہی کسر دفتر کے دروازے کے پاس پہنچ کر نکل گئی۔بند دروازے کی اوٹ سے سنائی دینے والی آواز بلاشبہ کمیٹی کے صدر پیٹر کی تھی۔ خزانچی کو ایسا لگا کہ شائید پیٹر کسی کو ڈانٹ رہا ہے یا پھر کسی کے ساتھ تکرار میں الجھا ہوا ہے۔خزانچی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔آرام دہ کرسی پر کمیٹی کے صدر کی سیکرٹری آنّا کچھ اس حالت میں بیٹھی تھی کہ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔وہ سینے تک آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔آنکھوں سے بہہ جانے والے کاجل نے اس کے سرخ وسفید چہرے پر سیاہ دھاریوں کا جال بنا ڈالا تھا۔لاتچ کو دیکھتے ہی وہ اچھل کر اس سے لپٹ گئی اور چلاتے ہوئے بولی۔۔

''شکر ہے خدا کا! کسی کو تو ہمت ہوئی ہے! سب ڈرپوک بھاگ گئے ہیں۔مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں''۔اور وہ خزانچی کو کھینچتے ہوئے میز کے پاس لے گئی۔

میز کے پیچھے کرسی پر ایک خالی سوٹ ''بیٹھا'' تھا۔اُس نے ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔کوٹ کی جیب

سے بیش قیمت فاؤنٹین پین جھانک رہا تھا۔کوٹ کے دائیں بازو سے کچھ فاصلے پر ایک قلم ہوا میں معلق تھا اور یوں لگتا تھا کہ سامنے پڑے کاغذ پر کچھ لکھ رہا ہے۔کوٹ کے کالر کے اوپر نہ تو کوئی گردن تھی اور نہ ہی کوئی سر۔خزانچی کے دفتر میں داخل ہونے کی آہٹ سن کر سوٹ تھوڑا پیچھے کو کھسکا اور کالر کے پیچھے سے پیٹر کی مانوس آواز اُبھری۔

''کیا مسئلہ ہے؟ میں نے تو دروازے پر نوٹ لگوا رکھا ہے کہ آج ملاقات کا دن نہیں ہے''۔

سیکرٹری روما خوفزدہ آواز میں بولی۔

''دیکھ رہے ہیں آپ؟ دیکھ رہے ہیں؟نہیں ہے وہ!نہیں ہے وہ! خدارا! اسے واپس لے آئیں۔واپس لے آئیں۔

اس دوران دفتر کا دروازہ کھلا۔کسی کی زوردار چیخ سنائی دی اور دروازہ پھر بند ہوگیا۔

خزانچی کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور اب زیادہ دیر تک اُس کا بوجھ برداشت نہیں کرسکیں گی۔وہ ایک کرسی کے کنارے پر بیٹھ گیا۔اپنا بیگ اُس نے ابھی تک بغل میں دبا رکھا تھا۔روما اُس کے آس پاس اچھل کود کر رہی تھی اور ایک ہاتھ سے اس نے خزانچی کا کوٹ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

وہ بولی۔۔

''میں انہیں ہمیشہ کہتی تھی کہ یہ بھوتوں والا تکیہ کلام چھوڑ دیں۔لیکن یہ نہیں مانے۔بات بات پر کہتے تھے۔۔بھوت جانے،بھوت کھا گئے،بھوت لے گئے۔۔اور یہ لو اب آخر کار بھوت لے ہی گئے''۔وہ زور زور سے روتے ہوئے چیخنے لگی۔''میرے پیارے پیٹر! کہاں ہیں آپ؟ کہاں ہیں آپ؟''

''کون سا پیارا؟ کون ہے یہاں پیٹر؟''سوٹ نے کرسی کو پیچھے کی جانب دھکیلتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں پہچان رہا۔نہیں پہچان رہا مجھے''۔سیکرٹری نے اونچی آواز میں دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

''براہ کرم میرے دفتر میں رونا دھونا بند کریں''۔سوٹ نے کوٹ کی ایک آستین ہوا میں بلند کرتے ہوئے غصیلی آواز میں کہا۔

''نہیں دیکھا جاتا یہ سب مجھ سے۔اب اور نہیں دیکھا جاتا''۔یہ کہتے ہوئے سیکرٹری دفتر سے باہر نکل گئی۔اس کی تقلید کرتے ہوئے لاتچ بھی گولی کی طرح اڑتا ہوا دفتر سے باہر نکل آیا۔

''ذرا اندازہ تو کیجئے۔میں کرسی پر بیٹھی تھی کہ''۔سیکرٹری روما نے دوبارہ لاتچ کو آستین سے قابو کرتے ہوئے بولنا شروع کیا۔''ہمارے دفتر میں ایک سیاہ رنگ کا جسیم بلا داخل ہوا۔میں نے فوراً شی،شی، کر کے اُسے بھگانے کی کوشش کی۔وہ کم بخت تو دفعان ہوگیا لیکن اس کی جگہ ایک ناٹے قد کا موٹا سا شخص

کمرے میں آن گھسا۔ اور اچنبھے کی بات یہ ہے کہ اُس کا چہرہ بھی بلّے سے مشابہہ تھا۔ وہ آتے ہی کہنے لگا۔ ''محترمہ یہ آپ مہمانوں کو شی شی کر کے باہر نکلنے کا کیوں کہتی ہیں'؟ اور وہ سیدھا میرے باس پیٹر کی میز کی جانب چل پڑا۔ میں بہت چلائی لیکن اس بدبخت نے میری ایک نہ سنی اور پیٹر کے سامنے کرسی پر براجمان ہوگیا۔'' آپ کو غالباً معلوم ہی ہوگا کہ پیٹر ایک انتہائی نستعلیق اور شائستہ آدمی ہے۔ ہاں اعصابی طور پر کمزور ضرور ہے۔ غصے میں بھی ذرا جلدی آ جاتا ہے۔ اس بدتمیز مہمان کو دیکھ کر وہ کچھ یوں گویا ہوا۔ ''آپ بغیر وقت لئے کیوں آئے ہیں؟'' جواب میں وہ کم بخت چہرے پر تضحیک آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے''۔ پیٹر نے جواب دیا کہ میں اس وقت مصروف ہوں۔ وہ بدبخت جواب میں کہنے لگا۔ ''جھوٹ مت بولو۔ تم مصروف نہیں ہو''۔ بس پھر کیا تھا۔ پیٹر کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ چیختے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ دھکے مار کر نکال دو۔ اس کم بخت کو نکال دو باہر۔ لے جائیں بھوت اس کو اور مجھے بھی بھوت غائب کر دیں یہاں سے''۔ وہ ملعون شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''آہا! بھوت لے جائیں؟ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ابھی ہو سکتا ہے''۔ اور اس سے پہلے کہ میں چیختی وہ بلّے کے تھوبڑے والا اچانک غائب ہوگیا اور پیٹر کی جگہ۔۔۔۔۔ اوہ خدایا! اوہ خدایا! صرف کوٹ اور پتلون''۔

شدت جذبات سے روما ہلکان ہو رہی تھی اور کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر نظر آ رہی تھی۔

اور وہ لکھ رہا ہے۔ لکھے جا رہا ہے۔ خدایا میں پاگل ہو جاؤں گی۔ ٹیلی فون پر باتیں کر رہا ہے۔۔ آواز بھی اسی کی ہے۔ لیکن خود غائب ہے۔ تمام لوگ خوفزدہ ہو کر دفتر سے بھاگ گئے ہیں''۔

خزانچی سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ لیکن اچانک قسمت خزانچی پر مہربان ہوگئی۔ سیکرٹری روما کے دفتر میں دو پولیس والے آ پہنچے۔ انہیں دیکھ کر خوبرو روما کے رونے میں مزید شدت آ گئی۔

''محترمہ دل چھوٹا نہ کریں اور براہ کرم رونا دھونا بند کر دیں''۔ ایک پولیس والا بولا۔ خزانچی یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس کی اب یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے دفتر سے باہر تازہ ہوا میں آ گیا۔ اس کے ذہن میں کھچڑی پک رہی تھی اور گذشتہ روز تھیٹر میں پیش آنے والے واقعات میں شامل بلّا بار بار اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ''کہیں یہ ہمارے تھیٹر والا بلّا یہاں بھی تو نہیں آن ٹپکا؟''۔

پیٹر کے دفتر آنے کا خزانچی کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس ادارے سے منسلک ایک دوسرے دفتر جانے کا ارادہ کر لیا۔ یہ دوسرا دفتر تقریباً نصف کلومیٹر دور تیسری گلی میں واقع تھا۔ اس کی عمارت اپنے خوبصورت تاریخی ستونوں کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھی۔

لیکن آج لوگوں کی توجہ کا مرکز یہ ستون نہیں بلکہ داخلی دروازے کے پاس شہر کے تھیٹر میں منعقد

ہونے والے ڈراموں اور دوسرے پروگراموں کے اشتہارات تقسیم کرنے والی لڑکی تھی۔ یہ لڑکی ایک کرسی پر بیٹھی زاروقطار رو رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک میز پر تھیٹری پروگراموں کا تشہیری مواد بکھرا پڑا تھا۔ اچانک ایک زوردار ہچکی لینے کے بعد وہ ہیجان کے عالم میں چیخ اٹھی۔ ''یہ کیا؟ پھر سے؟ دوبارہ؟'' اور یکا یک کانپتی آواز میں گانے لگ گئی۔۔۔۔۔

''وہ نیلا سمندر، وہ بارش کا پانی''۔

ایک قاصد جو سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا نجانے کسے مکا دکھاتے ہوئے اپنی بھدی سی آواز میں اس لڑکی کے ساتھ گانے لگ گیا۔

''وہ خستہ سی کشتی، وہ لہروں کی روانی''۔

ایک ایک کر کے اور بہت سے لوگ اس کورس میں شامل ہو گئے۔ تھیٹروں کی آمدن کا حساب کتاب رکھنے والے شعبہ کے کمرے کی کھلی کھڑکیوں سے آٹھ دس اہلکاروں نے ایک دوسرے کے پیچھے سے سر نکالے انتہائی پرجوش انداز میں اونچی نیچی سُریں نکالنی شروع کر دیں۔

''اے کشتی والے ذرا زور سے چلا نا''۔

قاصد سیڑھیوں پر ہی کھڑا اس گیت میں الاپ لے رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں سے لگاتار آنسو رواں تھے لیکن وہ اپنی روہانسی آواز میں گانا جاری رکھے ہوئے تھی۔۔

''ماہی میرا دور ہے پر جانا مجھے ضرور ہے''۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ عمارت کے مختلف حصوں میں کھڑے یہ لوگ کچھ ایسی تال میل سے گا رہے تھے کہ جیسے کوئی بہت بڑا موسیقار انہیں ہدایات دے رہا ہو۔ راہ گیر رک رک کر اس ثقافتی شو کا مزا لے رہے تھے۔

گیت کا پہلا بند ختم ہوتے ہی غیر متوقع طور پر سب لوگوں نے گانا بند کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے موسیقی کا ہدایت کار پاؤں پھسلنے سے نیچے گر گیا ہے اور انہیں ہدایات دینے والا اب کوئی نہیں رہا۔

قاصد نے کچھ مغلظات بکیں اور سیڑھیوں سے غائب ہو گیا۔

عمارت کا داخلی دروازہ کھلا اور وہاں سے سفید کوٹ پہنے ایک شخص سیکورٹی گارڈ کے ہمراہ برآمد ہوا۔

'' کچھ کرو ڈاکٹر۔ خدارا کچھ کرو'' لڑکی چیختی ہوئی بولی۔

سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے محکمے کا سربراہ بھی باہر نکل آیا۔ غالباً کچھ شرمندگی اور کچھ غصے کے عالم میں ہکلاتے ہوئے وہ بولا۔ ''دیکھئے ڈاکٹر یہ کوئی اجتماعی ہپناٹزم کا کیس لگتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں۔۔۔۔۔'' وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا اور اچانک بھونڈی آواز میں خود سے گانے لگ پڑا۔

''میری نیا پار لگا دے''۔

''احمق!!'' لڑکی چیخ کر بولی اور اس سے قبل کہ وہ بتا پاتی کہ اس خطاب سے اس نے کسے نوازا ہے وہ خود بھی پہلے کی طرح ''نیا پار لگا دے'' کے الاپ میں شامل ہوگئی۔

''قابو میں رکھیئے اپنے آپ کو۔۔۔۔ اور یہ گانا وانا بند کیجئے''۔ ڈاکٹر محکمے کے سربراہ سے مخاطب ہوا۔ لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ گانا بند کرنا اُس کے بس میں نہیں ہے۔ اگر کوئی اُس کا گانا رکوا سکتا تو بدلے میں وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔ وہ اب تمام لوگوں کے ساتھ سُر ملا کر چیخ رہا تھا۔

نہ خزانوں میں نہ ہیجانوں میں

میری زندگی تو ہے بس پیانوں میں

جونہی یہ بند ختم ہوا ڈاکٹر نے دوشیزہ کے منہ میں سکون آور دوا کے قطرے انڈیل دیئے اور دوڑ کر باقی ماندہ ''گلوکاروں'' کے منہ بھی کھلوانے لگ گیا۔

''معاف کیجئے گا''۔ خزانچی اس نوجوان لڑکی سے ہمکلام ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے یہاں سیاہ بلّے کا گذر تو نہیں ہوا؟''۔

''کہاں کا بلّا؟'' لڑکی چلا کر بولی۔ ''یہاں تو ایک گدھا بیٹھا ہے۔ لمبے لمبے کانوں والا گدھا! بے شک سن لے وہ آج۔ میں اب خاموش نہیں رہ سکتی۔ میں سارا پول کھول دوں گی''۔

اور پول اس نے واقعی میں کھول کر رکھ دیا۔

وہ اوپر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہتا ہے۔ رنگ برنگی سوسائٹیاں بناتا ہے اور ان کے نام پر فنڈ ہڑپ کر جاتا ہے۔ کبھی شطرنج سوسائٹی۔ کبھی مشاعرہ سوسائٹی، کبھی کوہ پیانوں کی سوسائٹی اور آج صبح یہ مردود''۔ محکمے کے سربراہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ بولی، ''کینٹین میں آ دھمکا۔ اس کے ساتھ ناقابل بیان حد تک مکروہ شکل والا ایک اور خبیث تھا جس نے دھاری دار پتلون پہن رکھی تھی۔ ہمارے چہیتے نے کینٹین میں موجود ملازمین کے ساتھ اس مکروہ شکل والے کا تعارف کچھ اس طرح کروایا:

''یہ صاحب گائیکی کے بہت بڑے قدردان ہیں۔ خود بھی بہت اچھا گاتے ہیں اور ہمارے ہاں گائیکی کی سوسائٹی تشکیل دینے میں دل چسپی رکھتے ہیں''۔

مستقبل کے کوہ پیاؤں کے چہرے یکدم لٹک گئے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ نئی سوسائٹی بنتے ہی پرانی غائب ہو جائے گی۔ مکروہ شکل والے نے گائیکی کے فوائد پر ایک اچھا خاصہ لیکچر جھاڑ دیا۔

چاپلوسی کے ماہرین، ایک قاصد اور خزانچی نے فوراً کھڑے ہو کر سوسائٹی کا ممبر بننے کا اعلان کر دیا۔ ان کی تقلید کرتے ہوئے کینٹین میں موجود تقریباً تمام لوگوں نے اپنے نام لکھوا دیئے۔ مکروہ شکل والا

اچھل اچھل کر خوشی کا اظہار کرتا رہا اور دوپہر کے کھانے کے وقفے کے دوران سب کو ایک ہال میں اکٹھا کر نے کے بعد،"وہ نیلا سمندر،وہ بارش کا پانی" کی ریہرسل کروانے لگ گیا۔

وہ ہاتھ میں چھڑی لئے کسی پیشہ ور موسیقار کی طرح لہک لہک کر ہمیں ایک ساتھ گانے کی ترغیب دیتا رہا۔اس کی شکل دیکھنے کے بعد ایک ہی خیال میرے ذہن میں ابھر رہا تھا کہ اوپر والے نے شائید غلطی سے بندر کا چہرہ اُس کی دُم کے نیچے لگا دیا ہے۔وہ کہہ رہا تھا کہ قدیم روایات اور قدیم موسیقی کو زندہ رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے اور نجانے وہ کہاں سے یہ صدیوں پرانا گیت نکال لایا۔

۔وہ نیلا سمندر۔۔۔۔

دھاری دار پتلون والا اپنا کام بخوبی جانتا تھا۔گانے کی ہدایات دینے کے بعد وہ کچھ دیر میں واپس آنے کا کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔سب کا خیال تھا کہ وہ جلد واپس آ جائے گا۔لیکن وہ ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہیں آیا۔اس کے غائب ہونے پر پورے عملے میں خوشی کی لہر دوڑ اٹھی تھی"۔

اور پھر اچانک گانے کے شرکا نے کسی کے بتائے بغیر دوسرا بند گانا شروع کر دیا۔تقریباً دس منٹ بعد سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر واپس لوٹ گئے۔لگتا تھا کہ حالات پہلے کی طرح پر سکون ہو گئے ہیں۔لیکن پھر اچانک ہی سب لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی گانے لگ پڑے۔ایک بند گانے کے بعد تین منٹ کی خاموشی اور گانا دوبارہ شروع۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی نادیدہ قوت ہم لوگوں سے گانا اگلوا رہی ہے۔ادارے کا سربراہ شرم کے مارے اپنے دفتر میں بند ہو گیا تھا۔

لڑکی کی کہانی کا تسلسل اچانک ٹوٹ گیا۔سکون آور دوا کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا کیونکہ اس نے دوبارہ اپنی بے سری آواز میں گانا الاپنا شروع کر دیا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد تین بسیں دفتر کے نزدیک آ کر رکیں۔ان تمام گلوکار ملازمین کو بسوں میں لادنے کے بعد وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔پہلی بس جیسے ہی سڑک پر چڑھی اس کی سواریوں نے یک زبان ہو کر پھر سے گانا شروع کر دیا۔ جب دوسری اور پھر تیسری بس کے مسافر بھی اس گائیکی میں شامل ہوئے تو یوں لگتا تھا کہ سارا شہر ہی پیانوں میں ڈوب رہا ہے۔

خزانچی لاسچ نے وہاں سے کھسک لینے میں ہی بہتری سمجھی اور نوٹوں سے بھرا بیگ بغل میں دبائے بینک پہنچ گیا۔بینک کے خزانچی کو بیگ دکھاتے ہوئے اس نے کہا۔پیسے جمع کرانے ہیں۔

بینک کے خزانچی نے پوچھا۔کہاں سے آئے ہو اور کتنے پیسے ہیں تمہارے پاس؟۔

"جی یہ ورائٹی تھیٹر کی امانت ہے"۔لاسچ بولا۔"ٹھیک اکیس ہزار سات سو گیارہ روبل ہیں"۔

"اوہ،ہو،ہو"مضحکہ خیز انداز میں بینک کا خزانچی بولا۔سبز رنگ کا ایک فارم لاسچ کو تھمانے کے

بعد اس نے بینک کی کھڑکی بند کردی اور ایک دوسرے ملازم کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگ گیا۔

بینکوں کی کاروائی سے بخوبی واقف لا سچ جلدی سے فارم پر کرنے لگ گیا۔ جب اس نے گنتی کرنے کے لئے نوٹوں کی گڈیوں کو کھولا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ تمام روبل غائب ہو چکے تھے۔ اور بیگ رنگ رنگ کی غیر ملکی کرنسی سے بھرا پڑا تھا۔ امریکی ڈالر۔ برطانوی پاؤنڈ۔ اطالوی لیرے۔ فرانسیسی فرانک۔ جرمن مارک۔

لا سچ کی آنکھوں کے سامنے لاتعداد رنگین ستارے چمکنے لگ گئے۔ وہ اپنا سر ہاتھوں میں تھامے فرش پر دوزانوں ہو کر بیٹھ گیا۔

یہ رہا ورائٹی تھیٹر کا ایک اور فن کار۔ ایک بھاری بھر کم کرخت آواز صدمے سے نیم بے ہوش لا سچ کے کانوں سے ٹکرائی۔

لا سچ کو گرفتار کرلیا گیا۔

باب ۱۸

بدقسمت مہمان

مین اس وقت جب شریف انفس خزانچی لاسچ ٹیکسی میں سوار انتظامی کمیٹی کے دفتر پہنچا اور خالی سوٹ کے سامنے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا، ریلوے سٹیشن پر شہر کیف سے آنے والی گاڑی کی بوگی نمبر نو سے دوسرے مسافروں کے ساتھ ایک خوش پوش درمیانے قد کا مرد ہاتھ میں چھوٹا سا صندوقچہ اٹھائے برآمد ہوا۔ یہ مسافر مرحوم مائیکل بیرلی کا پھوپھا پوپلی تھا جو کہ ایک مشہور ماہر اقتصادیات تھا۔

پوپلی کے ماسکو آنے کی وجہ وہ عجیب وغریب ٹیلی گرام تھا جو پرسوں شام اسے موصول ہوا تھا۔ ٹیلی گرام کا متن کچھ اس طرح تھا۔

!!! میں تھوڑی دیر قبل ٹرام تلے کچلا گیا ہوں۔ تدفین بروز جمعہ دن کے تین بجے ہو گی۔ ضرور پہنچئے!!

مائیکل بیرلی

پوپلی کو شہر میں دانائی سے بھرپور شخصیت مانا جاتا تھا۔ ماسکو سے موصول ہونے والی ٹیلی گرام کسی بھی دانا شخص کی عقل ماؤف کرنے کے لئے کافی تھی۔ ٹرام کے نیچے آنے والا جب خود ہی ٹیلی گرام بھیج رہا ہے تو اس کا واضح مطلب یہی نکلتا ہے کہ اس کی موت واقع نہیں ہوئی۔ لیکن پھر یہ تدفین کیوں؟ یا پھر شائید وہ شدید زخمی ہے اور اسے اپنی موت یقینی نظر آ رہی ہے۔ یہ ممکن تو ہے لیکن اپنی ہی تدفین کا وقت مقرر کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ کچھ عجیب ہی تھا یہ ٹیلی گرام۔

اوپر والے نے پوپلی جیسے عقل مند لوگ شائید اسی طرح کی پیچیدگیاں سلجھانے کے لئے ہی پیدا کر رکھے ہیں۔ بات سادہ سی لگتی ہے۔ شائید محکمہ ٹیلی گراف سے چھوٹی سی غلطی ہوگئی تھی۔ لفظ ''میں'' غالباً کسی دوسرے ٹیلیگرام کے پیغام سے اچک لیا گیا تھا۔ جبکہ اس ٹیلی گرام میں لفظ ''میں'' کی جگہ بیرلی ہونا چاہیے تھا۔ اس کا مطلب بلاشبہ انتہائی افسوسناک تھا۔ تاہم بات کچھ بے تکی سی لگتی تھی۔

یہ خبر سننے کے بعد جب بیرلی کی پھوپھی کی گریہ زاری کچھ مدہم پڑی تو پوپل نے ماسکو جانے کی تیاری شروع کردی۔

یہاں پوپل کا ایک چھوٹا سا بھید بیان کرنا ضروری ہے۔ یہ بات تو سچ ہے کہ اسے بیوی کے بھتیجے کی موت کا شدید رنج تھا لیکن اس کی تدفین پر موجودگی کو وہ کوئی بہت ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے باوجود پوپل ماسکو جانے کی جلدی میں تھا۔ آخر یہ ماجرا کیا تھا؟ ماجرا دراصل یہ تھا کہ پوپل کو ماسکو میں فلیٹ حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ نجانے اسے اپنا شہر کیف کیوں پسند نہیں تھا۔ وہ ماسکو میں فلیٹ حاصل کرنے کے لئے متعدد بار ناکام کوشش کر چکا تھا۔ گذشتہ کچھ سالوں سے وہ اسی وجہ سے چڑ چڑے پن کا شکار بھی ہوگیا تھا۔ اس کی راتوں کی نیند بے سکونی کا شکار ہوگئی تھی۔ اسے اپنے شہر کیف کی گلیاں بری لگنے لگی تھیں۔ موسم بہار میں باغیچوں میں کھلنے والے پھول اب اسے بھدے لگتے تھے۔ پروقار تاریخی عمارتوں سے اسے گھن آنے لگی تھی۔ اس کے سر پر ایک ہی بھوت سوار تھا۔ ''ماسکو میں مستقل رہائش''۔

کیف میں وسیع الرقبہ آرام دہ رہائش کے عوض ماسکو میں خواہ ایک کمرے کا ہی فلیٹ حاصل کرنے کے لئے اخبارات میں دیئے گئے اشتہار بے سود ثابت ہوئے تھے۔

شائید اسی لئے مائیکل بیرلی کی ناگہانی موت کے ٹیلی گرام نے پوپل کو بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ شائید اوپر والے نے اس کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لئے یہ سارا کھیل رچایا ہے۔ عقل مندی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اس موقعہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔

تمام رکاوٹوں اور مشکلات کو عبور کر کے بیوی کے مرحوم بھتیجے کا فلیٹ وراثت میں حاصل کرنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔ زندگی کے تجربے سے مالا مال پوپل کو بخوبی اندازہ تھا کہ سب سے پہلے تو وارث ہونے کے ناطے اس کا فلیٹ پر قابض ہونا بہت ضروری ہے۔

پوپل بروز جمعہ دن کے وقت عمارت ۳۰۲ کی انتظامی کمیٹی کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں دیوار پر ایک خستہ حال پرانا پوسٹر آویزاں تھا جس پر پانی میں ڈوبنے والے کو سانس دلانے کے مختلف طریقے درج تھے۔ ایک کرسی پر بکھرے ہوئے بالوں والا ایک ہونق سا آدمی بیٹھا تھا جو الو کی مانند اپنی گول گول آنکھیں دیوار پر گاڑے ہوئے تھا۔

''کیا میں انتظامی کمیٹی کے صدر سے مل سکتا ہوں''۔ اپنا صندوقچہ زمین پر رکھتے ہوئے مودبانہ انداز میں ماہر اقتصادیات نے پوچھا۔

اس بظاہر سادہ سے سوال نے نجانے کیوں کرسی پر بیٹھے اہلکار کو افسردہ کر دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یکسر تبدیل ہوگئے اور اس کی آنکھیں اچانک بھینگی ہوگئیں۔ اس نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''نہیں

ہے صدر"۔

"اچھا تو کیا وہ اپنے گھر پر ہیں؟ پوپل نے پوچھا۔" مجھے ان سے ایک انتہائی ضروری کام ہے"۔

کارندے نے دوبارہ بیزاری سے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔"نہیں ہے۔ وہ گھر پر بھی نہیں ہے"۔

"ان کی آمد کب تک متوقع ہے؟"

اس سوال کا جواب دینے کی بجائے کارندہ اداسی کے عالم میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگ گیا۔

"اچھا تو سیکرٹری صاحب کا ہی کچھ اتا پتا بتا دیں"۔

"نہیں ہے۔ سیکرٹری بھی نہیں ہے۔ بیمار ہے وہ"۔ اہلکار اسی بیزاری سے بڑبڑایا۔

پوپل کو اب اس شخص پر غصہ آنے لگا تھا۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے شائستہ لہجے میں پوچھا۔" جناب! صدر اور سیکرٹری کی عدم موجودگی میں کوئی تو ذمہ دار ہوگا اس دفتر کے معاملات کا؟"

"جی میں ہوں نا"۔ دھیمی آواز میں اہلکار نے کہا۔

"دیکھیں جناب"۔ پوپل نے بولنا شروع کیا۔"میں اپنے مرحوم بھتیجے مائیکل بیرلی کا واحد قانونی وارث ہوں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہوگا میرے بھتیجے کی موت ٹرام تلے کچلے جانے سے ہوئی ہے۔ مروجہ قانون کے مطابق اس کی تمام متروکہ جائیداد بشمول فلیٹ نمبر پچاس کا حقدار میں ہوں"۔

"نہیں محترم میں اس قانون سے آشنا نہیں ہوں"۔ اہلکار نے جواب دیا۔

"لو یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" اونچی آواز میں پوپل بولا۔"اگر آپ اس دفتر سے متعلق ہیں تو آپ کی ذمہ داری بنتی ہے کہ۔۔۔۔۔۔" پوپل کی بات نامکمل ہی رہ گئی کیونکہ کمرے میں ایک دوسرا شخص وارد ہوا تھا جسے دیکھتے ہی دفتری اہلکار کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

"آپ انتظامی کمیٹی کے رکن ہیں؟" نووارد نے اہلکار سے پوچھا۔

"جی میں"۔ دھیمی منمناتی آواز میں اہلکار نے جواب دیا۔

نووارد نے اہلکار کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر اہلکار کی حالت مزید بگڑ گئی۔ وہ فوراً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور نووارد کے ساتھ دفتر سے نکل گیا۔ اب پوپل بے چارہ کمرے میں اکیلا رہ گیا تھا۔

کیا مصیبت ہے۔ ان کم بختوں کو بھی آج ہی اکٹھے غائب ہونا تھا۔ انتہائی غصے کے عالم میں یہ سوچتے ہوئے پوپل فلیٹ نمبر پچاس کی جانب چل دیا۔

پوپل نے ابھی فلیٹ کے دروازے کی گھنٹی پر انگلی رکھی ہی تھی کہ دروازہ کھل گیا اور وہ فلیٹ کی نیم روشن راہداری میں داخل ہوگیا۔ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی وہ کچھ حیرانگی کا شکار ہوگیا کیونکہ راہداری سنسان پڑی تھی۔ واحد ذی روح کرسی پر براجمان جسیم سیاہ بلا تھا۔ پوپل نے توجہ حاصل کرنے کے لئے زور زور

سے کھانسنا شروع کر دیا اور پاؤں سے فرش بجانے لگ گیا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور وہاں سے غیر ملکی فن کار کا ترجمان برآمد ہوا۔

ترجمان کو دیکھ کر پوپل نے تعظیماً سر قدرے خم کیا اور بولا۔ "میرا نام پوپل ہے۔ میرا بھتیجا۔۔۔۔۔

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ترجمان نے جیب سے میلا کچیلا رومال نکالا اور با آواز اپنی ناک صاف کرنے کے بعد روتے ہوئے بولا۔ "مرحوم مائیکل کے پھوپھا ہوں نا؟ مجھے تو آپ کی شکل دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ یقیناً مائیکل کے پھوپھا ہیں"۔ اسی گندے رومال سے چہرہ پونچھتے ہوئے وہ بین کرنے کے انداز میں بولا۔ "ہائے یہ کیا ہو گیا! دیکھو تو دنیا میں کیسا اندھیر ہونے لگا ہے۔ ہائے، ہائے، ہائے، ہائے"۔

ٹرام کے نیچے کچلا گیا ہے نا بدنصیب؟" پوپل نے پوچھا۔

"بری طرح"۔ ترجمان واویلا کرتے ہوئے بولا۔ آنکھوں سے نکلنے والے آنسو اس کے چہرے سے بہتے ہوئے قمیض کو تر کر رہے تھے۔ "بہت بری طرح، یہ گنہ گار اس حادثے کا عینی شاہد ہے۔ آپ یقین کریں گے کہ ٹرام کا آہنی پہیہ اور اس غریب کی نازک گردن۔ ٹھک اور گردن اڑتی ہوئی چھ فٹ دور جا گری۔ دھڑ اس طرح تڑپ رہا تھا کہ جیسے اسے بجلی کے جھٹکے دیئے جا رہے ہیں۔ ایک اور ٹھک اور دائیں ٹانگ دھڑ سے الگ ہونے کے بعد دو فٹ دور جا گری۔ پھر سے ٹھک، اور بائیں ٹانگ دو ٹکڑے ہو کر ٹرام کے پہیوں میں اس طرح الجھ گئی جیسے گوشت کا ٹکڑا قیمہ بنانے والی مشین میں پھنسا ہوتا ہے۔ دیکھا یہ ٹرام کتنے خطرناک ہوتے ہیں"۔

ترجمان فاگوٹ غالباً جذبات کی رو میں بہتا ہوا بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے دوبارہ پہلے سے انداز میں ناک صاف کی۔ ہاں لیکن اس مرتبہ اُس نے رومال کی بجائے دیوار پر آویزاں ایک ایرانی غالیچے کو استعمال کیا تھا۔ ناک صاف کرنے کے بعد وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگ گیا۔

مائیکل کا پھوپھا اس انجان شخص کے رونے پر بہت حیران تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "لوگ غلط کہتے ہیں کہ دوسروں کا دکھ بانٹنے والا اب کوئی نہیں رہا"۔ ترجمان کو روتے دیکھ کر اس کی اپنی آنکھوں میں چبھن ہونے لگی تھی۔ لیکن اس دوران ایک انتہائی ناخوشگوار خیال نے پوپل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "کہیں یہ رونے دھونے والا فن کار خود مائیکل کی وراثت کا دعویدار تو نہیں بن بیٹھا؟ اس طرح کی کئی مثالیں موجود ہیں"۔

"معاف کیجئے گا۔ کیا آپ میرے مرحوم بھتیجے کے دوست ہیں؟" آستین سے اپنی بائیں آنکھ کو ملتے ہوئے پوپل نے پوچھا۔

ترجمان کی آواز رونے دھونے کی وجہ سے اتنی بیٹھ گئی تھی کہ اس کی گفتگو کو سمجھنا تقریباً ناممکن ہو گیا

تھا۔ سنائی دینے والے واحد الفاظ کچھ یوں تھے۔ ''ٹھک دو حصے۔ ٹھک دو حصے''۔

''نہیں۔ مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا۔ چلتا ہوں کوئی سکون آور دوا ڈھونڈتا ہوں'' اور پوپل پر نظریں ٹکائے، دونوں بازو بلند کرتے ہوئے وہ بولا۔ ''ہائے یہ موت بانمتی نرام''۔

''معاف کیجئے گا۔ ٹیلی گرام آپ نے مجھے بھیجا تھا؟'' پوپل نے ترجمان سے پوچھا۔

''نہیں۔ میں نے نہیں۔ اس نے''۔ ترجمان نے بلے کی جانب اشارہ کیا۔

یہ سنتے ہی پوپل کی آنکھوں کے سامنے شرارے ناچنے لگ گئے۔ اسے لگا کہ شاید اس نے کچھ غلط سنا ہے۔

''نہیں، نہیں۔ میرے اعصاب اب جواب دیتے جا رہے ہیں''۔ بار بار ناک سے نازیبا آوازیں نکالتے ہوئے ترجمان بولا۔

''ہائے، کیا خوفناک منظر تھا۔ وہ آہنی پہیہ، وہ نازک سی ٹانگ، اس پہیے کا وزن کم از کم دس من تو ضرور ہوگا۔ ٹھک۔ جا رہا ہوں میں۔ تھوڑی دیر لیٹتا ہوں۔ شائید نیند آ جائے اور میری اذیت ختم ہو جائے''۔

بلا اپنی جگہ سے اٹھا، پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''ہاں! ٹیلی گرام میں نے ہی بھیجا تھا۔ آگے بات کرو''۔

پوپل کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صندوقچہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ خود بھی دھڑام سے قریب پڑی کرسی پر گر گیا۔

''میں نے انسانی زبان میں سوال پوچھا ہے''۔ بلا غصیلی آواز میں بولا۔ ''اب آگے کیا؟''۔

پوپل کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

''پاسپورٹ!'' پوپل کے چہرے کے سامنے پنجہ لہراتے ہوئے بلا بولا۔

پوپل کا ذہن مکمل طور پر ماؤف ہو چکا تھا۔ اسے اپنے سامنے بلے کی چنگاریاں اگلتی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پوپل کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنی جیب میں چلا گیا اور اس نے اپنا پاسپورٹ بلے کے حوالے کر دیا۔ بلے نے قریبی میز سے سیاہ فریم والا چشمہ اٹھایا جسے پہن کر وہ محض بلا ہی نہیں بلکہ پروفیسر بلا دکھائی دینے لگا تھا۔

''خدایا یہ کیا ہو رہا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ میں بے ہوش ہوتا ہوں یا نہیں''۔ پوپل سوچ رہا تھا۔ کہیں دور سے ترجمان کی ہچکیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے غالباً کوئی سکون آور دوا استعمال کی تھی جس کی شدید ناگوار بو پورے فلیٹ میں پھیل گئی تھی۔ اس بدبو سے پوپل کو شدید متلی ہونے لگی تھی۔

''کس دفتر سے یہ پاسپورٹ جاری ہوا ہے؟''۔ بلّے نے پاسپورٹ کا بغور معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں خاموشی چھائی رہی۔

''دفتر نمبر ۴۱۲''۔ بلّے نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اس نے پاسپورٹ الٹا پکڑ رکھا تھا۔

''معلوم ہے۔ معلوم ہے مجھے۔ جانتا ہوں میں اس دفتر والوں کو۔ ایک نمبر کے نکمے اور بدحرام ہیں۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو اتنی اہم دستاویز ہرایرے غیرے کو ہرگز جاری نہ کرتا۔ اور تمہیں تو کسی صورت نہیں''۔ اس نے پوپل کا پاسپورٹ فرش پر پٹخ دیا۔

''تدفین پر تمہاری موجودگی معطل کی جاتی ہے''۔ اس نے کسی جج کے لہجے میں حکم صادر کیا۔ ''اپنے گھر واپس جانے کی تیاری کرو''۔

اس نے بلند آواز میں عزازیل کو بلایا۔

اس کی آواز پر سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک بھورے بالوں والا عجوبہ راہداری میں آن دھمکا۔ اُس نے چمڑے کی بیلٹ میں ایک خنجر لٹکا رکھا تھا۔ اُس کی بائیں آنکھ کی پتلی سفید تھی اور منہ سے ایک بدنما لمبا دانت باہر جھانک رہا تھا۔

پوپل کے لئے سانس لینا دشوار ہوگیا تھا۔ وہ بمشکل کرسی سے اٹھا اور ہاتھ سے سینے کو تھامے، لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ دروازے کی جانب چل پڑا۔

''عزازیل! اسے نکالو یہاں سے''۔ بلّے نے حکم دیا۔

''پوپل!'' دھیمی مگر سننے میں انتہائی مکروہ آواز میں عزازیل بولا۔ ''امید ہے کہ تمہیں بات سمجھ آ گئی ہوگی''۔

پوپل نے مثبت انداز میں سر ہلا دیا۔

''فوراً کیف لوٹ جاؤ''۔ عزازیل اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اور وہاں پہنچ کر خاموشی سے بیٹھ جاؤ''۔

''سی نہ کرنا اور سر نہ اٹھانا۔ ماسکو میں فلیٹ کا خیال دوبارہ کبھی دل میں نہ لانا۔ آئی سمجھ؟؟''۔

اس ناٹے قد کے ڈیڑھ آنکھ والے شیطان نے پوپل کو اس قدر خوفزدہ کر دیا تھا کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دے گئی تھی۔

عزازیل نے فرش سے پاسپورٹ اٹھایا اور پوپل کی جانب بڑھا دیا۔ پوپل نے اپنے نیم مردہ

ہاتھ سے پاسپورٹ پکڑ لیا۔ اس کے بعد عزازیل نے پوپلی کا صندوقچہ اٹھایا اور اُسے آستین سے گھسیٹتا ہوا فلیٹ سے باہر لے آیا جہاں پوپلی دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔ عزازیل نے چابی استعمال کئے بغیر صندوقچہ کھول لیا۔ صندوقچے سے تیل آلود اخبار میں لپٹا ایک ٹانگ والا بھنا ہوا مرغا برآمد ہوا جسے عزازیل نے فرش پر رکھ دیا۔ اس کے علاوہ صندوقچے میں پوپلی کے کچھ کپڑے، دانت صاف کرنے کا برش، کنگھی اور شیونگ کا سامان رکھا تھا۔ عزازیل نے ایک زوردار ٹھوکر سے صندوقچے کو سیڑھیوں کی جانب پھینک دیا۔ صندوقچہ ایک دھماکے سے نچلی منزل پر جا گرا۔ آواز سے یوں لگتا تھا کہ صندوقچے کا ڈھکن علیحدہ ہوگیا ہے۔

اس کے بعد بھورے بالوں والے بدمعاش نے مرغے کو زمین سے اٹھایا اور اس کی واحد ٹانگ پکڑ کر اس شدت کے ساتھ پوپلی کی گردن پر دے مارا کہ مرغے کا دھڑ الگ ہو کر دور جا گرا۔ اور ٹانگ عزازیل کے ہاتھ میں رہ گئی۔

ساری عمارت گویا گھومنے لگ گئی تھی۔ لاتعداد رنگین دائرے فضا میں تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔ پوپلی کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ بے وزن ہوگیا ہے اور فضاؤں میں اڑ رہا ہے۔

جی ہاں اُڑ تو وہ واقعی میں رہا تھا۔

پاسپورٹ ہاتھ میں لئے وہ سیڑھیوں سے اڑتا ہوا نیچے آن گرا۔ مرغے کا دھڑ اس کی بے جان ٹانگوں کے درمیان پڑا تھا۔ عزازیل نے ایک ہی نوالے میں مرغے کی ٹانگ ہڑپ کر لی۔ اور ہڈی اپنی بیلٹ میں خنجر کے ساتھ اٹکا لی۔ پرزور آواز سے دروازہ بند کرنے کے بعد وہ فلیٹ میں واپس چلا گیا۔ جبکہ نچلی منزل سے کسی کے محتاط قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

پوپلی بمشکل اٹھا اور مزید چند سیڑھیاں نیچے اترنے کے بعد دوبارہ زمین بوس ہوگیا۔ ایک ادھیڑ عمر مختصر جسم والا شخص سر پر سبز رنگ کا پھٹا پرانا بوسیدہ ہیٹ لگائے اور چہرے پر آزردگی کے تاثرات لئے پوپلی کے پاس رک گیا۔

''معاف کیجئے گا محترم!'' وہ شخص افسردہ لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ فلیٹ نمبر پچاس کہاں ہے؟''

''اوپر''۔ خوفزدہ آواز میں پوپلی نے جواب دیا۔

بہت شکریہ۔ یہ کہنے کے بعد وہ سبز ہیٹ والا سیڑھیوں سے اوپر چڑھنا شروع ہوگیا جبکہ پوپلی نے نیچے کی جانب دوڑ لگا دی۔

اب سوال اٹھتا ہے کہ کیا پوپلی فلیٹ نمبر پچاس پر قابض بدمعاشوں کے خلاف شکایت درج کرانے پولیس سٹیشن جا رہا تھا؟ جی نہیں۔ کسی صورت بھی نہیں۔ پولیس سٹیشن جا کر یہ بیان کرتا کہ ایک بلا

چشمہ لگائے اس کے پاسپورٹ کا مطالعہ کر رہا تھا اور ایک بھورے بالوں والا بے ڈھنگا سا آدمی لنگوٹ میں خنجر لٹکائے اس کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک کر رہا تھا. یقیناً پاگل خانے کا ویزہ حاصل کرنے کے مترادف تھا۔ پوپل جیسے عقلمند انسان سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

پہلی منزل پر پہنچنے کے بعد پوپل کی نظر ایک چھوٹے سے کمرے پر پڑی جس میں صفائی کے عملے نے اپنا ساز و سامان سجا رکھا تھا۔ دروازے کا شیشہ غالباً عرصہ دراز سے ٹوٹ چکا تھا۔ پوپل عمارت سے باہر نکلنے کی بجائے اس کمرے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اس کی دل چسپی کا مرکز اب وہ سبز ہیٹ والا تھا جو فلیٹ نمبر پچاس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جس طرح اس نے فلیٹ کے متعلق پوچھا تھا اس سے یہ بات صاف عیاں تھی کہ وہ زندگی میں پہلی بار یہاں آیا ہے اور وہ فلیٹ میں رہائش پذیر بدمعاشوں کے ٹولے کی موجودگی سے بھی بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ پوپل کو یقین تھا کہ اس شخص کو بھی بہت جلد فلیٹ سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ بھتیجے کی تدفین پر جانے کا ارادہ پوپل نے یکسر ترک کر دیا تھا۔ جبکہ کیف کو واپس جانے والی گاڑی کی روانگی میں ابھی بہت دیر تھی۔

دور اوپر سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پوپل سمجھ گیا کہ سبز ہیٹ والا فلیٹ میں داخل ہو گیا ہے اور نجانے کیوں اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کمرے میں کافی خنکی تھی لیکن وہاں کی فضا چوہوں اور جوتوں کی بدبو سے متعفن تھی۔ تاہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر سیڑھیوں پر ہونے والی آمدورفت سے باخبر رہنے کے لئے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں تھی۔ پوپل نے یہیں رک کر سبز ہیٹ والے کی واپسی کے انتظار کا ارادہ کر لیا۔

انتظار کے لمحے پوپل کی توقع سے کچھ زیادہ ہی طویل ہوتے گئے۔ سیڑھیاں ویران پڑی تھیں اور فضا میں ایک عجیب خاموشی طاری تھی۔ آخر کار دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پوپل نے سانس روک لی اور کان دروازے کے شکستہ شیشے سے لگا لیا۔

یہ یقیناً اسی کے قدموں کی آواز ہے۔ وہ نیچے آ رہا ہے۔

فلیٹ نمبر پچاس کی نچلی منزل کا بھی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ قدموں کی چاپ دھیمی پڑ گئی۔ ایک زنانہ آواز سنائی دی اور اس کے فوراً بعد سبز ہیٹ والے کی آواز سنائی دی جو غالباً کہہ رہا تھا۔

''خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو''۔

جواب میں زنانہ ہنسی کی آواز سنائی دی اور تیز قدموں سے کوئی نیچے اترنے لگا۔ کچھ دیر بعد پوپل کو ایک خاتون کی کمر دکھائی دی جو تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور سبز ہیٹ والے کے قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دینے لگی۔

لیکن یہ کیا؟ قدموں کی آواز تو دوبارہ اوپر جا رہی تھی۔

یہ کیا؟ کم بخت واپس فلیٹ میں جا رہا ہے؟ پوپل سوچ رہا تھا۔

اوپر سے دوبارہ دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پوپل نے مزید انتظار کرنے کی ٹھان لی۔

اس مرتبہ زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پھر سے دروازے کی آواز، قدموں کی چاپ، کسی کی بے اختیار چیخ، بلی کی میاؤں میاؤں کی آوازیں اور تیزی سے نیچے آتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور سبز ہیٹ والا سینے پر صلیب کا نشان بناتا نمودار ہوا۔ اب اس کے سر سے ہیٹ غائب تھا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے یکسر خالی تھا جبکہ اس کی آنکھوں سے خوف اور وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کی پتلون پانی سے نچڑی ہوئی تھی۔ وہ عمارت کے خارجی دروازے کے ہینڈل پر زور آزمائی کرنے لگا تھا۔ اسے غالباً خوف کے مارے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ دروازہ اندر کھلتا ہے یا باہر؟ آخر کار قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک بھی لحہ ضائع کئے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

فلیٹ کے متعلق تحقیق اب مکمل ہو چکی تھی۔ پوپل اب نہ تو مرحوم بھتیجے کے بارے اور نہ ہی اُس کے فلیٹ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ واحد سوچ جو اسے گھیرے ہوئے تھی وہ فلیٹ نمبر پچاس کے قابضین سے ممکنہ خطرہ تھا۔ پوپل "سب سمجھ گیا، سب سمجھ گیا" بڑبڑاتا ہوا باہر نکل آیا اور کچھ دیر بعد وہ بس پر سوار ریلوے سٹیشن کی جانب جا رہا تھا۔

ماہر اقتصادیات جب سیڑھیوں کے نیچے کمرے میں چھپا بیٹھا تھا۔ اس دوران سبز ہیٹ والے کو انتہائی غیر مہذب حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ یہ شخص دراصل ورائٹی تھیٹر کی کینٹین کا انچارج سوکا تھا۔ جس وقت پولیس والے تھیٹر کے ملازمین سے تفتیش کر رہے تھے وہ ایک کونے میں الگ تھلگ بیٹھا تھا اور عمومی طور پر اُس کے چہرے پر چھائی رہنے والی یتیمیت مزید گہری ہوگئی تھی۔

ہاں تو جناب! سیڑھیوں میں پوپل سے ملاقات کے بعد یہ کینٹین والا سیدھا فلیٹ نمبر پچاس کے دروازے پر جا پہنچا۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ فوراً کھول دیا گیا۔ دروازے کے اس پار کا منظر دیکھ کر کینٹین والا سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہے۔ اس کی کیفیت کو سمجھنا کوئی خاص مشکل نہیں ہے۔ دروازہ کھلنے پر جو منظر دکھائی دیا وہ کچھ اس طرح تھا۔ ایک بھورے بالوں والی خوبصورت دوشیزہ جس کے چہرے اور جسم کے خدوخال کسی اطالوی مصور کے تخیل کا شاہکار لگ رہے تھے سنہری جوتے پہنے، لباس کی قید سے آزاد، راہداری میں کھڑی تھی۔ وہ دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ سبز ہیٹ والے کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھی

''آیئے جناب، اندر تشریف لایئے''۔ دوشیزہ اپنی بڑی بڑی سبز آنکھوں سے مستیاں بکھیرتے ہوئے بول رہی تھی۔

کینٹین والے نے ایک لمبی آہ بھری، سر سے ہیٹ کو اتارا اور فلیٹ میں داخل ہو گیا۔ عین اس وقت راہداری کا فون بج اٹھا۔ اس شرم وحیا سے عاری برہنہ دوشیزہ نے ایک پاؤں کرسی پر جمائے فون اٹھالیا اور ''ہیلو'' کہا۔

کینٹین والے کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنی نظروں کا کیا کرے۔ بار بار اپنا وزن ایک ٹانگ سے دوسری پر منتقل کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ''ہت تیرے کی۔ یہ غیر ملکی کی کام کرنے والی بھی کیا دھماکہ خیز چیز ہے؟۔۔۔۔۔ اوہ خدایا! یہ کیا بے ہودگی ہے'' اور اس بے ہودگی سے بچنے کے لئے وہ نظریں دائیں بائیں دوڑانے لگ گیا۔

راہداری عجیب وغریب چیزوں سے اٹی پڑی تھی۔ کرسی پر کسی قدیم زمانے کے جنگجو کا لباس پڑا تھا۔ آئینے کے نیچے پڑی میز پر سنہری دستے والی ایک تلوار رکھی تھی۔ ایک کونے میں کچھ تلواریں اس انداز میں بکھری پڑی تھیں کہ جیسے کسی نے لاپروائی سے چھتریاں جابجا پھینک رکھی ہیں۔ دیواروں پر بارہ سنگھے اور ہرن کے متعدد سینگ سجے تھے۔

''جی میں محترم ولآند کی سیکرٹری بول رہی ہوں۔ کیا؟ کون؟ نواب مائیکیل صاحب؟ جی میں ہمہ تن گوش ہوں۔ معزز فن کار آج گھر پر ہی ہیں۔ آپ سے مل کر انہیں یقیناً بہت خوشی ہوگی۔ اور ہاں مہمانوں کے لئے سفید قمیض اور سیاہ کوٹ پہننا بہت ضروری ہے۔ جی، کیا؟ رات کے بارہ بجے؟ جی ٹھیک ہے''۔ یہ کہنے کے بعد دوشیزہ نے فون بند کر دیا اور کینٹین والے سے مخاطب ہوئی ''جی میں آپ کی کیا خدمت کروں؟''۔

''جی، میرا محترم فن کار صاحب سے ملنا اشد ضروری ہے''۔

''کیا مطلب؟ بالمشافہ جناب ولآند صاحب سے؟''

''جی ہاں، انہیں سے''

''اچھا پوچھتی ہوں''۔ یہ کہنے کے بعد دوشیزہ نے مائیکل کے دفتر کا دروازہ کھولا اور ولآند سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''میرے آقا، ایک مختصر سا آدمی ہاتھ میں سبز رنگ کا پھٹا ہوا ہیٹ لئے آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے''۔

''کوئی بات نہیں۔ آنے دو'' اندر سے ترجمان کی کھنکھناتی ہوئی آواز آئی۔

''آیئے جناب، مہمان خانے میں تشریف لایئے''۔ برہنہ دوشیزہ نے نہایت مہذب انداز میں

کینٹین والے کو دعوت دی۔ برہنہ ہونے کے باوجود اس خوبصورت لڑکی کے ناز و ادا حجاب سے ایسے بھرپور تھے کہ گویا وہ سر سے پاؤں تک لباس پہنے شرم و حیا کا پیکر بنی بیٹھی ہے۔

کمرے کی صفائی اور قرینے سے کی گئی سجاوٹ دیکھ کر کینٹین والا ششدر رہ گیا۔ وہ کچھ دیر کے لئے بھول گیا کہ وہاں کس مقصد سے آیا ہے۔ بڑی بڑی کھڑکیوں کے رنگدار شیشوں سے چھن کر آنے والی قوس قزاح کے مانند روشنی کی شعاعیں کسی بہت ہی خوبصورت گرجا گھر کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ موسم اچھا خاصا گرم ہونے کے باوجود کمرے میں ایک بہت بڑی انگیٹھی سے آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی خنکی کا احساس ہونے لگا تھا۔ نجانے کیوں کینٹین والے کے تخیل میں لفظ ''قبر'' گونجنے لگ گیا تھا۔

انگیٹھی کے سامنے شیر کی کھال پر بیٹھا سیاہ رنگ کا بلا آگ کے شعلوں کو بغور گھور رہا تھا۔ کمرے کے وسط میں رکھی ایک میز پر نگاہ پڑتے ہی دل میں خوفِ خدا رکھنے والا نووارد مہمان سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ میز کسی گرجا گھر سے چوری کی گئی ہے۔ جس میز پوش سے اسے ڈھانپا گیا تھا ویسا بالعموم گرجا گھروں میں استعمال ہوتا ہے۔ لاتعداد چھوٹی بڑی، کچھ چمکدار، کچھ گرد سے اٹی بوتلیں میز پر سجی تھیں۔ ان بوتلوں کے درمیان ایک سنہری رنگ کا پیالہ رکھا تھا جو یقیناً خالص سونے کا بنا ہوا تھا۔ انگیٹھی کے بالکل قریب بھورے بالوں والا لنگوٹ میں خنجر لگائے بیٹھا تھا اور ایک لمبی آہنی سلاخ پر پروئے گئے گوشت کے ٹکڑے آگ پر بھون رہا تھا۔ گوشت کے ٹکڑوں سے ٹپکنے والا پانی دہکتے کوئلوں پر گرنے کے بعد دھواں پیدا کر رہا تھا جسے انگیٹھی کے اوپر بنی چمنی اپنے دامن میں سمیٹے جا رہی تھی۔ کمرے میں بھنے ہوئے گوشت کی مخصوص خوشبو کے علاوہ بھی کچھ دوسری بہت تیز قسم کی خوشبوئیں دماغ کو معطر کئے دے رہی تھیں۔ ان میں لوبان اور اگربتیوں کی خوشبوئیں بہت نمایاں تھیں۔

کمرے کا ماحول دیکھ کر کینٹین والے کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال ابھرا کہ شائید گرجا گھر والوں نے مائیکل بیرلی کی دعائے مغفرت کے لیئے یہ کمرہ سجا رکھا ہے۔ پھر خود ہی اس نے یہ لغو خیال دماغ سے جھٹک دیا۔

پیش آنے والے واقعات سے شدید طور پر متاثر کینٹین والے کو اچانک ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔

''جی جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' کمرے کے ایک نیم روشن کونے میں بیٹھا کینٹین والے کو مطلوب شخص بولا۔

کالے علم کا ماہر متعدد تکیوں سے آراستہ ایک مسہری پر نیم دراز تھا۔ جرابوں اور جوتوں سمیت اس

کا تمام لباس سیاہ رنگ کا تھا۔
''میں''۔انتہائی غمگین لہجے میں کینٹین والا بولا۔''ورائٹی تھیٹر کی کینٹین کا انچارج ہوں''۔
غیر ملکی فن کار نے بیش قیمت پتھر کی جگمگاتی انگوٹھیوں سے آراستہ اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور بولا۔
''نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔ مزید ایک لفظ بھی نہیں۔ میں آئندہ تمہاری کینٹین کی کوئی بھی چیز ہرگز منہ میں نہیں ڈالوں گا۔ محترم! گزشتہ روز میرا گزر تمہاری کینٹین کے قریب سے ہوا تھا اور وہاں پڑی مچھلی اور پیزا کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ میرے گرانقدر دوست! بھلا پنیر بھی کبھی سبز رنگ کا ہوتا ہے کیا؟۔ سفید ہوتا ہے وہ۔ اجالے کے مانند سفید اور دودھیا۔ آپ کو کسی نے دھوکہ دیا ہے۔ ہاں اور چائے؟ وہ چائے نہیں، فرش صاف کرنے کا گدلا پانی تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ کیسے ایک غلیظ چائے دان میں پانی کی بالٹی انڈیلی جا رہی تھی۔ نہیں جناب! ایسے تو کام نہیں چل سکتا''۔
کینٹین والا اس ناگہانی حملے سے بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔''معاف کیجئے گا۔ میں اس سلسلے میں تو بات کرنے حاضر نہیں ہوا۔ مچھلی کا تو یہاں تذکرہ ہی برموقعہ نہیں ہے''۔
''کیسے برموقعہ نہیں ہے؟۔ جبکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مچھلی بالکل باسی تھی''۔
''ارے بھائی! مچھلی تو مجھے ملتی ہی ہفتوں پرانی ہے''۔ کینٹین والا بولا۔
''بکواس، بالکل بکواس''۔
''کیا بکواس؟''
''بکواس یہ ہے کہ مچھلی نہ تو پرانی ہوتی ہے اور نہ ہی نئی۔ وہ تو تازہ ہوتی ہے یا پھر باسی''۔
''معاف کیجئے گا۔۔۔۔'' کینٹین والے کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ گفتگو کا موضوع کیسے تبدیل کیا جائے۔
''معاف نہیں کر سکتا''۔ کالے علم کے ماہر نے دوٹوک جواب دیا۔
''میں اس سلسلے میں بات کرنے حاضر نہیں ہوا''۔ کینٹین والے کے اعصاب بالکل جواب دیتے جا رہے تھے۔
''اچھا! اس سلسلے میں نہیں؟'' حیرت ظاہر کرتے ہوئے غیر ملکی بولا۔''اور کون سا مسئلہ تمہیں میرے پاس لا سکتا ہے؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہارے پیشے سے تعلق رکھنے والا صرف ایک چہرہ میرا شناسا ہے۔ اور اُس سے بھی میری ملاقات تمہاری پیدائش سے بہت پہلے کی ہے۔ بہرحال میں بخوشی تمہاری بات سننے کو تیار ہوں۔ عزازیل! محترم مہمان کو سٹول پیش کرو''۔

گوشت بھوننے والے نے اپنی تمامتر توجہ مہمان کی جانب کر لی۔ اس کے بدنما دانت دیکھ کر کینٹین والے کو جھرجھری آ گئی۔ عزازیل نے خاموشی سے تین ٹانگوں والا ایک سٹول مہمان کی جانب بڑھا دیا۔

کینٹین والے نے شکریہ ادا کرنے کے بعد جیسے ہی وزن سٹول پر ڈالا اس کی ایک ٹانگ تڑاخ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گئی اور کینٹین والا چیختا ہوا پیٹھ کے بل زمین بوس ہو گیا۔ اس افراتفری میں اس کا پاؤں لگنے سے ایک دوسرا سٹول بھی الٹ گیا اور اس پر رکھا پانی کا پیالہ کینٹین والے کی ٹانگوں پر آ گرا اور اس کی پتلون پانی سے شرابور ہو گئی۔

غیر ملکی فن کار بے ساختہ بول اٹھا ''آئے ہائے۔ کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟''۔

عزازیل نے کینٹین والے کو اٹھنے میں مدد دی اور بیٹھنے کے لئے دوسرا سٹول پیش کر دیا۔ مہمان نے پتلون اتار کر انگیٹھی کے سامنے خشک کرنے کی میزبان کی تجویز کو شکریے کے ساتھ رد کر دیا۔

''میں تو ہمیشہ چھوٹی ٹانگوں والی کرسی پر بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہوں''۔ کالے علم کا ماہر بولا ''اس سے گرنے پر بھی زیادہ چوٹ نہیں لگتی۔ ہاں تو ہم کیا بات کر رہے تھے؟ جی ہاں! مچھلی کے بارے میں۔ تازہ، تازہ، تازہ۔ محترم کسی بھی کینٹین کا اولین نعرہ یہی ہونا چاہیے۔ اور آپ کو بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ۔۔۔۔۔''

غیر ملکی کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ عزازیل نے اس دوران سلاخ پر سیٹیاں بجاتے گوشت کے ٹکڑوں پر لیموں نچوڑا اور انہیں سونے کی پلیٹ میں سجا کر کینٹین والے کو پیش کر دیا۔ جبکہ بلّے نے میزبانی کے آداب بجا لاتے ہوئے انتہائی مودبانہ انداز میں اسے سونے کا کانٹا پیش کیا۔

''دیکھئے میں تو۔۔۔۔۔''

''نہیں، نہیں، چکھئے تو سہی''

میزبان کے اصرار پر کینٹین والے نے گوشت کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیا۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ بالکل تازہ گوشت ہے۔ ابھی وہ خوش ذائقہ گوشت کو چبانے میں مصروف ہی تھا کہ کمرے میں اڑتا ہوا ایک پرندہ داخل ہو گیا۔ اپنی پرواز کے دوران پرندے نے مہمان کے بالوں سے عاری سر کو اپنے پروں سے تھپتھپانا ضروری سمجھا اور جب وہ گھڑی کے نزدیک پتھر کے چبوترے پر جا بیٹھا تو کینٹین والے پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ پرندہ دراصل ایک الو ہے۔ ''اوہ میرے خدایا''۔ مہمان سوچ رہا تھا۔ ''کیا عجیب فلیٹ ہے یہ!''۔

''وسکی کا ایک پیگ ہو جائے جناب!! آپ کون سی لینا پسند کریں گے؟''

''نہیں محترم! میں نہیں پیتا''

''اوہ! پھر تو آپ بہت بڑی نعمت سے محروم ہیں۔آئیں پھر آپ کے ساتھ شطرنج کی ایک بازی ہوجائے۔یا شائید آپ کچھ اور پسند کرتے ہیں؟ مثلاً لڈو، تاش یا کچھ اور؟''

''نہیں۔ میں کچھ نہیں کھیلتا''۔اس گفتگو سے بے حال کینٹین والے نے جواب دیا۔

''ارے آپ تو بالکل ہی فارغ ہو''۔میزبان نے فتویٰ دیا۔''خیر، کیا ہوسکتا ہے۔ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ مرد جو پیتے نہیں وہ کھیلوں سے بھی بھاگتے ہیں اور خوبصورت عورتوں کی محفل سے بھی کتراتے ہیں.وہ یا تو شائید بیمار ہوتے ہیں یا مردم بے زار ہوتے ہیں۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ کچھ لوگ غیر معمولی طور پر عام لوگوں سے مختلف بھی ہوتے ہیں۔ میری جن لوگوں سے شناسائی ہے ان میں ایسے حضرات بھی شامل ہیں جو بظاہر پرہیز گار اور شکل کے مومن نظر آتے ہیں لیکن اکثر اوقات پرلے درجے کے مردود ثابت ہوتے ہیں''۔

''بہر حال میں ہمہ تن گوش ہوں۔

کل آپ نے تھیٹر میں کچھ کرشمے دکھائے تھے''۔کینٹین والے نے گفتگو میں دل چسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے۔۔۔؟'' کالے علم کا ماہر ناراض ہوتا ہوا بولا۔''معاف کرنا جناب! یہ چھوٹے موٹے کام میرے منصب سے مطابقت نہیں رکھتے''۔

''میں معذرت خواہ ہوں جناب''۔شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کینٹین والے نے کہا۔''لیکن کل تھیٹر میں کالے علم کے زور پر جو جادو۔۔۔۔۔۔''

''ارے ہاں، ہاں۔۔۔۔میرے محترم میں آپ کو اپنا ایک راز بتاتا ہوں۔ میں دراصل کوئی فن کار، ونکار نہیں ہوں۔ مجھے تو فقط ماسکو کے بہت سارے باسیوں کو کسی ایک جگہ اکٹھا دیکھنے کی خواہش یہاں کھینچ لائی ہے۔اس کام کے لئے بھلا تھیٹر سے بہتر کون سی جگہ ہوسکتی ہے؟ یہ جو میرے چیلے ہیں''۔اس نے بلّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''تمام شعبدے انہی نے پیش کئے تھے۔ میں تو سٹیج پر بیٹھا معزز شہریوں کے چہروں سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ ہاں تو جناب! اب آپ براہ کرم اپنے چہرے کا رنگ تبدیل کیئے بغیر یہ بتائیں کہ ہمارے شو میں ایسی کون سی بات تھی جو آپ کو یہاں کھینچ لائی ہے؟''

''دیکھیں جناب بات یہ ہے کہ آپ کے شعبدہ باز نے تھیٹر میں دس کے نوٹوں کی بارش کروادی تھی''۔کینٹین والا چھت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔''تماشائیوں نے یہ نوٹ خوب لوٹے اور اپنی جیبیں بھرلیں۔میرے پاس کینٹین میں ایک جوان آدمی آیا۔اس نے مجھے دس کا نوٹ دیا۔ میں نے اسے

بقایا کے ساڑھے آٹھ روبل واپس کر دیئے۔ اس کے بعد دوسرا آ گیا''۔

''کیا وہ بھی جوان آدمی تھا؟''

''نہیں وہ ادھیڑ عمر تھا۔ پھر تیسرا، پھر چوتھا۔ آج صبح اٹھ کر کیا دیکھتا ہوں کہ دس والے تمام نوٹ غائب ہیں اور ان کی جگہ سادہ کاغذ کے ٹکڑے پڑے ہیں۔ جب میں نے حساب لگایا تو مجھے ایک سو نو روبل کا ٹانکا لگ چکا تھا''۔

''آئے، ہائے، ہائے'' مضحکہ خیز انداز میں فن کار بولا۔ ''وہ لوگ کیا واقعی ان نوٹوں کو اصلی سمجھ رہے تھے؟ میں تو کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ انہوں نے جان بوجھ کر تمہیں دھوکہ دیا ہے''۔

کینٹین والا شانے اچک کر رہ گیا لیکن بولا کچھ نہیں۔

''کہیں نوسر باز تو نہیں ہیں؟'' کالے علم کے ماہر نے پراسرار انداز میں پوچھا۔ ''یقین نہیں آتا کہ اتنے نیک لوگوں میں نوسر باز بھی ہو سکتے ہیں''۔

جواب میں کینٹین والا کچھ اس طرح مسکرایا کہ جیسے کہہ رہا ہو کہ نوسر بازوں سے تو سارا شہر بھرا پڑا ہے۔

''یہ تو بڑا نیچ پن ہے''۔ غصیلے انداز میں ولانَد بولا۔ ''آپ تو غریب آدمی ہیں۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔ آپ تو غریب آدمی ہیں نا؟''۔

کینٹین والے نے اپنا سر شانوں کے درمیان کچھ اس طرح بھینچ لیا کہ وہ واقعی غریب دکھنے لگ گیا۔

''آپ نے اندازاً کتنی پونجی جمع کر رکھی ہوگی؟''۔ یہ بظاہر غیر اہم سا سوال سنتے ہی نجانے کیوں کینٹین والے کی آنکھوں سے مایوسی جھلکنے لگ گئی تھی۔

دوسرے کمرے سے ایک منمناتی ہوئی آواز آئی۔ ''دو لاکھ انچاس ہزار روبل، پانچ مختلف بنکوں میں۔ اس کے علاوہ گھر کے فرش میں سونے کی دو سو اینٹیں بھی دفن ہیں''۔ کینٹین والے کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے سٹول کے نیچے سے اسے چھرا گھونپ دیا ہے۔

''ارے واہ! یہ بھی کوئی رقم ہے بھلا؟'' ولانَد مہمان کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''اور میرا خیال ہے کہ آپ کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ویسے آپ کا کب تک مرنے کا ارادہ ہے؟''۔

کینٹین والا قدرے مشتعل ہو گیا اور ہمت کر کے بولا۔ ''اس بات کا تو کسی کو بھی علم نہیں ہے اور نہ ہی کسی کے پاس ایسی فضول باتوں کے لیئے فالتو وقت ہے''۔

''کیوں نہیں۔ سب معلوم ہے''۔ ساتھ والے کمرے سے وہی منمناتی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔ ''نیوٹن کا سادہ سا فارمولا ہے۔ اس کی موت ٹھیک نو مہینے بعد فروری میں ہسپتال نمبر ایک کے کمرہ نمبر چار میں جگر کے کینسر سے ہوگی''۔

کینٹین والے کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگ گیا۔

''نو مہینے''۔ انگلیوں پر کچھ گنتے ہوئے ولاند بولا۔''دو لاکھ انچاس ہزار۔ مطلب یہ ہوا کہ مہینے میں ستائیس ہزار۔ کچھ کم ہے۔ ہاں کچھ کم ہے۔لیکن اگر انکساری سے کام لیا جائے تو گزارہ ہوسکتا ہے۔اور ہاں وہ سونے کی اینٹوں کے بارے میں تو میں بھول ہی گیا تھا۔

سونے کی اینٹیں اس کے کسی کام نہیں آئیں گی''۔کینٹین والے کے دل کو منجمد کرتی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔''اس کی موت کے فوراً بعد اس کے گھر کو توڑ دیا جائے گا اور برآمد ہونے والی سونے کی اینٹیں سرکاری خزانے میں جمع کرادی جائیں گی''۔

''میں آپ کو ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ نہیں دوں گا''۔ ولاند اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔''دیکھو نا، خراٹے لیتے ہوئے موت کے منتظر مریضوں کے درمیان مرنے کا بھلا کیا مزا؟؟ میرا تو مشورہ ہے کہ ستائیس ہزار میں ایک اچھی سی پارٹی کا انتظام کرو، خوبصورت چلبلی حسینوں کا مجمع لگاؤ۔ چند قریبی دوستوں کو بلاؤ اور کسی ہیرو کی طرح جام شہادت نوش کرنے کا لطف اٹھاؤ''۔

کینٹین والا گم سم ہو کر رہ گیا تھا اور اچانک بہت بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے، گال اندر کو دھنس گئے تھے اور اس کے ادھ کھلے منہ سے رالیں ٹپکنے لگی تھیں۔

''اوہ! لگتا ہے ہم کچھ زیادہ ہی خوابوں کی دنیا میں کھو گئے ہیں۔اصل مسئلے کو تو ہم بھول ہی گئے۔ لاؤ، دکھاؤ کہاں ہیں وہ دس کے نوٹوں کی جگہ لینے والے سادہ کاغذ؟''

کینٹین والے نے جیب سے اخبار میں لپٹا ایک پیکٹ نکالا اور جب اسے کھولا تو اس میں پڑے نئے نکور دس دس کے نوٹ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

''میرے دوست تم تو واقعی بیمار لگتے ہو'' ولاند بولا۔

کینٹین والا ہذیانی انداز میں ہنسنے لگ گیا۔ وہ سٹول سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔

''اور اگر یہ پھر سے۔۔۔۔۔''

''کوئی بات نہیں''۔فن کار کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا'' آپ پھر سے ہمارے پاس تشریف لے آیئے گا۔ہم آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔اب آپ جاسکتے ہیں''۔

اچانک ترجمان کمرے میں داخل ہوا اور پرجوش انداز میں کینٹین والے سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کے گھر والوں اور پڑوسیوں کا حال چال پوچھنے لگ گیا۔

کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر کینٹین والا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''او میری حسینہ! مہمان کو رخصت کرو''۔ ترجمان چلا کر بولا۔ اور وہی سنہری بالوں والی لباس

سے عاری دوشیزہ فلیٹ کا دروازہ کھول کر کھڑی ہوگئی۔

کینٹین والا جھجکتی ہوئی آواز میں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا اور کسی شرابی کی طرح لڑکھڑاتا ہوا چند سیڑھیاں اترنے کے بعد گر گیا۔ تاہم وہ نوٹوں کا پیکٹ نکال کر دوبارہ اپنی تسلی کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس دوران ایک دوسرے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ہاتھ میں سبز رنگ کا بیگ تھامے ایک خاتون برآمد ہوئی۔ وہ سیڑھیوں میں بیٹھے نوٹ گنتے شخص کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''واہ! ہماری عمارت بھی کیا خوب ہے۔ جسے دیکھو وہ صبح سے ہی نشے میں دھت ہے'' اور کینٹین والے کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔''سنا ہے دس کے نوٹوں کو تو شہر کی مرغیوں نے بھی چونچ مارنی چھوڑ دی ہے۔ اتنا بوجھ کہاں اٹھائے پھرو گے۔ لاؤ میں تمہارا بوجھ بانٹ لوں''۔

''بی بی، خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو''۔ خوف زدہ کینٹین والا نوٹ چھپاتے ہوئے بولا۔

خاتون کی ہنسی چھوٹ گئی اور وہ کہنے لگی۔''ارے واہ، تم تو واقعی رونی صورت ہو۔ میں تو مذاق کر رہی تھی''۔ اور تیزی سے نیچے کی جانب چل دی۔

کینٹین والا دھیرے دھیرے اٹھ کھڑا ہوا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے اپنا ہیٹ درست کرنے کی کوشش کی لیکن ہیٹ تو سر سے غائب تھا۔ فلیٹ نمبر پچاس میں واپس جانے کو اب کسی صورت اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن ہیٹ کے ساتھ برسوں پرانی رفاقت کو نبھانا بھی ضروری تھا۔ بادل نخواستہ وہ فلیٹ پر واپس جا پہنچا اور گھنٹی بجا دی۔

''اب کیا چاہیے تمہیں؟'' رسیلے انداز میں وہی برہنہ حسینہ پھر بولی۔

''جی میں اپنا ہیٹ بھول گیا ہوں''۔ اپنے بالوں سے عاری سر کو سہلاتے ہوئے کینٹین والا بولا۔

دوشیزہ نے گھوم کر اپنی پشت اس کی جانب پھیر لی۔ کینٹین والے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں اس نے فلیٹ نمبر پچاس کی جانب دو مرتبہ تھوکا۔ جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو لڑکی اس کا ہیٹ تلوار پر لٹکائے کھڑی تھی۔ کینٹین والے نے جلدی سے اپنا ہیٹ اچک لیا اور بولا ''یہ تلوار میری نہیں ہے''۔

''ارے رکھ لو۔ کام آئے گی''۔ برہنہ حسینہ نے کہا۔

کینٹین والا کچھ بڑبڑاتا ہوا تیزی سے نیچے کی جانب دوڑ اٹھا۔ اسے سر پر کچھ الجھن سی محسوس ہونے لگی تھی اور ہیٹ غیر معمولی طور پر گرم لگ رہا تھا۔ اس نے ہیٹ اتار کر دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کیونکہ ہیٹ کی جگہ وہ ایک سفید پروں والی بطخ تھامے ہوئے تھا۔ سینے پر دو مرتبہ صلیب کا نشان بناتے ہوئے خوف زدہ کینٹین والے نے بطخ کو زمین پر پٹخ دیا۔

بلّے نے اسی لمحے 'میاؤں' کی آواز نکالی اور سیاہ بلّے میں تبدیل ہو گئی۔ اُس نے چھلانگ لگائی اور کینٹین والے کے سر پر سوار گیا۔ اپنے تیز ناخنوں سے وہ کینٹین والے کا گنجا سر نوچنے لگ گیا۔ کینٹین والے نے ایک زوردار چیخ ماری اور عمارت کے خارجی دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔ بلّے نے اس کے سر سے جست لگائی اور زینے پر اوپر کی جانب دوڑ پڑا۔

دروازے سے باہر نکل کر کینٹین والے نے اپنی بچی کھچی توانائی کو یکجا کرنے کے بعد وہاں سے دوڑ لگا دی اور بدروحوں کے اس مسکن سے ہمیشہ کے لئے دور ہوتا چلا گیا۔ گلی میں اس کی نگاہ ایک میڈیکل سٹور پر پڑی اور وہ فوراً اندر جا گھسا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا، سٹور میں کھڑی خاتون حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ چیخ اٹھی۔ "ارے آپ کا تو سارا سر زخمی ہوا پڑا ہے"۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد کینٹین والے کا سر سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے سٹور والی خاتون سے جگر کے معالج ماہرین کے متعلق بھی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس وقت اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اسے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک معالج کا گھر چند قدموں کے فاصلے پر ہے۔

ماہر امراض جگر کا گھر اور کلینک ایک خوبصورت سفید رنگ کی عمارت میں واقع تھا۔ یہ عمارت اطالوی طرز تعمیر کا ایک پر وقار نمونہ تھی۔ کینٹین والا جب اس عمارت کے باغیچے میں داخل ہوا تو خوبصورت رنگ برنگ کے مہکتے پھولوں نے اس کا استقبال کیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ زندہ لوگوں کی دنیا میں واپس آ گیا ہے۔ استقبالیہ پر ایک عمر رسیدہ خاتون نے کینٹین والے کو بتایا کہ اسے مشورے کے لئے دس دن بعد کا وقت ملے گا۔

کینٹین والا چہرے پر کرب طاری کرتے ہوئے بولا۔

"محترمہ میں سخت بیمار ہوں بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ بستر مرگ سے اٹھ کر آپ کے پاس آیا ہوں"۔

خاتون اس کے چہرے کا بغور معائنہ کرنے کے بعد بولی۔ "ایسی بات ہے تو آپ کی مدد کرنا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں"۔ اسے مریضوں کی انتظار گاہ میں بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد وہ خود ڈاکٹر کے دفتر میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور سفید کوٹ میں ملبوس ایک نرس نے کینٹین والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا۔

"حضرات یہ شخص شدید بیمار ہے، اس لیئے آپ لوگوں کی اجازت سے اس کا معائنہ پہلے کیا جائے گا"۔

چند لمحوں کے بعد کینٹین والا شہر کے مشہور ماہر جگر پروفیسر کاظمین کے سامنے بیٹھا تھا۔ "جی محترم! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" انتہائی شائستہ آواز میں ڈاکٹر نے پوچھا۔

''مجھے کچھ دیر پہلے انتہائی باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اگلے سال فروری میں جگر کے کینسر سے میری موت ہو جائے گی''۔ کینٹین والے نے جواب دیا۔''خدا کے لئے مجھے بچا لیجئے''۔

''معاف کیجئے گا میں سمجھا نہیں۔ آپ نے کیا پہلے بھی کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟ اور یہ آپ کا سر پٹیوں میں کیوں لپٹا ہوا ہے؟''۔

''کہاں کا ڈاکٹر؟ آپ کبھی اس ڈاکٹر کو دیکھیں تو سہی''۔ وہ دانتوں کو بھینچتے ہوئے بولا۔''اور میرے سر کی طرف آپ بالکل دھیان نہ دیں۔ بلکہ آپ میرے سر پر لعنت بھیجیں۔ اس کا اصل مسئلے سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ خدارا میرے جگر کے کینسر کو روک لیجئے''۔

''معاف کیجئے گا۔ آپ کی تشخیص کس نے کی ہے؟''۔

''آپ اس کا یقین کیجئے''۔ ہاتھ جوڑ کر کینٹین والے نے التجا کی۔''اس کم بخت کی اطلاع یقیناً درست ہے''۔

''آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں''۔ پروفیسر ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے بولا۔''کوئی آپ کو یہ کیسے بتا سکتا ہے کہ آپ کی موت کب ہوگی اور بالخصوص جبکہ یہ بتانے والا ڈاکٹر بھی نہیں ہے''۔

''جناب وارڈ نمبر چار میں''۔ کینٹین والے نے جواب دیا۔

پروفیسر بغور اس کے پٹیوں میں لپٹے ہوئے سر اور بھیگی ہوئی پتلون کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔''یہ تو ایک پاگل سے میرا پالا پڑ گیا ہے''۔ اور اس نے پوچھا۔''آپ شراب پیتے ہو؟''۔

''جی نہیں۔ آج تک کبھی ہاتھ نہیں لگایا''۔

کچھ دیر بعد اس کے کپڑے اتار دیئے گئے اور اسے ایک سرد بنچ پر لٹا کر پروفیسر نے اس کے پیٹ کا معائنہ شروع کر دیا۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ کینٹین والے کے اوسان اب کافی حد تک بحال ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد اعلان کیا۔۔

میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم اس وقت آپ کو کینسر کے عارضے کی کوئی علامات نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ کسی عطائی نے آپ کو اس وہم میں مبتلا کر دیا ہے تو میرا مشورہ ہے کہ دل کی تسلی کے لئے آپ کچھ متعلقہ ٹسٹ کروالیں۔

پروفیسر کمال مہارت کے ساتھ نہ صرف مریض کو بات سمجھا رہا تھا بلکہ ساتھ ہی ساتھ تیزی سے ایک کاغذ پر بھی لکھتا جا رہا تھا۔ ٹیسٹوں کے علاوہ اس نے کینٹین والے کو ایک مشہور ماہر نفسیات سے بھی ملنے کا مشورہ دیا کیونکہ اس کے خیال میں مریض کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔

''جی! مجھے کتنی رقم ادا کرنی ہے؟ کینٹین والا جیب سے پرس نکالتے ہوئے بولا۔

''جو آپ کا دل چاہے''۔ پروفیسر نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

کینٹین والے نے دس دس کے تین نوٹ پروفیسر کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ اسی اثنا میں وہ اخبار میں لپٹے نوٹوں کی گڈی بھی میز پر رکھ چکا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' مشتعل انداز میں پروفیسر چلایا۔

''دیکھئے محترم پروفیسر صاحب'' روہانسی آواز میں کینٹین والے نے کہا۔'' میں ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں کہ یہ سب آپ رکھ لیں مگر میرے جگر کے کینسر کو روک لیں''۔

اپنا یہ پیکٹ فوری طور پر یہاں سے اٹھا لیجئے۔

پروفیسر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

بہتر ہوگا کہ آپ اپنے اعصاب کی طرف توجہ دیں۔ کل صبح جا کر خون اور پیشاب چیک کروائیں۔ زیادہ چائے نہ پئیں اور نمک کا استعمال بالکل ترک کر دیں۔

کیا مطلب؟ یخنی میں بھی نمک نہ ڈالوں؟ کینٹین والے نے پوچھا۔

نہیں، کسی صورت نہیں۔ پروفیسر نے حکم صادر کیا۔

آئے، ہائے!۔۔۔۔۔ انتہائی بے چارگی کے عالم میں کینٹین والا بولا۔ اس نے نوٹوں کو سمیٹا اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی جانب چل دیا۔

اس رات پروفیسر کاظمین کے پاس مریضوں کا کوئی خاص رش نہیں تھا۔ آخری مریض کو فارغ کرنے کے بعد پروفیسر کی نظر میز پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کینٹین والے نے دس دس کے جو نوٹ میز پر رکھے تھے ان کی جگہ زردی مائل کاغذ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

یہ کیا بدتمیزی ہے! پروفیسر بڑبڑایا۔ یہ کم بخت صرف ذہنی مریض ہی نہیں نوسرباز بھی ہے۔ لیکن سمجھ نہیں آیا کہ وہ میرے پاس کیا لینے آیا تھا؟ پھر یکایک اسے خیال آیا کہ وہ کم بخت کہیں اس کا اوورکوٹ تو چرا کر نہیں لے گیا۔ پروفیسر نے جلدی سے دفتر کا دروازہ کھول کر نرس کو الماری چیک کرنے کا کہا۔ کوٹ اپنی جگہ پر موجود تھا۔ پروفیسر جب اپنے دفتر میں واپس لوٹا تو حیرت سے اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں کیونکہ نوٹوں کی جگہ اس کی میز پر سیاہ رنگ کا منحوس شکل والا ایک بلا بیٹھا پیالی سے دودھ پی رہا تھا۔

اب یہ اور کیا بدتمیزی ہے؟ ابھی اس کی کسر باقی تھی کیا؟ اور نجانے کیوں ایک سرد لہر اس کے سر کے پچھلے حصے سے نیچے کی جانب، ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ پروفیسر کے پیچھے پیچھے نرس بھی دفتر میں آ گئی۔ وہ خوف زدہ اور مشتعل پروفیسر کو دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔

ڈاکٹر صاحب! آپ تسلی رکھیں۔ پروفیسروں کے ہاں اکثر مریض اس قسم کی حرکتیں کر جاتے

ہیں۔ دراصل بعض لوگ جانور تو پال لیتے ہیں لیکن ان کا خرچہ برداشت نہیں کر پاتے۔ نرس کو شک تھا کہ یہ حرکت معدے کے السر میں مبتلا ایک بوڑھی مریضہ کی ہے۔

''میرا خیال ہے''۔ نرس کہنے لگی۔ ''بڑھیا سوچتی ہوگی کہ میرا وقت تو نزدیک ہے اور میرے مرنے کے بعد بے چارہ بلا تنہا اور یتیم ہو جائے گا''۔

''چلو فرض کیا آپ کی بات درست ہے''۔ پروفیسر بولا ''تو یہ دودھ کا پیالہ بھی کیا وہ کم بخت بڑھیا ساتھ لے کر آئی تھی؟''۔

''عین ممکن ہے۔ وہ دودھ بوتل میں لائی ہو اور یہاں آ کر دودھ پیالے میں انڈیل دیا ہو''۔ نرس نے قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا اس گفتگو کو اب بند کریں۔ اور اس بلے اور دودھ کے پیالے کو میری نظروں سے دور کر دیجئے''۔ نرس نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

پروفیسر نے سکھ کا سانس لیا۔ جب وہ اپنا سفید کوٹ کھونٹی پر لٹکانے لگا تو باہر سے کسی کے زور زور سے ہنسنے کی آواز نے اسے متوجہ کر لیا۔ وہ کھڑکی کی جانب لپکا۔ گلی میں ایک مانوس چہرے والی خاتون صرف قمیض میں ملبوس بھاگی جا رہی تھی۔ ہنسی کی آواز چند من چلے نوجوانوں کی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''۔ شدید الجھن میں مبتلا پروفیسر نے کہا۔

اچانک دفتر سے ملحقہ پروفیسر کی بیٹی کے کمرے سے اونچی آواز میں موسیقی بجنے لگی اور موسیقی کے ساتھ ساتھ یوں محسوس ہوا کہ جیسے کبوتر بول رہا ہے۔ پروفیسر نے پلٹ کر دیکھا تو حیرانگی کے عالم میں سانس لینا بھی بھول گیا کیونکہ اس کی میز پر سفید رنگ کا ایک جسیم کبوتر بیٹھا تھا۔

''غالباً گلی والی ادھ کھلی کھڑکی سے اڑ کر اندر آ گیا ہے''۔ پروفیسر نے سوچا لیکن جب اس نے قدرے غور سے اس پرندے کو دیکھا تو عیاں ہوا کہ کبوتر تو کچھ غیر معمولی حرکات کر رہا ہے۔ وہ پروفیسر کی بیٹی کے کمرے میں بجنے والی موسیقی کی لے پر کسی ماہر رقاص کی طرح تھرک رہا تھا اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ پروفیسر پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ پروفیسر کی ذہنی کیفیت دگرگوں ہو چکی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اسے وہم کی بیماری تو نہیں لگ گئی۔ پسینے میں شرابور ماہر امراض جگر پروفیسر کازمین شدید نقاہت محسوس کرنے لگا تھا۔ اپنے بے جان ہاتھوں سے اس نے بمشکل ٹیلیفون اٹھایا۔ اس نے اپنے بچپن کے دوست ماہر ذہنی امراض پروفیسر ستارین کے ساتھ اپنی موجودہ کیفیت کے متعلق مشورہ کرنے کی ٹھان لی۔ اسے بالخصوص یہ تشویش کھائے جا رہی تھی کہ ساٹھ سال کی عمر میں ناچتے ہوئے کبوتر کا نظر آنا یقیناً کسی نفسیاتی بیماری کی علامت ہے۔

اس اثنا میں کبوتر سیاہی کی شیشی پر جا بیٹھا اور کم بخت کو اچانک رفع حاجت کا خیال آ گیا۔ (میں مذاق نہیں کر رہا۔ یہ بات بالکل سچ ہے) اس کے بعد کبوتر ہوا میں معلق ہو گیا۔ اس نے کمرے کے دو چکر لگائے اور دیوار پر آویزاں ۱۸۹۴ میں میڈیکل یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ڈاکٹروں کے گروپ فوٹو کے شیشے پر اپنی آہنی چونچ سے کچھ اتنے زور سے ضرب لگائی کہ شیشہ ٹوٹ کر نیچے آن گرا۔

یہ نئی صورت حال دیکھ کر پروفیسر کا طمینن کا ذہن بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا۔ پھر نجانے کہاں سے اس کے ذہن میں یہ خیال ابھر آیا کہ اسے جونکیں لگوانے کی ضرورت ہے۔ اس نے پروفیسر ستارین کو فون کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور جونکوں سے علاج کرنے والے ادارے کا نمبر ملا کر فوراً جونکیں بھیجنے کو کہا۔

ٹیلی فون بند کرنے کے بعد وہ جیسے ہی مڑا تو ایک اور عجوبہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کرسی پر نرسوں کے لباس میں ملبوس ایک خاتون ہاتھوں میں پلاسٹک کا ڈبہ لیئے بیٹھی تھی۔ ڈبے پر جلی الفاظ میں لکھا تھا ''جونکیں''۔ خاتون کے چہرے کو بغور دیکھنے کے بعد پروفیسر کو فضا میں ہر طرف اڑتے ہوئے شہاب ثاقب نظر آنے لگے تھے۔ اس عورت کا چہرہ مردانہ خصوصیات کا حامل اور قدرے ٹیڑھا تھا۔ اس کا منہ ایک کان سے لے کر دوسرے کان تک پھیلا تھا اور اس کی مردہ آنکھیں روشنی سے عاری تھیں۔

یہ نوٹ میں لے جاؤں گی۔ بھاری مردانہ آواز میں نرس یا وہ جو کوئی بھی تھی، بولی۔ اس نے میز پر بکھرے زردی مائل کاغذ اپنے پنجہ نما ہاتھ میں سمیٹ لئے۔

دو گھنٹے گزرنے کے بعد پروفیسر اپنی خواب گاہ میں بستر پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کی کنپٹیوں، کانوں اور گردن پر جونکیں چمٹی تھیں اور کرسی پر بیٹھا پروفیسر ستارین اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

''گھبراؤ نہیں۔ یقیناً یہ سب تمہارا وہم ہے''

شہر پر رات کی تاریکی کے سائے چھا چکے تھے۔

اس رات ماسکو شہر میں مزید کیا کیا کرشمے رونما ہوئے ہم نہیں جانتے۔

ویسے بھی ہمیں اب اس تقریباً سچی کہانی کے دوسرے انتہائی اہم حصے کی طرف بڑھنے کی ضرورت ہے۔

میرے پیچھے۔ میرے پیچھے۔ محترم قاری! میرے پیچھے۔

حصہ دوم

باب ۱۹

مارگریٹا

میرے پیچھے۔محترم قاری! میرے پیچھے پیچھے۔

کون کہتا ہے کہ دنیا میں سچا، بے لوث اور سدا زندہ رہنے والا پیار نہیں ہے؟ ایسی غیر اخلاقی بات کہنے والے کی زبان کاٹ دینی چاہیے۔

میرے پیچھے۔ میرے محترم قاری۔ میرے پیچھے پیچھے۔ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ سچا پیار یہیں، اسی دنیا میں، دھڑکتے دلوں میں ہوتا ہے۔

ماسٹر صریحاً غلطی پر تھا۔

ہسپتال میں اپنی دکھ بھری داستان ایوان کو سناتے ہوئے اس کا یہ سوچنا کہ شائید وہ۔۔۔وہ اسے بھول چکی ہے، غلط تھا۔ سراسر غلط تھا۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے نہیں بھولی تھی۔۔ کبھی بھول ہی نہیں سکتی تھی!

سب سے پہلے تو ہم وہ حقیقت بیان کرتے ہیں جو ماسٹر نے ایوان سے چھپالی تھی۔ اس کی محبوبہ کا نام مارگریٹا تھا۔ اس کے بارے میں ماسٹر نے جو کچھ ایوان کو بتایا وہ بالکل سچ تھا۔ اپنی محبوبہ کے متعلق کہی گئی اس کی ہر بات درست تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور عقلمند بھی۔ دنیا کی بیشتر خواتین مارگریٹا کے طرز زندگی کو اپنانے میں یقیناً فخر محسوس کرتیں۔ یہ تیس سالہ بانجھ عورت ایک مشہور سائنسدان کی بیوی تھی۔ اس کا خاوند سرکاری حلقوں میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ وہ ایک خوبرو، حلیم طبع، ایماندار نوجوان سائنسدان کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اپنی بیوی کا وہ بہت بڑا مداح تھا۔ مارگریٹا اور اس کا شوہر شہر کے وسط میں ایک خوبصورت محل نما گھر کی بالائی منزل میں رہائش پذیر تھے۔ ایک دل کش باغیچے کے عقب میں تعمیر شدہ یہ عمارت بے

شک کرہ ارض پر جنت کا ایک نمونہ تھی۔

مارگریٹا کے پاس دولت کی اتنی فراوانی تھی کہ وہ جب چاہتی اور جو چاہتی حاصل کر سکتی تھی۔ اس کے شوہر کے ملنے والوں میں ملک کے نامور اور امیر ترین لوگ شامل تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی آج تک مارگریٹا کو متاثر نہیں کر سکا تھا۔ بظاہر اس عورت کو دنیا کی خوش قسمت ترین خاتون کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اصل حقیقت اس کے برعکس تھی۔ دیئے کی مانند روشن آنکھوں والی اس عورت کو زندگی سے مزید کیا چاہیے تھا؟ کس چیز کی کمی تھی اس کی زندگی میں؟ نہیں معلوم۔ نہیں معلوم مجھے۔

غالباً ماسٹر کا یہ کہنا ٹھیک ہی تھا کہ اسے نہ تو خوبصورت باغیچے والے گھر میں دلچسپی تھی اور نہ ہی وہ دولت کی بھوکی تھی۔ اُسے تو بس ماسٹر کی ضرورت تھی۔ فقط اور فقط ماسٹر کی۔ یہ بات سوچ کر ہی دل حلق کو آتا ہے کہ بے چاری اگلے دن شوہر کے انتظار سے عاجز آ کر جب اپنے محبوب کے گھر پہنچی تو وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ کیا گذری ہوگی اس کے دل پر؟ شاید یہ بھید کبھی بھی کوئی بھی نہ جان سکے گا۔ لیکن یہ بات بالکل سچ ہے کہ ماسٹر کے ساتھ وہ دل و جان سے محبت کرتی تھی۔

اس نے ماسٹر کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ماسٹر کا ملنا تو درکنار اس کے بارے میں کوئی اطلاع تک نہ مل سکی۔ تھک ہار کر مارگریٹا یہ غم سہنے میں لئے واپس اپنے باغیچے والے گھر میں لوٹ آئی۔

موسم تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ جوں جوں سڑکوں پر برف پگھلتی جا رہی تھی توں توں مارگریٹا کا دکھ مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تنہائی میں اکثر پھوٹ پھوٹ کر روتی اور اپنے ہی آنسوؤں کی کڑواہٹ اس کا کلیجہ چاٹ لیتی۔ اس بیچاری کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا محبوب زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا یہ خیال تقویت پکڑتا جا رہا تھا کہ ماسٹر غالباً یہ دنیا چھوڑ چکا ہے۔

اس کے لئے اب ضروری تھا کہ وہ ماسٹر کو یا تو بھول جائے یا پھر خود اس کے پاس عالم بالا میں چلی جائے۔ یوں تنہا رہنا تو ناممکن ہو گیا تھا۔ بھول جانے۔ ماسٹر کو بھول جانے ہی میں غالباً اس کی نجات تھی۔ لیکن اسے بھول جانا مارگریٹا کے بس میں نہیں تھا۔

ہاں، ہاں۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔ وہ اکثر خود سے کہتی تھی۔ پہروں انگیٹھی میں آگ بھڑکائے بیٹھی رہتی اور وہ دن یاد کرتی جب اسی طرح شعلے اگلتی انگیٹھی کے سامنے بیٹھا اس کا محبوب پونتی پلات کی کہانی لکھا کرتا تھا۔ کیوں میں اس رات ماسٹر کو اکیلا چھوڑ آئی؟ کیوں؟ کیوں؟ وہ بے بسی کے عالم میں اپنے بال نوچتی ہوئی چلاتی۔۔ میں تو واپس لوٹ آئی تھی۔ وعدے کے مطابق صبح لوٹ آئی تھی میں۔ لیکن بہت دیر کر دی تھی میں نے۔ بالکل اسی طرح جیسے میتھیو نے عیشوا کو بچانے میں دیر کر دی تھی۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر وہ اس رات رک بھی جاتی تو کیا وہ ماسٹر کو بچا لیتی؟ ہمارا خیال ہے کہ

نہیں۔ بالکل نہیں۔ لیکن غموں سے چور اس عورت کو یہ بات سمجھانا ناممکن تھا۔

جمعے کے روز۔ جی ہاں یہ وہی جمعے کا روز تھا جب کالے علم کے ماہر وولاند نے اپنے چیلوں کے ہمراہ ورائٹی تھیٹر میں بدنام زمانہ شو پیش کیا تھا۔ مائیکل بیرلی کے پھوپھا کو واپس کیف بھگا دیا گیا۔ خزانچی لاسچ کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے علاوہ بھی شہر میں متعدد عجیب و غریب انہونے واقعات رونما ہوئے۔

مارگریٹا دن کے تقریباً بارہ بجے بستر سے اٹھی۔ آج خلاف معمول اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ آخر کار آج کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اس کچھ ہونے کے تصور کو کھو دینے کے خوف سے مارگریٹا نے اسے مضبوطی سے اپنے سینے میں جکڑ لیا۔

''مجھے یقین ہے''۔ مارگریٹا جذباتی انداز میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ شائید آج میرے دکھوں کا آخری دن ہے۔ میں مانتی ہوں کہ میں جھوٹ بولتی رہی ہوں، دھوکہ دیتی رہی ہوں، لوگوں کی نظروں سے چھپ کر ایک دوہری زندگی جیتی رہی ہوں۔ لیکن اس کی سزا اتنی بھیانک اور لمبی تو نہیں ہونی چاہیے۔ میرا خواب جھوٹ نہیں ہوسکتا۔ مجھے پورا یقین ہے''۔

بیش قیمت آئینے کے سامنے اپنے گھنگریالے بالوں کو سمیٹتے ہوئے مارگریٹا یہ سب باتیں خود سے ہمکلام ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

آج رات مارگریٹا نے جو خواب دیکھا تھا وہ حقیقتاً کچھ خاص طرح کا تھا۔ اس سے بچھڑنے کے بعد ماسٹر کبھی بھی اس کے خواب میں نہیں آیا تھا۔ تمام دن اذیتوں میں مبتلا رہنے کے باوجود رات کو وہ ہمیشہ سکون کی نیند سویا کرتی تھی۔ لیکن آج اس نے پہلی مرتبہ اپنے محبوب کو خواب میں دیکھا تھا۔

خواب میں مارگریٹا نے خود کو ایک نامانوس اجڑے ہوئے باغ میں کھڑا پایا۔ اس باغ کی فضا میں ایک سوگوار سکوت طاری تھا۔ آسمان کو گہرے رنگ کے بادلوں نے چھپا رکھا تھا اور مرغابیوں کا ایک جھنڈ ان بادلوں تلے کسی نامعلوم منزل کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ سبزے سے عاری درختوں کے درمیان لکڑی کے ایک بوسیدہ پل کے نیچے گدلے پانی کا دریا بہہ رہا تھا۔ باغیچے کے ایک کونے میں جالوں سے اٹا لکڑی کا ایک گھروندہ کھڑا تھا جو شائید بیت الخلاء یا پھر باغبانی کے اوزار رکھنے کا سٹور روم تھا۔ زمین پر بکھرے خزاں زدہ پتے بالکل ساکت پڑے تھے۔ کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا۔ مارگریٹا کو یوں لگ رہا کہ جیسے وہ دنیا کے کسی آفت زدہ گوشے میں پہنچ گئی ہے۔ یا پھر شائید یہ جہنم کا کوئی نمونہ تھا۔

ذرا اندازہ لگائیے مارگریٹا کی خوشی کا جب اس گھروندے کا دروازہ کھلا اور وہاں سے اس کا محبوب ماسٹر برآمد ہوا۔ اس کا جسم کپڑے کے چند چیتھڑوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے بال بکھرے اور شیو بے ڈھنگے انداز میں بڑھی ہوئی تھی۔ وہ شدید نقاہت کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے وہ

مارگریٹا کو اپنے پاس بلا رہا تھا۔ مارگریٹا چیختی ہوئی اس کی جانب دوڑ اٹھی۔ اسی دوران اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس خواب کی دو ہی تعبیریں ہو سکتی ہیں۔۔۔ مارگریٹا سوچ رہی تھی۔ اگر وہ مر چکا ہے تو اس طرح خواب میں اس کا مجھے بلانا یقیناً میری موت کا عندیہ ہے اور یہ میرے لئے بہت خوشی کی بات ہے کہ بالآخر مجھے اذیتوں سے چھٹکارا مل جائے گا اور اگر وہ زندہ ہے تو غالباً خواب میں آ کر اپنے زندہ ہونے اور مجھ سے دوبارہ ملنے کا پیغام دے رہا ہے۔

مارگریٹا کے دل و دماغ میں ایک عجیب ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کپڑے تبدیل کئے اور خود کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ آج اس کی زندگی کے حالات یکسر تبدیل ہو جائیں گے۔ شائید آج آخرکار خوشیاں اس کے گھر کا رخ کرنے والی ہیں۔ ایسا موقعہ زندگی میں غالباً ایک بار ہی آتا ہے اور اس سے بروقت اور پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہئے۔ خوش قسمتی سے اس کا شوہر تین دن کے لئے شہر میں نہیں تھا اور ان تین دنوں میں وہ بالکل آزاد تھی۔ اس کا جو جی چاہے وہ بلا روک ٹوک کر سکتی تھی، جہاں جانا چاہے جا سکتی تھی۔ پانچ کمروں پر مشتمل یہ خوبصورت گھر پوری طرح اس اکیلی کے تصرف میں تھا۔

ان تین دنوں کی آزادی کا جشن منانے کے لئے مارگریٹا نے اس خوبصورت گھر کا سب سے بے کار کونہ منتخب کیا۔ یہ بطور سٹور استعمال کیا جانے والا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس تاریک کمرے میں چاروں طرف صندوق بکھرے پڑے تھے جبکہ دو الماریوں میں کچھ پرانی چیزوں کے انبار لگے تھے۔ ایک الماری کے سامنے وہ دوزانوں ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بھرا ایک ڈبہ نکالا اور ٹٹولتے ہوئے اس کی تہہ سے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ برآمد کر لیا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے سے منڈھی ایک چھوٹی سی البم تھی جس میں ماسٹر کی تصویر چسپاں تھی اور ایک بنک کا کتابچہ جس میں ماسٹر کے نام دس ہزار کا اندراج تھا۔ کتابچے میں رکھی گلاب کی خشک کلی پر نظر پڑتے ہی مارگریٹا کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ ڈبے کی تہہ میں مسودے کی ایک ادھ جلی کاپی رکھی تھی۔

اپنے اس خزانے کو سمیٹ کر مارگریٹا خواب گاہ میں آ گئی۔ ماسٹر کی تصویر آئینے کے سامنے سجائے گود میں ادھ جلی کاپی لیئے وہ غالباً پورا ایک گھنٹہ بیٹھی رہی۔ وہ احتیاط کے ساتھ کاپی کے اوراق پلٹ رہی تھی۔ ایک ادھ جلے ورق پر تحریر تھا۔۔ سمندر کی جانب سے بڑھنے والی تاریکی نے رومن قاضی کی نفرت کے مرکز شہر ''یروشلم'' کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ رسیوں پر معلق مندر اور محل کے خوفناک مینار کو ملانے والے پل غائب ہو گئے تھے۔ آسمان سے پانی کی دھاریں برس رہی تھیں اور مندر پر نصب محو پرواز خدائی مورتیاں پانی میں شرابور ہو گئی تھیں۔ شاہی محل، بازار، سرائے سب تحلیل ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے عظیم شہر ''یروشلم'' کبھی دنیا کے نقشے پر تھا ہی نہیں۔۔۔'' مارگریٹا کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آگے بھی پڑھے لیکن بدقسمتی

سے آگے چلتے ہوئے سیاہی مائل کاغذ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

آنسو پونچھتے ہوئے مارگریٹا نے کاپی زمین پر رکھ دی اور کہنیاں آئینے کے سامنے پڑی میز پر ٹکائے دیر تک ماسٹر کی تصویر پر ٹکٹکی لگائے بیٹھی رہی۔ جب آنسو خشک ہو گئے تو مارگریٹا نے احتیاط سے اپنی کائنات سمیٹی اور اسے "تاریک" سٹور روم میں کپڑوں کے نیچے چھپانے کے بعد اس نے دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کیا اور اسے قفل لگا دیا۔

مارگریٹا نے گھر سے باہر نکل کر سیر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جب وہ باہر جانے کی تیاری کر رہی تھی تو اس کی نوجوان ملازمہ نتاشا نے اسے روک لیا اور دوپہر کے کھانے کی تفصیل پوچھنے لگ گئی۔ مارگریٹا نے جواب دیا۔ "جو دل کرے بنالو۔ آج ہر چیز چلے گی"۔ نتاشا کی زبان کی چرکی مالکن کا شاہانہ رویہ دیکھ کر بہت تیزی سے بکنے لگ گئی اور وہ نجانے کیا کیا فضولیات بک رہی تھی۔ ورائٹی تھیٹر میں ہونے والے شو کے بارے میں سنا رہی تھی کہ کیسے شعبدہ بازوں نے تماشائی خواتین میں بیش قیمت تحائف بانٹے تھے اور کیسے یہ بدقسمت خواتین شو کے بعد تھیٹر سے باہر نکل کر برہنہ ہو گئی تھیں۔ مارگریٹا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی آئینے کے سامنے کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

"نتاشا! تمہیں شرم آنی چاہیے۔ مارگریٹا بولی۔ اچھی خاصی پڑھی لکھی اور عقلمند ہونے کے باوجود جاہل لوگوں کے بیان کردہ قصوں پر نہ صرف یقین رکھتی ہو بلکہ یہ بے پر کی فضول باتیں آگے بھی پھیلاتی ہو"۔

نتاشا کے رخسار سرخ ہو گئے۔ لیکن وہ بڑے پرجوش انداز میں مالکن پر ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کی کہانی بالکل سچ ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے اپنی آنکھوں سے شہر کے ایک مشہور سٹور پر ایک خاتون کو جوتے خریدتے دیکھا تھا۔ جب وہ جوتوں کا بل ادا کرنے لگی تو جوتے اس کے پاؤں سے غائب ہو گئے۔ بے چاری کی پھٹی پرانی جرابوں نے اسے ہنسی کا نشانہ بنا ڈالا تھا۔ اور ہاں! یہ جوتے اسی شعبدہ بازی کے شو سے لائے گئے تھے۔

"تو پھر کیا وہ اسی طرح ننگے پاؤں چل پڑی تھی؟"

"جی ہاں! وہ ننگے پاؤں ہی چل پڑی تھی"۔ دل میں یہ احساس لئے ہوئے کہ مارگریٹا اس کا یقین نہیں کر رہی، قدرے شرمساری کے ساتھ نتاشا بولی۔

"گزشتہ شام پولیس نے تقریباً سو آدمیوں کو گرفتار کیا ہوگا۔ اور شو کے بعد سڑکوں پر بہت ساری خاتون تماشائیوں کو برہنہ حالت میں بھاگتے ہوئے بھی دیکھا گیا تھا"۔

"ہاں بھئی ہاں! یہ میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔ ہماری ہمسائی داریا چسکے لے لے کر ہر کسی کو یہ

کہانی سنا رہی تھی۔ ویسے میں اس حقیقت سے بھی واقف ہوں کہ جھوٹ بولنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے''۔

اس بحث کا انجام نتاشا کے لئے غیر متوقع طور پر بہت خوش کن ثابت ہوا۔ مارگریتا اپنی خواب گاہ سے ایک غیر ملکی پرفیوم کی شیشی اور زنانہ جرابوں کا ایک نیا جوڑا ہاتھ میں لئے برآمد ہوئی۔ یہ چیزیں نتاشا کو تھماتے ہوئے وہ بولی۔''آج میں بھی ایک شعبدہ دکھانا چاہتی ہوں۔ یہ چیزیں تمہیں تحفتاً دے رہی ہوں اور یقین رکھو کہ یہ غائب نہیں ہوں گی۔اس جھوٹی دانیا کی باتوں پر کان دھرنا بند کردو''۔

نتاشا نے تحائف وصول کرنے کے بعد مالکن کو بوسہ دیا۔اس کے قبل ازیں شرمندگی سے لالہ زار ہونے والے گال اب خوشی سے تمتما اٹھے تھے۔

بس کی آرام دہ سیٹ پر ٹیک لگائے مارگریتا اپنے خیالوں کی دنیا میں گم تھی۔پچھلی سیٹ پر بیٹھے دو آدمیوں کے مابین ایک بے معنی سی گفتگو جاری تھی۔خیالوں کی دنیا سے نکلنے کے بعد مارگریتا کی تمام تر توجہ ان حضرات کی جانب مبذول ہوگئی تھی۔

وہ دونوں مسافر کھسر پھسر کرتے ادھر ادھر چور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔کھڑکی کے ساتھ بیٹھا بیل سے مشابہہ آنکھوں والا جسیم مسافر اپنے قدرے مختصر جسامت والے ہم سفر سے کہہ رہا تھا کہ آخر کار لاش کو ایک سیاہ رنگ کا دبیز کپڑا اوڑھنا پڑا تھا۔

''ناممکن سی بات لگتی ہے''۔ چھوٹی جسامت والا حیرت سے سرگوشی کر رہا تھا۔''آج تک ایسا نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔کیا سرکاری حکام نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا؟''

کھڑکی کے نزدیک سے بس کے انجن کی گھن گرج میں دبی سرگوشی ابھری۔

پولیس کیس۔سکینڈل۔۔۔۔۔حکام کا شرمندگی سے منہ کالا۔

ان مسافروں کی جو سرگوشیاں مارگریتا کی قوت سماعت نے اچک لی تھیں انہیں ربط میں لانے کے بعد مارگریتا کی سمجھ میں جو بات آئی وہ کچھ اس طرح تھی کہ آج صبح کسی مرحوم شخص (جس کا نام وہ نہیں سن سکی تھی) کی تابوت میں رکھی لاش کا سر چوری ہوگیا تھا۔اسی وجہ سے حکام پریشان تھے اور غالباً سرگوشیوں میں باتیں کرنے والے مسافروں کا بھی اس حادثے کے ساتھ کوئی تعلق تھا۔

ہمارے پاس پھول خریدنے کا وقت تو ہوگا نا؟ چھوٹے قد والے نے پوچھا۔''تدفین غالباً دو بجے ہے''۔

مارگریتا اس چوری ہو جانے والے سر کی کہانی سے اب عاجز آ گئی تھی۔اپنی منزل کو قریب دیکھ کر اس نے سکھ کا سانس لیا۔کچھ دیر بعد مارگریتا صدارتی محل کی دیوار کے سائے میں ایک بنچ پر سستا رہی تھی۔

سورج کی تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ تاہم وہ اپنے ہی خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ کیسے ٹھیک ایک سال قبل تقریباً اسی وقت اسی بنچ پر وہ اپنے محبوب کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بالکل اسی دن کی طرح مارگریٹا کا سیاہ رنگ کا بیگ بھی بنچ پر رکھا تھا۔ باوجودیکہ ماسٹر آج اپنی محبوبہ کے ساتھ نہیں تھا لیکن مارگریٹا خیالوں ہی خیالوں میں اسی کے ساتھ محو گفتگو تھی۔ ''اگر تمہیں جیل ہوگئی ہے تو تم رابطہ کیوں نہیں کر رہے؟ دیکھو نا لوگ ایسے حالات میں بھی اکثر اپنوں کو کسی نہ کسی طریقے سے اطلاع تو کر ہی دیتے ہیں۔ یا تم اب مجھ سے پیار نہیں کرتے؟ نہیں یہ بات میں ہرگز نہیں مان سکتی۔ مطلب یہ ہوا کہ تمہیں جیل ہوگئی اور وہیں تمہیں موت نے آ لیا۔۔۔ اس صورت میں تمہارے سامنے میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آزاد کردو مجھے۔ دے دو مجھے زندہ رہنے کی آزادی۔ مارگریٹا نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ ''تم آزاد ہو۔ میں نے کب تمہیں قید کر رکھا ہے؟'' اور پھر خود ہی بولی۔'' یہ بھلا کیا جواب ہوا۔ ایسے نہیں۔ تم نکل جاؤ میری یادوں سے۔ کھول دو میری روح کے قفس کو۔ تب ہی میں آزاد ہوسکوں گی''۔

ایک خوبصورت خوش پوش جوان عورت کو تنہا بیٹھے دیکھ کر قریب سے گزرنے والے ایک راہگیر کے قدم تھم گئے اور وہ بنچ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کچھ کھانسنے کے بعد وہ بولا۔'' آج موسم توقع سے کچھ زیادہ ہی خوش گوار ہے''۔ جواب میں مارگریٹا نے اس آدمی کو ایسی زہر آلود نگاہوں سے گھورا کہ وہ فوراً ہی اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

''یہ لو مثال حاضر ہے''۔ مارگریٹا خیالوں میں اپنی روح کے مالک سے مخاطب ہوئی۔'' میں نے کیوں اس آدمی کو بلاوجہ یہاں سے بھگا دیا؟ میں تنہا ہوں۔ اداس ہوں۔ غموں سے چور ہوں۔ ایسے میں اگر میرے دکھ بانٹنے والا کوئی مل جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں کیوں کسی الو کی مانند اس دیوار کے نیچے بیٹھی ہوں؟ میں کیوں زندگی کو جی نہیں رہی؟''

مارگریٹا رنج و غم سے شدید بے حال ہوگئی تھی۔ لیکن صبح کی طرح پھر ایک نئی آس کی لہر نے اچانک اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی آنکھوں کی چمک واپس لوٹ آئی۔ امید کی اس لہر کو وہ شدت کے ساتھ اپنے سینے میں محسوس کر رہی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کے سینے میں اٹھنے والی لہر دراصل کسی آواز کی تھی۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ دراصل یہ ڈھول اور ماتمی بگل کے بجنے کی آواز تھی۔ یہ ایک سوگوار دھن تھی جو عموماً تدفین کے موقعہ پر بجائی جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد مارگریٹا کے سامنے سڑک پر کچھ گھڑ سوار پولیس والے نمودار ہوئے جن کے پیچھے پیچھے مزید تین پولیس والے فوجی انداز میں مارچ کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے دھیمی رفتار سے رینگتا ہوا ٹرک تھا جس پر بینڈ کے سازندے سوار تھے۔ ٹرک کے عقب میں ایک بڑے سائز کی کھلی ایمبولینس پر پھولوں سے ڈھکی ایک میت رکھی تھی۔ جس کے چاروں

کونوں پر تین مرد اور ایک عورت تعظیماً کھڑے تھے۔ ایمبولینس سے کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود مارگریٹا کو واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ مرحوم کا آخری آرام گاہ تک ساتھ دینے والے ہمسفر سخت حواس باختہ تھے۔ خصوصاً میت کے بائیں جانب بائیں کونے میں کھڑی خاتون کے اوسان تو بری طرح خطا ہو چکے تھے۔ اس کے پھولے ہوئے گالوں سے یہ گمان ہوتا تھا کہ اندر سے کوئی اس کے منہ میں ہوا بھر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے تذبذب اور خوف کی کیفیت عیاں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے لاش کو آنکھ مارے گی اور پوچھے گی۔ کیوں جناب! کیا آپ نے کبھی پہلے ایسا دیکھا یا سنا؟۔ ہے نا معجزہ؟ کچھ اسی قسم کے تاثرات لئے تین سو افراد کا ایک جلوس بھی میت کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

یہ ماتمی جلوس آہستہ آہستہ مارگریٹا کی نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ ڈھول کی دل کو دہلا دینے والی ڈھم ڈھم کی آواز اب دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔ مارگریٹا سوچ رہی تھی کہ یہ تدفین غیر معمولی طور پر کچھ عجیب سی ہے۔ ڈھول کی ڈھم ڈھم مارگریٹا کے دل پر ضرب کاری بن کر گر رہی تھی۔ اوہ خدایا! میں اپنی روح شیطان کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ اس کے عوض مجھے صرف اور صرف ماسٹر چاہیے۔ وہ پرتجسس انداز میں سوچ رہی تھی۔ یہ مرنے والا آخر کون ہے؟

مائیکل بیرلی۔ پریس کلب کا صدر

ناک میں بولتی ہوئی ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

حیرت زدہ مارگریٹا نے آواز کی سمت میں دیکھا تو بنچ کنارے ایک شخص نظریں جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ مارگریٹا سوچ رہی تھی کہ اس نے شائید بے خیالی میں بآ واز بلند اپنا سوال پوچھ لیا تھا۔

ماتمی جلوس اس دوران غالباً ٹریفک سگنل پر رک گیا تھا۔

''جی ہاں!'' اجنبی شخص بول اٹھا۔ ''اس ماتمی جلوس کا عجب سا ماحول ہے۔ لوگ بظاہر میت کی تعظیم کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں لیکن سب کے دلوں میں ایک ہی سوال ہے کہ اس کا سر کہاں غائب ہو گیا ہے؟''۔

''کیسا سر؟'' مارگریٹا نے اجنبی کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

یہ اجنبی قدرے پستہ قد تھا۔ اس کے سر کے بال آگ کے شعلے کے مانند چمکدار بھورے رنگ کے اور منہ سے ایک بدنما دانت باہر جھانک رہا تھا۔ اس کی مائع لگی سفید قمیض پر جا بجا بدنما دھبے نظر آ رہے تھے۔ وہ دھاری دار سوٹ اور چمکدار سیاہ جوتے پہنے ہوئے تھا جبکہ اس نے سر پہ ایک ہنڈیا نما ہیٹ سجا رکھا تھا۔ اس کی ٹائی کے شوخ رنگ سورج کی روشنی میں بہت نمایاں نظر آ رہے تھے۔ اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے کوٹ کی جیب سے، جہاں مرد حضرات عموماً رومال سجاتے ہیں ،ایک مرغے کی شفاف ہڈی جھانک

رہی تھی۔

جی ہاں! محترمہ۔ بھورے بالوں والا بولا۔ قصہ کچھ اس طرح ہے کہ آج صبح پریس کلب سے تابوت میں رکھی لاش کا سر کسی نے چرالیا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ مارگریتا بے ساختہ بول اٹھی۔ اور اسے یکایک بس میں ہونے والی مسافروں کی گفتگو یاد آ گئی۔

''وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیسے ہوا؟'' بھورے بالوں والے نے جواب دیا۔ ویسے میرے خیال میں میرے محترم ساتھی بیگیموت کو پوچھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بڑا منفرد سا واقعہ ہے۔ میری سمجھ سے بالا ہے کہ کسی کو کٹے سر کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔

اپنے خیالوں میں گم ہونے کے باوجود مارگریتا اجنبی کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

''ذرا رکئے!'' وہ اچانک چلا اٹھی۔ ''کون سا مائیکل بیرلی؟ کہیں یہ وہ تو نہیں جس کے متعلق آج اخباروں میں چھپا ہے؟''

''جی ہاں! یہ وہی ہے''۔

اچھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس ماتمی جلوس میں ادب سے منسلک لوگ شامل ہیں؟۔ مارگریتا نے دانت بھینچتے ہوئے پوچھا۔

جی ہاں! بالکل وہی لوگ ہیں۔

کیا آپ ان کے چہروں سے شناسا ہیں؟

جی ہاں! ایک ایک کو پہچانتا ہوں۔

اچھا تو بتائیے۔ مارگریتا نے نفرت آمیز لہجے میں پوچھا۔ کیا ان میں نقاد لاٹو بھی موجود ہے؟

ارے واہ۔ وہ بھلا کیسے نہیں ہوگا؟ بھورے بالوں والے نے جواب دیا۔ ''وہ سامنے چوتھی لائن میں کونے والا آدمی وہی ہے۔

وہ جو سفید بالوں والا ہے؟ مارگریتا نے آنکھیں بھینچتے ہوئے سوال کیا۔

جی ہاں! بالکل وہی۔ آپ نے نوٹ کیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے نگاہیں آسمان پر جمائے ہوئے تھا۔

جی ہاں، بالکل شکاری کتا لگتا ہے۔

مارگریتا نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا۔ وہ خاموشی سے نقاد لاٹو پر ٹکٹکی باندھے بیٹھی تھی۔

آپ جیسا کہ میں دیکھ رہا ہوں۔ بھورے بالوں والا بولا۔ اس شخص لاٹو سے سخت نفرت کرتی ہیں۔

میں کچھ اور لوگوں سے بھی نفرت کرتی ہوں۔ دانت پیستے ہوئے مارگریتا بولی۔ لیکن چھوڑیں، یہ

کوئی بہت مزے کا موضوع نہیں ہے۔

جی ہاں! آپ بالکل درست فرما رہی ہیں، میری محترمہ مارگریتا۔

اپنا نام سن کر مارگریتا حیران ہو کر رہ گئی۔

آپ مجھے جانتے ہیں؟

جواب دینے کی بجائے بھورے بالوں والے نے سر خم کرتے ہوئے 'ہنڈیا' سر سے اتارنے کے بعد بغل میں دبالی۔

اوہ خدایا کیسا بدمعاشوں والا منحوس چہرہ ہے اس شخص کا! اپنے ہمکلام اجنبی کو بغور دیکھتے ہوئے مارگریتا سوچ رہی تھی۔

لیکن میں تو آپ کو نہیں جانتی۔ قدرے ترش لہجے میں مارگریتا نے کہا۔

جی ہاں! آپ بھلا مجھے کیسے پہچان سکتی ہیں؟ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مجھے آپ کے پاس ایک خاص کام سے بھیجا گیا ہے۔

مارگریتا کا رنگ یکدم سفید پڑ گیا اور اس کا پورا جسم کانپ اٹھا۔

تو پھر یہیں سے بات شروع کرنی چاہیئے تھی نا۔ مارگریتا بولی۔ کٹے ہوئے سر کی کہانی کو لے کر میرا دماغ چاٹنا کیا ضروری تھا؟ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہو؟

جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بھورے بالوں والا برہمی سے بولا۔ میں نے کب گرفتاری کی بات کی ہے؟ مجھے تو آپ کے پاس ایک بہت ہی ضروری کام سے بھیجا گیا ہے۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ کون سا خاص کام ہے آپ کو مجھ سے؟

بھورے بالوں والا ارد گرد نظر دوڑانے کے بعد سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔

مجھے آپ کو آج شام مدعو کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

یہ آپ کیا اول فول بک رہے ہیں؟ کہاں مدعو کیا گیا ہے مجھے؟

ایک بہت ہی جہاندیدہ اور غیر معمولی طور پر ذہین غیر ملکی کے ہاں۔ بھورے بالوں والا آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا۔

مارگریتا پر یکدم شدید غصہ غالب آ گیا۔

کوئی نئی نسل پیدا ہو گئی ہے کیا؟ گلیوں کی خاک چھاننے والے دلال!۔ اجنبی کو برا بھلا کہتی ہوئی مارگریتا بنچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور وہاں سے چل پڑی۔

تعریف کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ بھورے بالوں والا خفگی سے بولا اور مارگریتا کے کچھ دور چلے

جانے کے بعد وہ چلایا۔۔

''بے وقوف، پاگل؟''

مارگریٹا واپس پلٹتے ہوئے اس پر برس پڑی۔''الو کا پٹھا، کمینہ!''

اسی لمحے بھورے بالوں والے کی آواز مارگریٹا کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ کہہ رہا تھا۔''سمندر کی جانب سے بڑھنے والی تاریکی نے رومن قاضی کی نفرت کے مرکز شہر''یروشلم''کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ رسیوں میں معلق مندر اور محل کے خوفناک مینار کو ملانے والے پل غائب ہو گئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے عظیم شہر یروشلم کبھی دنیا کے نقشے پر تھا ہی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔''اس کی آواز مسلسل آرہی تھی۔''جاؤ۔ جاؤ۔ اپنی ادھ جلی کاپی اور گلاب کی خشک کلی کے ساتھ جا کر غرق ہو جاؤ کہیں! یا پھر اکیلی بیٹھی رہو اس بنچ پر اور کرتی رہو اس سے التجا کہ وہ تمہیں آزاد کر دے۔ سانس لینے کی آزادی دیدے تمہیں۔ نکل جائے تمہاری یادوں سے!!

مارگریٹا کا چہرہ کسی خزاں رسیدہ پتے کی مانند زرد پڑ گیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی واپس لوٹ آئی اور بنچ پر بیٹھ گئی۔ بھورے بالوں والا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ میرا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ مارگریٹا نے بولنا شروع کیا۔ ادھ جلی کاپی اور گلاب کی کلی کو دیکھ لینا تو ممکن ہے۔۔ غالباً نتاشا کو گانٹھ لیا ہوگا؟ لیکن میرے ذہن کو آپ نے کیسے پڑھ لیا؟ خدارا! مجھے مزید اذیت مت دو۔ بتاؤ آپ کون ہو؟ کس ادارے سے آپ کا تعلق ہے؟

آپ یہ اداروں کی رٹ چھوڑ دو۔ بھورے بالوں والا بولا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میرا کسی ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ آرام سے بیٹھو اور اپنے دماغ کو ٹھنڈا کرو۔

کون ہو آپ؟ مارگریٹا نے اپنا سوال دہرایا۔

عزازیل۔ عزازیل ہے میرا نام۔ لیکن یہ جان لینے سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اچھا تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ میری کاپی اور میرے خیالات کا آپ کو کیسے علم ہوا؟

نہیں بتاؤں گا۔ عزازیل نے جواب دیا۔

اچھا، چلیں یہی بتا دیں کہ آپ اُس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ عاجزانہ لہجے میں مارگریٹا بولی۔

فرض کر لیں کہ جانتا ہوں تو۔۔۔۔۔

میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ صرف اتنا بتا دیں کہ وہ زندہ ہے یا نہیں؟

زندہ ہے۔ زندہ ہے وہ۔ عزازیل بیزاری سے بولا۔

اوہ خدایا! اوہ خدایا۔ مارگریٹا فرطِ جذبات سے چلا اٹھی۔

آپ براہِ کرم شور نہ مچائیں۔ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں۔ عزازیل ناراض ہوتا ہوا بولا۔

''معاف کردیں۔ خدارا مجھے معاف کردیں''۔ مارگریٹا ہاتھ جوڑے بھورے بالوں والے سے کہہ رہی تھی۔ ''میں نے آپ کو بلاوجہ برا بھلا کہا۔ لیکن آپ براہِ کرم میری کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ یہ بات تو آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں نا کہ اکیلی عورت کو اچانک کوئی انجان مرد کہیں مدعو کرے تو اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ مجھے انسانوں سے ملنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں آج تک کسی غیر ملکی سے نہیں ملی اور نہ ہی مجھے غیرملکیوں سے ملنے کا کوئی خاص شوق ہے۔ علاوہ ازیں میرا شوہر۔۔۔۔۔۔ میرے لئے زندگی کی سب سے بڑی اذیت یہ ہے کہ جس کے ساتھ میں رہتی ہوں اس سے محبت نہیں کرتی۔ لیکن اس کی زندگی کو خراب کرنا بھی اپنے لئے بہت بڑا جرم سمجھتی ہوں۔ اس کی جانب سے مجھے آج تک صرف سکھ اور شفقت ہی ملی ہے''۔

عزازیل مارگریٹا کی اس گفتگو سے بہت بیزار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''چپ ہوجاؤ۔ چپ ہوجاؤ ایک منٹ کے لئے''۔ مارگریٹا انتہائی فرمانبرداری کے ساتھ خاموش ہوگئی۔

میں آپ کو جس غیر ملکی کے ہاں آنے کی دعوت دے رہا ہوں وہ ایک بالکل بے ضرر انسان ہے۔ اس ملاقات کے بارے میں کسی کو بھی کانوں کان خبر تک نہ ہوگی۔ اس بات کی میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں۔

اسے مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آگئی ہے؟ مارگریٹا نے پوچھا۔

اس کے متعلق آپ کو جلد ہی پتا چل جائے گا۔

سمجھ گئی۔ مجھے اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنا پڑے گا۔ گہری سوچ میں گم مارگریٹا بولی۔

یہ سن کر عزازیل نے دو مرتبہ اپنا سر زور زور سے جھٹکا اور کہنے لگا۔ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی ہر عورت اس غیر ملکی کے ساتھ تعلق جوڑنے پر فخر محسوس کرے گی۔ لیکن آپ کو وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کے دل میں ایسی خواہش پیدا ہوئی تو یقین رکھیئے کہ وہ کبھی پوری نہیں ہوگی''۔

''یہ کس قسم کا غیر ملکی ہے؟'' مارگریٹا اس طرح چلا کر بولی کہ کئی راہ گیر مڑ مڑ کر دیکھنے لگ گئے۔

''اور بھلا مجھے اس سے ملنے میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟''

عزازیل مارگریٹا کے قریب ہوتا ہوا آہستگی سے بولا۔۔۔''دلچسپی تو بہت بڑی ہے۔۔۔۔۔آپ کو اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے''۔

''کیا؟'' مارگریٹا کی آنکھوں میں اچانک زندگی کی روشنی لوٹ آئی۔ ''اگر میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں

تو آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا غیر ملکی اُس کے بارے میں جانتا ہے''۔
عزازیل نے آنکھیں بند کر کے خاموشی سے اپنا سر مثبت انداز میں ہلا دیا۔
جاؤں گی میں! مارگریٹا نے مضبوطی سے عزازیل کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔''جہاں بھی کہو گے میں جاؤں گی''۔
عزازیل نے ایک طویل سانس کھینچی اور بنچ کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے پرسکون آواز میں کہنے لگا۔
''بڑی مشکل مخلوق ہوتی ہیں یہ عورتیں''۔ اس نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ٹھونس لئے اور ٹانگوں کو سیدھا کر لیا۔''بھلا مجھے ہی اس کام کے لئے کیوں بھیجا گیا ہے؟ بہتر تھا کہ بیگیموت کو بھیج دیتے۔ وہ بہت رکھ رکھاؤ والی شخصیت ہے''۔
مارگریٹا اپنے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔
''آپ خدارا اپنی پہیلیوں سے مجھے مزید اذیت مت دیں۔ میں انتہائی بدنصیب انسان ہوں۔ آپ غالباً اسی کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میں نجانے آپ لوگوں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات میں الجھنے جا رہی ہوں؟ لیکن میں حلفاً کہتی ہوں کہ اگر آپ نے ماسٹر کا ذکر نہ کیا ہوتا تو میں کبھی بھی آپ کے ساتھ نہ جاتی۔ آپ کی باتوں اور پہیلیوں سے میرا سر چکرانے لگ گیا ہے''۔
ڈرامہ بازی نہیں۔ ڈرامہ بازی نہیں۔ آنکھیں گھماتے ہوئے عزازیل کہہ رہا تھا۔''میری مجبوری کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے''۔ ایڈمنسٹریٹر کے منہ پر گھونسا مارنا، کسی پر گولی چلانا، چوچا کو گھر سے باہر پھینکنا، یا اسی قسم کا کوئی اور کام کرنا میری بالواسطہ ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ لیکن کسی عشق کی ماری خاتون کے ساتھ گفتگو کرنا۔۔۔ اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے وہ بولا۔''اس خادم کو معاف کر دیجئے گا۔ میں پچھلے آدھے گھنٹے سے آپ کے ساتھ اپنا دماغ خراب کر رہا ہوں۔ آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں۔ چل رہی ہو آپ میرے ساتھ یا نہیں؟''۔
''چل رہی ہوں''۔ مارگریٹا نے دھیمے سے جواب دیا۔
''تو اس صورت میں یہ وصول کیجئے''۔ عزازیل نے جیب سے سنہری رنگ کی ایک ڈبیا نکالی اور مارگریٹا کو تھما دی۔ اسے فوراً چھپا لیجئے ورنہ راہ گیر بلاوجہ متوجہ ہوں گے۔ یہ آپ کے کام آئے گی۔ گذشتہ چھ مہینوں میں غموں کی شدت نے آپ کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے''۔ جواب میں مارگریٹا شانے اچکا کر رہ گئی۔
آج شام ٹھیک ساڑھے نو بجے براہ مہربانی یہ کریم چہرے اور تمام جسم پر مل لیجئے گا۔ اس کے بعد جو آپ کے دل میں آئے وہی کرنا۔ لیکن ٹیلی فون کے آس پاس ہی رہیے گا۔ میں ٹھیک دس بجے آئندہ کا لائحہ عمل آپ کو فون پر بتاؤں گا۔ آپ کو کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ منزل تک آپ کو پہنچا دیا

جائے گا۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی اور نہ ہی کوئی گزند پہنچے گی۔ سمجھ رہی ہیں نا آپ؟"۔

مارگریٹا قدرے توقف کے بعد بولی۔

"سمجھ گئی ہوں۔ یہ ڈبیا خالص سونے کی لگتی ہے۔ میں بہت اچھی طرح سمجھ رہی ہوں کہ کسی گہری دلدل میں دھنستی جا رہی ہوں اور مجھے یقیناً بعد ازیں اس کی بہت بھاری قیمت چکانی پڑے گی"۔

"یہ کیا؟ پھر سے شروع ؟" عزازیل شدید بدمزگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔"لائیں، میری کریم واپس کر دیں"۔

"نہیں، نہیں۔ یہ بات نہیں ہے"۔ مارگریٹا نے سونے کی ڈبیا کو ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑ لیا اور بولی۔"مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا کرنے جا رہی ہوں۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ سب میں صرف اس کی وجہ سے کر رہی ہوں کیونکہ میرے پاس امید کی اب اور کوئی گنجائش باقی نہیں بچی۔ لیکن میں آپ پر ایک بات واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ اگر آپ نے مجھے مار دیا تو آپ ساری زندگی شرمندہ رہیں گے۔ پچھتائیں گے آپ۔ میں اپنی جان اپنی محبت پر قربان کرنے جا رہی ہوں"۔ اپنے سینے کو ٹھوکتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی اور اپنی نگاہیں اس نے سورج پر مرکوز کر رکھی تھیں۔

"دے دو واپس!" عزازیل غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا"دے دو واپس۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ان لغویات پر۔ میں انہیں کہہ دوں گا کہ بیگیموت کو بھیج دیں"۔

"جی نہیں!" مارگریٹا ہذیانی لہجے میں بولی۔ راہ گیروں کو متوجہ کرتے ہوئے وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔"میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ بدن پر کریم ملنے کا مذاق بھی سہہ لوں گی۔ میں شیطان کے سینگوں پر سواری کرنے کو بھی تیار ہوں۔نہیں دوں گی واپس۔ کسی صورت نہیں دوں گی"۔

"واہ!" عزازیل اچانک ایک خاص سمت میں انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بول اٹھا۔ مارگریٹا کی توجہ غیر ارادی طور پر اسی جانب ہوگئی۔ لیکن اسے وہاں کوئی غیر معمولی چیز دکھائی نہیں دی۔ عزازیل سے اس "واہ" کی وجہ معلوم کرنے کے لئے جب وہ پلٹی تو اس سے ہمکلام ہونے والا مختصر سا عجیب الخلقت "عجوبہ" وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ مارگریٹا نے جلدی سے بیگ میں ہاتھ گھسا کر ڈبیا کی موجودگی کی تصدیق کی اور وہاں سے سرپٹ بھاگ اٹھی۔

باب ۲۰

عزازیل کی کریم

ستاروں سے سجے آسمان کے وسط میں چودھویں کا چاند کسی بڑے قمقمے کی طرح دمک رہا تھا۔ باغیچے میں درختوں اور بلند قامت پودوں کی شاخوں کے سائے زمین پر کسی مصور کی تخلیق کردہ بیلوں کا تاثر پیدا کر رہے تھے۔ باغیچے میں روشن قمقموں سے یہ گمان ہوتا تھا کہ گویا سورج خود ان شیشے کے دریچوں میں چھپ گیا ہے۔ مارگریتا کی خواب گاہ میں تمام بتیاں روشن تھیں اور کمرے میں ایک افراتفری کا عالم دکھائی دے رہا تھا۔ بستر اور کمبل پر جابجا زنانہ کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ اسی طرح فرش پر بھی استعمال شدہ کپڑوں کا ایک انبار لگا تھا۔

کپڑوں کے ڈھیر کے نزدیک پاؤں تلے آ کر پچک جانے والی ایک سگریٹ کی ڈبیا پڑی تھی۔ ایک غلیظ جوتوں کا جوڑا میز پر ادھ پیئے کافی کے کپ کے ساتھ پڑا تھا۔ اسی میز کے ایک کنارے پر ایش ٹرے میں پڑے سگریٹ کے ٹکڑوں کے ڈھیر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کمرے کی فضا زنانہ پرفیوم اور سگریٹ کی بو سے لبریز تھی۔ شب خوابی کا سیاہ زنانہ گاؤن کرسی سے نیچے فرش پر لٹک رہا تھا۔

مارگریتا نیم برہنہ حالت میں ایک میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ میز پر عزازیل کی دی ہوئی سونے کی ڈبیا کے ساتھ ہیروں سے جڑی ایک بیش قیمت گھڑی رکھی تھی۔ مارگریتا اس گھڑی کی سوئیوں پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی۔ بعض اوقات اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے گھڑی خراب ہوگئی ہے اور سوئیوں کی گردش رک گئی ہے۔ لیکن گھڑی چل رہی تھی۔ شائید اس کی رفتار مارگریتا کی خواہش سے کم تھی لیکن بہرحال چل رہی تھی۔ بالآخر گھڑی نے نو بج کر انتیس منٹ ہونے کا اعلان کیا۔ مارگریتا کا دل اچھل کر سینے سے باہر نکلنے کو ہو رہا تھا۔ سینہ کسی دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ اس بری طرح کانپ رہے تھے کہ کریم والی ڈبیا کو پکڑنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ آخرکار اس نے خود پر قابو پالیا اور ڈبیا کھولنے میں کامیاب ہوگئی جو پیلے رنگ کی کریم سے بھری ہوئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کریم سے دلدل کی سیلن جیسی بدبو اور جنگل کی جھاڑیوں کی ملی جلی

مہک آ رہی ہے۔

مارگریتا نے تھوڑی سی کریم لے کر اپنی پیشانی اور رخساروں پر ملنا شروع کر دی۔ کریم کے چہرے پر پھیلنے سے مارگریتا کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کا جسم بے وزن ہو کر ہوا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ چہرے پر دو تین بار کریم ملنے کے بعد جب اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تو کریم کی ڈبیا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گھڑی پر جا گری اور گھڑی کا شیشہ کئی جگہوں سے ٹوٹ گیا۔ مارگریتا نے آنکھیں بند کر لیں اور جب دوبارہ کھولیں تو اس پر ہنسی کا شدید دورہ طاری ہو گیا۔

ابروؤں کی باریک لکیریں کچھ گھنی ہو گئی تھیں اور ان کی خوبصورت بل کھاتی دھاریں مارگریتا کی خوبصورت پلکوں پر کسی شاعر کا تصور لگ رہی تھیں۔ اکتوبر میں ماسٹر سے بچھڑنے کے بعد اس کی بھنوؤں کے درمیان نمودار ہونے والی باریک سلوٹ غائب ہو گئی تھی۔ کنپٹیوں کے قریب زرد رنگ کے دھبے اور آنکھوں کے بیرونی گوشوں میں واضح نظر آنے والی لکیریں بھی مٹ چکی تھیں۔ رخسار گلابی، پیشانی شفاف اور سفید ہو گئی تھی۔ اور یوں لگتا تھا کہ سر کے بال تو پیدائشی طور پر ہی گھنگھریالے ہیں۔

آئینے سے تیس سالہ مارگریتا کو ایک سیاہ گھنگھریالے بالوں والی ہشاش بشاش زندگی کی مسکراہٹوں سے لبریز بیس سالہ لڑکی جھانک رہی تھی۔

ہنسی کا دورہ قدرے دھیما پڑنے پر مارگریتا نے جو باریک سا گاؤن پہن رکھا تھا وہ بھی اتار پھینکا اور جادو اثر کریم کو پورے جسم پر ملنا شروع کر دیا۔ اس کا پورا بدن دوبارہ جوان ہو جانے کے نشے سے چور ہو گیا تھا۔ سارے بدن کی جلد سرخ و سفید ہو گئی تھی اور اسے ایسا احساس ہونے لگا تھا کہ جیسے کسی نے دماغ میں چبھا کانٹا نکال دیا ہے اور اس کی تمام اذیتیں اور تکلیفیں ختم ہو گئی ہیں۔ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں میں ایک نئی توانائی آ گئی تھی اور پھر اچانک اس کا جسم بے وزن ہو گیا۔ وہ ہولے سے اچھلی اور قالین سے کچھ اوپر ہوا میں معلق ہو گئی اور پھر آہستگی سے واپس فرش پر اتر آئی۔ کیا کریم ہے یہ! کیا کریم ہے یہ! اس کریم نے نہ صرف اسے ظاہری طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا تھا بلکہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے ہر مسام سے خوشیاں بلبلے بن کر پھوٹ رہی ہیں۔

مارگریتا اپنے آپ کو اب آزاد محسوس کر رہی تھی۔ دنیا کے ہر غم اور ہر الجھن سے آزاد۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ صبح اس کی چھٹی حس نے جس تبدیلی کا اشارہ دیا تھا وہ اب حقیقتاً اس کے سامنے ہے اور غموں سے بھری اس کی گذشتہ زندگی اذیت بھری یادوں اور اس باغیچے والے گھر سمیت ہمیشہ کے لئے اس کا پیچھا چھوڑنے والی ہے۔ لیکن اس بیتی ہوئی زندگی کو چھوڑتے وقت اس کے دل میں ایک کسک موجود تھی اور یہ فضاؤں میں اڑنے کی دعوت دیتی ہوئی نئی خوشیوں سے بھرپور، پریوں کے دیس والی زندگی شروع کرنے

سے قبل اُس کے لیئے ایک فریضہ ادا کرنا بہت ضروری تھا۔ وہ برہنہ حالت میں ہی ہوا میں تیرتی ہوئی خواب گاہ سے نکلی اور اپنے شوہر کی لائبریری میں جا پہنچی۔ لکھنے کی میز پر رکھی کاپی سے اس نے ایک ورق نوچا اور اس پر نمایاں الفاظ میں تحریر کیا! ''مجھے معاف کر دینا اور جتنی جلدی ہو سکے مجھے بھلا دینا۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ مجھے ڈھونڈنا بے سود ہوگا۔ میری زندگی کی کڑواہٹ اور اذیتوں نے مجھے ایک چڑیل میں تبدیل کر دیا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ تمہارا اللہ نگہبان!''

مارگریٹا کی روح ایک دم ہلکی ہوگئی۔ اس کے دل پر پڑا بوجھ غائب ہوگیا۔ وہ اڑتی ہوئی خواب گاہ میں واپس پہنچ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے نتاشا بھی بہت سارا سامان اٹھائے کمرے میں آ گھسی۔ مارگریٹا پر نظر پڑتے ہی تمام اشیاء نتاشا کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر جا گریں۔ نتاشا کے بازو، پاؤں اور نگاہیں جہاں تھیں وہیں منجمد ہو کر رہ گئیں۔

حیران کیوں ہو رہی ہو؟ کیا میں اچھی نہیں لگ رہی؟ پھنسی پھنسی آواز میں مارگریٹا بولی۔

یہ کیسے ہوگیا؟ بدحواس نتاشا بولی۔

یہ کوئی معجزہ ہوگیا ہے اس کریم سے! اس جادو کی کریم سے۔ مارگریٹا نے سونے کی ڈبیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

نتاشا فرش پر بکھرے سامان کو روندتی ہوئی آئینے کے سامنے والی میز تک پہنچی اور ہوس میں سلگتی آنکھوں سے ڈبیا میں بچی کھچی کریم پر ٹکٹکی باندھے کھڑی ہوگئی۔ وہ زیرلب کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ یک لخت وہ مارگریٹا کی طرف پلٹی۔ ''جلد، آپ کی جلد۔ مارگریٹا! آپ کی جلد تو دمک رہی ہے''۔ پھر نجانے اسے کیا خیال آیا کہ بھاگ کر مارگریٹا کا بیش قیمت اوورکوٹ اُٹھالائی۔

رکھ دو! اسے واپس رکھ دو۔ مارگریٹا چلائی۔ ہاتھ مت لگاؤ میری چیزوں کو! ارے نہیں، نہیں۔ یہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟ رکھ لو اسے میری یاد میں تحفے کے طور پر۔ سمیٹ لو سب کچھ یہاں سے۔ یہ سب تمہارا ہے۔

نتاشا ایک لمحے کے لئے گم سم ہو کر ساکت کھڑی رہی۔ پھر دوڑ کر مارگریٹا سے لپٹ گئی اور اس کا منہ چومتے ہوئے چلانے لگی۔

چمک رہا ہے! آپ کا تو رواں رواں چمک رہا ہے۔ اور آپ کے ابرو تو! اوہ خدایا ابرو تو!

سمیٹ لو نتاشا۔ میرے سب کپڑے لے لو۔ میک اپ کا سارا سامان بھی اٹھالو۔ صرف زیورات نہ لینا ورنہ چوری کے الزام میں دھری جاؤ گی۔

یہ سن کر نتاشا نے جو ہاتھ لگا جلدی جلدی ایک گٹھری میں سمیٹ لیا اور وہاں سے رفو چکر ہوگئی۔

اسی دوران ادھ کھلی کھڑکی سے مشہور زمانہ ڈانس 'والز' کی دھن سنائی دینے لگ گئی اور گھر کے

داخلی دروازے سے ایک موٹر کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔

ابھی عزازیل کا فون آئے گا۔ مارگریٹا موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ اس کا فون ضرور آئے گا۔ وہ غیر ملکی بے ضرر ہے۔ ہاں ہاں، مجھے اب یقین ہوگیا ہے۔ وہ بے ضرر ہے۔

موٹر کار کے انجن کا شور دوبارہ بلند ہوا اور وہ کسی اور منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔ باغیچے کی روش پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ ''یہ نچلی منزل میں رہنے والا نکولائی ہے۔ میں اس کے قدموں کی چاپ پہچانتی ہوں۔ مارگریٹا سوچ رہی تھی۔ الوداعی تحفے کے طور پر مجھے اس کے ساتھ کچھ مضحکہ خیز حرکت کرنی چاہیئے۔

مارگریٹا نے کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے اور برہنہ حالت میں ایک پاؤں کھڑکی کی چوکھٹ پر جمائے، گھٹنا ہاتھوں میں دبائے بیٹھ گئی۔ چاندنی سے منور اس کا جسم کسی مجسمہ ساز کا شاہکار اور سوچ میں ڈوبا اس کا چہرہ کسی شاعر کا خیال لگ رہا تھا۔ کچھ دیر چاند سے لطف اندوز ہونے کے بعد مارگریٹا نے باغیچے میں نظر دوڑائی تو واقعتاً وہاں داخل ہونے والا شخص نکولائی ہی تھا۔ چاندنی میں نہایا نکولائی باغیچے میں اپنا بیگ ہاتھوں میں دبائے ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ جونہی اس کی نظر کھڑکی میں بیٹھی مارگریٹا پر پڑی تو اس نے بوکھلاہٹ میں اپنا بیگ مضبوطی سے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس پر لقوے کا حملہ ہوگیا ہے۔

آداب عرض ہے محترم نکولائی! غمناک آواز میں مارگریٹا بولی۔ لگتا ہے آپ بہت تھک گئے ہیں۔ شائید کسی میٹنگ سے آئے ہیں؟

نکولائی نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے تھے۔

''اور میں'' مارگریٹا اپنے عریاں جسم کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔ ''تنہا ہوں، اداس ہوں اور اس خوبصورت چاندنی رات میں اکیلی کھڑکی میں بیٹھی موسیقی سے دل بہلا رہی ہوں''۔

مارگریٹا نے بائیں ہاتھ سے اپنی الجھی ہوئی لٹ سلجھائی اور بگڑتی ہوئی بولی۔

''نکولائی! یہ تو بہت غیر اخلاقی بات ہے۔ میں آخر ایک عورت ہوں، جوان ہوں اور خوبصورت بھی ہوں۔ اور کسی خوبصورت عورت کی بات کا جواب نہ دینا بدتمیزی ہوتی ہے''۔

نکولائی جس کی جیکٹ کے دھاتی بٹن چاندنی میں چمک رہے تھے اور اس کی سفید داڑھی کا ایک ایک بال گنا جاسکتا تھا، اچانک بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور غصے میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے اپنا بیگ بنچ پر پٹخ دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی باغیچے میں مرغا بن کے کھڑا ہوجائے گا۔

'' کیسے بدمزاج آدمی ہیں آپ نکولائی''۔ مارگریٹا اپنی بات جاری رکھے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ویسے میں آپ جیسے خشک دل اور جذبات سے عاری لوگوں سے عاجز آ گئی ہوں۔ آپ جیسے لوگوں کی شان میں قصیدہ کہنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ کتنی خوش قسمت ہوں میں کہ آخر کار تم جیسے بے دل لوگوں کی دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں''۔

اس دوران کمرے میں رکھے ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ مارگریتا فوراً جست لگا کر کھڑکی سے نیچے اتری اور ٹیلیفون کی جانب بھاگ اٹھی۔

''عزازیل بول رہا ہوں''۔ ٹیلیفون میں سے آواز آئی۔

پیارے، میرے پیارے عزازیل۔ مارگریتا ٹیلیفون پر چلا کر بولی۔

''اڑان کی گھڑی آن پہنچی ہے''۔ عزازیل کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ مارگریتا کے تبدیل شدہ رویے نے اسے خوش کر دیا ہے۔ ''باغیچے کے گیٹ کے اوپر پہنچ کر زور سے چلانا 'میں نظر نہیں آ سکتی'۔ پھر پرواز سے کچھ آگاہی کے لئے پورے شہر کا ایک چکر لگانا۔ اس کے بعد شہر سے باہر جنوب کی سمت نکل جانا۔ سیدھا دریا کی طرف۔ وہاں تمہارا انتظار ہو رہا ہوگا''۔

مارگریتا نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ ساتھ والے کمرے سے فرش پر لکڑی کی کسی چیز کے چلنے کی ٹھک ٹھک کی آوازیں آنے لگیں۔ چند لمحوں بعد یہی آواز مارگریتا کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ مارگریتا نے کواڑ کھولا تو اس کا فرش کی صفائی والا لمبے راڈ کا برش اچھلتا ہوا کمرے میں گھس کر اڑنے لگ گیا۔ راڈ کی الٹی جانب سے برش بار بار زمین کو ٹھونک رہا تھا۔ جبکہ برش والا حصہ کھڑکی کی جانب اڑان لینے کے اشارے دے رہا تھا۔ مارگریتا یہ سب دیکھ کر شدت جذبات سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ دوڑ کر اس اڑن کھٹولے کو لپٹ گئی۔ یکا یک اسے خیال آیا کہ وہ تو بالکل برہنہ ہے۔ وہ برش پر سوار اڑتی ہوئی بیڈ کے پاس پہنچی اور ایک گلابی رنگ کا کپڑا جو شائید قمیض تھی یا گاؤن تھا یا کوئی چادر تھی، اپنے شانوں پر اوڑھنے کے بعد کھڑکی سے باہر کھلی فضاؤں میں پرواز کر گئی۔ باغیچے پر چھائی والز کی موسیقی میں اچانک تیزی آ گئی۔

کھڑکی سے اڑان بھرتے ہوئے مارگریتا کی نظر باغیچے میں بیٹھے نکولائی پر پڑی۔ وہ کسی مجسمے کی مانند منہ کھولے ساکت بیٹھا تھا۔ بالائی منزل پر رہنے والے ہمسائیوں کے کمرے سے آنے والے شور اور چیخوں نے اس کے اعصاب کو شل کر کے رکھ دیا تھا۔

''نکولائی! اپنے دل کی دھڑکن کو سننا سیکھو۔ میں جا رہی ہوں، ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں''۔ فضا میں معلق مارگریتا چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔

نکولائی کی فقط ایک آہ نکل کر رہ گئی اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں وہیں بنچ پر بے سدھ ہو گیا۔

"جا رہی ہوں، میں ہمیشہ کے لئے اڑی جا رہی ہوں"۔ مارگریٹا چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ اسے اچانک خیال آیا کہ اب اسے جسم ڈھانپنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اپنے جسم پر لپٹا کپڑا اتارا اور ہوا میں اچھال دیا۔ یہ منظر دیکھ کر نکولائی کا بے سدھ جسم دھڑام سے نیچے آن گرا۔ مارگریٹا نے پلٹ کر آخری مرتبہ اپنی اذیتوں کے مسکن کی جانب ایک نگاہ ڈالی۔ کھڑکی میں اسے فرط حیرت سے تبدیل شدہ نتاشا کا چہرہ نظر آیا اور وہ دوبارہ چلائی۔ "خدا حافظ نتاشا"۔ پھر اس نے برش کو ایک جھٹکا دیا اور باغیچے کے گیٹ کے عین اوپر پہنچ کر زور زور سے چلائی۔ "میں نظر نہیں آ رہی، میں نظر نہیں آ رہی"۔ اور باہر گلی کی جانب فضاؤں میں پرواز کر گئی۔ اس کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے "والز" کی موسیقی کی لے بھی انتہا کو پہنچ گئی۔

باب ۲۱

اُڑان

میں نظر نہیں آ رہی اور آزاد ہوں! میں نظر نہیں آ رہی اور آزاد ہوں!

اپنے گھر کے سامنے والی گلی کی فضا میں تیرتے ہوئے مارگریٹا ساتھ والی ٹیڑھی میڑھی گلی میں پہنچ گئی۔ وہاں پٹرولیم کی مصنوعات کا ڈپو تھا جس کے باہر عموماً لوگ قطار میں لگے مٹی کا تیل اور کیڑے مار دوا خریدتے تھے۔ اس گلی میں پرواز کرتے ہوئے مارگریٹا کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ وہ بے شک آزاد ہے اور کسی کو دکھائی بھی نہیں دے رہی لیکن اس کیفیت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے اسے کچھ عقلمندی سے کام لینا پڑے گا۔ پرواز کے دوران گلی میں نصب ایک کھمبے میں ٹکرا جانے سے وہ معجزانہ طور پر بال بال بچی تھی۔ مارگریٹا نے برش کے ڈنڈے کو مضبوطی سے تھام لیا اور اپنی پرواز کی رفتار کو کم کر دیا۔ بجلی کے تاروں اور اشتہاری بورڈوں کے نزدیک آنے پر وہ مزید احتیاط برتنے لگ گئی۔

تیسری گلی سے ہوتی ہوئی وہ سیدھا شہر کے وسط میں پہنچ گئی۔ پرواز کے دوران مارگریٹا کو اب بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ جادو اثر برش ہاتھ پاؤں یا جسم کے کسی بھی حصے کی معمولی سی جنبش پر اپنا رویہ تبدیل کر لیتا ہے۔ وہ اسے سنبھالنے میں اب خوب مشاق ہو گئی تھی۔ اڑان کے دوران کافی توجہ اور احتیاط درکار تھی۔ پہلی گلی میں ہی پرواز کے دوران یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اڑنے والی کسی کو بھی دکھائی نہیں دے رہی۔ کوئی بھی پلٹ پلٹ کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ کوئی بھی دیکھو دیکھو نہیں چلا رہا تھا۔ کسی کو بھی غشی کا دورہ نہیں پڑا اور کسی کی بھی غیر معمولی ہنسی کی آواز سنائی نہیں دی۔

مارگریٹا بے آواز اُڑ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اور قدرے کم بلندی پر غالباً کسی مکان کی دوسری منزل کی منڈیر کے برابر۔ دھیمی رفتار کے باوجود شہر کی وسطی شاہراہ پر مڑتے ہوئے مارگریٹا ذرا سا چوک گئی اور اس کا کندھا ایک روشن بورڈ سے ٹکرا گیا۔ مارگریٹا آگ بگولہ ہو گئی۔ اس نے جادو اثر برش کو ڈنڈے سے تھام لیا اور سخت غصے میں ڈنڈا مار مار کر بورڈ کو توڑ پھوڑ دیا۔ بورڈ کے ٹکڑے نیچے گرنے سے کئی راہ گیر زخمی ہو

گئے۔ یہ غیر ضروری حرکت کرنے کے بعد مارگریٹا زور زور سے ہنسنے لگ گئی۔ وسطی شاہراہ پر مجھے زیادہ احتیاط برتنی پڑے گی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کیونکہ یہاں بجلی کے تاروں اور نمائشی بورڈوں سے فضا اٹی پڑی ہے۔ مارگریٹا بسوں، ٹرام اور موٹر کاروں کی چھتوں کے اوپر اُڑی جا رہی تھی۔ اسے بلندی سے فٹ پاتھ پر ٹوپیوں کا ایک سیلاب دکھائی دے رہا تھا۔ اس سیلاب کے کچھ دھارے تجارتی مراکز کی جانب بہہ رہے تھے۔ ''اوہ، کیا فضول نظارہ ہے!'' جھنجھلاہٹ میں مبتلا مارگریٹا سوچ رہی تھی۔ ''یہاں لوٹ کر آنا بے وقوفی ہوگی''۔ وسطی چوراہے کے اوپر سے گذرنے کے بعد مارگریٹا چوتھی منزل کی بلندی پر اُڑنے لگ گئی۔ دھواں اگلتی چمنیوں کے پاس سے ہوتی ہوئی وہ ایک گلی میں مڑ گئی۔ اس گلی میں کثیر تعداد میں بلند و بالا عمارتیں کھڑی تھیں۔ ان عمارتوں کی بیشتر کھڑکیاں کھلی تھیں جن سے ریڈیو پر بجنے والی موسیقی کی دھنیں سنائی دے رہی تھیں۔ تجسس کی ماری مارگریٹا ایک کھڑکی کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ یہ کھڑکی ایک مشترکہ فلیٹ کے باورچی خانے میں کھلتی تھی۔ باورچی خانے میں دو خواتین چولہے پر دو بھاپ اگلتی دیگچیاں سجائے اور ہاتھوں میں غلیظ چمچ پکڑے تکرار میں مصروف تھیں۔

ایک کہہ رہی تھی۔ ''محترمہ غسل خانے سے نکلتے وقت بتی بجھانا بہت ضروری ہے۔ آپ لوگ اکثر اس جرم کے مرتکب ہوتے ہو اور قومی خزانے کو نقصان پہنچاتے ہو۔ آئندہ ایسی حرکت ہوئی تو میں سرکاری حکام کو تمہاری رپورٹ کر دوں گی تاکہ آپ لوگوں کو یہاں سے باہر نکال پھینکا جائے''۔

''اور تم کیا بہت پاک صاف ہو؟'' دوسری نے کہا

''تم دونوں ہی خوب ہو''، مارگریٹا نے کھڑکی کے راستے باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ لڑائی میں مصروف دونوں خواتین اپنے چمچ تانے آواز کی سمت پلٹیں۔ کسی کو وہاں موجود نہ پا کر وہ حیرت سے منجمد ہو گئیں۔ مارگریٹا محتاط انداز میں دونوں خواتین کے درمیان سے گذرتے ہوئے چولہے کے قریب پہنچی اور دونوں دیگچیوں کے ڈھکن اٹھا کر ان میں پانی انڈیل دیا۔ دونوں خواتین حیرت سے فق ہو گئیں۔ مارگریٹا اس تماشے سے مزید محظوظ ہونے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے باہر کی جانب پرواز کر گئی۔

گلی کے آخر میں ایک خوبصورت آٹھ منزلہ عمارت اس کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ وہ عمارت کے داخلی دروازے پر اتر گئی۔ دروازے کے تینوں اطراف کی دیواریں اور سیڑھیاں سیاہ مرمر سے مزین تھیں۔ دروازے کے شیشے سے سنہری بٹنوں سے آراستہ سیاہ کوٹ پہنے دربان نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے اوپر سنہری حروف میں درج تھا۔

''آشیانہ ادب''

مارگریٹا کچھ دیر دروازے پر ٹکٹکی باندھے کھڑی رہی۔ پھر اس نے عمارت کے اندر داخل ہونے کا

ارادہ کر لیا۔ جادو اثر برش کو بغل میں دبائے جب اس نے دروازہ کھولا تو دربان دروازے کی ضرب سے لڑکھڑا گیا۔ کسی کو نزدیک نہ پا کر وہ حیرت زدہ چہرہ لئے گلی میں نکل آیا۔ لفٹ کے قریب عمارت میں رہائش پذیر لوگوں کے کوائف ایک بورڈ پر درج تھے۔ مارگریٹا غور سے بورڈ کی تفصیلات پڑھنے لگ گئی۔ لاٹو کے نام پر نظر پڑتے ہی اس کے تمام جسم میں گھنٹیاں بج اٹھیں۔

خدایا! یہ تو وہی کم بخت نقاد ہے جس نے میرے محبوب ماسٹر کی زندگی چھینی ہے۔ بورڈ کو بار بار دیوار پر پٹختے ہوئے مارگریٹا سوچ رہی تھی۔

عمارت میں واپس لوٹ آنے والا دربان بورڈ کو خود بخود دیوار پر پٹختے دیکھ کر چکرا گیا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ مارگریٹا اس دوران سیڑھیوں کے اوپر اڑے جا رہی تھی اور بار بار دھرائے جا رہی تھی "لاٹو فلیٹ نمبر ۸۴۔ لاٹو فلیٹ نمبر ۸۴"

یہ بائیں ہاتھ نمبر بیاسی۔ اس کے ٹھیک اوپر نمبر تراسی اور بائیں جانب نمبر چوراسی۔ مارگریٹا بڑبڑاتی ہوئی فلیٹ نمبر ۸۴ کے سامنے فرش پر اتر آئی۔ اپنے حدت سے سلگتے ہوئے تلوے پتھر کے ٹھنڈے فرش پر ٹکانے سے مارگریٹا کو بہت سکون ملا۔ لیکن اُس کے سینے میں اُبلنے والا لاوہ اب جوالا مکھی بن کر پھٹنے کو تھا۔ دروازے پہ لاٹو کے نام کی تختی دیکھ کر اس نے تختی سے دانت بھینچ لئے اور گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ لیکن دروازہ کھولنے کوئی نہیں آیا۔ اس نے مزید دو بار گھنٹی بجائی لیکن جواب ندارد۔ فلیٹ نمبر ۸۴ کے مکیں کو یقیناً مرحوم مائیکل بیرلی کا شکر گذار ہونا چاہئے تھا کیونکہ اس دوران اگر وہ مرحوم کی یاد میں منعقد ہونے والی تعزیتی میٹنگ میں نہ بیٹھا ہوتا تو مارگریٹا اس کا جو حشر کرتی وہ غالبًا الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ لاٹو کی پیدائش یقیناً کسی خوش نصیبی کے ستارے کے زیر سایہ ہوئی تھی جو وہ آج بروز جمعہ چڑیل میں تبدیل ہو جانے والی مارگریٹا کے ہتھے چڑھنے سے بچ گیا تھا۔

دروازہ نہ کھلنے پر مارگریٹا اُڑتی ہوئی گلی میں واپس آ گئی۔ عمارت کی منزلوں کی گنتی کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگا لیا کہ لاٹو کے فلیٹ کی کھڑکیاں کون سی ہیں۔ اور اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ آٹھویں منزل کے کونے والے فلیٹ کی تاریکی میں ڈوبی کھڑکیاں بلا شبہ لاٹو کی رہائش گاہ ہی کی تھیں۔ اپنا اطمینان کر لینے کے بعد مارگریٹا ہوا میں بلند ہوئی اور ایک کھلی کھڑکی کے راستے تیرتی ہوئی تاریک کمرے میں پہنچ گئی۔ چاندنی کی ایک باریک لکیر کمرے کے وسط تک پھیلی تھی۔ دیواروں کو ٹٹولتے ہوئے مارگریٹا نے بتی کا بٹن ڈھونڈ نکالا جسے دباتے ہی پورا کمرہ روشنی سے منور ہو گیا۔ جادو اثر برش ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ فلیٹ میں کسی کے موجود نہ ہونے کا اطمینان ہو جانے کے بعد مارگریٹا نے بیرونی دروازہ کھول کر لاٹو کے نام کی تختی دیکھی اور تصدیق کر لی کہ وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر ہی موجود ہے۔

سنا ہے کہ نقاد لاٹو آج بھی اس خوفناک شام کو یاد کر کے کانپ اٹھتا ہے اور مرحوم مائیکل بیرلی کا نام وہ آج بھی عزت و احترام کے ساتھ لیتا ہے۔ اگر وہ اس شام اپنے گھر پر موجود ہوتا تو نجانے کس قسم کے خطرناک جرائم پیشہ لوگوں سے اس کا واسطہ پڑ جاتا۔ اس شام جب مارگریتا باورچی خانے سے نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک بھاری بھرکم ہتھوڑا تھا۔ یہ نظروں سے اوجھل رہنے والی برہنہ از نتی خود سے باتیں کر رہی تھی اور سامنے دکھائی دینے والی ہر چیز کو لاٹو کا سر تصور کرتے ہوئے ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ سب سے پہلے تو اس نے سفید رنگ کے خوشنما جرمن پیانو پر وار کرنے شروع کئے۔ بے چارے پیانو کی آہ وزاری دور دور تک گونج رہی تھی۔ پیانو کی چابیاں چاروں طرف اڑ رہی تھیں اور بے چارہ باجا ہر وار کے ساتھ بے سری آہیں بھر رہا تھا۔ نقش و نگار سے مزین پیانو کا ڈھکن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنے بےقصور ہونے کا ماتم کر رہا تھا۔ ہتھوڑے کی زوردار ضربوں کے سامنے پیانو کا سُروں والا حصہ کسی گولے کی مانند گرج پیدا کرتا ہوا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس ظلم کا شکار بے چارہ پیانو بہت چیخا، چلایا، کھانسا، سسکا اور بالآخر دو انسانوں کے درمیان رقابت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مارگریتا اس وحشیانہ حملے کے بعد شدید تھکن کا شکار ہو گئی تھی اور اپنی سانسوں کو قابو میں لانے کے لئے وہ ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

باورچی خانے اور غسل خانے سے پانی کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ غالباً اب فرش پر بہنے لگ گیا ہے۔ مارگریتا خود سے ہمکلام ہو رہی تھی۔ لیکن مجھے تو ابھی اپنا کام جاری رکھنا ہے۔

باورچی خانے سے پانی راہداری میں بہنا شروع ہو گیا تھا۔ ننگے پاؤں پانی میں شڑاپ شڑاپ کی آوازیں پیدا کرتے ہوئے مارگریتا نے بالٹی سے پانی کمرے میں پڑی اشیاء پر انڈیلنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر ستانے کے بعد اس نے ہتھوڑا دوبارہ اٹھا لیا اور دیوار گیر الماری کا حشر نشر کر دیا۔ کمرے کے کھنڈر کو فاتحانہ انداز میں دیکھتے ہوئے مارگریتا ہتھوڑا لئے خواب گاہ میں جا پہنچی۔ قد آدم آئینے سے آراستہ الماری ہتھوڑے کی پہلی ہی ضرب کے ساتھ ڈھیر ہو گئی۔ مارگریتا نے الماری میں لٹکا سوٹ نکال کر نہانے کے ٹب میں ڈبو دیا۔ سیاہی کی شیشی اٹھائی اور ڈبل بیڈ کے بستر پر انڈیل دی۔

فلیٹ میں برپا ہونے والی تباہی سے مارگریتا کو روحانی سکون مل رہا تھا۔ لیکن اس کے خیال میں جو کچھ اس فلیٹ کے مالک نے اس کے محبوب کے ساتھ کیا تھا اس کے مقابلے میں یہ توڑ پھوڑ بہت معمولی تھی۔ وہ وحشیانہ انداز میں سامنے آنے والی ہر چیز پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ اس نے چھری کے پے در پے وار سے بستر کی چادروں اور کمبل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اسے اب قطعاً تھکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہاں وہ پسینے میں ضرور نہا گئی تھی۔

اس دوران لاٹو کی رہائش کے ذیلی منزل پر واقع باورچی خانے میں ڈرامہ نویس کوانت کی

ملازمہ اس ہنگامے سے بے نیاز چائے پی رہی تھی۔ اس کی نظر جب چھت پر پڑی تو اسے محسوس ہوا کہ چھت مختلف جگہوں سے اپنا رنگ بدل رہی ہے۔ سفید چھت جا بجا کسی مردہ جسم کے مانند نیلے دھبوں سے بھرتی جارہی تھی۔ پھر اچانک یہ دھبے ابھرنے لگ گئے اور ان سے پانی ٹپکنے لگ گیا۔ چھت کے درمیان والا دھبہ پھیل کر بڑا ہوگیا اور اس سے اچھی خاصی بارش برسنے لگ گئی۔ ملازمہ نے دوڑ کر پانی کے دھارے کے نیچے ایک چلمچی رکھ دی۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ برسنے والے پانی کی شدت تیز ہوتی جارہی تھی اور اس کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جارہا تھا۔ گیس کا چولہا اور برتنوں والی میز بھی پانی کی زد میں آ گئی تھی۔ ملازمہ دوڑتی ہوئی فلیٹ سے باہر نکل آئی اور سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی فلیٹ نمبر چوراسی کے دروازے پر جا پہنچی۔ نقاد لاٹو کے فلیٹ کی گھنٹی بجنے لگ گئی۔

''کوئی آ گیا ہے۔ چلنا چاہیے''۔ مارگریتا بولی۔ وہ جب برش پر سوار ہوئی تو دروازے کے باہر سے زنانہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''کھولو، جلدی کھولو۔ تمہارے گھر میں پانی بہہ رہا ہے۔ ہماری چھت ٹپکنے لگی ہے''۔

مارگریتا چھت کی جانب ابھری اور اس نے ایک ہی ضرب سے ہیروں کی مانند قوس قزاح بناتے فانوس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ باہر سے چیخوں کی آواز آنا بند ہوگئی تھی۔ اب سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

مارگریتا کھڑکی کے راستے باہر نکل آئی۔ کھڑکی کے شیشوں پر بھی اس نے ہتھوڑے کا وار کیا۔ شیشے کے ٹکڑے مرمر سے مزین دیوار سے ٹکراتے ہوئے نیچے برسنے لگ گئے۔ دور نیچے سڑک پر لوگوں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کردیا۔ سڑک کنارے کھڑی دو گاڑیوں میں سے ایک نے ہارن بجایا اور وہاں سے نکل گئی۔

لاٹو کے فلیٹ پر شب خون مارنے کے بعد مارگریتا ہمسایوں کے فلیٹ کی کھڑکیوں کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے ہتھوڑے کی ضربیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ گلی میں شور بپا ہوگیا۔ عمارت کا دربان باہر نکل آیا لیکن کچھ سوچنے سمجھنے سے عاری فضا میں گھورتا ہوا ہونٹوں میں دبی سیٹی بجانے لگ گیا۔ سیٹی کی آواز نے مارگریتا کو اور بھی زیادہ مشتعل کردیا۔ آٹھویں منزل سے نمٹنے کے بعد اب وہ ساتویں منزل کی کھڑکیوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

عمارت کے بیرونی دروازے کے اندر کھڑا رہنے والا سستی کا مارا دربان پورا زور لگا کر اپنی روح سیٹی کی آواز میں پھونک رہا تھا اور مارگریتا کے پیدا کردہ ہنگامے کے پیچھے پیچھے کسی بچے جمورے کی مانند بھاگ رہا تھا۔ مارگریتا کے ایک سے دوسری کھڑکی تک پہنچنے کے وقفہ میں دربان کو اپنی پھولی ہوئی سانس بحال کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ جونہی ہتھوڑا دوبارہ کسی کھڑکی پر برستا وہ اپنا منہ پھلا کر سیٹی کا رخ آسمان کی

جانب کر دیتا۔

دربان کی بھاگ دوڑ اور مارگریتا کی مار دھاڑ نتیجہ خیز ثابت ہو رہی تھی۔ عمارت کے مکین افراتفری کا شکار ہو گئے تھے۔ جو کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے اب تک بچ گئی تھیں ان میں اب انسانی سر نظر آنے لگے تھے لیکن وہ فوراً ہی وہاں سے غائب بھی ہوتے جا رہے تھے۔ جو کھڑکیاں کھلی تھیں انہیں بند کیا جا رہا تھا۔ سامنے والی عمارت کے رہائشی اپنی کھڑکیوں کے آس پاس کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے اور سمجھنے سے قاصر تھے کہ اس نئی عمارت ''آشیانہء ادب'' کی شامت کیوں آئی ہے۔

گلی میں لوگ دوڑتے ہوئے ''آشیانہء ادب'' کے آس پاس جمع ہو رہے تھے۔ جبکہ عمارت کے اندر کئی لوگ بدحواسی کے عالم میں زینوں پر اوپر نیچے بلا مقصد دوڑ رہے تھے۔ ڈرامہ نویس کوانت کی ملازمہ چیخ چیخ کر قریب سے گزرنے والوں کو بتا رہی تھی کہ فلیٹ نمبر ۸۲ کی چھت سے کیسے بارش شروع ہو گئی ہے۔ جلد ہی فلیٹ نمبر ۸۰ کی ملازمہ بھی اپنی چھت ٹپکنے کا واویلا کرنے لگی تھی۔ آخر کار کوانت کے باورچی خانے کی چھت کے پلستر کا ایک بڑا حصہ ٹوٹ کر برتنوں کی میز پر آ گرا۔ شیشے اور چینی کے تمام برتن ٹوٹ کر بکھر گئے۔ چھت پر نمودار ہونے والے شگاف سے اب صحیح معنوں میں برسات شروع ہو گئی تھی۔

ادھر مارگریتا اب چوتھی منزل پر اتر آئی تھی۔ درمیانی کھڑکی میں اسے ایک شخص نظر آیا جس نے افراتفری کے عالم میں دھوئیں سے بچاؤ کا ماسک پہن رکھا تھا۔ کھڑکی پر پہلے ہی وار کی آواز سن کر وہ خوف کے مارے کمرے سے غائب ہو گیا۔

پھر اچانک فضا میں سکوت چھا گیا۔ تیسری منزل پر پہنچ کر مارگریتا کی نظر کونے والے فلیٹ کی کھڑکی کے اندر پڑی۔ کمرے میں جالی دار جھالر سے آراستہ ایک چھوٹا سا بیڈ پڑا تھا۔ بیڈ پر بیٹھا ایک چار سالہ بچہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بچے کے علاوہ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ گھر کے دیگر افراد غالباً باہر بھاگ گئے تھے۔

شیشے توڑ رہے ہیں۔ بچہ بولا اور چیخ چیخ کر پکارنے لگ گیا۔ امی! امی! لیکن اس کی آواز سن کر کوئی نہ آیا۔

امی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

مارگریتا نے کھڑکی کے پردے کو ہٹایا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

''نہیں ڈرو، نہیں ڈرو بچے''۔ مارگریتا اپنی آواز کو شائستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''باہر کچھ آوارہ لڑکے شیشے توڑ رہے ہیں''۔

غلیل سے؟ بچے نے پوچھا۔ اس نے کانپنا بند کر دیا تھا۔

''ہاں، ہاں غلیل سے، غلیل سے''۔ مارگریٹا نے تصدیق کی۔ ''اور تم اب سو جاؤ''۔

یہ ساشا ہے۔ بچہ بولا۔ اسی کے پاس غلیل ہے۔

ہاں! ہاں۔ بالکل وہی بدمعاش ہے۔

بچہ چاروں جانب نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کہاں ہو خالہ؟''

''میں یہاں نہیں ہوں''۔ مارگریٹا نے جواب دیا۔ ''یہ تمہیں خواب آ رہا ہے''۔

''میرا بھی یہی خیال تھا''۔ بچے نے کہا

''اچھا تم اب جلدی سے لیٹ جاؤ''۔ مارگریٹا بولی۔ ''ایک بازو اپنے سر کے نیچے رکھ لو۔ پھر میں تمہیں خواب میں دکھائی دوں گی''۔

''آؤ، آؤ خالہ! جلدی سے میرے خواب میں آ جاؤ''۔ بچہ فوراً لیٹ گیا اور اس نے ایک بازو اپنے سر کے نیچے رکھ لیا۔

''میں تمہیں کہانی سناتی ہوں''۔ مارگریٹا نے ایک ہاتھ سے بچے کا سر سہلانا شروع کر دیا اور بولی۔ ''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گھر میں ایک عورت رہتی تھی۔ اس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس کی زندگی غموں سے بھری پڑی تھی۔ وہ سارا سارا دن بیٹھی روتی رہتی تھی اور پھر ایک دن وہ غصے سے پاگل ہو گئی''۔ مارگریٹا خاموش ہو گئی اور اس نے اپنا ہاتھ بچے کے سر سے ہٹا لیا۔ بچہ گہری نیند سو چکا تھا۔

مارگریٹا نے کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر ہتھوڑا کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور چپکے سے باہر پرواز کر گئی۔ عمارت کے قریب لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا تھا۔ سڑک پر بکھرے شیشے کے ٹکڑوں کے ارد گرد لوگ افراتفری کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کئی پولیس والے بھی جائے وقوعہ پر پہنچ چکے تھے۔ اور پھر گھنٹی بجاتی سیڑھیوں سے لیس سرخ رنگ کی آگ بجھانے والی گاڑی بھی وہاں پہنچ گئی۔

مارگریٹا کو اب یہاں کے واقعات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے آسمان کی جانب نگاہ دوڑائی اور ایک ہی جست میں انتقام کا نشانہ بننے والی اس آٹھ منزلہ عمارت کی چھت سے اوپر نکل گئی۔ اس کے نیچے عمارتوں کی چھتیں تیزی سے چھوٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ سڑکوں اور گلیوں کی جگہ اب باریک لکیریں ظاہر ہو رہی تھیں۔ روشنیاں تحلیل ہوتی جا رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں مارگریٹا کے نیچے ٹمٹماتی روشنیوں کی ایک جھیل کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر اچانک یہ جھیل مارگریٹا کے سر کے اوپر منتقل ہو گئی۔ چاند اس کے پاؤں کے جانب سرک گیا۔ مارگریٹا فوراً سمجھ گئی کہ اس نے قلابازی کھائی ہے اور ایک جھٹکے کے ساتھ اصل حالت میں واپس آ گئی۔ اس اثنا میں روشنیوں کی جھیل غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ افق پر ایک دھندلا غبار چھا گیا تھا اور چند لمحوں بعد یہ غبار بھی

غائب ہو گیا۔

مارگریٹا کے بال تیز ہوا سے بکھر جانے والے سرکنڈوں کی مانند پھیل گئے تھے۔ اس کا تمام جسم سیٹیاں بجاتی چاندنی میں نہا گیا تھا۔ مارگریٹا کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اب ناقابل فہم سبک روی سے اڑ رہی ہے۔ اچنبھے کی بات یہ تھی کہ اس کا تنفس کسی طرح بھی متاثر نہیں ہو رہا تھا۔

چند لمحوں بعد دور نیچے زمین کی تاریک گہرائیوں میں ٹمٹماتی روشنیوں کی جھیل دوبارہ نمودار ہوئی اور پھر فوراً ہی غائب ہو گئی۔ کچھ دیر بعد یہی منظر دوبارہ ظاہر ہوا اور غائب ہو گیا۔

شہر! شہر! مارگریٹا چلائی۔

بعد ازاں دو تین مرتبہ اسے ایسا لگا کہ جیسے سیاہ رنگ کی کھلی میان میں تلوار پڑی ہے۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ یہ دراصل دریا تھے۔

جب اس اڑنتی نے نگاہ قدرے اوپر اور بائیں جانب دوڑائی تو اسے محسوس ہوا کہ چاند کسی پاگل چکور کی طرح اپنی جگہ سے ہلے بغیر اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ مارگریٹا کے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لے لیا کہ وہ اس جادو اثر برش کی بلاوجہ دوڑیں لگوا رہی ہے اور اپنی پرواز سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے مواقع ضائع کر رہی ہے۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ منزل پر اس کے منتظر لوگ اس کے جلد پہنچنے میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے۔ لہٰذا برق رفتاری سے اڑنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

مارگریٹا نے برش کو زمین کی سمت دکھا دی اور اپنی پرواز کی رفتار بہت کم کر دی۔ ہوا کے دوش پر پھسلنے سے مارگریٹا کو جو تسکین حاصل ہو رہی تھی وہ ناقابل بیاں ہے۔ دھرتی ماں اپنے ہاتھ پھیلائے اسے اپنی آغوش میں لینے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی۔ چند لمحے قبل تاریکیوں میں پوشیدہ اس کے خوبصورت راز اب چاندنی میں نہائے ظاہر ہونے لگ گئے تھے۔ زمین مارگریٹا کی جانب لپک رہی تھی۔ سبز جنگل کی مسحور کن مہک مارگریٹا کو مدہوش کئے دے رہی تھی۔ وہ دھند کا لبادہ اوڑھے چشموں کے اوپر اڑ رہی تھی۔ اسے مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور کہیں دور سے سنائی دینے والی ریل گاڑی کی آواز نجانے کیوں اس کا سینہ چیرتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد کسی اژدھے کی مانند دھیرے دھیرے بل کھاتی، ہوا میں چنگاریاں اڑاتی ریل گاڑی اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ مارگریٹا اس کے اوپر سے پرواز کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ ایک آبی شیشے کے اوپر اڑ رہی تھی۔ اب چاند صرف اوپر سے ہی نہیں بلکہ نیچے سے بھی اس کے عریاں جسم سے اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ مارگریٹا اتنا نیچے اتر آئی کہ اس کے پاؤں عمودی صنوبروں کے پنکھوں سے الجھنے لگے تھے۔

اپنے عقب سے مارگریٹا کو ہوا کے دوش پر ایک عجیب سا شور سنائی دیا۔ اس شور میں دور سے کسی

راکٹ کی سیٹیوں کی مانند بتدریج زنانہ ہنسی کی آواز شامل ہوگئی۔ مارگریٹا نے پلٹ کر دیکھا تو ایک سیاہ ہیولا تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب یہ اڑتا ہوا سیاہ گولہ واضح ہوا تو مارگریٹا کی حیرت قابل دید تھی۔ ہواؤں میں برق رفتاری سے اڑتی ہوئی اس کی ملازمہ نتاشا لپکی چلی آرہی تھی۔ مارگریٹا نے اپنی رفتار مزید کم کردی اور نتاشا کے قریب پہنچ گئی۔

وہ بھی عریاں تھی اور ایک جسیم سور نما عفریت پر سوار تھی۔ اس عفریت نے اپنے سینے کے ساتھ ایک بیگ دبوچ رکھا تھا اور پچھلی ٹانگوں سے ہوا کو تھپیڑے لگا رہا تھا۔ چاند کی روشنی میں گاہے گاہے سور کی ناک سے الجھتی ہوئی ایک ٹائی پھڑ پھڑا رہی تھی اور سور کے سر پر جما ہیٹ بار بار اس کی آنکھوں پر گر رہا تھا۔ بغور دیکھنے پر مارگریٹا نے اس عفریت کو پہچان لیا۔ یہ اس کا ہمسایہ نکولائی تھا۔ مارگریٹا کی ہنسی کی کھل کھلاہٹ پورے جنگل پر پھیل گئی۔

نتاشا! کیا تم نے بھی کریم لگائی ہے؟ اور اس کو بھی لگائی ہے؟

''میری جان!'' نتاشا اپنی خوبصورت لفاظی سے صنوبر کے ساکت جنگل کو متحرک کرتے ہوئے بولی۔ ''میری ملکہ، میری فرانسیسی ملکہ، میں نے آپ کی بچی ہوئی کریم مل لی تھی۔ اور اس کی بالوں سے عاری کھوپڑی پر بھی تھوڑی سی لگا دی تھی''۔

''میری شہزادی'' کسی درباری کے انداز میں سور نما عفریت بھاری بھرکم آواز میں بولا۔

مارگریٹا کے برابر پہنچتے ہوئے نتاشا نے کہنا شروع کیا۔

''میری جان! میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے کریم استعمال کی تھی۔ آخر ہم بھی تو زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اڑنا چاہتے ہیں۔ میری ملکہ مجھے معاف کردیں۔ میں واپس نہیں جاؤں گی۔ کسی صورت واپس نہیں جاؤں گی۔ اوہ خدایا! یہ کیسا نشہ ہے! اس نے''۔ نتاشا انگلی سے عفریت کی گردن کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ ''اس نے میرا ہاتھ مانگا ہے''۔

''تم نے مجھے کیسے پکارا تھا؟ بولو نا دوبارہ؟'' وہ سور کے کان کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

''دیوی''۔ سور نے جواب دیا ''میں اتنی تیز رفتاری سے نہیں اڑ سکتا۔ مجھے ڈر ہے کہ میری انتہائی اہم دستاویزات بکھر جائیں گی۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔ مجھ پر رحم کیا جائے''۔

''تمہاری اور تمہارے دستاویزات کی ایسی کی تیسی''۔ نتاشا ہنستے ہوئے بولی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں نتاشا! کوئی سن لے گا''۔ سور نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

مارگریٹا کے ساتھ سائے کی طرح چپکی نتاشا نے اس کے چلے جانے کے بعد باغیچے والے گھر میں رونما ہونے والے واقعات کی تفصیل بتانا شروع کی۔ نتاشا نے اقرار کرلیا کہ اس نے مارگریٹا کی دی

ہوئی تمام اشیا پھینک دی تھیں اور خود اس نے برہنہ حالت میں سونے کی ڈبیا میں بچی کریم اپنے پورے جسم پر مل لی تھی۔ وہ بھی مارگریٹا کی مانند خوبصورت اور جوان ہو گئی تھی۔ نتاشا خوشی میں جھومتی ہوئی آئینے کے سامنے اپنے طلسماتی حسن سے محظوظ ہو رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور نکولائی اندر آ گھسا۔ وہ کچھ پریشان تھا اور ہاتھوں میں مارگریٹا کی قمیض اٹھائے ہوئے تھا۔ نتاشا کو دیکھ کر نکولائی ہونقوں کی طرح منہ کھولے رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور بولا۔ ''میں مارگریٹا کی قمیض بنفس نفیس خود لوٹانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

''یہ ملعون مجھے نہ جانے کیا کیا کہتا رہا''۔ نتاشا کسی چابی بھری گڑیا کی مانند خود ہی اپنی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جا رہی تھی۔ ''مجھے جانے کیا کچھ لالچ دے رہا تھا! ہزاروں روبل مجھ پر لٹانے کو تیار تھا۔ کہہ رہا تھا کہ بیوی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دے گا۔ کیوں؟'' وہ سور کا کان مروڑتے ہوئے بولی۔

''جھوٹ بول رہی ہوں کیا؟''

جواب میں سور فقط تھوتھنی ہلا کر رہ گیا۔

مارگریٹا کی خواب گاہ میں اپنے نخرے دکھاتی ہوئی نتاشا نے بچ رہنے والی تھوڑی سی کریم نکولائی کے سر پر بھی مل دی۔ یہ دیکھ کر وہ بے حد حیران ہو گئی کہ نکولائی کا چہرہ کسی جانور کی تھوتھنی جیسا ہو گیا ہے۔ اس کے پاؤں اور ہاتھوں کی جگہ کھر نمودار ہو گئے۔ آئینے میں اپنا حلیہ دیکھ کر نکولائی کی چیخ نکل گئی لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ اب کچھ تبدیل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ اپنی کمر پر کاٹھی باندھے روتا ہوا شہر سے بہت دور اڑا جا رہا تھا۔

''میں التجا کرتا ہوں کہ مجھے میری اصل حالت میں واپس کر دیا جائے''۔ سور کی شکل میں تبدیل ہونے والا نکولائی بھیک منگوں کی طرح گریہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں کسی بھی غیر قانونی، غیر اخلاقی ڈرامہ بازی کا حصہ نہیں بننا چاہتا۔ محترمہ مارگریٹا آپ کا فرض ہے کہ یہ بات اپنی ملازمہ کو بھی سمجھا دیں''۔

''اچھا تو میں ملازمہ ہوں؟ کیا کہا، ملازمہ ہوں میں؟'' نتاشا نکولائی کے دونوں کان کھینچتی ہوئی بولی۔ ''کچھ دیر پہلے تو میں دیوی تھی۔ تم نے مجھے دیوی کہہ کر ہی پکارا تھا نا؟''۔

''کہا تھا، دیوی ہی کہا تھا''۔ پتھروں پر شور مچاتے چشمے کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے نکولائی نہایت عاجزی سے بولا۔ اس دوران نکولائی کا پاؤں ٹکرانے سے ایک درخت کی ٹہنی ٹوٹ کر نیچے گر گئی۔

''اب مزہ آیا نا۔ دیوی، دیوی''۔ نتاشا فاتحانہ انداز میں ایک ہاتھ سے نکولائی کا کان کھینچتے اور دوسرے سے چاند کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''مارگریٹا! میری ملکہ، آپ میری سفارش کریں کہ مجھے ہمیشہ کے لئے اسی حالت میں چڑیل ہی رہنے دیا جائے۔ آپ کے کہنے پر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں طاقت ہے''۔

اچھا، ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔

''شکریہ، مہربانی، میری ملکہ عالیہ''۔ نتاشا خوشی اور غم کے ملے جلے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ساتھ ہی اس نے نکولائی کے پیٹ میں پاؤں سے ٹھوکر لگاتے ہوئے آواز اٹھائی۔ ''ہے۔ ہے۔ تیز اور تیز۔ اور تیز'' یہ حکم سن کر نکولائی نے اپنی رفتار اتنی بڑھا دی کہ ہوا پھر شور کرنے لگ گئی۔ چند لمحوں میں نتاشا دور ایک نقطے کی مانند نظر آنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نقطہ بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ہوا بھی دوبارہ پرسکون ہوگئی۔

مارگریٹا پہلے کی طرح دھیمی رفتار سے ہی اڑ رہی تھی۔ نیچے میلوں تک پھیلے غیر آباد میدان اور جنگل تھے۔ پرواز کے دوران مارگریٹا سوچ رہی تھی کہ اس وقت وہ ماسکو سے غالباً بہت دور نکل آئی ہے۔ اس کا برش اب صنوبر کے درختوں کے درمیان اڑ رہا تھا۔ اس اڑنتی کا مدہم سا سایہ پرواز کے دوران اس کے آگے آگے بھاگ رہا تھا۔ چاند اب مارگریٹا کی پشت پر چمک رہا تھا۔

مارگریٹا کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی منزل اب دور نہیں ہے۔ صنوبر کے درختوں کی تعداد کم ہوتی جارہی تھی اور پھر اچانک ایک گھاٹی نمودار ہوئی جس کے نچلے حصے کے بیچوں بیچ قدرے تاریکی میں دریا بہہ رہا تھا۔ جنگل سے دریا تک گھاٹی دھند کی چادر کی لپیٹ میں تھی۔ دریا کے دوسری جانب سطح زمین قدرے نیچی اور ہموار تھی۔ دریا کے اس کنارے کے ساتھ ساتھ درختوں کا چھوٹا سا جھنڈ تھا جس کے نیچے روشن ایک بہت بڑے الاؤ کے شعلے لپک رہے تھے۔ مارگریٹا کو محسوس ہوا کہ وہاں سے دل کو گدگدی کرنے والی شوخ موسیقی کی دھن فضا میں بکھر رہی ہے۔ اس سے آگے حد نظر تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔

مارگریٹا نے گھاٹی سے نیچے کی جانب چھلانگ لگا دی۔ اتنی دیر ہوا کے دوش پر پرواز کرنے کے بعد اسے پانی کو چھونے کی شدید خواہش تھی اور وہ کسی تیر کی مانند سر کے بل پانی میں کود گئی۔ جس جگہ وہ دریا میں کودی وہاں سے اٹھنے والی پانی کی بلند لہر غالباً چاند کو چھو گئی تھی۔ پانی خوش کن حد تک گرم تھا۔ مارگریٹا دریا کی تہہ کو چھونے کے بعد پانی کی سطح پر واپس نمودار ہوئی اور تن تنہا دریا میں تیراکی سے لطف اندوز ہونے لگ گئی۔ اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ کچھ دور درختوں کے جھنڈ کے قریب سے کسی کے پانی میں ہاتھ پاؤں چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہاں بھی کوئی پیراکی کر رہا تھا۔

مارگریٹا پانی سے باہر نکل آئی۔ گرم پانی میں نہانے کے بعد اس کا جسم نہایت آسودہ ہوگیا تھا۔ تھکن کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ وہ نم آلود گھاس پر ہولے ہولے تھرکنے لگ گئی۔ پھر یک لخت کچھ آوازیں سن کر وہ ساکت ہوگئی۔ پانی میں کسی کے تیرنے کی شڑاپ، شڑاپ کی آوازیں قریب آتی جارہی تھیں۔ جلد ہی ایک موٹا تازہ آدمی نہانا ترک کر کے دریا سے باہر نکل آیا۔ اس کے کیچڑ سے آلودہ پاؤں دیکھ کر یہ گمان

ہوتا تھا کہ جیسے اس نے سیاہ رنگ کے جوتے پہن رکھے ہیں۔ اس کی ہچکی اور بار بار لمبی پھونکیں مارنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے اچھی خاصی چڑھا رکھی ہے۔ کچھ دیر بعد اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ دریا کے پانی سے برانڈی کی بو آنے لگی تھی۔

مارگریتا پر نظر پڑتے ہی موٹا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا اور یکا یک خوشی سے چلا اٹھا۔

''ارے واہ! کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ میری جان! کلدینا۔ خدمت خلق کرنے والی سدا جوان بیوہ کلدینا''۔ وہ خاتون کو گلے لگانے کے لئے ہاتھ پھیلائے آگے بڑھ رہا تھا۔

مارگریتا اپنا ناموس و احترام سنبھالتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی اور اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔ ''کون سی کلدینا؟ کیسی بیوہ؟ بھاڑ میں جاؤ تم۔ ہوش کے ناخن لو اور غور سے دیکھو کہ تم کس سے ہمکلام ہو''۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے ایک دمدار، غلیظ، ناقابل اشاعت خطاب سے موٹے کو نواز دیا۔ اس گفتگو کے نتیجے میں موٹے کا نشہ کافی حد تک ہرن ہوگیا۔

اوئے ہوئے۔ وہ دھیرے سے بولا اور کانپ اٹھا۔ میں معذرت خواہ ہوں جہاں پناہ ملکہ عالیہ ''مارگو''! میں اقرار کرتا ہوں کہ پہچاننے میں غلطی ہوگئی۔ اس میں سارا قصور برانڈی کا ہے۔ اس کا خانہ خراب ہو!۔

موٹا ایک گھٹنے کے بل زمین پر بیٹھ گیا، درباری انداز میں آداب بجالایا اور روسی میں کچھ فرانسیسی کے الفاظ شامل کرتا ہوا پیرس میں اپنے ایک دوست کی خونی سانحے سے دوچار ہونے والی شادی کا قصہ بیان کرنے لگ گیا اور پھر اچانک برانڈی پر لعن طعن کرنے لگ پڑا۔ بعدازاں اپنی غلطی پر شدید نادم ہونے کا یقین دلانے لگ گیا۔

''تم سور کی اولاد!، پتلون ہی پہن لیتے''۔ مارگریتا نے اپنا لہجہ قدرے نرم کردیا۔

مارگریتا کا رویہ نرم ہوتا دیکھ کر موٹا کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا کہ فوری طور پر یہ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ برانڈی کے زیر اثر وہ دراصل یہاں سے بہت دور ایک دوسرے دریا کے کنارے اپنی پتلون بھول آیا ہے۔ لیکن ملکہ عالیہ کا حکم سر آنکھوں پر۔ وہ ابھی اڑتا ہوا واپس جائے گا اور پتلون پہننے کے بعد ہی ملکہ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوگا۔

موٹا احتراماً الٹے قدموں پیچھے کھسکنے لگ گیا اور پھسل کر واپس دریا میں جا گرا۔ تاہم گرتے ہوئے بھی اس کے شاہی حسن سے متاثر چہرے پر تعظیم اور وفاداری کے تاثرات واضح دکھائی دے رہے تھے۔

مارگریتا نے ہولے سے سیٹی بجائی اور برش پر سوار ہو کر دریا کے دوسرے کنارے جا پہنچی۔ وہاں

پہاڑی نما گھاٹی کا سایہ نہیں پڑ رہا تھا اور دریا کا پورا کنارہ چاندنی نے منور کر رکھا تھا۔

جونہی مارگریتا نے پاؤں سے گیلی گھاس کو چھوا موسیقی کی آواز مزید تیز ہوگئی اور الاؤ سے نکلنے والے شعلوں میں شدت آ گئی۔ نازک سرخ و سفید جھمکوں سے لدی جھاڑیوں تلے دو قطاروں میں غیر معمولی کشادہ منہ والے مینڈک بیٹھے تھے جو غبارے کی مانند اپنے گپھڑوں میں ہوا بھرتے ہوئے سامنے پڑی لکڑی کی ڈگڈیوں پر ایک استقبالیہ دھن بجا رہے تھے۔ چمکتے ہوئے جگنوان موسیقاروں کے سامنے رکھے سُروں کے کتابچوں کو روشن کئے ہوئے تھے۔ مینڈکوں کی قطاریں الاؤ سے پیدا ہونے والی روشنی میں بہت واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ یہ استقبالیہ دھن مارگریتا کے اعزاز میں بجائی جا رہی تھی۔ مارگریتا کو جو شاہانہ استقبال دیا گیا وہ یقیناً مثالی تھا۔ دریا پر معلق جل پریوں کا ایک طائفہ کورس کی شکل میں مارگریتا کے اعزاز میں سریلی دھنیں بجا رہا تھا۔ دھنوں کی بازگشت دریا کے دونوں جانب پھیلے سبزے کے غالیچوں پر دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ برہنہ چڑیلوں کی ایک لمبی قطار درختوں کے جھنڈ کے عقب سے نمودار ہوئی اور تعظیماً جھک کر شاہی محل کے درباریوں کی مانند آداب بجا لائیں۔ فضا میں ایک بھیڑ سے مشابہہ مخلوق نمودار ہوا۔ وہ مارگریتا کے سامنے دوزانوں ہوگیا اور اس کے ہاتھ کا بوسہ لینے کے بعد بولا۔

ملکہ عالیہ، ہمیں امید ہے کہ آپ کو دوران پرواز اور پیرا کی کوئی زحمت پیش نہیں آئی ہوگی۔ اتنے لمبے سفر کے بعد آپ یقیناً تھک گئی ہوں گی۔ اگر آپ کچھ دیر ستا لیں تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔

مارگریتا اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے لیٹ گئی۔ بھیڑ نما مخلوق نے مارگریتا کو شیمپین سے بھرا ایک جام پیش کیا جسے پینے کے بعد اس کا دل لذت آمیز حدت سے لبریز ہوگیا۔ نتاشا کے بارے میں استفسار پر اسے بتایا گیا کہ وہ دریا میں نہانے کے بعد اپنی سور نما سواری پر بیٹھ کر ماسکو روانہ ہوگئی ہے تاکہ وہاں اطلاع کر سکے کہ مارگریتا جلد پہنچنے والی ہے اور اسے مارگریتا کے لئے شاہی پوشاک تیار کرنے میں بھی مدد دینی ہے۔

اس مختصر دورانیئے میں جب مارگریتا درختوں کے جھنڈ تلے آرام کر رہی تھی ایک اور دل چسپ واقعہ رونما ہوا۔ فضا سے سیٹی کی آواز پیدا کرتا ہوا ایک سیاہ ہیولا، غالباً نشانہ چوک جانے پر زوردار آواز کے ساتھ دریا میں آ گرا۔ چند لمحوں بعد پانی سے وہی موٹا آدمی نمودار ہوا جو کچھ دیر پہلے دریا کے اس پار برانڈی کے نشے میں مارگریتا کو پہچاننے میں غلطی کر چکا تھا۔ وہ غالباً اس جگہ کا چکر لگا کر آیا تھا جہاں سے وہ دریا میں کودا تھا کیونکہ اب اس نے پتلون اور قمیض پہن رکھی تھی۔ برانڈی کے شوق نے اسے پھر ایک بار ذلیل کروا دیا کیونکہ وہ خشکی کی بجائے پانی میں اتر گیا تھا۔ اس بدمزگی کے باوجود موٹے کے چہرے پر مسکراہٹ برقرار تھی۔ اس واقعہ سے محظوظ ہوتی ہوئی مارگریتا نے اپنا ہاتھ بوسے کے لئے موٹے کی جانب بڑھا دیا۔

جونہی مارگریٹا درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلی کوچ کی تیاری شروع کردی گئی۔ جل پریاں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بعد چاندنی میں تحلیل ہوچکی تھیں۔ بھیڑ نما مخلوق نے مارگریٹا سے دریافت کیا کہ اس نے اپنا سفر کیسے طے کیا ہے۔ یہ معلوم پڑنے پر کہ ان کی ملکہ عالیہ صفائی والے برش پر بیٹھ کر پرواز کرتی رہی ہے، اس نے سخت افسوس کا اظہار کیا۔ ''اوہو! یہ تو آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ اس طرح سفر میں آپ کو بہت بے آرامی رہی ہوگی۔ اس نے زمین میں گڑی دو ٹہنیاں اٹھا کر انہیں کچھ اس طرح توڑا مروڑا کہ انہوں نے ٹیلیفون کی شکل اختیار کرلی جسے کان سے لگا کر اس نے ملکہ عالیہ کے لئے فوری طور پر گاڑی بھیجنے کو کہا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد اس کے مطالبے کی تکمیل کردی گئی۔ ایک بغیر چھت کے کھلی گاڑی رات کے سکوت کو اپنے بے کراں شور سے توڑتی ہوئی وہاں آ پہنچی۔ گاڑی میں روایتی ڈرائیور کی جگہ ایک لمبی چونچ والا سیاہ گدھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ سیاہ دھاریوں والے لمبے کوٹ اور سفید دستانوں میں ملبوس تھا۔ دریا کا ساحل ویران ہونا شروع ہوگیا۔ چڑیلوں کا ٹولہ بھی چاندنی میں تحلیل ہوگیا۔ الاؤ میں دہکنے والا ایندھن اپنی آخری چنگاریاں بکھیرتا ہوا چیخ رہا تھا اور اس پر سفید راکھ غالب آتی جارہی تھی۔ برانڈی کے رسیا موٹے آدمی اور بھیڑ نما مخلوق نے انتہائی مودبانہ انداز میں مارگریٹا کو گاڑی میں سوار کرایا اور وہ پچھلی آرام دہ سیٹ پر نیم دراز ہوگئی۔ گاڑی ہوا میں بلند ہوئی اور ایک ہی جست میں چاند کے قریب جا پہنچی۔ دریا اور جنگل نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ مارگریٹا کی سواری ماسکو کی جانب محو پرواز تھی۔

باب ۲۲

دیئے کی لو

بلند فضاؤں میں تیرتی ہوئی گاڑی کی مسلسل گوں گوں کی آواز اور چاندنی کی لذت آمیز حدت نے مارگریٹا کو لوری کی طرح مسحور کر دیا تھا۔ ہوا کے تھپیڑے اسے ہولے ہولے سہلا رہے تھے۔ نیم مدہوشی کے عالم میں اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا پورا بدن کسی الہڑ دوشیزہ کی طرح اینٹھ رہا تھا۔ اسے یہ سوچ کر افسوس ہو رہا تھا کہ وہ غالباً اب کبھی بھی اس نامانوس جگہ پر واپس نہیں آ سکے گی اور اپنے اعزاز میں دیئے گئے طلسماتی استقبالیہ سے دوبارہ کبھی محظوظ نہیں ہو سکے گی۔

آج کے شعبدوں اور جادو بھرے کرشموں کو دیکھ کر مارگریٹا کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے مدعو کرنے والا میزبان کون ہے۔ لیکن اسے اب کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس امید نے کہ وہاں اس کی تمام خوشیاں اسے لوٹا دی جائیں گی اسے بے خوف کر دیا تھا۔

مارگریٹا کو سوچوں کے تانوں بانوں میں کچھ زیادہ دیر الجھنا نہیں پڑا۔ یا تو گاڑی کا ڈرائیور بہت مشاق تھا یا پھر گاڑی کچھ ایسی خوبیوں کی مالک تھی کہ مارگریٹا کو بہت جلد ماسکو کی ٹمٹماتی روشنیوں کا سمندر دکھائی دینے لگ گیا تھا۔ پرواز کے دوران سیاہ پرندہ ڈرائیور نے گاڑی کا اگلا دایاں پہیہ کھول کر اپنے پاس رکھ لیا اور بڑی مہارت کے ساتھ گاڑی کو ایک ویران قبرستان میں اتار دیا۔ مارگریٹا کو ایک قبر کے نزدیک اتارنے کے بعد اس نے گاڑی کو دوبارہ اسٹارٹ کیا اور قبرستان کے عقب میں ایک دیوار میں اس زور سے ٹکرا دیا کہ گاڑی کے پرخچے اڑ گئے اور خود واپس قبرستان پہنچ کر تعظیماً مارگریٹا کے آگے جھکا اور گاڑی کے پہیے پر بیٹھ کر فضا میں پرواز کر گیا۔

ایک قبر کے تعویذ کے عقب سے سیاہ لمبا کوٹ پہنے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے منہ سے باہر جھانکتا ہوا بدنما دانت چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ مارگریٹا اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ عزازیل تھا۔ اس نے اشارے سے مارگریٹا کو برش پر سوار ہونے کا کہا اور خود بھی ایک لمبے ڈنڈے والے بیلچے پر سوار ہو گیا۔

دونوں فضا میں بلند ہوئے اور چند لمحوں بعد ماسکو کے وسط میں کوئی آواز پیدا کئے بغیر عمارت نمبر ۳۰۲ کے سامنے اتر گئے۔ جب وہ دونوں ہم سفر صفائی والا برش اور بیلچہ بغلوں میں دبائے گلی سے گزر رہے تھے تو انہیں سیاہ ٹوپی اور ربڑ کے لمبے جوتے پہنے ایک گٹھے جسم والا شخص نظر آیا۔ جو غالباً وہاں کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ مارگریتا اور عزازیل کے ہولے ہولے قدم اٹھانے کے باوجود اس آدمی نے ان کی آہٹ سن لی اور سنسان گلی میں کسی کو نہ پاکر وہ مضطرب ہو گیا۔

عمارت کے دروازے کے قریب بھی ایک آدمی کھڑا تھا۔ پہلے شخص سے بہت حد تک مشابہہ یہ آدمی بھی سنسان گلی میں قدموں کی آہٹ سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ جب دروازہ کھلا اور بند ہوا تو وہ بھی جلدی سے اندر کو لپکا لیکن کسی کو وہاں نہ پاکر شانے اچکاتا ہوا واپس گلی میں آ گیا۔

تیسری منزل پر سیڑھیوں کے نزدیک پہلے دو آدمیوں سے مماثلت رکھتا ہوا ایک تیسرا شخص بنچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے نزدیک سے گزرتے وقت مارگریتا کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کھانسی کی آواز سن کر یہ شخص ایسے اچھلا کہ جیسے کسی نے اسے سوئی چبھو دی ہے۔ آس پاس کسی کو نہ پاکر وہ سیڑھیوں کے جنگلے سے نیچے جھانکنے لگ گیا۔ عزازیل اور مارگریتا اس دوران فلیٹ نمبر پچاس کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ عزازیل نے گھنٹی بجانے کی بجائے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھولنے کے بعد دونوں خاموشی سے فلیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔

فلیٹ میں اندھیرے کا راج تھا۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مارگریتا نے ٹھوکر کھائی اور سنبھلنے کے لئے غیر ارادی طور پر عزازیل کو آستین سے تھام لیا۔ دور اندھیرے میں ایک ٹمٹماتی روشنی دکھائی دی اور بتدریج لالٹین کی یہ مدھم لو نزدیک آنا شروع ہو گئی۔ عزازیل نے اس دوران مارگریتا کی بغل سے طلسماتی برش اچک لیا جو بغیر کوئی آواز پیدا کیئے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ مارگریتا اور عزازیل چند لمحوں کے بعد ایک کشادہ زینے پر اوپر کی جانب چڑھ رہے تھے۔ مارگریتا کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ سیڑھیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ وہ حیران تھی کہ ماسکو کے ایک عام سے فلیٹ میں اتنی سیڑھیاں کہاں سے آ گئیں۔ بالآخر چڑھائی کا یہ طویل سلسلہ ختم ہوا اور مارگریتا نے خود کو ایک ہموار جگہ پر کھڑا پایا۔ روشنی کی لو اب بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ لالٹین کی لرزتی لو میں مارگریتا کو قدرے سانولا ایک لمبوترا مردانہ چہرہ دکھائی دیا۔ یہی شخص ایک ہاتھ میں لالٹین اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ بدقسمت لوگ جو ان دنوں اس شیطانی فلیٹ میں مہمان داری کا شکار ہو چکے تھے اگر اس وقت موجود ہوتے تو لالٹین کی مدھم روشنی میں بھی اس شخص کو فوراً پہچان لیتے۔ یہ وہی منحوس آدمی تھا جو خود کو ترجمان ظاہر کرتا تھا اور اپنا نام فاگوٹ بتاتا تھا۔

ہاں یہ بات درست ہے کہ فاگوٹ کی ظاہری حالت بہت حد تک تبدیل ہو چکی تھی۔ اس نے وہ

پرانا دھاری دار کوٹ جسے عرصہ دراز سے کوڑے کے ڈھیر پر ہونا چاہیے تھا اب اتار پھینکا تھا۔ اور اب وہ ایک لمبے سیاہ رنگ کے کوٹ میں ملبوس تھا۔ ویسے اس کوٹ کی حالت بھی کوئی خاص اچھی نہیں تھی۔ اس کے شرم سے عاری چہرے پر نمایاں دکھائی دینے والے غیر اخلاقی تاثرات اس کی اندرونی شیطانیت کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے۔

ترجمان۔ کالے علم کا ماہر۔ شعبدہ باز۔ یا جو کوئی بھی وہ تھا، مارگریتا کے سامنے تعظیماً جھکا اور لالٹین ہوا میں گھماتے ہوئے اس نے مارگریتا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ عزازیل وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

''حیرت انگیز حد تک عجیب ہے آج کی شام''۔ مارگریتا سوچ رہی تھی۔ حیرانگی کی بات یہ ہے کہ ان کی بجلی کہاں گئی ہے؟ اور ایک عام سے فلیٹ میں اتنی کشادگی کہاں سے آ گئی ہے؟ سیدھی سی بات ہے۔ یہ ناممکن ہے۔

لالٹین کی روشنی انتہائی مدھم ہونے کے باوجود مارگریتا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک بے شمار ستونوں سے آراستہ خالی ہال میں پہنچ چکی ہے۔

ایک دیوان کے قریب پہنچ کر فاگوٹ رک گیا۔ اس نے لالٹین ایک میز پر سجانے کے بعد مارگریتا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک سٹول پر کسی مصور کے ماڈل کی مانند اکڑوں بیٹھ گیا۔

آپ کی اجازت سے میں اپنا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ خادم کو فاگوٹ کہتے ہیں۔ آپ حیران ہیں کہ بجلی کہاں گئی۔ بجٹ۔ محترمہ آپ یہی سوچ رہی تھیں نا؟ نہیں محترمہ بالکل نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اگر دروغ گوئی سے کام لوں تو بے شک میری گردن اسی سٹول پر رکھ کر کاٹ دی جائے۔ اس کام کے لئے آپ کو جلاد بھی یہیں مل جائے گا۔

اب سے کچھ ہی دیر میں کم از کم تین جلاد آپ کے گھٹنے چھونے کے لئے حاضر ہونے والے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے بڑے صاحب کو بجلی کی روشنی سے سخت نفرت ہے۔ یہ روشنیاں آج کی محفل کے اختتام پذیر ہونے سے کچھ دیر قبل جلائی جائیں گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت یہ تمام ماحول اس طرح منور ہو جائے گا کہ آپ آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ ویسے میرے خیال میں روشنی کم ہی رہے تو بہتر ہے۔

کچھ دیر قبل مکروہ شکل دکھائی دینے والا فاگوٹ اب مارگریتا کو بھلا لگنے لگا تھا۔ اس کی لفاظی نے مارگریتا کے تحفظات کو بہت حد تک دور کر دیا تھا۔ ''نہیں''۔ مارگریتا نے جواب میں کہا'' مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ''۔ وہ ہاتھ سے ہال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس مختصر سے فلیٹ میں اتنا کشادہ ہال کیسے بن گیا؟''۔

یہ سوال سن کر فاگوٹ کو بہت تسکین ملی۔ وہ کچھ اس طرح مسکرایا کہ اس کی بھنوؤں کے درمیان ایک کتھی ہوئی مثلث بن گئی۔

''یہ تو بہت سادہ سی بات ہے''۔اس نے جواب دیا'' جسے پانچویں اکائی کا علم ہو اس کے لئے معمولی سی جگہ کو کشادہ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بلکہ میری قابل احترام خاتون! میں تو یہ عرض کروں گا کہ وہ کس حد تک وسعت کر سکتے ہیں, شائید مجھے بھی اس کا اندازہ نہیں ہے۔ ویسے میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جنہیں پانچویں اکائی کا سرے سے علم نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے رہائشی رقبے کو وسیع کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مثلاً ایک صاحب کو شہر میں تین کمروں کا فلیٹ الاٹ کیا گیا۔ اس نے ذہانت سے کام لے کر اس فلیٹ کو چار کمروں میں تبدیل کر لیا۔ سب سے بڑے کمرے کے درمیان اس نے پردہ کھینچ کر اس کے دو کمرے بنا لئے۔ بعد ازاں اس نے یہ چار کمروں کے فلیٹ کا دو مختلف مقامات پر واقع دو کمروں والے اور تین کمروں والے دو فلیٹوں سے تبادلہ کر لیا۔ پھر اس نے تین کمروں والے فلیٹ کو دو دو کمروں کے دو مختلف فلیٹوں سے تبدیل کرالیا۔ اب آپ حساب لگائیں تو وہ چھ کمروں کا مالک بن گیا تھا۔ اور وہ اپنا اگلا معرکہ مارنے (یعنی اپنے چھ کمروں کو جو کہ شہر کے مختلف علاقوں میں واقع تھے ایک پانچ کمروں والے فلیٹ سے تبدیل کرنے کا ارادہ کر رہا تھا) جا ہی رہا تھا کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر جو کسی بھی صورت اس کے بس میں نہیں تھیں اسے یہ معرکہ آرائی ترک کرنی پڑ گئی۔ ممکن ہے کہ اس کے پاس اب بھی ایک کمرہ ہو لیکن وہ کمرہ یقیناً ماسکو میں نہیں ہے اور غالباً اس کمرے کا دروازہ اس کی مرضی سے نہیں کھلتا''۔

کیوں جناب! ہے نا دلچسپ کہانی۔اب آپ کو پانچویں اکائی کی بھی سمجھ آ گئی ہوگی۔

مارگریتا کو پانچویں اکائی کے متعلق ذرہ برابر سمجھ نہیں آئی تھی تاہم وہ فاگوٹ کی تین کمروں کو چھ کمرے بنا لینے کی کہانی سے بہت محظوظ ہوئی تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''لیکن اب اصل کام کی بات کریں''۔ فاگوٹ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔''مارگریتا آپ کافی عقلمند خاتون ہیں۔ آپ کو بخوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ ہمارا مالک کون ہے''۔

مارگریتا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔اس نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

''ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہمارا کوئی پس پردہ راز نہیں ہے۔ نہ ہی ہم اپنے دوستوں سے کچھ چھپانے کے قائل ہیں۔ ہمارے مالک ہر سال ایک بہت بڑا تہوار مناتے ہیں۔ ہم اسے موسم بہار میں پورے چاند کا تہوار کہتے ہیں یا بسا اوقات سو بادشاہوں کا تہوار بھی کہہ لیتے ہیں۔ ہمارے اس تہوار پر کتنا بڑا ہجوم ہوتا ہے میں کیا بتاؤں آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا۔ ہمارے مالک غیر شادی شدہ ہیں اور آپ تو بخوبی جانتی ہیں کہ گھر میں جب مہمانوں کی آمد ہو تو ایک خاتون۔ گھر کی مالکہ۔ کی موجودگی بہت ضروری ہے''۔

مارگریٹا بہت توجہ سے فاگوٹ کے ایک ایک لفظ کو سن رہی تھی جبکہ اس کا دل صرف ایک ہی خبر سننے کو تڑپ رہا تھا۔ اپنی خوشیوں کے لوٹ آنے کی امید نے اس کے دل میں ایک جوت روشن کر رکھی تھی۔

''ایک روایت قائم ہو چکی ہے''۔ فاگوٹ اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔ ''تہوار کے دن گھر کی مالکہ کا نام ہمیشہ مارگریٹا ہوتا ہے۔ اور اس کی جائے پیدائش لازمی طور پر اسی شہر کی ہونی چاہیے جہاں یہ تہوار منایا جا رہا ہو۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہی ہیں ہم تو ہر وقت دنیا کی گردش میں رہتے ہیں۔ آج کل ہمارا ڈیرہ آپ کے شہر میں ہے۔ ماسکو میں ہم نے مارگریٹا نامی ایک سو اکیس خواتین ڈھونڈ نکالی تھیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی ہمارے معیار پر پوری نہیں اتر سکی اور بالآخر قسمت آپ پر مہربان ہوئی۔۔۔۔''

فاگوٹ مسکرایا اور اپنا توازن ایک ٹانگ سے دوسری پر منتقل کرتے ہوئے معنی خیز نظروں سے مارگریٹا کی جانب دیکھنے لگ گیا۔ مارگریٹا کا دل ایک مرتبہ پھر اچھل کر حلق کو آ گیا۔

قصہ مختصر۔۔۔۔ فاگوٹ ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ اس ذمے داری سے انکار نہیں کریں گی''۔

''نہیں کروں گی''۔ پر اعتماد لہجے میں مارگریٹا نے جواب دیا۔

''زندہ باد''۔ فاگوٹ نے نعرہ مارا۔ اس نے لالٹین اٹھالی اور بولا۔

''براہ کرم میرے پیچھے پیچھے تشریف لے آئیں''۔

وہ ستونوں کے درمیان گذرتے ہوئے ایک دوسرے ہال میں جا پہنچے جس کی فضا لیموں کی تیز خوشبو سے معطر تھی۔ یہاں کچھ عجیب وغریب سی آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ اچانک مارگریٹا کا سر ہوا میں معلق کسی چیز سے ٹکرا گیا اور وہ سہم گئی۔

''ڈریئے نہیں''۔ خوشدلی سے مسکراتے ہوئے فاگوٹ نے مارگریٹا کا ہاتھ تھام لیا اور بولا ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تہوار کی خوشی میں بیگموت کے بکھیڑے ہیں جو جابجا اڑتے پھر رہے ہیں۔ ویسے میرا آپ کے لئے مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ کہیں بھی، اور کسی سے بھی خوف زدہ نہ ہوں۔ کیونکہ ڈر جانے والا کبھی بھی دانش مند نہیں بن سکتا۔ میں آپ کو قبل از وقت بتا دینا چاہتا ہوں کہ تہوار کی رسومات کا انعقاد انتہائی پر ہجوم اور ہنگامہ خیز ہوگا۔ ہمیں ایسے ایسے چہرے دیکھنے کو ملیں گے جو اپنے وقت میں دور دور تک مشہور تھے اور دوسرے انسانوں پر ان کی حکومت وسیع وعریض رقبے پر محیط تھی۔ لیکن جب آپ ان کی طاقت اور ان کے اختیارات کا موازنہ اُس ذات سے کریں گی جس کے خادموں میں سے ایک میں ہوں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان حضرات کی حیثیت بے بس چیونٹیوں جیسی ہے۔ یہ بات سوچ سوچ کر ہنسی آتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ اور ہاں! آپ کی رگوں میں بھی شاہی خون دوڑ رہا ہے''۔

کیا مطلب؟ کیسا شاہی خون؟ مارگریتا نے حیران ہوکر پوچھا۔

آہ، ملکہ، ملکہ۔ فاگوٹ مزے لیتا ہوا بولا۔ ''خون کا سوال دنیا میں سب سے پیچیدہ سوال ہے۔ اگر کچھ پردادیوں سے، اور بالخصوص ان پردادیوں سے جو اپنی زندگی میں سمجھوتہ بازی کے لئے مشہور رہی ہوں، یہ سوال پوچھا جائے تو نجانے کیسے کیسے راز افشا ہوجائیں۔ بہت سے رشتے ایسے ہیں جو سرحدوں اور نسلوں کی قید سے آزاد ہیں۔ ایک چھوٹا سا اشارہ دیتا ہوں۔ فرانس کی ایک ملکہ جس کا تعلق سولہویں صدی سے تھا یقیناً یہ جان کر حیران ہوجائے گی کہ اس کی ایک، پڑ، پڑ، پڑپوتی کا ہاتھ تھامے، یہ خادم''۔ وہ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اس وقت تہوار کی رسومات میں شامل ہونے کے لئے ماسکو شہر کے اس ہال میں چل رہا ہے۔۔ لیں جناب، ہماری منزل آ گئی''۔

فاگوٹ نے لالٹین کے شعلے کو گل کردیا اور لالٹین اس کے ہاتھوں سے غائب ہوگئی۔ مارگریتا کو ایک دروازے کے نیچے سے رینگتی ہوئی روشنی کی ایک باریک لکیر نظر آئی۔ فاگوٹ نے اسی دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ اس لمحے مارگریتا کچھ اس طرح خوف زدہ ہوگئی کہ اس کے دانت بجنے لگ گئے اور کمر میں رعشے کی لہر دوڑ گئی۔ دروازہ کھل گیا۔ اس مختصر سے کمرے میں لکڑی کا ایک قدیم طرز کا بیڈ رکھا تھا جس پر سلوٹوں اور گرد سے اٹی میلی کچیلی چادر اور پھٹا پرانا تکیہ پڑا تھا۔ بیڈ کے دائیں جانب لکڑی کی ایک میز پر کسی پرندے کے پنجے سے مشابہہ ایک انتہائی خوبصورت شمع دان پڑا تھا جس کے سونے سے مزین سات پیندوں میں موم بتیاں روشن تھیں۔ اس کے علاوہ میز پر ایک شطرنج رکھی تھی جس کے مہرے ان کے خالق فن کار کی بے مثل کاریگری کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ قالین کے چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک سٹول رکھا تھا۔ کمرے کے کونے میں پڑی ایک دوسری میز پر سانپ کی شکل سے مشابہہ موم بتی والا شمع دان رکھا تھا۔ کمرے میں سیلے پن اور لکڑی کے برادے کی ملی جلی بو میں سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ موم بتیوں کی روشنی نے فرش پر لکیروں کا ایک جال بنا رکھا تھا۔

کمرے میں موجود لوگوں میں سے عزازیل کو مارگریتا نے فوراً پہچان لیا۔ وہ اب ایک لمبا پروقار کوٹ پہنے بیڈ کی ٹیک کے پاس کھڑا تھا۔ عزازیل کا حلیہ یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائے پہلے والے بدمعاشوں جیسے تاثرات بالکل غائب ہو گئے تھے۔ اس نے نہایت مودبانہ انداز میں مارگریتا کو خوش آمدید کہا۔

وہی برہنہ چڑیل جو ورائٹی تھیٹر کے کینٹین انچارج کو موت کی حد تک خوفزدہ کر چکی تھی اور جو خود ورائٹی تھیٹر والے کالے علم کے شو کے بعد مرغ کی اذان سن کر خوفزدہ ہوگئی تھی، بیڈ کے نزدیک قالین پر بیٹھی ایک دیگچی میں چمچ چلا رہی تھی۔ دیگچی سے گندھک کے بخارات خارج ہو رہے تھے۔

ان کے علاوہ میز کے پاس رکھے ایک اونچے سٹول پر اپنے پنجے میں شطرنج کا گھوڑا تھامے سیاہ رنگ کا جسیم بلا بیٹھا تھا۔

عزازیل کی پیروی کرتے ہوئے لباس سے عاری چڑیل نے بھی جھک کر مارگریتا کو خوش آمدید کہا۔ بلا بھی جست لگا کر سٹول سے نیچے اتر آیا اور پچھلے پنجوں کے بل کھڑا ہو کر کسی دربان کی طرح تعظیم بجا لایا۔ اس دوران شطرنج کا گھوڑا اس کے پنجے سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا جس کی تلاش میں وہ بیڈ کے نیچے گھس گیا۔

موم بتیوں کی روشنی میں نظر آنے والے لرزتے ہوئے سائیوں نے خوف سے کانپتی مارگریتا کے اوسان مزید خطا کر دیئے۔ اس کی تمام توجہ بستر پر براجمان اس ہستی پر مرکوز تھی جسے کچھ عرصہ قبل ہمارا شاعر ایوان یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ شیطان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اب وہی ''بے وجود'' بستر پر بیٹھا تھا۔ دو آنکھیں مارگریتا کے چہرے پر مسلسل ٹکٹکی باندھے ہوئے تھیں۔۔ سنہری شعلہ اگلتی دائیں آنکھ جو کسی بھی روح کو اس کی آخری حد تک چیر سکتی تھی۔ اور بائیں۔ کسی بھی رنگ سے عاری، کسی بے کراں گہری کھائی کے دہانے کی مانند سیاہ۔ ولاند کا چہرہ قدرے ٹیڑھے پن کا شکار تھا۔ اس کے دہانے کا دایاں گوشہ نیچے کو لٹکا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر تیکھی متوازی بھنوؤں کے درمیان دو عمودی سلوٹیں کسی کمان پر چڑھے تیر کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ اس کے چہرے کی رنگت سے یوں لگتا تھا کہ جیسے سورج صدیوں تک اس پر اپنی آگ برساتا رہا ہے۔

ولاند نے ایک لمبی میلی کچیلی فراک نما قمیض پہن رکھی تھی۔ جس کا دایاں بازو اس نے کہنی سے اوپر چڑھا رکھا تھا۔ ایک پاؤں اس نے قریب پڑے سٹول پر جما رکھا تھا اور دوسری ٹانگ اس نے اپنے نیچے اکٹھی کر رکھی تھی۔ برہنہ دوشیزہ بھاپ اگلتی مرہم سے ولاند کے گھٹنے پر مالش کر رہی تھی۔

ولاند کے بالوں سے عاری سینے پر ایک سونے کی زنجیر میں پرویا سیاہ رنگ کا پتھر لٹک رہا تھا۔ پتھر پر کسی نامانوس زبان میں ایک عبارت کندہ تھی۔ ولاند کے بستر سے ملحقہ ایک آہنی سٹینڈ پر دنیا کا گلوب پڑا تھا جو صرف ایک جانب سے روشن تھا۔

چند لمحوں کے لئے خاموشی چھائی رہی۔

''یہ میرا مشاہدہ کر رہا ہے''۔ اپنی قوت ارادی سے ٹانگوں کی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے مارگریتا سوچ رہی تھی۔

بالآخر ولاند کی روشن آنکھ میں چنگاریوں نے شدت پکڑ لی۔ وہ چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں، ملکہ عالیہ، اور اس غیر رسمی ماحول کے لئے معذرت خواہ ہوں''۔
ولاند کی آواز اتنی بھاری تھی کہ اس پر خراٹوں کا گمان ہوتا تھا۔
اس نے بستر پر پڑی ایک چھڑی اٹھائی اور اسے بیڈ کے نیچے ادھر ادھر ہلاتے ہوئے بولا۔''نکلو باہر۔ بازی معطل کی جاتی ہے۔ ہماری مہمان آ گئی ہیں''۔
''بالکل نہیں۔ کسی صورت نہیں''۔ فاگوٹ نے عالم اضطراب میں مارگریٹا کے کان میں ہولے سے کہا۔
''نہیں کسی صورت نہیں''۔ مارگریٹا نے بولنا شروع کیا۔
''میرے آقا کہہ کر مخاطب کرو''۔ فاگوٹ نے لقمہ دیا۔
''نہیں، کسی صورت نہیں، میرے آقا''۔ اپنی غلطی کی تصحیح کرتے ہوئے مارگریٹا مسکرا کر بولی۔
''بازی کو جاری رکھیئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر شطرنج کے موضوع پر چھپنے والے رسالوں کو اس بازی کی بھنک پڑ جائے تو وہ اس پر مضامین لکھنے کے لئے کوئی بھی قیمت چکانے پر تیار ہو جائیں گے''۔
عزازیل نے سر کی جنبش کے ساتھ مارگریٹا کی تائید کی۔ ولاند بغور مارگریٹا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خود سے ہمکلام ہوتے ہوئے بولا۔'' صحیح کہہ رہا تھا فاگوٹ! انسانوں میں خوبیاں کیسے نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں۔ اوہ یہ خون!''اس نے ہاتھ بڑھا کر مارگریٹا کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ مارگریٹا کے برہنہ پیروں تلے سے فرش غائب ہو گیا اور وہ ولاند کے پاس پہنچ گئی۔ ولاند نے کسی پتھر کی طرح بھاری مگر آگ کی مانند دہکتا اپنا ہاتھ مارگریٹا کے شانے پر رکھتے ہوئے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔
''آپ تو میری توقع سے بھی زیادہ مہربان ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اب کسی تکلف اور حجاب کی ضرورت نہیں ہے''۔ وہ بیڈ کی ایک جانب جھکتے ہوئے چلا کر بولا۔
''تم اور کتنی دیر بیڈ کے نیچے اچھل کود کرو گے؟ نکلو باہر، ڈرامے باز بہروپئے!''
''گھوڑا نہیں مل رہا''۔ بیڈ کے نیچے سے مکر کرتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں بلے نے جواب دیا۔'' مجھے لگتا ہے کہ گھوڑا کہیں کھسک گیا ہے اور اس کی جگہ ایک مینڈک پھدکتا پھر رہا ہے''۔
''تمہیں اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ یہاں تھوڑی دیر میں میلہ لگنے والا ہے۔ بیڈ کے نیچے کوئی مینڈک وینڈک نہیں ہے۔ اس طرح کے شعبدے تم ورائٹی تھیٹر کے لئے رہنے دو۔ اگر تم اسی لمحے باہر نہیں نکلے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ تم نے ہاتھ کھڑے کر دیئے ہیں۔ خبیث، دھوکے باز!!''
''نہیں۔ میرے آقا۔۔۔۔ بالکل نہیں''۔ چیختا ہوا بلا فوراً بیڈ کے نیچے سے برآمد ہو گیا۔ اس نے بائیں پنجے میں شطرنج کا گھوڑا تھام رکھا تھا۔

میرا آپ کو مشورہ ہے! کہتے ہوئے ولاند رک گیا اور دوبارہ یوں گویا ہوا۔ ''کیا کروں میں اس چھوٹے سے مسخرے کا؟ ذرا دیکھو بیڈ کے نیچے گھس کر اس نے اپنا کیا حلیہ بنالیا ہے''۔

اس دوران گرد میں اٹا بلا مارگریٹا کو ادب کے ساتھ جھک جھک کر آداب بجالا رہا تھا۔ اپنے گلے میں اس نے پارٹیوں والی مخصوص سفید رنگ کی ٹائی سجا رکھی تھی۔ اس کے سینے پر گلابی رنگ کی زنانہ دوربین لٹک رہی تھی جبکہ اس کی مونچھوں کا رنگ سنہری ہو چکا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' ولاند بلند آواز میں بولا ''مونچھیں سنہری کیوں رنگ لی ہیں؟ اور یہ ٹائی، تمہیں اس کی کیا ضرورت تھی؟ پتلون تک تو تم نے پہنی نہیں!''

''پتلون بلے کے لئے غیر ضروری ہے، میرے آقا''۔ بلے نے نہایت باوقار انداز میں جواب دیا۔ ''کیا آپ نے کبھی آج جیسی بلند پایہ محفل میں کسی عزت دار شخص کو ٹائی کے بغیر دیکھا ہے؟ اب آپ مجھے لمبے بوٹ پہننے کا نہ کہہ دیجئے گا۔ اس طرح کی چیزیں تو بلے صرف کارٹون فلموں میں پہنتے ہیں، میرے آقا! اور معاف کیجئے گا میں اتنے بڑے مجمعے میں مذاق کا نشانہ نہیں بننا چاہتا۔ ہر کوئی اپنی حیثیت کے مطابق''۔ وہ دوربین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''فیشن کرتا ہے''۔

''نہ تو مونچھیں؟''

''میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے''۔ بلا بظاہر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''آج کے دن اگر فاگوٹ اور عزازیل اپنے چہروں پر سفید پاؤڈر کا چھڑکاؤ کر سکتے ہیں تو معاف کیجئے گا۔ میرے سنہری پاؤڈر میں بھلا کون سی خرابی ہے؟ ہاں، اگر میں شیو کرا لیتا تو اور بات تھی۔ شیو بنوا کر تو بلا واقعی کارٹون لگے گا۔ یہ بات میں ہزار بار ماننے کو تیار ہوں۔ ویسے مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ میرے ساتھ امتیازی برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ میرے سامنے اب انتہائی سنجیدہ سوال کھڑا ہو گیا ہے کہ مجھے آج کی تقریب میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں؟ کیا حکم ہے میرے آقا!''

یہ کہنے کے بعد بلا کچھ اس طرح منہ پھلا کر بیٹھ گیا کہ جیسے ابھی غبارے کی مانند پھٹ جائے گا۔

''اوہ، رنگ باز۔ رنگ باز''۔ سر کو دائیں سے بائیں ہلاتا ہوا ولاند بولا۔

''جب کبھی یہ بازی ہارنے پر آتا ہے تو اسی طرح تماشہ کھڑا کر دیتا ہے۔ چلو فوراً بیٹھ جاؤ اور یہ لفاظی بند کرو''۔

''جناب میں بیٹھ جاتا ہوں''۔ بلا سٹول پر ٹکتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آپ کی اس بات سے میں بالکل متفق نہیں ہوں۔ یہ خادم ایک نہایت ہی نستعلیق شخصیت ہے۔ اور جسے آپ لفاظی کہہ رہے ہیں یہ صدیوں سے حاصل کردہ علم کے خزانے کا نچوڑ ہے۔ آج اگر دانش مندی کا جدامجد ارسطو یہاں موجود ہوتا تو

وہ میری اس بات کی ضرور تصدیق کرتا"۔

"اچھا تو یہ لو تمہارے بادشاہ کو "شہ" دے رہا ہوں"۔

"بصد شوق، بصد شوق"۔ بلا دوربین آنکھوں پر سجائے شطرنج کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو"۔ وولانڈ مارگریتا سے مخاطب ہوا۔ "محترمہ، میرے حواریوں سے ملیئے۔ یہ باتونی حضرت ہیں۔ بلا بیگیموت۔ یہ حُسن کا پیکر عزازیل ہے اور فاگوٹ سے تو آپ پہلے ہی متعارف ہو چکی ہیں۔ اور یہ ہے میری ملازمہ "گیلا"۔ انتہائی فرمانبردار، اور اشاروں کی بات سمجھنے والی دوشیزہ۔ دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جو یہ نہ کر سکے"۔

خوبرو دوشیزہ نے مسکراتے ہوئے مارگریتا کی جانب دیکھا۔ اس دوران وہ وولانڈ کے گھٹنے پر مرہم کا لیپ جاری رکھے ہوئے تھی۔

"بس یہی چند لوگ ہیں جو میرے آس پاس رہتے ہیں۔ سب ایک دوسرے سے مختلف اور مکر وفریب سے عاری ہیں"۔ اتنا کہنے کے بعد وولانڈ خاموش ہو گیا اور قریب پڑے گلوب کو ہاتھ سے گھمانے لگ گیا۔ یہ گلوب ایسی مہارت سے تیار کیا گیا تھا کہ سمندروں کے پانی کی لہریں حقیقتاً موجیں مارتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ گلوب کے بالائی حصے میں جمی برف کو دیکھ کر جسم میں سردی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔

اس دوران شطرنج کے خانوں میں ایک عجب حالت جنگ کا سماں تھا۔ سفید ٹوپی والا بادشاہ اپنے خانے میں کھڑا مایوسی اور بے بسی کے عالم میں سٹپٹا رہا تھا۔ بادشاہ سے دو خانے آگے کھڑے دو پیادے حیرانگی کے عالم میں اپنے سامنے کھڑے فیلے کو دیکھ رہے تھے جس پر سوار ایک فوجی وردی میں ملبوس افسر تلوار سے آگے بڑھنے کا اشارہ دے رہا تھا اور اس کے بالمقابل وولانڈ کے دو گھوڑے اپنے اگلے پاؤں بلند کیئے ہر قسم کے حملے کا سامنا کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ مارگریتا شطرنج کے ان زندہ مہروں کو دیکھ کر بہت حیران اور محظوظ ہو رہی تھی۔ بلے نے دوربین آنکھوں سے ہٹانے کے بعد اپنے بادشاہ کی کمر میں ہولے سے کوئی چیز چبھوئی جس کے نتیجے میں بادشاہ نے خوفزدہ ہو کر اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

"حالات تو بہت بگڑ چکے ہیں، میرے محترم بیگیموت"۔ زہر آلود لہجے میں فاگوٹ دھیرے سے بولا۔

"حالات کٹھن ضرور ہیں لیکن ناامیدی والی کوئی بات نہیں ہے"۔ بلے نے جواب دیا۔ "مجھے پورا یقین ہے کہ آخری فتح میری ہی ہوگی۔ بس تھوڑا دماغ پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اس صورت حال کا ذرا خصوصی توجہ سے جائزہ لینا پڑے گا"۔

اور یہ جائزہ اس نے کچھ عجیب طریقے سے لینا شروع کر دیا۔ عجیب عجیب شکلیں بناتے ہوئے وہ اپنے بادشاہ کو کبھی دائیں اور کبھی بائیں آنکھ بھینچ کر کچھ اشارے کرنے لگ گیا۔

''کچھ فائدہ نہیں ہوگا''۔ فاگوٹ نے رائے ظاہر کی۔

''ارے یہ کیا؟''بیگیموت چلایا۔''یہ طوطوں نے کیوں اڑنا شروع کر دیا ہے؟''

اور واقعتاً کچھ فاصلے پر بہت سارے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز سنائی دینے لگ گئی۔ فاگوٹ اورعزازیل فوراً کمرے سے باہر نکل گئے۔

جونہی فاگوٹ اورعزازیل کمرے سے باہر نکلے بیگیموت کی بادشاہ سے چھیڑ خانی میں مزید شدت آ گئی۔ سفید بادشاہ کو بالآخر سمجھ آ ہی گئی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے فوراً اپنی خلعت اتار کر شطرنج کے خانے میں رکھ دی اور خود وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ بادشاہ کی پھینکی ہوئی خلعت فیلے نے اوڑھ لی اور اس کے خالی کردہ خانے میں جا کھڑا ہوا۔ فاگوٹ اورعزازیل واپس لوٹ آئے۔

ہمیشہ کی طرح جھوٹ۔

عزازیل غصے سے بیگیموت کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

شائید میرے کان بجنے لگے تھے! بیگیموت نے جواب دیا۔

اچھا اب اپنے تماشے بند کرو اور شطرنج کی طرف دھیان دو، ولاند بولا۔ تمہارے بادشاہ کو شبہ ہے۔

مجھے شائید سننے میں کچھ غلطی لگ رہی ہے میرے آقا۔ بلّے نے جواب دیا۔ میرے بادشاہ کو نہ تو شبہ ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔

دوبارہ کہہ رہا ہوں کہ تمہارے بادشاہ کو شبہ ہے۔

میرے آقا! اپنے لہجے سے بناوٹی اشتعال ظاہر کرتے ہوئے بلّا بولا۔ آپ غالباً تھکاوٹ سے نڈھال ہو گئے ہیں۔ میرے بادشاہ کو شبہ نہیں ہے۔

تمہارا بادشاہ۔ جی۔ II خانے میں ہے۔ ولاند شطرنج کی جانب دیکھے بغیر بولا۔

بلّا شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ نہیں تو۔ میرا بادشاہ اس خانے میں تو نہیں ہے۔

یہ کیا مذاق ہے۔ قدرے الجھن محسوس کرتے ہوئے ولاند بولا۔ اور جب اس نے شطرنج پر نگاہ ڈالی تو بادشاہ کے خانے میں کھڑا فیلہ ایک ہاتھ سے اپنا منہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

تم واقعی خباثت کے کٹورے ہو۔ کچھ توقف کے بعد ولاند نے کہا۔

''میرے آقا! میں پھر سے منطق کا حوالہ دوں گا''۔ بلّے نے اپنے سینے پر پنجہ جماتے ہوئے بولنا شروع کیا۔''اگر کوئی مہرہ بادشاہ کو شبہ دینے کا اعلان کرتا ہے اور اس دوران بادشاہ اپنے خانے میں موجود نہیں ہے تو شبہ غیر موثر ہو جائے گی''۔

تم اپنی ہار مانتے ہو یا نہیں؟ اچانک ولاند خوفناک آواز میں دھاڑتا ہوا بولا۔

مجھے کچھ دیر سوچنے کا موقعہ تو دیجئے، میرے آقا۔ انتہائی تحمل کے ساتھ بلے نے جواب دیا۔ اپنی کہنیاں میز پر ٹکائے اور دونوں پنجوں سے کانوں کو دبوچے وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد آہستہ سے بولا۔ ''میں اپنی ہار تسلیم کرتا ہوں''۔

ڈھیٹ لوگوں کو مار دینا چاہیے۔ منہ سے جھاگ اڑاتا ہوا عزازیل بولا۔

جی ہاں! میں اپنی ہار مانتا ہوں۔ بلا بولا۔ ''لیکن یہ ہار میں صرف ایک وجہ سے تسلیم کر رہا ہوں اور وہ وجہ ہیں میرے خلاف زہر اگلنے والے تماشائی۔ یہ کہنے کے بعد وہ سٹول سے اٹھ گیا اور شطرنج کے مہرے بھی ایک ایک کر کے ڈبے میں جا گھسے۔

گیلہ، وقت ہو گیا ہے۔ ولاند نے کہا اور گیلہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس ٹانگ کم بخت کو بھی آج تہوار کے دن ہی دکھنا تھا۔

آپ مجھے اجازت دیں گے؟ دھیرے سے مارگریٹا نے پوچھا۔

ولاند نے پر تجسس نگاہوں سے مارگریٹا کو گھورنے کے بعد ٹانگ اس کی جانب بڑھا دی۔

لاوے کی مانند تپتی مرہم سے مارگریٹا کے ہاتھ جلنے لگے تھے لیکن وہ ماتھے پر ایک بھی شکن لائے بغیر یہ اکسیر ولاند کے گھٹنے پر ملنے لگ گئی۔

''کچھ وقوف رکھنے والے رفقاء کا کہنا ہے کہ یہ گنٹھیا ہے''۔ ولاند مارگریٹا پر ٹکٹکی لگائے کہہ رہا تھا۔ ''لیکن مجھے شک ہے کہ یہ درد دراصل مجھے ایک انتہائی خوبصورت چڑیل نے اپنی یاد میں تحفتاً ۱۵۷۱ میں اس وقت دیا تھا جب میں اس سے شناسائی کی کوشش میں کچھ زیادہ ہی قریب جا پہنچا تھا۔

آہ! یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ مارگریٹا نے سوال کیا۔

''ہے تو احمقانہ سی بات لیکن حقیقت یہی ہے۔ تین سو سال تک خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے بہت ساری دوائیں تجویز کی گئی تھیں۔ لیکن میں ذرا پرانے خیالات کا واقع ہوا ہوں۔ اسی لئے میں اپنی دادی کے نسخوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیسی کیسی حیرت انگیز اور زود اثر جڑی بوٹیاں مجھے اپنی دادی سے ورثے میں ملی ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ویسے آپ کو تو کوئی عارضہ لاحق نہیں ہے؟ ہو سکتا ہے آپ کسی ذہنی غم میں مبتلا ہوں جو آپ کی روح کو زہر آلود کر رہا ہے؟''۔

نہیں میرے آقا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ عقل مند مارگریٹا نے بہت محتاط انداز میں جواب دیا۔ ویسے بھی جب سے آپ کا قرب حاصل ہوا ہے میرے تمام درد دور ہو گئے ہیں۔

خون، ورثہ۔ بہت اہم چیز ہے۔ ولاند مارگریٹا کے جواب سے متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ میں

محسوس کر رہا ہوں کہ آپ میرے گلوب میں خصوصی دلچسپی لے رہی ہیں۔

جی ہاں۔ میں نے اس سے قبل زندگی میں اس سے ملتی جلتی کوئی چیز نہیں دیکھی۔

بہت زبردست چیز ہے یہ گلوب! سچ بات کہوں! مجھے ریڈیو پر نشر کردہ چیزیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ ایک تو خبر رساں ادارے جھوٹ بہت بولتے ہیں اور پھر یہ خبریں پڑھنے والی لڑکیاں! توبہ توبہ۔ منہ ٹیڑھا کر کے بولتی ہیں۔ شہروں کے نام بھی صحیح طور پر نہیں بول سکتیں۔ میرا گلوب اس معاملے میں ہزار درجہ بہتر ہے۔ ویسے بھی مجھے سو فیصد صحیح خبریں سننے کی عادت ہے۔ مثال کے طور پر یہ جو آپ چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا دیکھ رہی ہیں اس کے ایک جانب سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور اس کے اندر آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ وہاں دراصل جنگ لگی ہوئی ہے۔ اگر آپ قریب سے بغور دیکھیں گی تو آپ کو اس جنگ کی تفصیلات بھی دکھائی دیں گی۔

مارگریتا نے جونہی جھک کر گلوب کو بغور دیکھنا شروع کیا تو خشکی کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا یک دم سے کچھ پھیل گیا۔ اس کے چاروں اطراف مختلف رنگ بھر گئے اور اس نے ایک اچھے خاصے جغرافیائی نقشے کی شکل اختیار کر لی۔ ایک باریک نظر آنے والی لکیر دریا میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے کنارے کسی آبادی کے آثار بھی نظر آنے لگ گئے۔ ایک گھر جو پہلے مٹر کے دانے کے برابر نظر آ رہا تھا غور سے دیکھنے پر ماچس کی ڈبیا کے برابر دکھنے لگ گیا۔ اور پھر اچانک اس گھر کی چھت کوئی آواز پیدا کیئے بغیر اڑ گئی۔ گھر سے سیاہ دھوئیں کا بادل اٹھنے لگ گیا۔ دیواریں زمین بوس ہوگئیں۔ چند لمحوں بعد اس دو منزلہ گھر کی جگہ ملبے کا ڈھیر پڑا تھا جس سے سیاہ رنگ کا دھواں اٹھ رہا تھا۔

پُرتجسس مارگریتا گلوب کے اور بھی قریب ہوگئی۔ اسے ملبے کے قریب ایک عورت پڑی دکھائی دی جس کے جسم سے بہنے والے خون نے اردگرد کی زمین کو رنگین کر دیا تھا۔ اور۔۔ ایک چھوٹا سا بچہ اپنے ننھے منے خون آلود ہاتھوں سے اس بے جان جسم کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

یہیں پر یہ کہانی ختم ہوتی ہے۔ مسکراتے ہوئے ولاند بولا۔ یہ کام بلاشبہ عبیدونؔ کا ہے۔

میں تو ان لوگوں کی جانب ہرگز نہیں ہونا چاہوں گی جن سے یہ عبیدون نبرد آزما ہے۔ ویسے وہ خود کس کی جانب ہے؟ مارگریتا نے پوچھا۔

''آپ کے ساتھ گفتگو جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے''۔ ولاند نے کہا۔ ''توں توں مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ آپ انتہائی عقلمند خاتون ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں وہ غیر معمولی طور پر جذبات سے عاری ہستی ہے۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِپیکار دونوں فریقوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لئے دونوں جانب نقصان برابر ہی رہتا ہے۔ عبیدونؔ! ولاند نے آہستگی سے پکارا اور دیوار میں سے ایک دبلا پتلا شخص سیاہ چشمہ لگائے برآمد ہوگیا۔ اس کے چشمے نے نجانے کیوں مارگریتا کو سخت خوف زدہ کر دیا اور اس نے اپنا چہرہ ولاند کی ٹانگ کے پیچھے چھپا لیا۔

یہ کیا مذاق ہے؟ وولاند بلند آواز میں بولا۔

آج کل انسانوں کے اعصاب کتنے کمزور ہو گئے ہیں! ارے بابا۔ دیکھ رہی ہو کہ اس نے تو چشمہ لگا رکھا ہے۔ وولاند نے مارگریتا کی پشت پر کچھ اس انداز سے تھپکی دی کہ اس کے سارے جسم میں گھنٹیاں بج اٹھیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ عبیدون کبھی بھی کسی کے سامنے قبل از وقت ظاہر نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ آپ یہاں میری مہمان ہیں۔ میں تو آپ کو عبیدون سے صرف ملوانا چاہتا تھا۔

عبیدون بالکل ساکت کھڑا تھا۔

اچھا کیا ایک سیکنڈ کے لئے یہ چشمہ اتار سکتا ہے؟ مارگریتا وولاند کے ساتھ چپکتی ہوئی بولی۔ اب اس کی آواز سے خوف کی بجائے تجسس عیاں ہو رہا تھا۔

نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ وولاند نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور عبیدون نامی ہیولا جھٹ سے غائب ہو گیا۔ ''تم کچھ کہنا چاہتے ہو، عزازیل؟''۔

میرے آقا۔ ہمارے ہاں دو بن بلائے مہمان وارد ہوئے ہیں۔ عزازیل نے بتایا۔ ایک خوبصورت نوجوان دوشیزہ جس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ اسے اپنی مالکہ کے پاس رہنے دیا جائے۔ اور دوسرا۔ معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ اس کا سور۔

خوبصورت عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ وولاند معنی خیز انداز میں بولا۔

''نتاشا! یہ یقیناً نتاشا ہے'' مارگریتا جذباتی انداز میں چلاتی ہوئی بولی۔

اجازت ہے۔ اس لڑکی کو ملکہ عالیہ کے پاس بھیج دیا جائے اور سور کو باورچیوں کے حوالے کر دیا جائے۔

کیا مطلب؟ ذبح کر دیں گے؟ مارگریتا خوفزدہ آواز میں بولی۔ رحم کریں میرے آقا! یہ سور دراصل میرا ہمسایہ نکولائی ہے۔ غلطی سے تھوڑی سی کریم اسے بھی مل دی گئی تھی۔

گھبرائیے نہیں۔ کوئی اسے ذبح کرنے نہیں جا رہا۔ باورچیوں کی محفل میں اس کا دل لگا رہے گا۔ اب آپ خود ہی سوچئے اسے تقریبات والے ہال میں تو نہیں بٹھا سکتے نا۔

بالکل ٹھیک فرمایا۔ عزازیل نے لقمہ دیا۔ اور ویسے بھی میرے آقا آدھی رات ہونے کو ہے۔

ارے ہاں، ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وولاند مارگریتا کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ آیئے محترمہ۔ میں پیشگی آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس بھیڑ میں کہیں کھو نہ جایئے گا اور خوف زدہ ہونے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پانی کے سوا کسی دوسرے مشروب کو ہاتھ نہ لگایئے گا ورنہ آپ مدہوش ہو جائیں گی اور کسی مصیبت میں پھنس سکتی ہیں۔ وقت ہو گیا ہے۔

مارگریتا اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے میں فاگوٹ تعظیماً سر جھکائے کھڑا تھا۔

باب ۲۳

شیطان کا عظیم تہوار

آدھی رات ہونے کو تھی۔ شائید اسی لئے ولاند کے حواریوں نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ روشنی مدھم ہونے کی وجہ سے مارگریٹا کو پورا ہال دھند میں لپٹا دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ شمع دان اور ایک روشن تالاب واضح نظر آ رہے تھے۔ تالاب خالی تھا۔ جب مارگریٹا تالاب میں اتر گئی تو گیلہ اور اس کی مدد گار نتاشا نے ایک نیم گرم سرخ رنگ کا گاڑھا محلول مارگریٹا کے جسم پر ملنا شروع کر دیا۔ محلول کو ہونٹوں سے چھوتے ہی مارگریٹا اس کے نمکین ذائقے سے فوراً سمجھ گئی کہ یہ خون ہے۔ کچھ دیر بعد خون کی جگہ ایک شفاف ہلکے گلابی رنگ کے محلول نے لے لی۔ عرق گلاب کی تیز خوشبو سے مارگریٹا کا سر چکرانے لگ گیا۔ اس غسل کے بعد مارگریٹا کو ایک کرسٹل سے بنے تخت نما ٹب میں لٹا دیا گیا۔ اور اس کے پورے جسم کو سبز رنگ کے بڑے بڑے پتوں سے رگڑنا شروع کر دیا گیا۔

اسی دوران بلاّ بھی وہاں پہنچ گیا اور اس عمل میں شامل ہو گیا۔ وہ مارگریٹا کے پاؤں میں بیٹھ کر کچھ اس انداز میں اس کے تلوؤں کو چمکانے لگ گیا کہ جیسے سڑک کنارے بیٹھا جوتے پالش کر رہا ہے۔ مارگریٹا کو یاد نہیں کہ گلاب کی پتیوں سے اس کے جوتے کس نے تیار کئے تھے اور کیسے مہندی رنگ کی ڈوری سے انہیں اسکے پاؤں پر باندھ دیا گیا تھا۔ کسی ان دیکھی قوت نے مارگریٹا کو ایک آئینے کے سامنے بٹھا دیا۔ وہ اپنے بالوں میں سجے ہیروں سے جڑے شاہی تاج کو دیکھ کر حیران ہو گئی۔

کچھ دیر بعد وہاں فاگوٹ نمودار ہو گیا۔ اس نے مارگریٹا کے گلے میں ایک دھاتی زنجیر پہنا دی۔ اس زنجیر کے ساتھ ایک کتے کی شبیہ والا وزنی سیاہ رنگ کا بیضوی لاکٹ لٹک رہا تھا۔ یہ زیور ملکہ کے نازک جسم پر کافی گراں ثابت ہو رہا تھا۔ زنجیر سے گردن کی جلد زخمی ہونے لگی تھی اور لاکٹ کے بوجھ کی وجہ سے مارگریٹا کو سر جھکا لینا پڑا تھا۔ لیکن جو اذیت اس کتے والی شبیہ کے لاکٹ اور زنجیر سے اسے پہنچ رہی تھی اس کے عوض ایک فائدہ بھی ہوا تھا۔ فاگوٹ اور بلاّ مارگریٹا کے سامنے انتہائی مودب ہو گئے تھے۔

کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں! فاگوٹ تالاب والے کمرے کے دروازے میں کھڑا بڑبڑا رہا تھا۔ کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ تو اب جھیلنا ہی پڑے گا۔ ضروری ہے، ضروری ہے، بہت ضروری ہے۔ اب اجازت ہو تو آج کی تقریب کے بارے میں ایک آخری احتیاط آپ کے گوش گذار کروں! آج کی محفل میں ایک دوسرے سے انتہائی مختلف مہمان شامل ہوں گے۔ آپ کے لئے مشورہ ہے کہ کسی سے بھی امتیازی سلوک نہ برتیں۔ میری ملکہ عالیہ مارگو! میں دوبارہ یہ ضروری بات کہہ رہا ہوں کہ آپ کی حرکات وسکنات سے، زبان یا آنکھوں سے کسی کو بھی امتیازی رویے کی جھلک نظر نہیں آنی چاہیے۔ اگر آپ کو کوئی مہمان ناپسندیدہ لگے تو یہ بات کسی صورت بھی اس پر عیاں نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ اس طرح کا خیال بھی دماغ میں مت لائیے گا۔ کیونکہ وہ شخص آپ کے خیالات کو بھی فوراً اچک لے گا۔ ہر ایک سے پیار سے پیش آئیں۔ آپ کی جانب سے تمام مہمانوں کو صرف اور صرف پیار کا پیغام ملنا چاہیے۔

اس میلے میں تقریب کی میزبان ملکہ عالیہ کو کیسے نوازا جائے گا؟ میری خام عقل اس کا تصور کرنے سے قاصر ہے۔ کسی کو بھی آپ کی نگاہ کرم سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ اگر کچھ کہنے کا وقت نہیں ہے تو مسکراہٹ ہی سہی۔ سر کی ہلکی سی جنبش ہی سہی۔ سب کچھ ممکن ہے لیکن کسی کو بھی آپ کی عدم توجہی کی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ یہ لوگ کئی طرح کی مکاری کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

مارگریٹا فاگوٹ اور بیگیموت کی معیت میں تالاب والے کمرے سے نکلنے کے بعد ایک مکمل تاریکی میں داخل ہوگئی۔

میں۔ میں۔ بلّے نے سرگوشی کی۔ میں سگنل دوں گا!

کر دو اعلان۔ اندھیرے میں فاگوٹ کی آواز سنائی دی۔

''جشن شروع ہوتا ہے''۔ بلّے نے بگل کی مانند صدا بلند کی۔ مارگریٹا کی ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس نے چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ فاگوٹ نے بہت ادب کے ساتھ اس کا بازو تھام رکھا تھا۔

آنکھیں کھولنے پر مارگریٹا نے خود کو ایک سرسبز جنگل میں کھڑے پایا۔ سبز وسرخ رنگ کے طوطے درختوں کی شاخوں پر چہک رہے تھے اور شور مچاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔''ہم نشے میں ہیں۔ ہم نشے میں ہیں''۔

یہ جنگل جلد ہی ختم ہوگیا۔ اس کی حبس بھری فضا کی جگہ ایک لطیف ہوادار فضا والے ہال نے لے لی۔ اس ستونوں سے آراستہ ہال میں ایک انگیٹھی سے سنہری چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ جنگل کی طرح یہ ہال بھی تقریباً خالی تھا۔ ہاں البتہ ستونوں کے گرد برہنہ جسم سیاہ فام افراد پیشانی پر چاندی رنگ کی پٹیاں باندھے ساکت کھڑے تھے۔ جونہی مارگریٹا اپنے حواریوں کی معیت میں ہال میں داخل ہوئی تو، غالباً ملکہ کے حسن

سے متاثر،ان سیاہ فاموں کے چہرے مزید گہرے رنگ کے ہوگئے۔ فاگوٹ نے مارگریٹا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بولا۔

''سیدھا پھولوں کی جانب،میری ملکہ عالیہ''۔

مارگریٹا کے سامنے ٹیولپ کے سفید پھولوں کی ایک دیوار کھڑی ہوگئی۔اس پھولوں کی دیوار کے پیچھے سرخ ٹوپیاں اوڑھے لاتعداد شعلے متحرک رہے تھے۔یہ سازندے تھے۔سامنے سے ان کے سفید سینے اور اطراف میں سیاہ فراکوں والے شانے نظر آ رہے تھے۔انہیں دیکھتے ہی مارگریٹا فوراً سمجھ گئی کہ موسیقی کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ہرسُو بگل بج اٹھے تھے۔موسیقی کے شور نے مارگریٹا کی قوت سماعت ماؤف کر کے رکھ دی تھی۔اس شور کے پس منظر میں بتدریج بلند ہوتی ہوئی وائلن کی رومان پرور دھن سنائی دے رہی تھی۔ مارگریٹا اس قدر متاثر ہوئی کہ وائلن کی یہ دھن اس کے دل کو چیرتی ہوئی دوران خون کے ساتھ پورے جسم میں سرایت کرگئی۔آرکسٹرا میں تقریباً ڈیڑھ سوفن کار شامل تھے۔

آرکسٹرا کے سامنے لمبا فراک پہنے اور دائیں ہاتھ میں سفید رنگ کی چھڑی لئے جو موسیقار کھڑا تھا اس کا چہرہ مارگریٹا پر نظر پڑتے ہی سفید ہوگیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے چھڑی کی جنبش سے تمام سازندوں کو ملکہ مارگریٹا کی تعظیم میں کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔موسیقی کا تسلسل ایک لمحے کے لئے بھی منقطع نہیں ہوا۔ سازندے کھڑا ہونے کے باوجود ملکہ کے لئے دھن بکھیرے جارہے تھے۔ڈائریکٹر موسیقار نے آرکسٹرا کی جانب پشت موڑ لی اور تعظیماً جھکتے ہوئے دونوں بازو فضا میں بلند کردیئے۔

مارگریٹا نے مسکراہٹ کے ساتھ ایک ہوائی بوسہ موسیقار کی جانب پھینکتے ہوئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

''کم ہے۔ بہت کم ہے''۔ فاگوٹ بول اٹھا۔''اسے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ بلند آواز میں اس کو کہیں۔۔خوش آمدید،موسیقی کے بادشاہ''۔

مارگریٹا نے یہ الفاظ اونچی آواز میں دہرائے اور اپنی گھنٹی کی طرح بلند آہنگ اور موسیقی پر چھا جانے والی آواز سن کر وہ دنگ رہ گئی۔موسیقار خوشی سے جھوم اٹھا اور اپنا بائیاں ہاتھ سینے پر سجائے وہ بار بار جھک کر اپنی عزت افزائی پر ملکہ کا شکریہ ادا کرنے لگ گیا۔

''کم ہے۔ ملکہ عالیہ ابھی بھی کم ہے''۔ فاگوٹ نے سرگوشی کی۔''آپ کے بائیں جانب جو وائلن والوں کی قطار ہے انہیں کچھ اس انداز میں اشارہ کیجئے کہ ان میں سے ہر ایک یہی سمجھے کہ اشارہ ذاتی طور پر اسی کے لئے ہے۔ یہ تمام لوگ دنیا کے نامور ترین فن کار ہیں۔ جی ہاں۔ جی ہاں۔اب آپ بالکل ٹھیک جا رہی ہیں۔اسی طرح جاری رکھیں''۔

یہ چھڑی والا موسیقار کون ہے؟ تھوڑا پیچھے کو جھکتے ہوئے مارگریتا نے پوچھا۔
یوگان سٹراؤس۔ بلا جھٹ سے بولا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج تک کبھی بھی کسی بھی تقریب میں اتنے نامور فن کاروں نے یکجا ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اگر یہ بات غلط ثابت ہو تو مجھے جنگل میں طوطوں کے ساتھ الٹا لٹکا دیا جائے۔ ان سب کو میں نے ذاتی طور پر فرداً فرداً مدعو کیا تھا۔ اور جناب، کسی ایک نے بھی نہ تو انکار کیا اور نہ ہی بیمار ہونے کا بہانہ بنایا۔

اگلے ہال میں ستونوں کی جگہ سرخ، گلابی اور سفید گلابوں کے مینار کھڑے تھے۔ جبکہ دوسری جانب دیوار کے ساتھ سفید مخملی جاپانی پھولوں کے انبار لگے تھے۔ ان دیواروں کے بیچ تین تالابوں میں بلبلے بناتی شیمپین کے فوارے ابل رہے تھے۔ ایک تالاب میں گلابی، دوسرے میں دودھیا اور تیسرے میں نیلگوں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ سیاہ فام سازندوں کا ایک دستہ، سرخ رنگ کی ٹوپیاں سروں پر سجائے کھڑا تھا۔ ان کا ماسٹر موسیقار سرخ رنگ کی لمبی فراک پہنے، ہاتھ میں چھڑی لئے والہانہ انداز میں اچھل کود کر رہا تھا۔ اس کے سامنے سازندوں کا ہجوم 'جاز' کی دھن بجا رہا تھا۔ مارگریتا پر نظر پڑتے ہی یہ موسیقار تعظیماً اس قدر جھک گیا کہ اس کے ہاتھ زمین کو چھونے لگ گئے۔ سیدھا ہونے پر اس نے با بلند آواز صدا لگائی۔ ''ملکہ عالیہ کا وقار بلند ہو''۔ اپنے دائیں گھٹنے پر اس نے ایک زوردار ہاتھ مارا۔ پھر بائیں پر۔ یہی عمل اس نے دو مرتبہ دہرانے کے بعد قریب کھڑے سازندے سے دھاتی پلیٹ چھین لی اور ستون میں دے ماری۔

واپسی اڑان لیتے ہوئے مارگریتا نے دیکھا کہ جذبات سے بے قابو یہ موسیقار دھاتی پلیٹ بار بار سازندوں پر جھونک رہا تھا اور وہ مضحکہ خیز انداز میں اٹھک بیٹھک کر رہے تھے۔

یہ اڑان اس چبوترے پر پہنچ کر ختم ہوئی جہاں غالباً کچھ دیر قبل فاگوٹ نے لالٹین تھامے مارگریتا کا استقبال کیا تھا۔ لیکن اب کرسٹل سے بنے انگور کے گچھوں سے امڈنے والی تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا رہی تھی۔ مارگریتا کو چبوترے کے وسط میں پہلے سے مختص جگہ پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس نے اپنا بایاں بازو ایک یاقوت سے بنے ستون پر ٹکا دیا۔

''بہت خوب ملکہ عالیہ! یہ ستون بازو رکھنے کے لئے ہی بنایا گیا ہے''۔ فاگوٹ نے سرگوشی کی۔

ایک سیاہ فام نے کتے کے سر سے منقش ویلوٹ کا تکیہ مارگریتا کے قدموں میں رکھ دیا۔ ایک دوسرے حبشی نے مارگریتا کا دایاں پاؤں اپنے ہاتھوں میں تھامنے کے بعد تکیے پر ٹکا دیا۔ مارگریتا نے چاروں اطراف کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ فاگوٹ اور عزازیل اس کے قریب مودبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ عزازیل کے ساتھ تین نوجوان موجود تھے جنہیں دیکھ کر نجانے کیوں مارگریتا کو عبیدون یاد آ گیا۔ مارگریتا کی کمر میں بار ہا سرد لہر دوڑ رہی تھی۔ اس کے عقب میں سنگ مرمر کی دیوار سے سرخ رنگ کی شراب کا

فوارہ ابل رہا تھا اور یہ شراب بہتی ہوئی ایک برف سے بنے تالاب میں اکٹھی ہو رہی تھی۔ مارگریٹا کو اپنے بائیں پاؤں کے قریب کچھ نرم گرم چیز محسوس ہوئی۔ اس نے نیچے نگاہ جھکائی تو بیگیموت اس کے پاؤں سے چپکا پڑا تھا۔

مارگریٹا کا چبوترہ کافی بلندی پر واقع تھا۔ چبوترے سے فرش تک غالیچے سے آراستہ کشادہ بل کھاتی سیڑھیوں کے سلسلے کو دیکھتے وقت مارگریٹا کو یہ گمان ہو رہا تھا کہ شائید اس نے دوربین الٹی پکڑ رکھی ہے۔ سیڑھیاں جس لاؤنج میں اختتام پذیر ہو رہی تھیں وہاں ایک ناقابل بیان حد تک کشادہ انگیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس انگیٹھی کا تاریک دہانہ پانچ ٹن وزنی ٹرک کو یقیناً آسانی نگل سکتا تھا۔ تیز روشنی سے منور سیڑھیاں اور لاؤنج سنسان پڑے تھے۔ موسیقی کی آواز اب بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ تقریباً ایک منٹ تک سب لوگ خاموش کھڑے رہے۔

مہمان کہاں ہیں؟ مارگریٹا نے فاگوٹ سے دریافت کیا۔

آ ئیں گے۔ ملکہ عالیہ، ابھی آئیں گے اور بہت بڑی تعداد میں آئیں گے۔ ویسے ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں یہاں کھڑے ہو کر مہمانوں کا استقبال کرنے کی بجائے باہر جا کر انگیٹھی کے لئے لکڑیاں کاٹنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

لفاظی کا شوقین بلا بھی زیادہ دیر تک خاموش نہ رہ سکا اور گفتگو میں شامل ہوتا ہوا بولا۔

لکڑیاں کاٹنا بھی بھلا کوئی کام ہے؟ میں تو ٹرام کا کنڈکٹر بننا پسند کروں گا۔ میرے نزدیک دنیا میں اس سے زیادہ مشکل اور دلچسپ کام اور کوئی نہیں ہے۔

ملکہ عالیہ! ہر چیز کی تیاری پہلے سے کر لینی چاہئے۔ اپنی ایک شیشے والی خستہ حال عینک کے عقب سے جھانکتے ہوئے فاگوٹ بولا۔ کسی بھی مہمان کے لئے اس سے زیادہ ہتک آمیز صورتحال نہیں ہو سکتی جب وہ کسی تقریب میں سب سے پہلے پہنچ جائے اور اسے چپ چاپ ایک کونے میں تن تنہا کھڑا ہونا پڑے۔ اس سے بھی بدتر صورتحال اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس کی قانونی ہم سفر سرگوشیوں میں اس کے کان میں قبل از وقت آنے پر لعن طعن کر رہی ہو۔ ایسے مہمانوں کو تو کچرے کے ڈھیر میں پھینک دینا چاہیے۔

کچرے کے ڈھیر میں۔ کچرے کے ڈھیر میں۔ بلّے نے تائید کی۔

بارہ بجنے میں صرف دس سیکنڈ رہ گئے ہیں۔ فاگوٹ نے اعلان کیا۔

بس اب تقریب شروع ہونے والی ہے۔

یہ دس سیکنڈ مارگریٹا کو کئی گھنٹوں پر محیط لگ رہے تھے۔ غالباً یہ دس سیکنڈ گزرنے کے باوجود بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔ لیکن پھر یکا یک ایک عجیب و غریب سا شور سنائی دیا اور انگیٹھی سے ایک تختہ دار برآمد

ہوگیا۔اس تختے پر کیڑوں کی خوراک بننے سے بچ رہنے والا ایک پنجر پھانسی کے پھندے سے لٹکا ہوا تھا۔ یہ پنجر پھندے سے آزاد ہونے کے بعد زمین پر آن گرا اور اس کی جگہ لمبے فراک میں ملبوس ایک سیاہ بالوں والے خوبرو نوجوان نے لے لی۔تختہ دار کے پیچھے پیچھے انگیٹھی سے ایک خستہ حال تابوت برآمد ہوا جس کا ڈھکن اڑ کر دور جا گرا۔اس تابوت سے بھی ایک مسخ شدہ لاش برآمد ہوئی۔خوبرو نوجوان نے اس لاش کے پاس پہنچ کر اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور یہ لاش لباس کی قید سے آزاد ایک خوبصورت دوشیزہ میں تبدیل ہوگئی۔اس نے پرندوں کے پروں سے بنا ایک ہیٹ سر پہ سجا رکھا تھا جبکہ وہ پاؤں میں سیاہ رنگ کے لمبے جوتے پہنے ہوئے تھی۔وہ دونوں تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگ گئے۔

یہ ہیں ہمارے پہلے مہمان! فاگوٹ نے اعلان کیا۔ جناب جیک اور ان کی اہلیہ۔ ملاحظہ کیجئے! موصوف اپنے وقت کے دل چسپ ترین آدمی ہوا کرتے تھے۔ ان کے مشہور ہونے کی وجہ جعلی سکوں کا کاروبار،حکومت وقت کے خلاف بغاوت اور سب سے اہم بات ان کا کیمیاگر ہونا تھا۔ملک کے کونے کونے میں ان کی مشہوری کی وجہ ایک انوکھا واقعہ بنا تھا۔انہوں نے بادشاہ کی محبوبہ کو زہر دے دیا تھا۔ایسی وجہ شہرت بھی کسی کسی کے نصیب میں ہوتی ہے۔ذرا اس کے چہرے پر غور فرمائیں۔کمبخت کس بلا کا خوش شکل آدمی ہے۔

مارگریتا کا رنگ خوف سے زرد پڑ گیا۔اس کا منہ ادھ کھلا رہ گیا۔ نیچے لاؤنج میں اسے دکھائی دے رہا تھا کہ کیسے تختہ دار اور تابوت ایک بغلی دروازے میں غائب ہو رہے ہیں۔

میں آپ کا بہت بڑا مداح ہوں۔بلا سیڑھیوں پر گامزن جیک کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

اس دوران نیچے انگیٹھی سے ایک دائیں بازو سے محروم سربریدہ ڈھانچہ برآمد ہوا اور دھڑام سے زمین بوس ہونے کے بعد ایک لمبی فراک زیب تن کیئے مرد میں تبدیل ہوگیا۔جیک کی اہلیہ اپنا ایک گھٹنا زمین پر رکھے مارگریتا کے سامنے جھک گئی اور بوکھلاہٹ کے عالم میں مارگریتا کے پاؤں پر بوسے لینے لگ گئی۔

ملکہ عالیہ! ملکہ عالیہ! وہ دھیرے سے مسکراتی ہوئی بولی۔

ملکہ عالیہ آپ سے بہت خوش ہیں۔فاگوٹ نے اسے فارغ کرتے ہوئے کہا۔

ملکہ عالیہ۔جیک تعظیماً جھک کر آہستہ سے بولا۔

ہمیں بھی آپ پر ناز ہے۔بلا بھی اونچی آواز میں بول اٹھا۔

عزازیل کے مددگار نوجوان چہروں پر زندگی کی چمک سے عاری مسکراہٹ طاری کئے مہمانوں کو اس جانب بڑھنے کی دعوت دے رہے تھے جہاں سیاہ فام ہاتھوں میں شیمپین سے بھرے جام لئے کھڑے تھے۔لمبی فراک والا ایک نیا مہمان تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چبوترے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

نواب رابرٹ۔ فاگوٹ نے مارگریتا کے کان میں کہا۔ ماضی کی طرح آج بھی دلکش شخصیت کا

حامل ہے۔ پہلے مہمان سے بالکل مختلف۔ ذرا غور فرمائیے۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے میری ملکہ عالیہ کہ یہ صاحب اس دور کی ملکہ کا عاشق تھا اور اپنی بیوی کو اس نے زہر دے دیا تھا۔

نواب رابرٹ! آپ کی تشریف آوری پر ہم بے حد خوش ہیں۔ بلّے نے نواب کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

انگیٹھی سے اوپر تلے تین مزید تابوت برآمد ہوئے جن کے فوراً ہی پرخچے اڑ گئے اور ان کے مکین اپنی ہیئت تبدیل ہونے کے بعد سیڑھیوں کی جانب چل پڑے۔ ان کی تقلید میں ایک سیاہ پوشاک والا انگیٹھی سے دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ اس کا پیچھا کرتا ہوا ایک کریہہ صورت شخص برآمد ہوا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے فراک والے کی پشت میں چھرا گھونپ دیا۔ لاؤنج میں ایک دبی دبی سی چیخ ابھر کر رہ گئی۔ انگیٹھی سے دوڑتی ہوئی ایک ادھ گلی لاش برآمد ہوئی۔ مارگریتا کی پیشانی غیر ارادی طور پر سلوٹوں سے بھر گئی کیونکہ اسے اپنے وجود سے تعفن اٹھتا محسوس ہونے لگا تھا۔ کسی نے فوراً ہی مارگریتا کی الجھن کو بھانپتے ہوئے نمک سے بھری ایک شیشی اس کی ناک سے لگا دی۔ مارگریتا کو شک گذرا کہ یہ ہاتھ شائد نتاشا کا تھا۔

سیڑھیوں پر اب مہمانوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ ہر زینے پر ایک لمبے فراک والا مرد اور اس کے ساتھ برہنہ خاتون پاؤں میں لمبے جوتے اور سر پر پروں والا ہیٹ پہنے نظر آ رہی تھی۔

ایک دبلی پتلی خوش شکل خاتون کسی کلیسائی داسی کی طرح نظریں جھکائے بائیں پاؤں میں ایک عجیب وغریب لکڑی کا جوتا پہنے اور گردن کے گرد سبز رنگ کا رومال لپیٹے مارگریتا کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔

اف کتنا گہرا سبز ہے؟ غیر ارادی طور پر مارگریتا کے منہ سے نکل گیا۔

''یہ انتہائی خوبصورت اور رکھ رکھاؤ والی خاتون ہے''۔ فاگوٹ نے سرگوشی کی۔ ''ملاحظہ کیجئے ملکہ عالیہ! یہ محترمہ طوفانہ اپنے دور میں روم کی نوجوان حسیناؤں میں بڑا نام رکھتی تھی۔ یہ بالخصوص ان خواتین کے انتہائی قریب تھی جو اپنے شواہر سے تنگ آ چکی تھیں۔ دیکھیں ملکہ عالیہ ایسا ہو ہی جاتا ہے تا کہ عورت شوہر سے تنگ آ جائے''۔

جی ہاں! کھوکھلی آواز میں مارگریتا نے جواب دیا اور اور اس دوران وہ فراک پہنے ان دو نوجوانوں کو مسکراہٹ سے نوازنے لگ گئی جو ملکہ کے سامنے دوزانوں ہو کر اس کے ہاتھ اور گھٹنے کو بوسہ دے رہے تھے۔

ہاں تو۔۔۔۔۔ فاگوٹ اپنی سرگوشی جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''یہ محترمہ طوفانہ ان بے چاری خواتین کی بہت بڑی خیر خواہ تھی اور انہیں چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں ایک محلول بیچا کرتی تھی۔ خاتون خانہ اس محلول کو شوہر کے سوپ میں ملا دیتی تھی جسے پینے کے بعد وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا اور لذت

آمیز کیفیت کے عالم میں بیوی کے ہاتھ چومنے لگ جاتا۔ چند گھنٹوں کے بعد اسے شدت سے پیاس کا احساس ہونے لگتا تھا۔ بعد ازاں وہ بستر پر دراز ہو جاتا اور بالآخر ایک دن بعد اتنے اہتمام سے شوہر کو سوپ پلانے والی رومن دوشیزہ نسیم سحری کی مانند آزاد ہو جاتی''۔

اچھا۔ یہ اس نے بائیں پاؤں میں کیا پہن رکھا ہے؟ اپنے سامنے جھکنے والی خاتون کو ہاتھ پیش کرتے ہوئے مارگریٹا نے استفسار کیا۔ اور گردن پر یہ سبزہ کس مقصد کے لئے ہے؟ کہیں گردن بدنما تو نہیں ہے؟

میں آداب بجا لاتا ہوں نواب صاحب! فاگوٹ بلند آواز میں بولا۔ اور پھر فوراً ہی مارگریٹا کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے دھیمے لہجے میں بیان کرنے لگا۔

''انتہائی خوبصورت گردن ہے جناب۔ لیکن جیل میں اسے ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا۔ پاؤں میں، ملکہ عالیہ، اس نے ہسپانوی جوتا پہن رکھا ہے۔ گردن پر سبز پٹی اس لئے لپیٹ رکھی ہے کہ جب قیدیوں کو یہ معلوم ہوا کہ تقریباً پانچ سو بدنصیب رومن شوہر اس نیکوکار خاتون کی مہربانی سے ہمیشہ کے لئے دنیا سے کوچ کر چکے ہیں تو انھوں نے طیش میں آ کر موصوفہ کا گلا گھونٹ ڈالا''۔

میں کتنی خوش قسمت ہوں اے اندھیروں کی ملکہ کہ مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی ہے۔ عقیدت کی ماری طوفانہ گھٹنے کے بل بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بول رہی تھی۔ ہسپانوی جوتے نے اسے مشکل میں ڈال رکھا تھا۔ تاہم فاگوٹ اور بیگیموت کی مدد سے وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔

میں بہت خوش ہوں۔ مارگریٹا نے اسے جواب دیا۔ اس دوران وہ قریب پہنچنے والے مہمانوں کو بوسے کے لئے اپنا ہاتھ پیش کرنا نہیں بھولی تھی۔

سیڑھیوں پر اب انسانی سروں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ مارگریٹا نے لاؤنج کی جانب دیکھنا بند کر دیا تھا۔ وہ اب مشینی انداز میں اپنا ہاتھ اوپر نیچے کئے جا رہی تھی اور زبردستی مسکراہٹ چہرے پر سجائے مہمانوں پر اپنی پسندیدگی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ چبوترے کی فضا میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا شور چھا گیا تھا۔ دوسرے ہال میں موسیقی کی بلند لہریں طوفان برپا کر رہی تھیں۔

''اور یہ انتہائی خشک مزاج عورت''۔ فاگوٹ اب سرگوشی کی بجائے با بلند آواز بول رہا تھا کیونکہ چبوترے پر چھائے شور میں کسی دوسرے کا اُسے سن لینا ممکن نہیں رہا تھا۔ ''پارٹیوں میں جانا اس کا مشغلہ ہے اور ہر وقت اپنے رومال کے بارے میں شکایت کرنے کا سوچتی رہتی ہے''۔

مارگریٹا کی نگاہوں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہجوم میں اس خاتون کو ڈھونڈ نکالا جس کی تعریف فاگوٹ کر رہا تھا۔ وہ ایک بیس سالہ نوجوان اور غیر معمولی طور پر خوبصورت عورت تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں یقیناً کسی گہری سوچ میں گم اور سخت بے چینی میں مبتلا تھیں۔

''کیسارومال''۔ مارگریتا نے پوچھا۔

''اس کی ایک ملازمہ ہے''۔ فاگوٹ بولنا شروع ہوا۔''جو گذشتہ تیس سال سے روزانہ ایک رومال رات کے وقت میز پر سجا دیتی ہے۔ جونہی صبح اس کی آنکھ کھلتی ہے رومال سامنے میز پر پڑا ہوتا ہے۔ اس نے بیسیوں مرتبہ رومال کو دریا برد کیا، انگیٹھی کے شعلوں کے سپرد کیا، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا''۔

''یہ کیسا رومال تھا؟''۔ مارگریتا نے وضاحت چاہی۔

سفید رنگ کا، نیلے حاشیئے کے ساتھ۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ وہ ایک کیفے میں ملازمت کرتی تھی اور ایک دن کیفے کے مالک نے اسے سٹور میں بلالیا۔ ٹھیک نو مہینے بعد اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ نومولود کو وہ جنگل میں لے گئی اور اس کے منہ میں رومال ٹھونسنے کے بعد اسے ایک گڑھے میں دبا دیا۔ عدالت میں اس نے بیان دیا تھا کہ بچے کی پرورش کے لئے اس کے پاس وسائل نہیں تھے''۔

اور وہ کیفے کا مالک کہاں گیا؟ مارگریتا کا تجسس بڑھا

ملکہ عالیہ! فرش پر بیٹھا بلا اچانک بول پڑا۔''میں آپ سے یہ پوچھنے کی جسارت کررہا ہوں کہ اس روداد سے کیفے کے مالک کا بھلا کیا تعلق ہے؟ نومولود بچے کے منہ میں رومال اُس نے تو نہیں ٹھونسا تھا نا''۔

مارگریتا نے چہرے پر مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے اور دائیاں ہاتھ مہمانوں کو بوسے کے لئے برابر بڑھاتے ہوئے اپنے بائیں ہاتھ کے لمبے ناخن بیگیموت کے کان میں گاڑ دیئے اور سخت ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

سنو خنزیر! اگر تم دوبارہ ہماری گفتگو میں مخل ہوئے تو۔۔۔۔۔۔

بیگیموت کی چیخ نکل گئی۔ وہ بظاہر خوف زدہ آواز میں بولا۔''ملکہ عالیہ! کان سوج جائے گا، میری پارٹی خراب ہوجائے گی۔ میں تو قانونی بات کررہا تھا۔ میرا مطلب ہے قانونی نکتہ نظر سے۔ لیکن اب نہیں بولوں گا۔ پکا وعدہ۔ بالکل خاموش رہوں گا۔ یوں سمجھ لیں کہ میں بلا نہیں مچھلی ہوں۔ بس میرا کان چھوڑ دیں''۔

مارگریتا نے بلے کا کان چھوڑ دیا۔ اداس، بے چین آنکھیں اب مارگریتا کے سامنے موجود تھیں۔

''میں خوش نصیب ہوں ملکہ عالیہ کہ مجھے پورے چاند کی تقریب میں مدعو کیا گیا ہے''۔

اور میں۔ مارگریتا نے جواب دیا۔ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں۔ آپ شیمپین پینا پسند کریں گی؟

یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ملکہ عالیہ؟ گھبراہٹ کے عالم میں فاگوٹ چلا اٹھا۔ ہنگامہ ہوجائے گا۔ سیڑھیوں پر ساری آمدورفت رک جائے گی۔

''جی مجھے شیمپین بہت پسند ہے''۔ ملتجی ہو کر خاتون بولی۔''فریدہ۔ فریدہ۔ فریدہ۔ نام ہے میرا ملکہ عالیہ''۔

''فریدہ آج آپ اتنی پیئو کہ نشے میں آپ کو کچھ یاد نہ رہے''۔ مارگریتا نے کہا۔

فریدہ نے ملکہ سے بغل گیر ہونے کے لئے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ لیکن فاگوٹ اور بیگیموت نے اسے فوراً تھام لیا اور وہ ہجوم کے دباؤ میں لڑکھڑاتی ہوئی آگے نکل گئی۔

مہمانوں کا اتنا بڑا ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا کہ لاؤنج سے چبوترے تک انسانی سروں کی دیواریں بن گئی تھیں۔ برہنہ زنانہ جسم لمبے فراکوں میں ملبوس مردوں کے ساتھ چبوترے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مارگریتا کے سامنے گندمی، سفید، سیاہ اور کافی کے بیج سے مشابہہ رنگوں کے اجسام کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ سیاہ، سنہرے، بھورے، سرخی مائل، چھوٹے، لمبے، سیدھے اور گھنگریالے بالوں میں سجے بیش قیمت پتھر روشنی کی شعاعوں سے ملاپ ہونے پر رنگین چنگاریاں فضا میں بکھیر رہے تھے۔ مردوں کے سینے پر سجے، ہیروں سے جڑے بٹن روشنی پڑنے پر قوس قزح کے رنگ منعکس کر رہے تھے۔ مارگریتا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے ہاتھ اور گھٹنے کے ساتھ کسی تعطل کے بغیر بوسہ لینے والے ہونٹ چپک گئے ہیں۔ مہمانوں کو خوش آمدید کہنے والی مسکراہٹ اب مستقلاً اس کے چہرے پر موجود تھی۔

''ہم بہت خوش ہیں۔ ہم بہت متاثر ہیں''۔ فاگوٹ کسی طوطے کی مانند دہرائے جا رہا تھا۔ ''ملکہ عالیہ بہت خوش ہیں''۔ اپنی منحوس آواز میں عزازیل بھی بول اٹھا۔

''میں بے انتہا خوش ہوں''۔ بلا بھی شامل ہوگیا۔

ماکیزہ۔ فاگوٹ برابر بولے جا رہا تھا۔ ''اس نے اپنے باپ، دو بھائیوں اور دو بہنوں کو جائیداد کی خاطر زہر دے کر مار ڈالا تھا''۔ ملکہ عالیہ بہت متاثر ہوئی ہیں! محترمہ امینہ! واہ زنانہ حسن کا کیا نادر نمونہ ہے۔ بس ذرا اعصاب کی کمزور ہیں۔ بھلا کیا ضرورت تھی ملازمہ کا چہرہ گرم گرم سلاخ سے داغنے کی؟ ایسے جرم کی معافی تو نہیں ہوتی نا! ملکہ بہت خوش ہیں! ملکہ عالیہ ذرا غور فرمایئے۔ شہنشاہ رڈولف۔ بہت بڑا جادوگر اور کیمیادان۔ آہ، ایک اور کیمیادان پھندے میں لٹکا دیا گیا''۔

''اور اسے ملاحظہ فرمائیں۔ بلند پائے کی نائکہ۔ سٹراسبرگ میں نہایت خوشنما کوٹھے کی مالکہ۔ ہمیں فخر ہے آپ پر۔ ماسکو کی درزن۔ ہم سب اس کی بلند سوچ کے مداح ہیں۔ انہوں نے اپنی کپڑوں کی سلائی کی دوکان سے ملحقہ کمرے کی دیوار میں دو گول سوراخ کر دار کھے تھے۔۔۔۔۔۔

خواتین کو کیا یہ بات معلوم نہیں تھی؟ مارگریتا نے پوچھا۔

ہر ایک کو معلوم تھا۔ فاگوٹ نے کہا۔ میں خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔ یہ بیس سالہ جوان بچپن سے ہی اپنی بلند پایہ سوچ کے لئے مشہور تھا۔ ایک خوبصورت معصوم لڑکی اس کے عشق میں مبتلا ہوگئی اور اس جوان نے اس بے چاری کو ایک نائکہ کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

نیچے سے انسانوں کا ایک دریا بہتا چلا آ رہا تھا۔ اس دریا کا کنارہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتا

تھا۔اس کا منبع ''انگیٹھی'' اسے مواد مہیا کیے جا رہی تھی۔ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پھر دوسرا گھنٹہ گزر گیا۔ مارگریتا کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے گلے میں لٹکی زنجیر کا وزن بڑھتا جا رہا ہے۔ بازو کے ساتھ بھی کچھ عجیب معاملہ ہو رہا تھا۔اسے اٹھاتے وقت مارگریتا کو پیشانی پر بل ڈالنے پڑ رہے تھے۔ فاگوٹ کی دل چسپ لقمہ بازی سے اب مارگریتا کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ گول چہرے، لمبوترے منگول چہرے، سفید اور سیاہ چہرے، اب اسے ایک جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا میں بھی عجیب نوعیت کی ہلچل اور روانی پیدا ہو گئی تھی۔ اچانک سوئی کی چبھن کی مانند تیز درد مارگریتا کے دائیں ہاتھ میں اٹھی۔اس نے دانت بھینچ لیے اور کہنی ستون پر ٹکا دی۔

عقبی ہال سے پرندوں کے پروں سے ملتی جلتی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ مارگریتا سمجھ گئی کہ وہاں مہمانوں کا جم غفیر ناچنے میں مصروف ہو گیا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس وحشت ناک ہال کے مرمر، یاقوت اور کرسٹل سے بنے فرش بھی موسیقی کی لے پر دھڑک رہے ہیں۔

مارگریتا کے لئے اب نہ تو قیصر اعظم اور نہ ہی مسولینی میں کوئی دلچسپی رہ گئی تھی۔ اسے اپنے سامنے پیش ہونے والے بادشاہوں، نوابوں، کیمیادانوں، جادوگروں، شعبدہ بازوں، قاتلوں، ڈاکوؤں، رہزنوں، چوراچکوں، قیدیوں اور مقتولوں میں کسی قسم کی دل چسپی نہیں رہی تھی۔ ان تمام لوگوں کے نام اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے اور ان سب کے چہرے ایک دوسرے سے چپک کر ایک بہت بڑے گلوب میں تبدیل ہو گئے تھے۔اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور اسے خدشہ تھا کہ کسی بھی لمحے اس کے آنسو بہہ نکلیں گے۔اس کا بوسہ زنی کا شکار گھٹنہ شدید اذیت دے رہا تھا اور کافی سوج بھی گیا تھا۔اس کی جلد نیلی پڑ چکی تھی۔ تقریب کے دوران تین چار مرتبہ نتاشا کے نرم ہاتھ اس کے گھٹنے پر کسی تیز خوشبودار کریم کا لیپ بھی کر چکے تھے لیکن یہ دوا شاید ناکافی ثابت ہوئی تھی۔ تیسرے گھنٹے کے آخر میں مارگریتا نے ناامیدی سے بھری نگاہیں جب نیچے ڈالیں تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ مہمانوں کا ریلا اب ختم ہونے کو تھا۔

ملکہ عالیہ۔ ہر بڑی ضیافت کے اصول ایک جیسے ہوتے ہیں۔ فاگوٹ سرگوشی کر رہا تھا۔ ہجوم ابھی چھٹنا شروع ہو جائے گا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم اس وقت چند آخری لمحے بھگت رہے ہیں۔ یہ ابھی بروکس کے آوارہ گردوں کا ٹولہ وارد ہوا ہے۔ یہ لوگ عموماً آخر میں ہی آیا کرتے ہیں۔ جی ہاں، یہ بالکل وہی لوگ ہیں۔شراب کے نشے میں دھت ویمپائروں کی جوڑی۔بس؟ اوہ نہیں۔ایک اور، نہیں نہیں دو اور!

زینے پر آخری دو مہمان لپکے آ رہے تھے۔ ارے ہاں، یہ کوئی نووارد ہے۔ فاگوٹ بتا رہا تھا۔ ایک مرتبہ عزازیل نے ذکر کیا تھا کہ کیسے اس کی ملاقات اس شخص سے ہوئی تھی اور عزازیل نے اسے اپنے مشورے سے نوازا تھا کہ ایک ناپسندیدہ ملاقاتی سے کیسے چھٹکارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔عزازیل کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس شخص نے دفتر کی تمام دیواروں پر زہر کا چھڑکاؤ کرنے کے عوض ایک ملازم

کی جیب خوب گرم کردی تھی۔

کیا نام ہے اس کا؟ مارگریتا نے پوچھا۔

ایمانداری کی بات ہے میں خودنہیں جانتا۔ فاگوٹ نے جواب دیا۔ عزازیل سے پوچھنا پڑے گا۔

اس کے ساتھ کون ہے؟

وہی ملازم جس نے زہر چھڑکا تھا۔ میں بے حد متاثر ہوں جناب؟ فاگوٹ مہمانوں کی آخری جوڑی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

سیڑھیاں سنسان ہوچکی تھیں۔ احتیاطاً چندمنٹ مزید انتظار کیا گیا لیکن انگیٹھی سے کوئی اور برآمدگی نہ ہوئی۔

نجانے یہ کیسے ہوا لیکن چندلمحوں بعد مارگریتا دوبارہ تالاب والے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔ بازو اور گھٹنے کے درد سے بے چین ہوکر وہ رونے لگ گئی اور فرش پر چت ہوگئی۔ گیلہ اور نتاشا اسے تسلی دیتی ہوئی دوبارہ خونی بارش کے نیچے لے آئیں اور اس کے جسم کی مالش کرنے لگ گئیں,جس سے مارگریتا ازنو ہشاش بشاش ہوگئی۔

ابھی کچھ دیر اور، میری ملکہ عالیہ مارگو! فاگوٹ مارگریتا کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ابھی تمام ہال کمروں میں پرواز کرنا بہت ضروری ہے۔ مہمانوں کو یہ احساس قطعاً نہیں ہونا چاہیے کہ میزبان انہیں بھول گئے ہیں۔

مارگریتا تالاب والے کمرے سے اڑان بھرتی ہوئی ہال میں نکل آئی۔ پھولوں کی دیوار کے پیچھے جہاں کچھ دیر قبل موسیقی کا شہنشاہ اپنے فن کا مظاہرہ کررہا تھا اب بندروں کا ایک غول 'جاز' بجارہا تھا۔ ایک جسیم گوریلا جس کے چہرے کے دونوں جانب لمبے لمبے بال لٹک رہے تھے ہاتھوں میں بھاری بھرکم بگل اٹھائے، اچھل کود کرتے ہوئے سازندوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

بھورے رنگ کے بندر پہلی قطار میں بیٹھے روشنی میں جگمگاتے بگل بجارہے تھے۔ ان کے سروں کے عین اوپر دوسری قطار میں شوخ چیمپینزی ہارمونیم بجانے میں مصروف تھے۔ دو لمبے چوڑے سینے والے بابون پیانو بجارہے تھے۔ جبکہ گیبون اور افریقی نسل کے پستہ قامت سیاہ بندر وائلن اور سیکسوفون پر طوفان بپا کئے ہوئے تھے۔ شیشے کی مانند شفاف فرش پر ان گنت جوڑے حیرت انگیز مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہی سمت میں گھومتے ہوئے ناچ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ راستے میں پڑنے والی ہر چیز کو روند کر نکل جائیں گے۔ زندہ شیطانی تتلیاں ناچنے والوں کے اوپر قلابازیاں لگا رہی تھیں۔ چھت سے پھولوں کی بارش ہورہی تھی۔ بجلی کے قمقمے گل ہوتے ہی فوراً ستونوں پر لگی مشعلیں روشن ہوجاتیں اور فضا میں ہزاروں جگنو

جگمگانے لگ جاتے۔

مارگریٹا پرواز کرتی ہوئی ایک ناقابل یقین حد تک کشادہ تالاب کے کنارے پہنچ گئی۔ تالاب کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت ستون کھڑے تھے اور ایک بہت بڑے اژدھا نما پتھر کے مجسمے کے ادھ کھلے دہانے سے گلابی رنگ کے محلول کا فوارہ تالاب میں گر رہا تھا۔ تالاب سے شیمپین کی مسحورکن مہک اٹھ رہی تھی۔ یہاں بے پناہ مسرت اور لطافت کا راج تھا۔ خواتین قہقہے بلند کرتی ہوئی اپنے بیگ ہمسفروں یا سیاہ فاموں کے حوالے کرنے کے بعد کلکاریاں بھرتی تالاب میں کود رہی تھیں۔

تالاب سے جھاگ اڑاتی لہریں فضا میں بلند ہو رہی تھیں۔ تالاب کے شفاف فرش سے ہلکی سی روشنی پھوٹ رہی تھی جس میں خواتین کے تیرتے ہوئے چاندی جیسے جسم بخوبی دیکھے جا سکتے تھے۔ نہانے کے بعد نشے میں چور لڑکھڑاتی خواتین تالاب سے برآمد ہو رہی تھیں۔ فضا میں ہر سو قہقہے بکھر رہے تھے۔

افراتفری کے اس عالم میں مارگریٹا کو نشے میں مدہوش صرف ایک چہرہ یاد رہ گیا تھا۔ جس کی بے رونق لیکن التجا کرتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مارگریٹا کے ذہن میں ایک ہی نام ابھرا تھا ''فریدہ''۔ شراب کی تیز مہک سے مارگریٹا کا سر چکرانے لگا تھا اور وہ وہاں سے نکل جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ بلے بیگیموت نے ایک نیا شعبدہ دکھانے کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے مارگریٹا کچھ دیر مزید رکنے پر مجبور ہو گئی۔ بیگیموت نے اژدھے کے دہانے کے قریب پہنچ کر کچھ جنتر منتر پڑھا جس پر بلبلے بناتی شیمپین کسی آبشار کے مانند شور مچاتی اژدھے کے منہ میں واپس چلی گئی اور تالاب خالی ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اژدھے نے جھاگ بنانے والے محلول کی جگہ گہرے براؤن رنگ کا محلول تالاب میں اگلنا شروع کر دیا۔

خواتین شوخیاں کرتی ہوئی چلا اٹھیں ۔۔۔۔ برانڈی۔ برانڈی

خواتین کا ہجوم تالاب کنارے ایستادہ ستونوں کے عقب میں چلا گیا۔ تالاب چند سیکنڈ میں لبالب بھر گیا۔ بلے نے ہوا میں تین قلابازیاں لگائیں اور لہریں اٹھاتی برانڈی میں چھلانگ لگا دی اور جب وہ برانڈی کی کلیاں کرتا ہوا تالاب سے برآمد ہوا تو اس کی ٹائی کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا, جبکہ مونچھوں کا سنہرا پن سرے سے غائب ہو گیا تھا۔ اس کی دوربین غالباً غوطہ خوری کے دوران تالاب میں گر گئی تھی۔ اس کی تقلید کرنے والی واحد خاتون ماسکو کی مشہور درزن, نائیکہ تھی۔ ایک سانولا نوجوان اس کی سنگت کر رہا تھا۔ دونوں نے برانڈی کے تالاب میں چھلانگ لگا دی اور اسی وقت فاگوٹ مارگریٹا کا ہاتھ تھامے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

مارگریٹا کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ پتھر کے بنے وسیع و عریض تالابوں کے اوپر پرواز کر رہی ہے۔ یہ تالاب رنگ برنگ کی مچھلیوں سے اٹے پڑے ہیں اور پھر اسے شیشے سے بنا وہ فرش دکھائی دیا جس کے نیچے جہنم کی آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ ان شعلوں کے درمیان سفید لباس پہنے باورچی شمشیر

زنی کر رہے تھے۔ مارگریٹا کی عقل اب منطق سے عاری ہوتی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس نے کچھ نیم روشن تہہ خانے دیکھے ہیں جن میں مشعلیں جل رہی تھیں اور نیم عریاں دوشیزائیں دہکتے کوئلوں پر بھنا گوشت مہمانوں کو پیش کر رہی تھیں۔ مہمان میزوں پر بیٹھے مارگریٹا کا جام صحت نوش کر رہے تھے۔ بعدازیں اسے سفید ریچھوں کا ایک غول دکھائی دیا جو ہاتھوں میں باجے اٹھائے موسیقی کی دھن پر اچھل اچھل کر ناچ رہے تھے۔ اب مارگریٹا کی ہمت دوبارہ جواب دیتی جارہی تھی۔

یہ آخری پرواز ہے میری ملکہ۔ فاگوٹ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کے بعد ہم آزاد ہوں گے۔

وہ فاگوٹ کی رہنمائی میں دوبارہ اڑتی ہوئی ہال میں پہنچ گئی جہاں ناچ گانا اب اختتام کو پہنچ چکا تھا اور مہمان ستونوں کے درمیان کچھ اس طرح جمع تھے کہ ہال کے عین وسط میں ایک دائرے کی صورت میں کچھ جگہ خالی بچی تھی۔ مارگریٹا کو قطعاً یاد نہیں کہ کس نے اسے اس نمایاں دکھائی دینے والے چبوترے پر کھڑا ہونے میں مدد دی تھی۔ جونہی مارگریٹا اس چبوترے پر بلند ہوئی تو اسے آدھی رات کا اعلان کرنے والے گھڑیال کی آواز سن کر بہت حیرت ہوئی کیونکہ رات کے بارہ تو کئی گھنٹے پہلے بج چکے تھے۔

گھڑیال نے جونہی بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ مہمانوں کے ہجوم پر خاموشی طاری ہوگئی اور مارگریٹا کو ولاند دوبارہ دکھائی دیا۔

اس کے دائیں جانب عزازیل، بائیں جانب عبیدون اور عقب میں عبیدون سے مشابہہ چند نوجوان چلے آرہے تھے۔ اس کے لئے مارگریٹا کے بالمقابل ایک الگ چبوترہ تیار کیا گیا تھا لیکن وہ اس چبوترے پر نہیں چڑھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی بڑی تقریب میں بھی ولاند وہی پہلے والا میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے ہاتھ میں تلوار پکڑ رکھی تھی جسے وہ بطور عصا استعمال کر رہا تھا۔ ولاند لنگڑاتا ہوا اپنے لئے مختص چبوترے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ عزازیل ہاتھوں میں ایک طشتری اٹھائے ولاند کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ طشتری میں دانتوں سے عاری، گردن سے کٹا ایک انسانی سر رکھا تھا۔ ہال میں مکمل سناٹا چھا گیا۔ اس دوران کہیں دور سے کسی دروازے پر لگی گھنٹی کی مدھم سی آواز سنائی دی۔

مائیکل بیرلی! دھیمی آواز میں ولاند کٹے ہوئے سر سے مخاطب ہوا۔ مردے کی پلکیں اوپر کو اٹھ گئیں۔ ایک جھرجھری لینے کے بعد مارگریٹا نے دیکھا کہ ان آنکھوں سے کس طرح دانش اور اذیت جھلک رہی تھیں۔

''ساری پیش گوئیاں درست نکلیں نا؟ کیوں سچ کہہ رہا ہوں نا؟'' ولاند کٹے ہوئے سر کو کہہ رہا تھا۔ ''سر ایک عورت کے ہاتھوں کٹ گیا۔ میٹنگ کینسل ہوگئی۔ اور میں تمہارے فلیٹ میں رہ رہا ہوں۔ یہی

حقیقت ہے اور حقیقت اس دنیا میں سب سے کڑوی گولی ہے۔ لیکن ہماری دل چسپی اب مستقبل میں ہے نہ کہ گزرے ہوئے واقعات میں۔ تم ہمیشہ سے اس نظریئے کے قائل رہے ہو کہ سر کٹنے کے بعد انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہ راکھ میں تبدیل ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ اپنے ان مہمانوں کی موجودگی میں جو کہ خود تمہارے اس نظریئے کے غلط ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں، میں بصد مسرت یہ اعلان کرتا ہوں کہ تمہارا نظریہ یقیناً وزن بھی رکھتا ہے اور تمہاری بھرپور دانش کا آئینہ دار بھی ہے۔ لیکن نظریئے تو بہر حال بدلتے بھی رہتے ہیں اور ایک دوسرے پر حاوی بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ان نظریوں میں ایک نظریہ ایسا بھی ہے جس کے مطابق ہر کسی کو اس کے ایمان کے مطابق ہی صلہ ملے گا۔ جی ہاں۔ ایسا ہی ہوگا۔ تم مفقود الوجود ہونے جا رہے ہو اور مجھے اس پیالے سے، جس میں تم تبدیل ہونے جا رہے ہو، لازوالیت کا جام پیتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہوگی''۔

ولاند نے تلوار ہوا میں بلند کر لی۔ کٹے ہوئے سر کی چمڑی پہلے نیلی اور پھر سیاہ ہونے کے بعد چھوٹے چھوٹے ریزوں کی صورت میں زمین پر بکھر گئی۔ اس کی آنکھیں غائب ہو گئیں اور چند ہی لمحوں میں طشتری پر زمردی آنکھوں والی موتیوں جیسے دانتوں سے جڑی زردی مائل کھوپڑی پڑی نظر آ رہی تھی۔ کھوپڑی کا بالائی حصہ جوڑ سے اکھڑ کر دور جا گرا۔

''ابھی چند لمحوں میں، میرے آقا''۔ فاگوٹ ولاند کے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ ابھی آپ کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔ مجھے اِس موت کے سناٹے میں اُس کے جوتوں کی چرچراہٹ بخوبی سنائی دے رہی ہے اور ابھی ابھی مجھے اُس شیمپین بھرے گلاس کے میز سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی ہے جو کہ اُس کی زندگی کا آخری مشروب ہوگا۔ لیجئے، وہ حاضر ہو گیا ہے''۔

ہال میں داخل ہونے والا مہمان سیدھا ولاند کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بظاہر یہ شخص دوسرے مرد مہمانوں سے مختلف نہیں تھا لیکن دور سے دیکھنے پر بھی صاف پر نظر آ رہا تھا کہ وہ پریشانی کے عالم میں لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے۔ اس کے گالوں پر سرخی مائل دھبے ظاہر ہو گئے تھے اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ مہمان حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتا لگ رہا تھا۔ ہال کی ہر چیز اور بالخصوص ولاند کا لباس اس کے لئے اچنبھے کا باعث بن رہے تھے۔

''ارے میرے عزیز نواب مائیکیل!'' چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے ولاند نے حیرت زدہ مہمان کو مخاطب کیا۔ ہجوم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا۔ ''میں اعلیٰ مقام نواب مائیکیل کو آپ لوگوں سے متعارف کرواتا اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔ میرے قابل احترام مہمان اس سرکاری ادارے میں ملازم ہیں جو غیر ملکیوں کو شہر کے تاریخی اور قابل ذکر مقامات کی سیر کرواتا ہے''۔

مارگریٹا کو یاد آیا کہ وہ اس مائیکیل نامی مہمان کو متعدد بار شہر کے تھیٹروں اور ریستورانوں میں دیکھ چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی بھی موت ہو چکی ہے۔ مارگریٹا کو اپنے خدشات کا فوراً ہی جواب مل گیا۔

''میرے پیارے نواب صاحب''۔ والاند بول رہا تھا۔''اس قدر مہربان ہیں کہ ماسکو میں میری آمد کی اطلاع ملتے ہی انہوں نے فوراً مجھے فون کیا اور شہر سے شناسائی کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ انہیں اپنے ہاں مدعو کرنا میں اپنے لئے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں''۔

اس دوران مارگریٹا کی نظر عزازیل پر جا پڑی جس نے طشتری فاگوٹ کے حوالے کر دی تھی۔

''ہاں تو جناب نواب صاحب!'' والاند نے نسبتاً دھیمی آواز میں دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔''شہر میں آپ کی ضرورت سے زیادہ متجسس ہونے کی خبریں گشت کر رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ کا ضرورت سے زیادہ تجسس میں مبتلا ہونا اور باتونی ہونا، بہت سے لوگوں کی توجہ آپ کی جانب مبذول ہونے کی وجہ بنا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ بہت سی زبانوں نے تو یہ زہر اگلنا شروع کر دیا ہے کہ آپ ہر دروازے پر کان لگاتے پھرتے ہو اور غالباً جاسوسی بھی کرتے ہو۔ ہمیں دور افق پر لکھا نظر آ رہا ہے کہ آپ کی زندگی کا سفر زیادہ سے زیادہ ایک مہینے تک انتہائی خوفناک طریقے سے ختم ہونے والا ہے۔ چونکہ آپ نے از خود ہمارا مہمان بننے کی پیش کش کی ہے اور دل ہی دل میں اپنی آنکھوں اور کانوں کا بے دریغ استعمال کرنے کی ٹھان رکھی ہے اس لئے ہم نے آپ کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ آپ کو انتظار کی اذیت سے چھٹکارہ دلایا جا سکے''۔

نواب کا رنگ عبیدون سے بھی زیادہ سفید ہو گیا۔ عبیدون نواب کے سامنے آن کھڑا ہوا اور اس نے ایک لمحے کے لئے اپنا چشمہ اتار لیا۔ عزازیل کے ہاتھوں میں کوئی چیز چمک رہی تھی۔ کچھ چھلکنے کی آواز آئی اور نواب نے نیچے گرنا شروع کر دیا۔ تازہ بھاپ اڑاتا خون کا فوارہ اس کے سینے سے امڈ پڑا اور اس کی سفید بے داغ قمیض پر نقش و نگار بناتا ہوا زمین پر ٹپکنے لگ گیا۔ فاگوٹ نے ایک پیالہ اس فوارے کے نیچے رکھ دیا اور جونہی پیالہ لبریز ہوا اسے والاند کو پیش کر دیا۔

''یہ جام آپ حضرات کی صحت کے نام ہے''۔ والاند نے یہ کہتے ہوئے پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ جونہی پیالے نے والاند کے ہونٹوں کو چھوا اُس کی ہیئت یکسر تبدیل ہو گئی۔ اس کی بوسیدہ میلی کچیلی قمیض اور خستہ حال جوتے غائب ہو گئے۔ ان کی جگہ سیاہ رنگ کے لمبے کوٹ نے لے لی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مارگریٹا کے پاس پہنچا اور پیالہ اسے تھماتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔

پیئو۔

مارگریٹا کا سر چکرانے لگ گیا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا اٹھے۔ لیکن اس دوران پیالہ اُس کے لبوں

کو چھو چکا تھا۔ اور کچھ نامانوس آوازیں اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

ڈرو نہیں ملکہ۔۔۔۔۔۔۔ ڈرو نہیں۔ خون تو کب کا زمین میں سما چکا اور جہاں جہاں گرا تھا وہاں اب انگور کی بیلیں لہلہا رہی ہیں۔

مارگریتا نے آنکھیں کھولے بغیر گھونٹ بھرا اور ایک میٹھی سی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ اس کے کانوں میں گھنٹیاں بج اٹھیں۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے بہت سارے مرغ یک زبان ہو کر کانوں کو بہرہ کئے دے رہے ہیں اور کہیں دور کسی نے فوجی پریڈ کی دھن چھیڑ دی ہے۔

مہمانوں کے ہجوم نے اپنی شکل کھونی شروع کر دی۔ فراک پہنے مرد اور برہنہ خواتین راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئیں۔ ہال کی وسعت سکڑتی جا رہی تھی اور فضا مردار کے تعفن سے آلودہ ہوتی جا رہی تھی۔ ستون غائب ہو گئے، روشنیاں گل ہو گئیں۔ نہ چشمے رہے نہ پھول اور نہ ہی اژدھے کا شراب اگلتا دہانہ۔ جب آنکھیں اس تبدیلی سے کچھ مانوس ہوئیں تو مارگریتا نے خود کو سنار کی بیوی کے عام سے فلیٹ کے لاؤنج میں کھڑے پایا جہاں خواب گاہ کے ادھ کھلے دروازے سے روشنی کی ایک باریک لکیر نظر آ رہی تھی۔ مارگریتا نے اس دروازے کو کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔

باب ۲۴

ماسٹر کی آمد

ولاند کی خواب گاہ میں ہر چیز پہلے کی طرح ہی تھی۔ ولاند ایک قمیض پہنے بستر پر بیٹھا تھا اور گیلہ اس کی ٹانگ پر مرہم لگانے کی بجائے اُس میز پر کھانا لگا رہی تھی جہاں اس سے قبل شطرنج کی بازی لگی تھی۔ فاگوٹ اور عزازیل اپنے فراک اتارنے کے بعد کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ ان کے پاس اس سنگت کا سب سے اہم رکن بلاّ براجمان تھا، جواب بھی اپنی جھاڑن میں تبدیل شدہ ٹائی سے جدا ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ مارگریٹا لڑکھڑاتی ہوئی میز کے نزدیک پہنچی اور اس کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی۔ ولاند نے تھکن سے چور مارگریٹا کو اپنے پاس بستر پر بٹھالیا۔

''کیا بات ہے؟ لگتا ہے کہ آپ کو ضرورت سے زیادہ زحمت دی گئی ہے''۔ ولاند نے پوچھا۔

''جی نہیں میرے آقا''۔ مارگریٹا نے بصد مشکل جواب دیا۔

''میں آپ کا پالتو خدمت گزار ہوں، ملکہ عالیہ''۔ بلاّ چاپلوسی کرتے ہوئے بولا اور اس نے شفاف محلول سے بھرا ایک گلاس مارگریٹا کو پیش کر دیا۔

یہ ووڈکا ہے کیا؟ مارگریٹا نے دھیمے سے پوچھا۔

بلاّ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ ''کیا میں اتنا گستاخ ہوں کہ ایک قابل احترام خاتون کو ووڈکا پیش کروں گا؟ محترمہ یہ خالص ترین سپرٹ ہے''۔

مارگریٹا دھیرے سے مسکرائی اور اس نے ایک ہاتھ سے گلاس کو اپنے سے پرے سرکانے کی کوشش کی۔

بے خوف ہو کر پی لیجیے۔ ولاند بولا اور مارگریٹا نے فوراً گلاس اٹھالیا۔

گیلہ ، بیٹھ جاؤ۔ ولاند نے حکم دیا اور مارگریٹا کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

پورے چاند کی رات جشن کی رات ہوتی ہے اور میں اس موقعہ پر رات کا کھانا ہمیشہ اپنے قریبی

لوگوں اور ملازمین کے ساتھ کھاتا ہوں۔ ہاں تو یہ بتائیے کہ اب آپ خود کو کیسا محسوس کر رہی ہیں۔ آج کا تھکا دینے والا جشن کیسا رہا؟

زبردست، بہت اعلیٰ۔ فاگوٹ گفتگو میں مخل ہوتے ہوئے بولا۔ ہم سب بہت خوش ہیں۔ بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ ہر لمحہ ہر مہمان کو داد دینے کو جی چاہ رہا تھا۔ اتنی عقل! اتنی کاریگری، اتنا رکھ رکھاؤ اور ایسا بھرم! نہ کبھی آنکھوں دیکھا اور نہ ہی کبھی کانوں سنا۔

ولاند نے خاموشی سے گلاس مارگریٹا کے گلاس سے ٹکرانے کے بعد اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ مارگریٹا نے بھی فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے سپرٹ سے بھرا گلاس پی لیا اور اس انتظار میں رہی کہ اس کی زندگی کا ابھی خاتمہ ہو جائے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ ایک زندگی سے بھرپور حدت اُس کی آنتوں میں پھیل گئی۔ اپنی گدی میں اسے ایک لطیف سا جھٹکا محسوس ہوا اور وہ یکا یک از سرِ نو ہشاش بشاش ہوگئی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ ایک طویل اور گہری نیند سے بیدار ہوئی ہے۔ اس پر شدید بھوک کا غلبہ حاوی ہوگیا۔ جب اسے یاد آیا کہ اس نے تو گذشتہ صبح سے کچھ نہیں کھایا تو بھوک اور بھی شدید ہوگئی۔

بیگیموت نے اناناس کی ایک قاش کاٹی، اس پر نمک اور کالی مرچ چھڑکنے کے بعد چسکے لے لے کر کھا گیا اور مستیاں کرتے ہوئے اگلے پنجوں کے بل کھڑا ہو کر سپرٹ کا دوسرا گلاس غڑپ کر گیا۔ ولاند اور ساتھیوں نے تالیاں بجا کر اس کے فن کی داد دی۔

مارگریٹا کے سپرٹ کا دوسرا گلاس حلق میں انڈیلتے ہی شمع دانوں میں موم بتیوں کی لو پہلے سے زیادہ روشن ہوگئی۔ انگیٹھی میں بھڑکتے آگ کے شعلوں نے الاؤ کی شکل اختیار کر لی۔ مارگریٹا اپنے مرمریں دانتوں سے بھنے ہوئے گوشت کا ٹکڑا چبا رہی تھی جس کا جوس اس کی ٹھوڑی سے بہتا ہوا جسم پر ٹپک رہا تھا۔ بیگیموت مچھلی پر سرسوں کی چٹنی کا لیپ کر رہا تھا۔

مارگریٹا بلّے کی پسلیوں میں انگلی چبھوتے ہوئے بولی۔ ''اس کے اوپر انگور کی بھی ایک تہہ لگا لو''۔

''مجھے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے''۔ بلا خفا ہوتا ہوا بولا۔ ''مجھے کھانے کی میز پر نستعلیق لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کا بہت وسیع تجربہ ہے''۔

واہ! اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ اس طرح بیٹھ کر کھانا کھانے کا اپنا ہی لطف ہے! فاگوٹ بولا۔

''نہیں فاگوٹ''، بلا سر دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بولا ''پارٹی میں لوگوں کے ہجوم اور ہلے گلے کا اپنا ہی مزہ ہے''۔

''بالکل نہیں، کیا مزے کا رکھا تھا اس ہجوم اور ہلے گلے میں؟ وہ کم بخت بھالو اور بار میں اودھم مچاتے شیروں کے غل غپاڑے نے میری دردِ شقیقہ کی نس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے''۔ ولاند بولا۔

''میں آپ کا پالتو ہوں میرے آقا! آپ کا ہر حکم میری عبادت ہے''۔ بلا بولا۔''اگر آپ کے خیال میں ہجوم اور بلا گا فضول تھے تو آج سے میری بھی یہی سوچ ہے''۔

''تم کچھ زیادہ ہی عقلمند ہوتے جارہے ہو''۔ ولاند نے طنزاً کہا۔

مذاق کر رہا ہوں میرے آقا۔ بلا کھسیانہ ہوتا ہوا بولا۔''میں ابھی شیروں کو بھون ڈالنے کا حکم دیتا ہوں''۔

شیر کو کھایا تو نہیں جاسکتا نا! گیلہ بولی۔

''یہ آپ کو خام خیالی ہے۔ میں آپ کو ایک دل چسپ قصہ سناتا ہوں''۔ بلا اس گفتگو سے لطف اندوز ہوتا ہوا بیان کرنے لگا کہ کیسے وہ ایک مرتبہ تنہا صحرا میں بھٹکتا رہا اور واحد خوراک جس نے اس کو زندہ رکھا وہ ایک شیر کا گوشت تھا جسے اس نے خود ہی شکار کیا تھا۔ سب لوگ بہت دل چسپی سے یکسوئی سے داستان سنتے رہے۔ جب اس کی کہانی ختم ہوئی تو سبھی یک زبان ہو کر بول اٹھے۔

''جھوٹ! بالکل جھوٹ!''

''اس کہانی کا ایک ایک لفظ جھوٹ ہے''۔ یہ ولاند کا تبصرہ تھا۔

''اچھا جی! یہ جھوٹ ہے؟'' بلا احتجاجاً چلایا اور خلاف توقع بحث کرنے کے بجائے بولا۔ تاریخ خود ہی ایک دن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردے گی۔

''اچھا، آپ ایک بات بتائیں''۔ مارگریتا نے عزازیل سے پوچھا۔'' آخر میں آنے والے مہمان 'سابقہ نواب' کو آپ نے گولی ماری تھی نا؟''۔

''جی ہاں، کیسے نہ مارتا۔ وہ اس کا حقدار تھا''۔ عزازیل نے جواب دیا۔

''میں تو یکدم خوف زدہ ہوگئی تھی''۔ مارگریتا نے کہا''یہ سب کس قدر غیر متوقع تھا!''۔

'' کچھ بھی غیر متوقع نہیں تھا''۔ عزازیل نے جواب دیا۔

فاگوٹ نے ایک زوردار ہچکی لی اور بولا۔'' کیسے غیر متوقع نہیں تھا؟ میرے بھی اعصاب خوف سے کانپ اٹھے تھے۔ ٹھاہ! اور نواب دھڑام سے زمین پر''۔

''میں بھی ہسٹریا کا شکار ہونے لگا تھا''۔ چمچ چاٹتے ہوئے بلا بولا۔

''مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آرہی''۔ کرسٹل کے گلاس سے منعکس ہونے والی شعاعوں سے مارگریتا کا چہرہ دمک رہا تھا۔''موسیقی کا شور اور اس تقریب کا ہنگامہ، کیا باہر سے سنائی نہیں دے رہا تھا؟''۔

''جی بالکل نہیں''۔ فاگوٹ سمجھانے لگا۔''یہ سب اس طرح کرنا چاہیے کہ باہر والوں کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ایسے کاموں میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے''۔

''جی ہاں، جی ہاں! مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب میں اور عزازیل اس طرف آ رہے تھے تو مجھے یوں لگا کہ عمارت کے دروازے کے قریب اور سیڑھیوں میں کچھ لوگ آپ کے فلیٹ کی نگرانی کر رہے ہیں''۔

''بالکل صحیح فرمایا آپ نے''۔ فاگوٹ نے تصدیق کی۔ ''کتنی گہری نظر ہے آپ کی میری محترم مارگریتا۔ آپ نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا ہے۔ وہ یقیناً فلیٹ کی نگرانی کر رہے ہیں۔ پہلے تو مجھے یہ گمان ہوا تھا کہ سیڑھیوں میں شائید کوئی مخبوط الحواس پروفیسر یا پھر کوئی نامراد عاشق کھڑا ہے۔ لیکن نہیں! نہیں! میرے دل کو کوئی انجانی سوچ جکڑے جا رہی تھی۔ جی ہاں! وہ یقیناً فلیٹ کی نگرانی پر ہی مامور تھا۔ اور وہ جو صدر دروازے پر کھڑا تھا وہ بھی اسی کا ساتھی تھا''۔

اچھا ایک بات بتائیں۔ اگر آپ کو گرفتار کرنے آ جائیں تو پھر کیا ہوگا؟ مارگریتا نے پوچھا۔

''بے شک آئیں گے! ضرور آئیں گے۔ میری ہر دل عزیز ملکہ''۔ فاگوٹ نے جواب دیا۔ ''میرا دل کہہ رہا ہے کہ آئیں گے۔ لیکن ابھی نہیں۔ وقت آنے پر ضرور آئیں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کوئی خاص دل چسپی کا واقعہ پیش نہیں آئے گا''۔

''اوہ! میں ابھی تک خوف زدہ ہوں۔ نواب کا زمین بوس ہوتا ہوا جسم ابھی تک میری آنکھوں میں گھوم رہا ہے''۔ مارگریتا بولی۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو قتل ہوتے دیکھا ہے۔ ''آپ یقیناً بہت اچھے نشانہ باز ہیں''۔

''آداب عرض ہے''۔ عزازیل نے سرخم کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کتنے قدموں کے فاصلے سے؟'' مارگریتا نے عزازیل سے مبہم سا سوال پوچھ لیا۔

''یہ صریحاً اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نشانہ کیا ہے''۔ عزازیل نے برجستہ جواب دیا۔ ''ہتھوڑے سے نقاد لاٹو کی کھڑکی کے شیشے پر ضرب لگانا ایک بات ہے لیکن اسی ہتھوڑے سے لاٹو کے دل کا نشانہ لگانا یکسر مختلف بات ہے''۔

''دل کا نشانہ!'' مارگریتا دایاں ہاتھ اپنے دل پر رکھتی ہوئی چلا اٹھی۔ دل کا نشانہ!۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں دوبارہ بولی۔

یہ نقاد لاٹو کیا بلا ہے؟ ولاند نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے مارگریتا سے پوچھا۔

عزازیل، فاگوٹ اور بیگموت نے نجانے کیوں شرماتے ہوئے ہاتھ منہ پر رکھ لئے۔ جبکہ مارگریتا کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ بولی۔

''ہے ایک بد بخت۔ آج شام میں نے اس کے فلیٹ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے''۔

ہت تیرے کی! وہ کیوں؟

''اس نے میرے آقا! ایک ماسٹر کو، میرے ماسٹر کو برباد کر دیا تھا''۔ مارگریٹا نے وضاحت کی۔

لیکن از خود یہ زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وولاند نے پوچھا۔

مجھے اجازت دیجئے میرے آقا۔ بلّے کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔

''تم آرام سے بیٹھو''۔ عزازیل نے بلّے کو دھتکارتے ہوئے کہا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں خود ابھی دیکھ کر آتا ہوں''۔

''نہیں۔ ہرگز نہیں، میرے آقا''۔ مارگریٹا چلا اٹھی۔ ''میں ہاتھ جوڑتی ہوں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''اچھا بھئی جیسے آپ کی مرضی''۔ وولاند نے کہا اور عزازیل اپنی جگہ واپس بیٹھ گیا۔

''ہاں تو ہماری گفتگو کہاں تک پہنچی تھی؟ میری بیش قیمت ملکہ عالیہ مارگو''۔ فاگوٹ نے اپنی گفتگو شروع کر دی۔ ''ہاں! دل کی بات ہو رہی تھی نا! دل کا نشانہ وہ اپنی مرضی سے لگاتا ہے''۔ فاگوٹ اپنی لمبی انگلی سے عزازیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''دل کے چاروں خانوں میں سے کسی کو بھی نشانہ بنا سکتا ہے۔ اوپر والے کو۔ نیچے والے کو۔ دائیں یا بائیں والے کو''۔

مارگریٹا کو یہ بات فوری طور پر سمجھ نہیں آئی اور جونہی یہ بات اس کے حلق سے نیچے اتری وہ حیرانگی کے عالم میں بول اٹھی۔

''لیکن دل کے چاروں خانے تو بند ہوتے ہیں!''

محترمہ! فاگوٹ کسی استاد کے انداز میں بولا۔ ''یہی تو اصل فن ہے۔ کھلی چیز پر تو کوئی بھی نشانہ لگا سکتا ہے۔ بند چیز کو اس کی صحیح جگہ نشانہ لگانا ہی اصل فن ہے''۔

فاگوٹ نے ایک دراز سے تاش کی گڈی نکالی اور چڑیا کا ستہ مارگریٹا کو پیش کرتے ہوئے بولا۔

''اس کے کسی بھی حصے پر ایک نشان لگا دیجئے''۔

مارگریٹا نے اوپر والے دائیں کونے کو اپنے ناخن سے کھرچ دیا۔ گیلہ نے یہ پتہ تکئے کے نیچے چھپا دیا اور بولی۔

تیار ہے۔

عزازیل نے، جو کہ تکیئے کی جانب پشت کئے بیٹھا تھا اپنی پتلون کی جیب سے ایک سیاہ رنگ کی پستول نکالی اور اس کی نالی اپنے شانے پر رکھنے کے بعد تکیئے کی جانب مڑے بغیر گولی چلا دی۔ مارگریٹا کی دبی دبی چیخ نکل گئی۔ تاش کا پتہ تکئے کے نیچے سے نکال لیا گیا۔ گولی نے حیرت انگیز طور پر مارگریٹا کے کھرچے ہوئے نمبر سات کو ہی نشانہ کیا تھا۔

''آپ کے ہاتھ میں پستول کی موجودگی میں آپ سے ملنا بہت خطرناک ہے''۔ مارگریٹا نے شوخ انداز میں عزازیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ وہ ہمیشہ سے اپنے فن میں مشاق لوگوں کی گرویدہ رہی ہے۔

''میری قابل قدر ملکہ عالیہ''۔ فاگوٹ بولا۔ ''میں تو یہ مشورہ دوں گا کہ اگر اس کے ہاتھ میں پستول نہ ہو تب بھی اس سے ملاقات نہ کرنے میں ہی بہتری ہے۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ سابقہ نواب نے بھی اس کے ساتھ ملاقات پر فخر نہیں کیا ہوگا''۔

بلّا جو اس تمام کاروائی پر خاموش رہا تھا اچانک بول پڑا۔

''میں ستے کو نشانہ لگانے کے ریکارڈ کو چیلنج کرتا ہوں''۔

عزازیل نے جواب میں بلّے کو کچھ ناشائستہ کلمات کہے۔ لیکن بلّا بضد تھا کہ وہ بیک وقت دو پستولوں کے ساتھ نشانہ بازی کرے گا۔ تاش کے ستے پر دو جگہ نشان لگانے کے بعد اسے تکیئے کے نیچے چھپا دیا گیا۔ عزازیل نے جیب سے ایک اور پستول نکال لی اور گھوڑا چڑھانے کے بعد دونوں پستول بلّے کے حوالے کر دیئے۔ بلّا کافی دیر تک نشانہ لگانے کی تیاری کرتا رہا۔ مارگریٹا نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور انگیٹھی پر بیٹھے الو پر ٹکٹکی باندھ لی۔ آخر کار بلّے نے دونوں پستولوں سے فائر کر دیا۔ گیلہ کی زور دار چیخ نکل گئی۔ خون آلود مردہ الو انگیٹھی سے نیچے آ گرا اور دیوار پر آویزاں گھڑیال شیشہ چکنا چور ہونے کے بعد ساکت ہو گیا۔ گیلہ جس کا ایک ہاتھ خون میں بھیگ گیا تھا ایک خوفناک چیخ کے ساتھ بلّے پر جھپٹ پڑی اور بلّے نے جواباً اپنے پنجے گیلہ کے بالوں میں گاڑ دیئے۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا فرش پر لوٹ پوٹ ہونے لگ گئے۔ ایک گلاس میز سے نیچے آ گرا اور چکنا چور ہو گیا۔

''میری جان چھڑاؤ اس چڑیل سے''۔ بلّا اپنے اوپر سوار گیلہ سے دفاع کرتے ہوئے بولا۔ دونوں نبرد آزما شیطانی چیلوں کو بصد مشکل علیحدہ کیا گیا۔ فاگوٹ نے گیلہ کی زخمی انگلی پر پھونک ماری اور اس کا زخم فوراً مندمل ہو گیا۔

''جب لوگ میری ناک کے نیچے باتیں کر رہے ہوں تو میں کبھی بھی صحیح نشانہ نہیں لگا سکتا''۔ بلّا سٹپٹا کر بولا۔ اس دوران وہ اپنی کمر سے نوچا گیا بالوں کا بڑا سا گچھا واپس چپکانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اب میری بات سنو''۔ وولاند مسکراتے ہوئے مارگریٹا سے مخاطب ہوا۔ ''میں یقین دلاتا ہوں کہ اس کم بخت نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ بلّا کا نشانہ باز ہے''۔

گیلہ اور بلّے میں صلح کرا دی گئی جس کی تصدیق دونوں نے بوس و کنار کے مظاہرے سے کر دی۔ تاش کا ستہ تکیئے کے نیچے سے نکال لیا گیا۔ عزازیل کی گولی سے نشانہ بننے والے سات کے ہندسہ کے سوا پورا پتہ صحیح سلامت تھا۔

''یہ نہیں ہوسکتا''۔ بلا پتے کو شمع کی روشنی میں دیکھتے ہوئے بولا۔

ان عجیب و غریب لیکن دلچسپ واقعات کے ساتھ رات کا کھانا جاری تھا۔ شمع دان پگھلتی ہوئی موم سے بھرتے جا رہے تھے۔ انگیٹھی سے لہروں کی صورت گرم اور خشک ہوا کمرے میں پھیل رہی تھی۔ مارگریتا دیکھ رہی تھی کہ کیسے عزازیل کے سگار سے اٹھنے والے دھوئیں کے دائرے انگیٹھی میں غائب ہو رہے تھے۔ بلا ایک تلوار کی نوک سے ان دائروں کو پرونے کی کوشش کر رہا تھا۔ باوجودیکہ بہت دیر ہو چکی تھی اُس کا دل وہاں سے جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ غالباً صبح کے چھ بجنے والے تھے۔ وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ولاند سے کہا۔ ''مجھے اب اجازت لینی چاہیے۔ بہت دیر ہو چکی ہے''۔

کہاں جانے کی جلدی ہے آپ کو؟ ولاند نے شائستہ لیکن تحکمانہ انداز میں پوچھا۔ بقیہ تمام لوگ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ دھوئیں کے دائروں کی طرف متوجہ ہیں، خاموش رہے۔

جی ہاں، مجھے اب چلنا چاہیے۔ مارگریتا اس صورت حال سے سٹپٹاتی ہوئی بولی۔ اور دائیں بائیں اس انداز سے نظریں دوڑانے لگ گئی کہ جیسے کوئی لباس یا شال ڈھونڈ رہی ہو۔ اچانک اسے اپنی عریانی پر شرمندگی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ولاند نے بستر پر پڑا اپنا سلوٹوں سے بھرا بوسیدہ گاؤن خاموشی سے اٹھایا اور فاگوٹ کے حوالے کر دیا۔ فاگوٹ نے گاؤن مارگریتا کے شانوں پر ڈال دیا۔

میں آپ کی شکرگزار ہوں۔ مارگریتا دھیمی آواز میں بولی اور سوالیہ نگاہوں سے ولاند کو دیکھنے لگ گئی۔

ولاند نے جواباً چہرے پر مسکراہٹ بھر لی۔

مارگریتا کے سینے پر اچانک ایک سیاہ سانپ لوٹنے لگ گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دھوکے کا شکار ہو گئی ہے۔ تقریب میں اس کی کاوش اور محنت کا اسے کوئی صلہ ملنے والا نہیں ہے اور نہ ہی ان لوگوں میں سے کوئی اس کے دکھ بانٹنے والا ہے۔ اب اس پر یہ حقیقت بھی عیاں ہونے لگی تھی کہ یہاں سے اس کے لئے کوئی راہ فرار نہیں ہے۔ اپنے گھر واپس جانے کی ایک ہلکی سی امید کی سوچ نے اسے بے چین کر دیا۔ شائید پوچھ لینا چاہیے۔ عزازیل نے پہلی ملاقات میں اسے یہی مشورہ دیا تھا۔ ''نہیں، کسی صورت نہیں''۔ اس نے خود سے کہا۔

''اچھا، اجازت دیجئے میرے آقا''۔ وہ بلند آواز میں بولی۔ اس دوران وہ سوچ رہی تھی کہ بس اب کسی طرح یہاں سے نکل جاؤں اور دریا میں چھلانگ لگا دوں۔

''ذرا تشریف تو رکھیں''۔ یکا یک ولاند نے حکم دیا۔

مارگریتا کا چہرہ متغیر ہو گیا اور وہ فوراً بیٹھ گئی۔

''شائید آپ جانے سے پہلے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟''۔

''نہیں ۔کچھ نہیں میرے آقا''۔ مارگریٹا نے باوقار انداز میں جواب دیا۔''میرے لئے اگر کوئی اور حکم ہے تو میں بصد خوشی آپ کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ میں بالکل نہیں تھکی ،تقریب کا بھی میں نے بھرپور لطف اٹھایا ہے۔اگر یہ تقریب کچھ دیر اور جاری رہتی تو میں بخوشی اپنا گھٹنا بوسے کے لئے ہزاروں تماش بینوں اور قاتلوں کو پیش کیئے رکھتی''۔وہ چیرتی ہوئی نگاہوں سے والاند کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

برحق! بالکل صحیح کہہ رہی ہو! بلند خوفناک آواز میں والاند بولا۔

ایسا ہی ہونا چاہیے!

ایسا ہی ہونا چاہیے! کسی بازگشت کی طرح والاند کے حواریوں کی آواز آئی۔

ہم آپ کا امتحان لے رہے تھے۔والاند اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے بولا۔''کبھی بھی،کسی سے بھی ،کچھ نہ مانگنا! ہرگز نہیں اور کچھ بھی نہیں۔ بالخصوص ان لوگوں سے جو تم سے زیادہ طاقتور ہیں۔وہ خود ہی تمہیں پیش کش کریں گے اور خود ہی تمہیں بن مانگے دے دیں گے۔بیٹھ جایئے،قابل احترام خاتون!''۔ والاند نے اپنا بھاری گاؤن مارگریٹا کے شانوں سے کھینچ لیا اور اس نے خود کو دوبارہ والاند کے بستر پر بیٹھا پایا۔

''ہاں تو مارگو'' والاند اب قدرے شائستہ انداز میں بول رہا تھا۔آج میرے ہاں میزبانی کا فریضہ انجام دینے کے عوض آپ کیا چاہتی ہیں؟ برہنہ حالت میں اس تقریب کی کاروائی میں شامل ہونے کے عوض کیا چاہتی ہو؟ اپنے گھٹنے کی کیا قیمت لگاتی ہو؟ میرے مہمانوں کے ہاتھوں،جنہیں تم نے ابھی تماش بین کہہ کر پکارا ہے تم نے کیا کھویا ہے؟ بولو! اب بغیر کسی جھجک کے بولو''۔

مارگریٹا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگ گیا۔اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور سوچ میں ڈوب گئی۔

''ہاں تو نڈر بنیئے نا'' والاند اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔''اپنی سوچنے کی صلاحیت کو بیدار کیجئے۔کسی خوف کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیں۔صرف اکیلی یہ حقیقت کسی انسان کو انعام دینے کے لئے کافی ہے کہ اس نے سٹیج پر اس ملعون نواب کا خون ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔بالخصوص جب یہ انسان ایک عورت ذات ہے''۔

مارگریٹا کے لئے سانس لینا دوبھر ہوگیا تھا۔وہ اپنے ذہن میں اکٹھے کئے گئے الفاظ کو بولنے ہی والی تھی کہ اچانک اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔اس کا منہ کھل گیا اور آنکھیں باہر کو ابل آئیں۔''فریدہ! فریدہ! فریدہ!'' اس کے کانوں میں کسی کی روہانسی ،التجا کرتی صدا گونجنے لگی۔''میرا نام فریدہ ہے''۔ مارگریٹا الفاظ کے تانے بانے میں الجھتی ہوئی بالآخر بولی۔

اچھا تو مطلب یہ ہوا کہ میں ایک بات کے لئے التجا کر سکتی ہوں؟

''مطالبہ کیجئے،مطالبہ میری بلند پایہ ملکہ''۔ والاند نے جواب دیا''ہم سے اپنی اس ایک بات کا

مطالبہ کیجئے''۔

ولاند مارگریٹا کے انداز بیاں سے متاثر ہوتے ہوئے اسی کے الفاظ ''ایک بات'' کو کسی آیت کی طرح دہرا رہا تھا۔

میں چاہتی ہوں کہ جس رومال سے فریدہ نے اپنے بچے کی سانس بند کی تھی وہ اسے پیش کرنا اب بند کر دیا جائے۔

بلّے نے آنکھیں آسمان کی طرف بلند کیں اور ایک ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد خلاف توقع خاموش ہو گیا۔ اسے غالباً تقریب کے دوران مارگریٹا کے ہاتھوں اپنے کان کا حشر یاد آ گیا تھا۔

''یہ بات مدنظر رکھتے ہوئے''۔ ولاند مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کہ آپ جیسی پروقار شخصیت نے تقریب کے دوران اس احمق فریدہ سے کسی صورت بھی رشوت قبول نہیں کی ہوگی میری سمجھ سے بالا ہے کہ میں کیا کروں۔ شائید اب ایک ہی حل بچتا ہے کہ میں ان چیتھڑوں سے اپنی خواب گاہ کے تمام سوراخ بند کرنے کا حکم دے دوں''۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میرے آقا؟''۔ الجھی ہوئی مارگریٹا یہ بے موقع اور بے ربط الفاظ سن کر بول اٹھی۔

''میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں میرے آقا''۔ بلّا گفتگو میں کود پڑا۔ انہی چیتھڑوں سے۔ اس نے بظاہر غصے میں پنجہ میز پر دے مارا۔

''میں رحم دلی کے بارے میں بات کر رہا ہوں''۔ ولاند اپنی شعلہ اگلتی نظریں مارگریٹا پر ٹکائے بولا۔ ''جو بعض اوقات غیر متوقع طور پر اور زبردستی چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں گھس آتی ہے۔ اسی لئے میں چیتھڑوں کی بات کر رہا ہوں''۔

''اور میں بھی یہی کہہ رہا ہوں''۔ بلّا بولا اور حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے گلابی کریم سے اٹے کانوں کو پنجوں سے ڈھانپتا ہوا مارگریٹا سے چند قدم پرے ہٹ گیا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے''۔ ولاند غصے سے بولا۔

''میں نے تو ابھی تک کافی بھی نہیں پی''۔ بلّا بولا۔ ''پھر میں بھلا کیسے یہاں سے چلا جاؤں میرے آقا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس تقریب کی رات مہمانوں کو دو کلاسوں میں تقسیم کر دیا جائے! پہلی کلاس ایک نمبر اور دوسری کلاس، معذرت کے ساتھ، دو نمبر''۔

''خاموش''۔ ولاند دھاڑا اور مارگریٹا کو مخاطب کرتا ہوا بولا۔ ''یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ انتہائی رحم دل انسان ہیں۔ بلند درجے کی شریف النفس انسان!''۔

''نہیں''۔ مارگریٹا نے پرزور انداز میں جواب دیا۔''میں جانتی ہوں کہ آپ کے ساتھ صرف سچ بولنا چاہیے اور میں آپ کو سچ بتا رہی ہوں کہ میں انتہائی چھوٹی سوچ کی انسان ہوں۔ میں نے آپ سے فریدہ کی سفارش صرف اس لئے کی ہے کہ میں اپنی بداحتیاطی کی وجہ سے اسے ایک ٹھوس امید دلا چکی ہوں۔ وہ انتظار میں ہے، میرے آقا۔ اسے میری مدد کا مکمل یقین ہے۔ اگر اس کے ساتھ دھوکہ ہوگیا تو میں سخت مکروہ صورت حال سے دوچار ہوجاؤں گی۔ مجھے ساری زندگی چین نہیں آئے گا!''۔

''جی ہاں۔ میں سمجھ سکتا ہوں''۔ ولاند نے مختصر جواب دیا۔

''تو آپ میری خاطر یہ کردیں گے؟'' مارگریٹا نے آہستگی سے دریافت کیا۔

''نہیں۔ کسی صورت نہیں''۔ ولاند نے جواب دیا۔''بات دراصل یہ ہے میری محترم ملکہ عالیہ، کہ یہاں ایک چھوٹی سی پیچیدگی ہے۔ ہر قوت صرف اپنے اپنے دائرہ اختیار میں رہ کر کام کرسکتی ہے۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ ہماری طاقت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ غالباً بہت سے نظیر سے عاری لوگوں کی سوچ سے بھی زیادہ''۔

''جی ہاں، ملکہ اس سے بھی کہیں زیادہ''۔ بلّے سے رہا نہ گیا اور اس نے پھر سے لقمہ دیا۔ اس کی آواز سے غرور اور فخر جھلک رہا تھا۔

''خاموش، بدذات!''۔ ولاند نے اسے ڈانٹ پلا دی اور مارگریٹا کے ساتھ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔''ہر کسی کا اپنی حدود میں رہنا بہت ضروری ہے۔ جب کوئی ایک قوت ایک مخصوص کام پر مامور ہے تو دوسری قوت کو اس میں ٹانگ اڑانے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ ہاں، تو میں یہ کام نہیں کروں گا۔ آپ خود ہی یہ کام کرنے کی مجاز ہیں''۔

''کیا مطلب؟ میرے کہنے پر یہ ہوسکتا ہے؟''۔

عزازیل نے مضحکہ خیز انداز میں اپنی ٹیڑھی آنکھ سے مارگریٹا کو گھورا۔ سر کو کچھ جھٹکے دیئے اور لمبی سی آہ بھر کر رہ گیا۔

ہاں تو کیجئے نا حکم! ولاند بولا اور جھک کر گلوب میں کچھ ڈھونڈنے لگ گیا۔ مارگریٹا سے گفتگو کے دوران وہ غالباً کسی اور مسئلے میں بھی الجھا ہوا تھا۔

ہاں تو فریدہ! فاگوٹ نے مارگریٹا کو یاد دلایا۔

فریدہ! مارگریٹا نے کھنکتی ہوئی آواز میں پکارا۔

دروازہ ایک آہٹ کے ساتھ کھل گیا اور مخبوط الحواس، عریاں لیکن اب نشے سے عاری غمگین آنکھوں والی خاتون دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور کسی بھکارن کے مانند ہاتھ پھیلائے مارگریٹا کے

سامنے کھڑی ہوگئی۔

مارگریتا پروقار انداز میں بولی۔

تمہاری سزا معاف کردی گئی ہے۔ آئندہ تمہیں رومال نہیں دکھایا جائے گا۔

خوشی سے فریدہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ مارگریتا کے سامنے دوزانوں ہوکر بیٹھ گئی اور سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ ولاند نے ہاتھ سے ایک اشارہ کیا اور فریدہ وہاں سے غائب ہوگئی۔

میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ یہ کہتی ہوئی مارگریتا اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہاں تو بیگیموت۔ ولاند بولا۔ ''آج کی تقریب کے روز ہم ایک انجان شخص کے غیر رسمی رویے کو تنقید کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔ مارگریتا کی جانب رخ موڑتے ہوئے وہ بولا۔ آپ کے لیئے تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ بتایئے اپنے لئے آپ کیا چاہتی ہیں؟

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

خاموشی کے عالم میں چند لمحے گزر گئے۔ فاگوٹ نے اس موقعہ پر مارگریتا کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

میری ہیروں جیسی ملکہ! میرا مشورہ مانو۔ اس بار دانش مندی سے کام لو۔ خوش قسمتی دروازے پر روز روز دستک نہیں دیتی۔

میں چاہتی ہوں کہ میرے محبوب ماسٹر کو ابھی، اسی لمحے مجھے لوٹا دیا جائے۔ مارگریتا کہہ گزری اور اس کے چہرے کی ایک ایک رگ پھڑکنے لگ گئی۔

کمرے میں تیز ہوا چلنے لگ گئی، موم بتیوں کی لو پھڑ پھڑا اٹھی، کھڑکی پر لٹکا دبیز پردہ نیچے آ گرا، کھڑکی کے پٹ زوردار آواز کے ساتھ کھل گئے اور دور بلندی پر دمکتا چودہویں کا چاند آدھی رات کے مانند روشن نظر آنے لگ گیا۔ کھڑکی سے گزرتی ہوئی روشنی نے کمرے کے فرش پر ایک سبزی مائل قالین بچھا دیا۔ اسی روشنی میں ایوان بے گھر کا انجان مہمان ''ماسٹر'' کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہ ہسپتال کے مریضوں والا یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ سر پر اس نے وہی سیاہ رنگ کی ٹوپی اوڑھ رکھی تھی جس سے وہ کبھی بھی جدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے غالباً کئی دنوں سے شیو نہیں بنائی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح خوف زدہ نظروں سے شمع دانوں کی جانب دیکھ رہا تھا اور چاندنی اس کے چاروں جانب ایک الاؤ روشن کیئے ہوئے تھی۔

مارگریتا نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ سسکیاں بھرنے لگ گئی اور دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کیئے دوڑتی ہوئی ماسٹر کے پاس پہنچ گئی۔ وہ والہانہ انداز میں اس کی پیشانی، رخسار اور ہونٹوں کو چوم رہی تھی اور وہ

آنسو جو اس نے عرصہ دراز سے ضبط کر رکھے تھے ایک سیلاب کی شکل میں بہہ نکلے تھے۔ وہ بار بار ایک ہی لفظ دہرائے جا رہی تھی۔

تم۔۔۔تم۔۔۔تم۔۔۔

ماسٹر اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے لرزتی آواز میں کہنے لگا۔

"مت رو، مارگو۔ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ میں شدید بیمار ہوں" اس نے ایک ہاتھ کھڑکی کی دہلیز پر رکھ دیا۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دے گا۔ وہ بار بار دانت پیس رہا تھا۔ کمرے میں موجود لوگوں کی جانب بغور دیکھتے ہوئے وہ چلا کر بولا "مجھے ڈر لگ رہا ہے مارگو! میرے دماغ پر خوفناک واہمے چھا رہے ہیں"۔

ماسٹر کی باتوں سے مارگریتا کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ روہانسی آواز میں اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہہ رہی تھی "نہیں، نہیں، بالکل نہیں ڈرو! میں ہوں نا تمہارے ساتھ، میں ہوں نا تمہارے ساتھ"

فاگوٹ نے اس دوران ایک سٹول ماسٹر کی جانب بڑھا دیا اور وہ اس پر بیٹھ گیا۔ مارگریتا گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گئی اور اپنے محبوب سے لپٹ کر سسکنے لگ گئی۔ اس دوران مارگریتا کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب اور کیسے اس کا عریاں جسم ایک لمبے سیاہ ریشمی کوٹ سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ مریض نے اپنا سر جھکا لیا اور بے قرار ہو کر خوف بھری نگاہوں سے فرش کو گھورنے لگ گیا۔

"اوہو۔ اس غریب کا تو حشر کر دیا گیا ہے"۔ دیر سے خاموش وولاند بولا۔ اس نے فاگوٹ کو حکم دیا کہ اس شخص کو پینے کے لئے کچھ پیش کیا جائے۔

مارگریتا کانپتی ہوئی آواز میں ماسٹر کو کہنے لگی۔ "پی لو، پی لو، تم خوف زدہ ہو۔ نہیں، نہیں، میرا یقین کرو یہاں صرف تمہاری مدد کرنے والے لوگ ہیں۔

مریض نے گلاس تھام لیا اور اس میں جو کچھ بھی تھا اسے پی گیا۔ اس دوران اس کے ہاتھ میں لرزش ہوئی اور گلاس فرش پر گرنے کے بعد چکنا چور ہو گیا۔

"خوش قسمتی، خوش قسمتی کی نشانی ہے یہ"۔ فاگوٹ نے تبصرہ کیا۔ "دیکھیں تو سہی اس کے اوسان بحال ہو رہے ہیں"۔

واقعتاً ماسٹر کی حالت تبدیل ہونے لگ گئی تھی۔ "یہ تم ہو مارگو؟" مہمان نے پوچھا۔

"غور سے تو دیکھو۔ میں ہی ہوں"۔ مارگریتا نے جواب دیا۔

"ایک گلاس اور"۔ وولاند نے حکم دیا۔

ماسٹر نے جونہی دوسرا گلاس حلق میں اتارا اس کی آنکھوں میں زندگی کی روشنی واپس لوٹ آئی۔

''بہت خوب! یہ ہوئی نا بات''۔ ولاند آنکھیں سکیڑتا ہوا بولا۔''آیئے اور اب اپنا تعارف کرایئے۔کون ہیں آپ؟''۔

''میں اب کوئی بھی نہیں ہوں''۔ ماسٹر نے جواب دیا۔ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پر چھا گئی۔

اس وقت آپ کہاں سے تشریف لائے ہو؟

دکھیاروں کے گھر سے۔ میں روحانی مریض ہوں۔نووارد مہمان نے جواب دیا۔ مارگریتا یہ الفاظ برداشت نہ کرسکی اور دوبارہ رونے لگ گئی۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی چیخ کر بولی۔''خوف ناک! کتنے خوف ناک ہیں یہ الفاظ۔ یہ ماسٹر ہے میرے آقا۔ میں آپ کو پابند کرتی ہوں کہ اسے ٹھیک کردیں۔ میرا یقین کیجئے وہ اس کا حقدار ہے''۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ اس وقت کس سے ہمکلام ہیں؟ ولاند نے نووارد سے پوچھا۔'' کیا آپ جانتے ہیں کہ اس وقت کس کی پناہ میں ہیں؟''۔

جانتا ہوں۔ ماسٹر نے جواب دیا۔ پاگل خانے میں میرا ہمسایہ ایک نوجوان ایوآن بے گھر تھا۔ اس نے مجھے آپ کے متعلق بتایا ہے۔

یاد آیا۔ یاد آیا۔ ولاند بولا۔ اس نوجوان سے ملاقات کا شرف مجھے شہر کے وسطی چوک میں حاصل ہوا تھا۔ اس نے تو مجھے بھی تقریباً پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ مجھے یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ میرا وجود ہی نہیں ہے۔ آپ تو اس بات پر یقین رکھتے ہیں نا کہ میں واقعی میں ہوں۔

جی ہاں، یقین تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ماسٹر بولا۔لیکن آپ کو بآسانی واہمے کا نتیجہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ میں اس بات کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

چلیں اگر اسی میں آسانی ہے تو ایسا ہی سہی۔ ولاند نے شگفتگی سے جواب دیا۔

نہیں، نہیں۔خوف زدہ مارگریتا بول اٹھی اور ماسٹر کے شانے جھنجھوڑتے ہوئے کہنے لگی۔ ہوش میں آؤ۔تمہارے سامنے وہ بذات خود موجود ہیں۔

بلا گفتگو میں ٹپک پڑا اور کہنے لگا۔''میری طرف دیکھئے میں واقعی واہمے کی طرح ہوں۔ ذرا چاندنی میں میری ہیت کو ملاحظہ کیجئے۔ وہ سرکتا ہوا چاند کی روشنی کے نیچے آن کھڑا ہوا۔ ابھی وہ کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ اسے خاموش رہنے کی تنبیہ کی گئی۔ اس نے جواب دیا۔'' ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے میں خاموش رہنے کو تیار ہوں۔ یوں سمجھئے کہ میں ایک خاموش واہمہ ہوں''۔

اچھا یہ بتایئے کہ مارگریتا آپ کو ماسٹر کے نام سے کیوں پکارتی ہے؟ ولاند نے پوچھا۔

ماسٹر نے ایک آہ بھری اور بولا۔''یہ ایک قابل معافی کمزوری ہے۔ میں ایک ناول لکھ رہا تھا۔

مارگریٹا کے خیال میں یہ ناول اعلیٰ درجے کی تصنیف تھا''۔

اس ناول کا موضوع کیا ہے؟ ولاند نے پوچھا۔

یہ ناول پونتی پلات کے متعلق ہے۔

کمرے میں اچانک پھر سے تیز ہوا چلنے لگ گئی اور موم بتیوں کی زبانیں نیچے کو لٹک گئیں۔ میز پر پڑے برتن آپس میں ٹکرانے لگ گئے۔ ولاند نے خوف ناک آواز میں ہنسنا شروع کر دیا لیکن اچنبھے کی بات یہ ہے کہ اس کی ہنسی نے نہ تو کسی کو خوف زدہ کیا اور نہ ہی حیرت زدہ۔ بیگیموت نجانے کیوں تالیاں پیٹنے لگ گیا۔

کیا؟ کیا کہا آپ نے؟ کس کے بارے میں؟ ولاند اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولا۔ یہ تو بہت عجیب سا موضوع ہے۔ آپ کو اس سے بہتر موضوع نہیں ملا کیا؟ لائیں دکھائیں مجھے۔ ولاند نے ماسٹر کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

بدقسمتی سے میں اب ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں نے ناول کو انگیٹھی کے شعلوں کی نذر کر دیا تھا۔

معاف کیجئے گا، میں نہیں مانتا۔ ولاند نے جواب دیا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہاتھ کے لکھے مسودے کبھی جلا نہیں کرتے۔ اس نے بلّے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بیگیموت ذرا ناول تو ادھر لانا۔

بلّے نے فوراً سٹول سے چھلانگ لگائی اور سب لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ سٹول کی بجائے کاغذوں کے پلندے پر بیٹھا تھا۔ بلّے نے پلندے کے اوپر والے کچھ اوراق تعظیم سے جھکتے ہوئے ولاند کو پیش کر دیئے۔ مارگریٹا کا پورا جسم کانپ اٹھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے پھر امڈ آئے۔ وہ چیخ کر بولی۔ ''یہ تو ہی مسودہ ہے۔ بالکل وہی ہے''۔ وہ دوڑتی ہوئی ولاند کے قریب پہنچ گئی اور فرط جذبات سے چیختی ہوئی کہنے لگی۔

ہر چیز پر قادر ہے! ہر چیز پر قادر ہے!

ولاند نے بلّے کے پنجے سے اوراق اچک لئے اور ایک نظر ڈالنے کے بعد بستر پر رکھ دیئے۔ وہ خاموش نگاہوں سے ماسٹر کو دیکھنے لگ گیا۔ لیکن ماسٹر نجانے کیوں بے چینی میں مبتلا ہوگیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور چاند پر نظریں مرکوز کیئے بولا۔ ''چاندنی رات مجھے بے چین کر کے رکھ دیتی ہے۔ کیوں مجھ سے میرا سکھ، میرا چین چھین لیا گیا ہے؟۔ اوہ خدایا۔ اوہ خدایا!''۔ مارگریٹا نے اسے آستین سے تھام لیا اور اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ وہ آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی بکھیرتے ہوئے بولی۔

اوہ خدایا۔ دوا اثر کیوں نہیں کر رہی؟

کوئی بات نہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ولاند ماسٹر کے قریب پہنچ کر بولا۔ ایک گلاس اور لاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بلکہ اس بار میں بھی آپ کا ساتھ دوں گا۔

تیسرے گلاس کے بعد ماسٹر واقعی پرسکون ہوگیا۔ اسے کرسی پر واپس بٹھا دیا گیا۔ اب سمجھ آئی کہ ماجرا کیا ہے۔ ولانداپنی لمبی انگلیوں سے مسودے کو کھنگالتے ہوئے بولا۔

بالکل سمجھ آگئی ہے بات۔ بلّے نے تائید کی۔ وہ غالباً اپنا خاموش واہمہ بننے کا دعویٰ بھول گیا تھا۔ یہ دل خراش کہانی اب پوری طرح واضح ہوگئی ہے۔ ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے عزازیل؟ اس نے اب تک خاموش عزازیل کوٹٹولنے کی کوشش کی۔

میں یہ کہہ رہا تھا۔ عزازیل نحوست بھری آواز میں بولا۔ کہ تمہیں دریا برد کر دینا ہی بہتر ہے۔

رحم کرو عزازیل۔ بلّے نے جواب دیا۔ میرے آقا کو اس قسم کے مشورے مت پیش کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر ایسا ہوا تو ہر چاندنی رات میں اس غریب ماسٹر کی طرح تمہارے سامنے ظاہر ہوتا رہوں گا اور پنجے جوڑ کر آنسو بہاتے ہوئے تمہارے سامنے بین کیا کروں گا۔ یہ تمہیں کیسا لگے گا عزازیل؟

جی مارگریٹا۔ ولاند دوبارہ گویا ہوا۔ بولو اب تمہیں کیا چاہیے؟

مارگریٹا کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہوگئی تھیں۔ اس نے التجا کی۔ ''میرے آقا مجھے اس کے کان میں کچھ کہنے کی اجازت چاہیے''۔ ولاند نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی۔ مارگریٹا نے ماسٹر کے اوپر جھکتے ہوئے اس کے کان میں کچھ کہا۔

جواب میں ماسٹر بلند آواز میں بولا۔ ''بہت دیر ہوچکی ہے۔ مجھے زندگی میں تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ لیکن میں تمہیں دوبارہ یہی مشورہ دوں گا کہ مجھے چھوڑ دو۔ میرے ساتھ تم برباد ہو جاؤ گی''۔

''نہیں۔ نہیں چھوڑوں گی''۔ مارگریٹا نے جواب دیا اور ولاند سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ ہمیں دوبارہ ماسٹر کے تہہ خانے میں بھیج دیا جائے۔ ہماری شمع پھر سے روشن کر دی جائے اور سب کچھ جیسے تھا ویسے ہی ہمیں لوٹا دیا جائے''۔

ماسٹر نے مارگریٹا کا سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور مایوسی سے بھری ہنسی کے ساتھ بولا۔

میرے آقا اس معصوم کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔ اس تہہ خانے میں عرصہ دراز سے کوئی دوسرا آدمی رہائش پذیر ہے۔ ویسے بھی زندگی میں ایسا تو نہیں ہوا کرتا کہ سب کچھ دوبارہ پہلے کی طرح ہو جائے۔ اس نے اپنا چہرہ مارگریٹا کے سر پہ رکھ دیا اور اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ ماسٹر کے آنسو مارگریٹا کے بالوں کو تر کرتے ہوئے ساون کی جھڑی کے مانند فرش پر ٹپک رہے تھے۔

''کیا کہا آپ نے؟ ایسا نہیں ہوا کرتا؟'' ولاند بولا۔ ''شائید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ پھر بھی ہم کوشش کر کے دیکھتے ہیں'' اُس نے ایک زوردار نعرہ بلند کیا۔ عزازیل!

ایک دھماکے کے ساتھ کمرے کی چھت شق ہوگئی اور ایک موٹا چربی چڑھا شخص ہاتھ میں صندوقچہ

تھامے کمرے کے فرش پر آ گرا۔ اس نے صرف بنیان اور جانگیا پہن رکھا تھا۔ وہ وحشت بھری بے معنی نظروں سے سب کو گھور رہا تھا۔ خوف سے اس شخص کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

مگارچ؟ عزازیل نے پوچھا۔

جی ہاں مگارچ ہی ہوں۔

تمہی نے اس شخص کے ناول پر لاٹو کی تنقید پڑھنے کے بعد حکام سے یہ شکایت کی تھی کہ اس شخص نے غیر قانونی تحریریں جمع کر رکھی ہیں؟

چھت سے نکلنے والا شخص یہ سن کر نیلا پڑ گیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔

تم اس تہہ خانے پر قبضہ کرنا چاہتے تھے نا؟ عزازیل نے اپنے لہجے میں ممکن حد تک نحوست بھرتے ہوئے کہا۔ کمرے میں بلے کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ اسی لمحے مارگریتا بھی چلاتی ہوئی بولی۔

''یہ لو اب چڑیل سے ملو۔ چڑیل سے ملو''۔ اس نے اپنے ناخن نووارد کے چہرے پر گاڑ دیئے۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟'' ماسٹر گھبرا کر بولا۔ ''خود کو ذلیل مت کرو مارگو!''۔

''میں احتجاج کرتا ہوں''۔ بلا بول اٹھا۔ ''اس میں ذلیل ہونے والی کوئی بات نہیں ہے''۔

شدید تگ و دو کے بعد فاگوٹ مارگریتا کو مگارچ سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوا۔

''میں نے تو وہاں ایک نیا غسل خانہ بھی تعمیر کروا دیا ہے''۔ مگارچ اپنے زخمی چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے بولا۔

''اچھی بات ہے نا۔ غسل خانہ تعمیر کروانا تو بہت ثواب کا کام ہے''۔ عزازیل بولا۔ ''اس زمانے کے ستائے ہوئے شریف آدمی کو ویسے بھی غسل خانے کی بہت ضرورت رہتی ہے۔ جہاں تک تمہاری ذات کا تعلق ہے۔۔۔۔۔'' وہ اچانک برہم ہوتا ہوا بولا۔ ''اب دفع ہو جاؤ یہاں سے''۔

مگارچ کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کی جانب ہو گئیں۔ کسی ان دیکھی شیطانی طاقت نے اُسے خواب گاہ کی کھڑکی سے باہر اچھال پھینکا۔

''میرے خیال میں یہاں کے حالات ایوآن کی بیان کردہ کہانی سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہیں''۔ سخت حیرانگی کے عالم میں اپنے چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے ماسٹر بولا۔ کچھ توقف کے بعد وہ بیگموت سے مخاطب ہوا۔

''تو یہ آپ ہیں؟ میرا مطلب ہے تم ہو؟ نہیں آپ ہو نا؟؟'' اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بلے کو آپ یا تم کہہ کر مخاطب کرنا چاہیے۔ ''آپ وہی بلا ہو نا جو ٹرام میں سفر کر رہا تھا؟''۔

''جی ہاں! میں وہی ہوں''۔ بلے نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ سن کر بہت مسرت

حاصل ہوئی ہے کہ آپ ایک بلّے کو اتنے احترام کے ساتھ مخاطب کر رہے ہو۔ ورنہ بلّوں کو تو عموماً تُو،
تڑاں کر کے ہی بلایا جاتا ہے۔ حالانکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج تک کسی ایک بلّے نے بھی انسان
کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی"۔

معلوم نہیں مجھے کیوں ایسا لگتا ہے کہ آپ کچھ بہت زیادہ۔ بلّا۔ نہیں ہو"۔اس نے قدرے جھجکتے
ہوئے کہا۔"بہرحال مجھے تو اب ہسپتال والے دوبارہ قابو کرلیں گے"۔ ماسٹر نے کہا۔

کیسے قابو کرلیں گے! فاگوٹ بول اٹھا۔اس نے ہاتھوں میں پکڑی ایک فائل اور کتابچہ ماسٹر کے
حوالے کردیا۔"یہ رہی آپ کی ہسپتال کی فائل اور ریکارڈ والا کتابچہ"۔ ماسٹر کو دکھانے کے بعد اس نے یہ
دستاویزات انگیٹھی میں جھونک دیں۔

"دستاویز کا ریکارڈ غائب تو بندہ بھی غائب"۔ بہت مطمئن انداز میں فاگوٹ بولا۔اس نے اپنا
بایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا تو ایک سرخ رنگ کا کتابچہ اس کی گرفت میں آ گیا۔اور وہ کہنے لگا۔

"یہ رہی تمہاری رہائش گاہ کی رجسٹری۔ دیکھتے ہیں اس میں کس کا نام درج ہے۔اوہو! یہاں تو
مگارچ کا نام درج ہے"۔کتابچے پر ایک پھونک مارنے کے بعد وہ بولا۔"لیجئے مگارچ غائب اور ماسٹر
حاضر۔اگر رجسٹرار کے دفتر والے حیران ہو جائیں اور سوالات پوچھنے لگیں تو کہہ دینا کہ مگارچ کا تو سرے
سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔تم لوگوں کو شائید خواب میں دکھائی دیا ہوگا"۔اسی دوران کتابچہ اس کے ہاتھ
سے غائب ہوگیا۔"لیں جناب کتابچہ واپس رجسٹرار کے دفتر پہنچ گیا ہے"۔

اس صورتحال پر ماسٹر نے کہا"آپ نے بالکل درست فرمایا کہ اگر دستاویز غائب تو بندہ بھی غائب۔
اسی لئے تو اب میں بھی غائب ہوں۔کیونکہ میرے پاس ثبوت کے طور پر کوئی دستاویز موجود نہیں ہے"۔

"جناب میں معذرت چاہتا ہوں"۔شوخ انداز میں فاگوٹ نے کہا۔"یہ بھی آپ کا واہمہ ہے۔
یہ رہی آپ کی دستاویز"۔اوراس نے ایک شناختی کارڈ ماسٹر کے حوالے کردیا۔ پھر اس نے اپنا روئے سخن
مارگریٹا کی جانب پھیر دیا اور بولا۔"یہ رہی آپ کی تمام جمع پونجی"۔اس نے ایک ادھ جلی کاپی، ایک خشک
گلاب کی کونپل، ایک تصویر اور دس ہزار روبل کی ایک بنک رسید مارگریٹا کے حوالے کردی اور کہا"یقین
مانیے ہم لوگوں نے آپ کی امانت میں کسی قسم کی خیانت نہیں کی"۔

"پرائی امانت کو چھونے سے پہلے میرے پنجے سوکھ کر جھڑ نہ جاتے؟"بلّا ماسٹر کے ناول کا مسودہ
ایک صندوقچے میں رکھتا ہوا بولا۔

اور یہ رہا آپ کا بھی شناختی کارڈ۔ فاگوٹ نے ایک دوسرا کارڈ مارگریٹا کو تھما دیا اور ولاند سے
مخاطب ہوتا ہوا بولا۔"میرے آقا! لگتا ہے کہ ہمارا کام اب مکمل ہوگیا ہے"۔

''نہیں،نہیں، ابھی نامکمل ہے''۔ والاند نے گلوب سے اپنی توجہ ہٹاتے ہوئے کہا۔''میری محترمہ! حکم کیجئے کہ آپ کی ملازمہ اوراس کے ساتھی سور کا کیا کیا جائے۔ میرے لئے ذاتی طور پران کا کوئی مصرف نہیں ہے''۔
اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور نتاشا برہنہ حالت میں دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔''آپ سدا خوش رہیں مارگریتا!'' پھراس نے ماسٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''مجھے تو سب معلوم تھا کہ آپ کہاں جاتی ہیں اور کس سے ملتی ہیں''۔
گھریلو خادمائیں عموماً سب جانتی ہیں''۔ بلّے نے لقمہ دیا۔ اس نے اپنا پنجہ فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔''یہ سوچنا کہ خادمائیں اندھی ہوتی ہیں بہت بڑی غلطی ہے''۔
''نتاشا! تم کیا چاہتی ہو؟'' مارگریتا نے پوچھا۔ میرا مشورہ ہے کہ گھر واپس لوٹ جاؤ''۔
''میری جان، میری مارگریتا''۔ نتاشا صدقے واری ہوتے ہوئے بولی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور والاند کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
''ان سے سفارش کرو کہ مجھے اسی طرح چڑیل ہی رہنے دیں۔ میں گھر واپس نہیں جانا چاہتی۔ نہ کسی انجینئر اور نہ ہی کسی ڈسپنسر سے شادی کروں گی۔ آج کی پارٹی کے ایک جیک نامی مہمان نے میرا ہاتھ مانگا ہے''۔ نتاشا نے اپنی بند مٹھی کھولی تو اس کی ہتھیلی پر سونے کے چند سکے چمک رہے تھے۔
مارگریتا نے سوالیہ نظروں سے والاند کی جانب دیکھا۔ والاند نے سر کی جنبش سے اپنی آمادگی کا اظہار کردیا۔ نتاشا خوشی سے پاگل ہوتی ہوئی مارگریتا سے لپٹ گئی اوراس کی گردن پر بوسے دینے لگ گئی۔ پھرایک فاتحانہ نعرہ بلند کرتی ہوئی کھڑکی سے باہر فضاؤں میں پرواز کرگئی۔
نتاشا کے جانے کے بعد نکولائی نمودار ہوگیا۔ وہ اب واپس پہلے جیسی انسانی حالت میں تبدیل ہوچکا تھا۔ وہ انتہائی مایوس اور کسی قدر برہم بھی نظر آرہا تھا۔
''ان حضرت کو تو میں بصد خوشی روانہ کروں گا''۔ والاند نے نفرت بھری نگاہوں سے نکولائی کو گھورتے ہوئے کہا۔''اس کی چھٹی کرتے وقت مجھے واقعی بہت سکون ملے گا۔ اس کی یہاں موجودگی ویسے بھی غیر ضروری ہے''۔
''میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے ایک سرٹیفکیٹ دیا جائے جس میں یہ درج ہو کہ میں نے گزشتہ رات کہاں گزاری ہے''۔ نکولائی نے مطالبہ پیش کردیا۔
''کس مقصد کے لئے؟'' بلّے نے غصیلی آواز میں پوچھا۔
''اس مقصد کے لئے کہ پولیس اور بیوی کو پیش کیا جاسکے''۔ نکولائی کا جواب تھا۔
ہم بالعموم سرٹیفکیٹ نہیں دیا کرتے۔ لیکن تمہارے لئے اپنی روایت توڑنے کو تیار ہیں۔ اوراس

سے قبل کہ نکولائی دوبارہ منہ کھولتا، برہنہ بدن گیلا۔ ایک ٹائپ رائٹر تھامے میز پر بیٹھ گئی اور بلا اسے سرٹیفکیٹ کی عبارت لکھوانے لگ گیا۔

میں یہ تصدیق کرتا ہوں کہ نکولائی نے گذشتہ رات شیطان کے ہاں ایک پارٹی میں گذاری ہے جہاں اسے بطور ذریعہ آمدورفت استعمال کیا گیا۔۔۔۔ اور ہاں بریکٹ میں لکھو۔۔۔۔۔ سور۔۔۔۔۔۔۔ دستخط۔ بقلم خود بہیموت۔

اور تاریخ؟ نکولائی بولا۔

''تاریخ نہیں ڈالتے۔ تاریخ ڈالنے سے سرٹیفکیٹ جھوٹا ہو جاتا ہے''۔ بلے نے جواب دیا۔ اس نے کہیں سے ایک مہر برآمد کی، اس پر زوردار پھونک ماری اور سرٹیفکیٹ پر ثبت کردی۔ پھر اسے نکولائی کو تھمادیا جو اسی لمحے وہاں سے غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک دوسرے غیر متوقع مہمان نے لے لی۔

یہ کون ہے؟ تلخ لہجے میں ولاند نے پوچھا۔

وریام نے سر جھکا لیا۔ ایک لمبی آہ بھری اور آہستگی سے بولا۔ ''واپس بھیج دیں مجھے۔ میں اب مزید ذریکولا بن کر نہیں رہ سکتا۔ اس روز میں نے گیلا۔ سے مل کر بے چارے رمیض کی جان ہی نکال دی تھی! میں کسی کے خون کا پیاسا نہیں ہوں۔ خدارا مجھے آزاد کردیں''۔

یہ کیا بکواس ہے؟ ولاند نے بگڑتے ہوئے پوچھا۔ رمیض کون ہے؟ اور یہ شخص کیا بے پر کی اڑا رہا ہے؟

میرے آقا آپ پریشان نہ ہوں۔ عزازیل ولاند کو بتانے لگا۔ اور وریام کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جانتے ہو نا کہ ٹیلیفون پر بدتمیزی کرنا اور جھوٹ بولنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ وعدہ کرو کہ آئندہ یہ سب کچھ نہیں کرو گے۔ یہ سنتے ہی وریام کے دماغ میں خوشیوں کے شادیانے بج اُٹھے۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا اور وہ بلا سوچے سمجھے بڑبڑانے لگ گیا۔

''سچا وعدہ۔ یعنی کہ میں کہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ آپ کے لئے۔۔۔۔ نہیں نہیں ان کے لئے۔۔۔۔۔'' اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ دیئے اور پر امید نگاہوں سے عزازیل کی جانب دیکھنے لگ گیا۔

اچھا، ٹھیک ہے۔ جاؤ اپنے گھر۔ وریام فوراً تحلیل ہو گیا۔

''اب مجھے ان لوگوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیا جائے''۔ ولاند نے ماسٹر اور مارگریٹا کی سمت دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ولاند نے ماسٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو مطلب یہ ہوا کہ واپس تہہ خانے میں! اور لکھے گا کون؟ اور وہ خواب، وہ

خواہشات اور وہ پرامیدی؟''۔

''میرے اب کوئی خواب نہیں ہیں۔اب نہ ہی کوئی خواہشات اور نہ ہی کوئی امیدیں باقی ہیں۔ مجھے اب اپنے گردوپیش کسی چیز میں دل چسپی نہیں رہی۔سوائے اس کے''۔اس نے اپنا ہاتھ دوبارہ مارگریٹا کے سر پہ رکھ دیا۔''میں ٹوٹ چکا ہوں۔ بے سکون ہو گیا ہوں۔ میں تہہ خانے میں واپس جانا چاہتا ہوں''۔

اور آپ کا ناول۔ پونتی پلاٹ؟

مجھے اس ناول سے نفرت ہے۔ میں نے یہ ناول لکھنے کی بہت بھاری قیمت چکائی ہے۔

میں تم سے استدعا کرتی ہوں۔ مارگریٹا روہانسی آواز میں بولی۔مت بولو ایسے۔تم مجھے کس غلطی کی پاداش میں سزا دے رہے ہو؟ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے اپنی تمام زندگی اس ناول کے لئے وقف کر دی ہے۔ ولاند سے مخاطب ہوتے ہوئے مارگریٹا کہنے لگی۔میرے آقا آپ اس کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔ یہ بہت آزردہ ہے اور سخت تھکن کا شکار ہے۔

ولاند نے جواب میں کہا۔''لیکن کچھ نہ کچھ تو لکھنا ہی پڑے گا۔ اگر آپ رومن قاضی کی ذات سے بیزار ہو گئے ہو تو رومن قیصر یا پھر مصری فرعون کے بارے میں ہی لکھنا شروع کر دیں''۔

ماسٹر مسکرا اٹھا۔''ہمارے ادیب اس قسم کے موضوع کو پسند نہیں کریں گے۔ ویسے بھی مجھے ان حضرات میں کوئی دل چسپی نہیں ہے''۔

نہ تو پھر زندہ رہنے کے لئے کیا کرو گے؟ اس طرح تو بھوکے مر جاؤ گے۔

''بھوکا مرنے میں مجھے بیحد خوشی ہوگی''۔ ماسٹر نے جواب دیا اور مارگریٹا کو آغوش میں لیتے ہوئے بولا۔ مجھے امید ہے کہ یہ سمجھداری کا ثبوت دے گی اور مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔

''میں ایسا نہیں سوچتا''۔ دانت بھینچتے ہوئے ولاند بولنے لگا۔''مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص جو پونتی پلات کی تاریخ رقم کر رہا تھا اب ایک تہہ خانے میں بند ہو جائے گا اور لالٹین کی لو کے نیچے بیٹھا بھوک سے مرنے کا انتظار کرے گا''۔

مارگریٹا ماسٹر کی آغوش سے نکل کر پرجوش لہجے میں بولی۔

میں نے تو اپنے تئیں ہر کوشش کر ڈالی ہے۔اسے راغب کرنے کی ہر ممکن کوشش کر گزری ہوں۔ میں نے جب اس کے کان میں سرگوشی کی تھی تو اسے دنیا کی سب سے قیمتی شے دینے کی پیشکش کی تھی۔لیکن اس نے یہ پیش کش بھی ٹھکرا دی۔

آپ نے اس کے کان میں جو سرگوشی کی تھی وہ مجھے معلوم ہے۔ ولاند بولا اور مسکراتا ہوا ماسٹر سے مخاطب ہوا۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کا ناول مستقبل میں آپ کے لئے کچھ مزید غیر متوقع

تبدیلیاں لانے والا ہے۔

یہ تو بہت مایوس کن بات ہے۔ ماسٹر نے کہا۔

نہیں، نہیں۔ اس میں مایوسی والی کوئی بات نہیں ہے۔ آئندہ آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ ہاں تو میری محترم مارگریتا سب کچھ تیار ہے۔ آپ کو مجھ سے کوئی گلہ شکوہ تو نہیں ہے؟

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میرے آقا!

یہ آپ میری طرف سے ہماری ملاقات کی یادگار کے طور پر رکھ لیجئے۔ ولاند نے کہا اور اسے ہیروں سے جڑا سونے کا ایک کنگن پیش کیا۔

نہیں، نہیں میرے آقا یہ میں نہیں لوں گی۔

آپ میرے ساتھ بحث کرنا چاہتی ہو؟ ولاند نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

مارگریتا نے کنگن ایک رومال میں لپیٹ کر اسے گرہ لگالی کیونکہ اس کے کوٹ میں کوئی جیب نہیں تھی۔ جب اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو چاند کو دیکھ کر حیران رہ گئی اور کہنے لگی ''میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے آدھی رات ہی کیوں طاری ہے۔ میری عقل کے مطابق تو بہت پہلے صبح ہوجانی چاہیے تھی''۔

''تہوار کی آدھی رات کو کچھ دیر کے لئے روک لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے''۔ ولاند نے مختصر سا جواب دیا۔

''میری خواہش ہے کہ آپ لوگوں کا دامن ہمیشہ خوشیوں سے بھرا رہے''۔

مارگریتا نے فرط عقیدت سے اپنے دونوں ہاتھ ولاند کے سامنے پھیلا دیئے لیکن اس کے نزدیک جانے کی ہمت نہ کرسکی اور بھرائی ہوئی آواز میں دھیرے سے بولی۔

الوداع! الوداع!

الوداع! ولاند نے جواب میں کہا۔

سیاہ لمبے کوٹ میں ملبوس مارگریتا اور ہسپتالی یونیفارم پہنے ماسٹر فلیٹ کی موم بتی کی لو میں نیم روشن راہداری میں نکل آئے جہاں ولاند کے حواری ان کے منتظر تھے۔ گیلہ نے وہ صندوقچہ اٹھا رکھا تھا جس میں ناول کا مسودہ اور مارگریتا کا اثاثہ مقفل کیا گیا تھا۔ بلا بظاہر بہت مصروف نظر آرہا تھا۔ فاگوٹ نے سرخم کرتے ہوئے مہمانوں کو الوداع کہی اور بیرونی دروازے کے نزدیک تحلیل ہوگیا۔ باقی لوگ فلیٹ سے باہر نکل آئے۔ سیڑھیاں یکسر سنسان پڑی تھیں۔ جب یہ مختصر سا قافلہ تیسری منزل سے گزر رہا تھا تو غالباً کسی موٹر کی ہلکی سی آواز سنائی دی لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ عمارت سے باہر نکلنے کے بعد عزازیل نے

آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے فضا میں ایک زور دار پھونک داغ دی۔ دروازے کے نزدیک ایک بنچ پر چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس اور سر پر سیاہ رنگ کی کھلاڑیوں والی ٹوپی پہنے ایک لمبا تڑنگا آدمی محوخواب تھا۔ عمارت کے بالکل سامنے سڑک کنارے ایک سیاہ رنگ کی لمبی موٹر کار کھڑی تھی۔ جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر گاڑی کے بند شیشے کے پار ایک جسیم سیاہ گدھ کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔

گاڑی میں بیٹھنے کی تیاری ہو رہی تھی کہ مارگریٹا پریشان آواز میں چلا اٹھی۔ ''اوہ! خدایا میرا کنگن کہیں کھو گیا ہے''۔

آپ گاڑی میں تشریف رکھیں۔ عزازیل بولا۔ اور میرا انتظار کیجئے۔ میں واپس جا کر دیکھتا ہوں کہ ماجرا کیا ہے۔ یہ کہنے کے بعد وہ عمارت میں غائب ہو گیا۔

ماجرا دراصل یہ تھا کہ ماسٹر، مارگریٹا اور ان کے الوداعی ٹولے کے روانہ ہونے سے کچھ دیر قبل ولاند کے فلیٹ کی زیریں منزل کے فلیٹ نمبر ۴۸ سے ایک دبلی پتلی خاتون ایک بیگ اور پلاسٹک کا ڈبہ لئے سیڑھیوں پر نمودار ہوئی۔ اس عورت کا نام تھا، انوشکا۔ یہ وہی انوشکا تھی جس نے بدھ کے روز بدنصیب مائیکل بیرلی کے راستے میں سورج مکھی کا تیل انڈیل دیا تھا۔

اس عورت کا ذریعہ معاش کیا تھا۔ اس کا پیشہ کیا تھا۔ غالباً کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ ہی کبھی معلوم ہوگا۔ انوشکا کو اکثر اوقات بیگ یا پلاسٹک کا ڈبہ یا پھر دونوں چیزیں ہاتھوں میں لئے کبھی تیل کے ڈپو کے باہر، کبھی مارکیٹ میں، کبھی سیڑھیوں میں، کبھی عمارت کے باہر بنچ پر اور کبھی فلیٹ نمبر ۴۸ کے باورچی خانے کی کھڑکی میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس خاتون کے بارے میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ یہ جہاں بھی جاتی ہے وہاں کوئی نہ کوئی آفت کھڑی ہو جاتی ہے۔ شائد اسی لئے وہ 'طاعون' کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔

طاعون انوشکا نجانے کیوں آج علی الصبح اٹھ گئی تھی۔ وہ پو پھٹنے کا انتظار کئے بغیر ہی صبح ایک بجے اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کے فلیٹ کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور کچھ لمحوں بعد وہ باہر نکل آئی۔ وہ ابھی سیڑھیوں کی جانب بڑھنے کے لئے پر تول ہی رہی تھی کہ بالائی منزل سے دروازہ بند ہونے کی زوردار آواز آئی اور ایک شخص سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا انوشکا سے اس طرح آن ٹکرایا کہ بے چاری کا سر دیوار میں جا لگا۔

خدا تمہیں غارت کرے۔ یہ بنیان اور جانگیہ پہنے اندھوں کی طرح کدھر اڑتے جا رہے ہو۔ انوشکا ہاتھوں میں اپنا سر تھامے غصیلی آواز میں بولی۔ بنیان اور جانگیے میں ملبوس شخص ہاتھ میں صندوقچہ اٹھائے بند آنکھوں کے ساتھ نیند بھری آواز میں بولا۔ ''میرا نیا غسل خانہ۔ میرا نیا غسل خانہ''۔ اور روتا ہوا نیچے جانے کی بجائے واپس اوپر کی جانب دوڑ پڑا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔

یہ دیکھ کر انوشکا اپنے سر کی چوٹ بھول گئی اور دوڑتی ہوئی کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ سڑک پر بنیان

اور جا نکیئے والی لاش دیکھنے کی توقع میں وہ کھڑکی سے نیچے سڑک کی جانب جھانکنے لگ گئی۔ لیکن اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں کیونکہ قمقموں کی تیز روشنی میں نہائی سڑک بالکل سنسان پڑی تھی۔

انوشکا سوچ رہی تھی کہ نیند کے نشے میں چُور عجیب الخلقت شخص بنا کوئی نشان چھوڑے کسی پرندے کی مانند کیسے ہوا کے دوش پر اڑ گیا ہے۔ انوشکا سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''لوگ سچ ہی کہتے ہیں، یہ فلیٹ نمبر ۵۰ آسیب زدہ ہے۔ خدا بچائے اس بھوت بنگلے سے''۔

انوشکا ابھی اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی کہ بالائی منزل سے دوبارہ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور ایک دوسرا شخص سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ خوف زدہ انوشکا دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ اس شخص کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ دیکھنے میں پڑھا لکھا لگتا تھا لیکن اس کے چہرے کے خدوخال میں کسی سور کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ انوشکا کے قریب سے گزرتا ہوا بڑے اطمینان کے ساتھ تیسری منزل کی کھڑکی سے نیچے کود گیا۔ انوشکا یکسر بھول گئی کہ وہ گھر سے کس کام کے لئے نکلی تھی اور سیڑھیوں میں بیٹھی سینے پر مسلسل صلیب کا نشان بنانے لگ گئی۔

کچھ دیر بعد ایک گول چہرے والا جسیم شخص سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ وہ بھی پہلے دو آدمیوں کی طرح کھڑکی سے باہر کود گیا۔ یہاں انوشکا کی ہمت اور تجسس کی داد دینی چاہیے کیونکہ وہ جائے وقوع سے بھاگنے کی بجائے وہیں بیٹھی کسی نئے تماشے کا انتظار کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد بالائی فلیٹ کا دروازہ دوبارہ کھلا۔ اس مرتبہ ایک نہیں بلکہ پورا ٹولہ سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ یہ لوگ کسی افراتفری کے بغیر نیچے کی جانب روانہ ہو گئے۔ انوشکا دوڑتی ہوئی اپنے فلیٹ میں گھس گئی اور تجسس بھری آنکھیں دروازے سے لگائے بیٹھ گئی۔

ایک بظاہر بیمار شخص جو شائید خون کی کمی کا شکار تھا، سر پر سیاہ ٹوپی اوڑھے اور عجیب قسم کا یونیفارم پہنے ناتواں قدموں سے ڈولتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ اسے سیاہ لمبے ریشمی کوٹ میں ملبوس خوبصورت دوشیزہ نے سہارا دے رکھا تھا۔ انوشکا کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ خاتون یا تو ننگے پاؤں ہے یا پھر اس نے نہایت نفیس غیر ملکی شفاف جوتے پہن رکھے ہیں۔ ہت تیرے کی۔ یہ میں کیا جوتوں میں اٹک گئی ہوں۔ انوشکا سوچ رہی تھی۔ اسے یکا یک محسوس ہوا کہ خاتون نے تو فقط کوٹ پہن رکھا ہے۔ ''واہ کیا فلیٹ ہے!''۔ انوشکا دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ وہ کس طرح یہ چسکے دار کہانی صبح اپنے ہمسائیوں کو سنائے گی۔

اس عجیب وغریب طریقے سے ملبوس خاتون کے عقب سے ایک دوسری عورت نمودار ہوئی جس نے ہاتھ میں صندوقچہ اٹھا رکھا تھا اور لباس کی قید سے آزاد مکمل طور پر برہنہ تھی۔ صندوقچے کے آس پاس ایک سیاہ رنگ کا موٹا تازہ بلا اچھل کود کر رہا تھا۔ خوف کے مارے انوشکا کی چیخ حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی۔ آخر میں ایک ناٹے قد کا، قدرے لنگڑاتا ہوا ٹیڑھی آنکھ والا غیر ملکی نمودار ہوا جس نے سفید رنگ کی فراک

نما قمیض پر ٹائی باندھ رکھی تھی۔ یہ سب لوگ انوشکا کے دروازے کے قریب سے ہوتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ اس دوران انوشکا کو فرش پر کچھ گرنے کی آواز سنائی دی۔ یہ تسلی کر لینے کے بعد کہ قدموں کی آواز اب دور جا چکی ہے انوشکا سانپ کی مانند بل کھاتی ہوئی دروازے کی اوٹ سے باہر نکل آئی۔ اس نے اپنا پلاسٹک کا ڈبہ دیوار کے ساتھ رکھ دیا اور فرش پر اوندھے منہ لیٹ کر وہاں گرنے والی چیز تلاش کرنے لگ گئی۔ اس کا ہاتھ رومال میں لپٹی کسی وزنی چیز سے ٹکرایا۔ رومال کھولنے پر انوشکا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہیروں سے جڑا کنگن دیکھ کر انوشکا کی آنکھیں کسی بھیڑیے کی مانند چمک اٹھی تھیں۔ اس کے سر میں لاوا پک رہا تھا اور وہ خود سے کہہ رہی تھی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی! میں نے کچھ نہیں دیکھا! اپنے بھتیجے کے پاس چلی جاؤں یا پھر اس قیمتی زیور کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنالوں۔ ہیرے تو ویسے بھی آسانی سے الگ کئے جاسکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا! میں کچھ نہیں جانتی''۔

انوشکا نے قدرت کا عطا کردہ یہ تحفہ اپنی انگیہ میں چھپا لیا اور پلاسٹک کا ڈبہ اٹھائے واپس اپنے گھر میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ نجانے کہاں سے سفید فراک میں ملبوس ٹیڑھی آنکھ والا غیر ملکی اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ''لاؤ رومال اور کنگن واپس کردو''۔

''کیسا رومال؟ کیسا کنگن؟'' انوشکا نے انجان بنتے ہوئے جواب دیا۔

''میں کسی رومال کے بارے میں نہیں جانتی۔ تم کیا نشے میں ہو؟''۔

ٹیڑھی آنکھ والے نے مزید کچھ کہے بغیر اپنی برف کی طرح سرد لمبی انگلیوں سے انوشکا کا گلا اس طرح دبوچ لیا کہ اس کے پھیپھڑوں میں ہوا کی آمدورفت رک گئی۔ ڈبہ انوشکا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور فرش پر گر گیا۔ غیر ملکی نے کچھ دیر تک انوشکا کو اسی طرح جکڑے رکھا اور جب اس نے اپنا ہاتھ گردن سے ہٹایا تو انوشکا اپنی سانس درست کرنے کے بعد بولی۔

اچھا تو یہ کنگن آپ کا ہے؟ یہ تو رومال میں لپٹا ادھر فرش پر گرا پڑا تھا۔ میں نے اس امانت کو حفاظت کے لئے اٹھا لیا تھا۔ اگر کسی اور کے ہتھے چڑھ جاتا تو بس کنگن کا خدا ہی حافظ تھا''۔

کنگن اور رومال وصول کرنے کے بعد غیر ملکی نے پرجوش انداز میں انوشکا سے ہاتھ ملایا اور بھاری غیر ملکی لہجے میں بولا۔ ''مادام میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ یہ کنگن میرے پاس دراصل کسی کی امانت ہے۔ میں اسے دیانتداری کے ساتھ سنبھالنے پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دوسو روبل انعام کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں''۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب سے دوسو روبل نکالے اور انوشکا کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

شکریہ! شکریہ! انوشکا بول اٹھی۔ فیاض دل غیر ملکی ایک ہی جست میں پوری منزل کی سیڑھیاں پھلانگ گیا اور نچلی منزل سے غیر ملکی لہجے کے بغیر دھاڑتا ہوا بولا۔

''تو بوڑھی چڑیل میری ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تمہیں آئندہ کوئی چیز زمین پر گری ملی اور تم نے اسے پولیس سٹیشن میں جمع کرانے کی بجائے اپنی انگیہ میں چھپایا تو میں اس چھپائی گئی چیز کے ساتھ ساتھ انگیہ میں موجود تمہاری اپنی چیزیں بھی تمہارے جسم سے نوچ لوں گا''۔ انوشکا کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیوں نے طوفان بپا کر دیا تھا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں طوطے کی مانند ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ شکریہ! شکریہ! بے حد شکریہ۔

مارگریتا کی امانت اس کے حوالے کرنے کے بعد عزازیل نے موٹر کار میں بیٹھے مہمانوں سے پرجوش طریقے سے الوداعی مصافحہ کیا۔ گیلہ نے مارگریتا کے دونوں رخساروں پر جبکہ بلّے نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور یہ تینوں سیڑھیاں پھلانگنے کی زحمت اٹھانے کی بجائے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ گدھ ڈرائیور نے دھیمی آواز میں ایک نعرہ بلند کیا، گاڑی سٹارٹ کی اور مہمانوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد تہہ خانے کے ایک کمرے میں ٹھیک ایک سال پہلے کی طرح میز پر ایک ریشمی رومال بچھا پڑا تھا۔ گلدان میں سجے چنبیلی کے پھولوں کی مہک سے فضا معطر ہو رہی تھی۔ دیوار پر روشن بلب کے نیچے مارگریتا ایک کرسی پر بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ادھ جلی کاپی تھی جبکہ ناول کا مکمل مسودہ میز پر پڑا تھا۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ دوسرے کمرے میں ایک مسہری میں ماسٹر گہری نیند سو رہا تھا۔

آنسو پونچھنے کے بعد مارگریتا نے ولاند کا دیا ہوا ناول کا مسودہ اٹھایا اور اس ورق کو پڑھنے لگ گئی جو عزازیل کے ساتھ پہلی ملاقات کے وقت پڑھ رہی تھی۔ مارگریتا کو اچانک ایک خوفناک خیال نے گھیر لیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ شائد یہ سب خواب ہے یا پھر محض سراب ہے۔ یہ مسودہ ابھی فضا میں تحلیل ہو جائے گا۔ وہ اپنے باغیچے والے گھر میں واپس پہنچ جائے گی اور جب اس کی آنکھ کھلے گی تو اسے دریا میں غرق ہونے کے لئے جانا پڑے گا۔ لیکن اس پر گزرنے والی اذیتوں کے سلسلے کا یہ آخری پریشان کن خیال تھا۔ کچھ بھی غائب نہیں ہوا۔ ولاند واقعی ہر چیز پر قادر تھا۔ مارگریتا دیر تک بیٹھی ناول کے مسودے کا مطالعہ کرتی رہی اور کاغذوں کو چومتی رہی۔ بالآخر یہ سطر پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھ لگ گئی--------

''سمندر کی جانب سے بڑھنے والی تاریکی نے رومن قاضی کی نفرت کے مرکز شہر یروشلم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا--------''

باب ۲۵

قاضی کی عیشوا کو بچانے کی کوشش

سمندر کی جانب سے بڑھنے والی تاریکی نے رومن قاضی کی نفرت کے مرکز ''شہر یروشلم'' کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ رسیوں پر معلق مندر اور محل کے ہولناک مینار کو ملانے والے پل غائب ہو گئے تھے۔ آسمان سے پانی کی دھاریں برس رہی تھیں اور مندر پر نصب محو پرواز نظر آنے والی خدائی مورتیاں پانی میں نہا گئی تھیں۔ شاہی محل، بازار، سرائے، سب تحلیل ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے عظیم شہر یروشلم کبھی دنیا کے نقشے پر موجود ہی نہیں تھا۔

یروشلم اور اس کے گرد و نواح پر چھا جانے والا اندھیرا، جس نے ہر ذی روح کو خوفزدہ کر دیا تھا، سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لیتا جارہا تھا۔ موسم بہار کے مہینے نسان کے چودھویں روز شام کے وقت ایک غیر معمولی طور پر گہرے رنگ کا بادل کا ٹکڑا سمندر کی جانب سے اٹھتا ہوا شہر کی فضا میں داخل ہو گیا۔

کل وری پہاڑی پر جلاد سزائے موت پانے والے مجرموں کو صلیبوں پر لٹائے ان کے ہاتھوں میں کیل ٹھونک رہے تھے۔ پہاڑی پر جل تھل کرنے کے بعد بادل یروشلم کے محل، مندر اور شہر کے نشیبی حصے کو اپنی بوچھاڑ کا نشانہ بنا رہے تھے۔ بارش اتنی شدید تھی کہ مکانوں کی چھتوں، گلیوں اور میدانوں سے دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ مرکزی مندر کا گنبد کبھی کبھار آسمان سے لپکنے والے شعلوں کی روشنی میں مچھلی کے جسم کی مانند چمکتا دکھائی دیتا اور پھر فوراً ہی شہر پر چھائے اندھیرے میں ڈوب جاتا تھا۔ بجلی کی چمک کے بعد آسمان ہر بار خوفناک آواز میں دھاڑ اٹھتا تھا۔

مرکزی مندر کے مقابل واقع محل کے مشرقی حصے پر کوندنے والی آسمانی چنگاریاں ہولناک منظر پیش کررہی تھیں۔ محل کے باغیچے میں نصب بے چشم سنہری مجسمے اپنے ہاتھ سیاہ آسمان کی جانب اٹھائے پناہ مانگتے محسوس ہو رہے تھے۔ لیکن جونہی سیاہ آسمان چنگاریوں کی چمک اپنی چادر میں چھپا لیتا تھا یہ مجسمے دوبارہ شہر پر حملہ آور شدید طوفان کی تاریک آغوش میں غائب ہو جاتے تھے۔

طوفان لمحہ بہ لمحہ مزید شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس جگہ جہاں دن کے وقت باغیچے میں مرمر کے بنچ کے نزدیک رومن قاضی اور پجاریٔ اعظم کے درمیان گفتگو ہوئی تھی توپ کی مانند گرجدار آواز کے ساتھ ایک دیو قامت صنوبر کا درخت زمین بوس ہو گیا۔ گرد آلود پانی میں گلاب کے پھول، پودوں کے پتے اور ٹہنیاں بہتی جا رہی تھیں۔ طوفان نے باغیچے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔

اس دوران محل کی بالکونی کے ستونوں کے درمیان صرف ایک شخص تن تنہا موجود تھا۔ اور وہ شخص تھا رومن قاضی پونتی پلاٹ۔

لیکن اب وہ کرسی کی بجائے ایک مسہری نما مرمریں بنچ پر دراز تھا۔ اس کے قریب ایک میز پر چاندی کے برتنوں میں کھانا اور صراحی میں انگوری شراب رکھی تھی۔ میز کے دوسری جانب ایک اور مسہری نما مرمریں بنچ پڑا تھا۔ مسہری کی پائیں جانب فرش خون کی مانند سرخ محلول سے آلودہ تھا۔ محلول کے وسط میں ایک شکستہ صراحی کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ قاضی کو کھانا پیش کرنے والا غلام نجانے کیوں اس خوف میں مبتلا ہو گیا تھا کہ شائید قاضی اس کی کسی غلطی پر سخت ناراض ہے۔ چنانچہ غلام نے کھانا پیش کرتے وقت اپنی نگاہیں مسلسل جھکا رکھی تھیں۔ قاضی کو غلام کی اس حرکت پر غصہ آ گیا اور اس نے انگوری شراب سے بھری صراحی زمین پر پٹخ دی اور بولا۔ ''تو کھانا پیش کرتے وقت میرے حضور کیوں نہیں دیکھتا؟ تو نے کیا کوئی چوری کی ہے؟''

سیاہ فام غلام کا چہرہ خوف کے مارے مزید سرمئی پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے موت کی اذیت جھلکنے لگی تھی۔ وہ اس بری طرح تھرتھرانے لگا کہ دوسری صراحی بھی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ تاہم اس کی خوش قسمتی تھی کہ قاضی کا غصہ جس طرح اچانک نمودار ہوا تھا اسی طرح فوراً غائب بھی ہو گیا۔ غلام صراحی کے ٹکڑے اٹھانے کے لئے جھکا تو قاضی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ غلام امان پانے پر کمان سے نکلے تیر کی مانند وہاں سے فوراً غائب ہو گیا۔

طوفان کے دوران سیاہ فام غلام ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ ستون کے عقب میں ایک جانب سر جھکائے برہنہ عورت کا سفید مجسمہ ایستادہ تھا۔ غلام اب قاضی کی نظروں کے سامنے آنے سے ڈر رہا تھا۔ لیکن اسے یہ خوف بھی تھا کہ اگر کسی وقت قاضی کی اُسے طلب کرنے کی آواز سنائی نہ دی تو نیا طوفان کھڑا ہو جائے گا۔

اس طوفان بادوباراں میں مسہری پر لیٹے لیٹے قاضی خود ہی اپنے لئے پیالے میں شراب انڈیل رہا تھا۔ بڑے بڑے گھونٹ لینے کے بعد وہ کبھی روٹی کا ٹکڑا منہ میں ڈال لیتا، کبھی مچھلی کو چوسنے لگ جاتا، کبھی لیموں چاٹنے لگتا اور دوبارہ شراب کا پیالہ منہ سے لگا لیتا۔

اگر بارش کا شور نہ ہوتا، طوفان کے وہ شدید تھپیڑے نہ ہوتے جو محل کی چھت کو برابر کرنے کے در پہ تھے اور اگر ژالہ باری سے محل کی سیڑھیوں میں ٹکا ٹک نہ ہو رہی ہوتی! تو با آسانی سنا جاسکتا تھا کہ رومن قاضی اس وقت کیسے بڑبڑا رہا تھا۔ اگر آسمانی بجلی کی چمک چند لمحے برقرار رہتی تو اس کے چہرے کے تاثرات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بے خوابی اور شراب کے نشے میں ڈوبی اُس کی آنکھیں کس قدر بے چین تھیں۔ وہ فرش پر گری سرخ رنگ کی شراب میں تیرتے سفید گلاب کے پھولوں کو بغور دیکھتے ہوئے بار بار مضطرب نگاہوں سے باغیچے کی جانب نظر دوڑا رہا تھا۔ وہ کسی کا منتظر تھا۔ شدید بے چینی کے عالم میں منتظر تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ آسمان سے نازل ہونے والی پانی کی بوچھاڑ دھیمی پڑتی جارہی تھی۔ طوفان کی شدت میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ بادلوں کی گرج چمک بھی کم ہوتی جارہی تھی۔ یروشلم کے آسمان پر چھائے بادلوں کا رنگ تبدیل ہو رہا تھا۔ سفید کناروں والے جامنی رنگ کے بادل اب عام مٹیالہ رنگ اختیار کر گئے تھے۔ طوفان بحیرہ مردار کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

اب بارش کے برسنے اور پانی کے سیڑھیوں پر بہنے کی آوازیں الگ الگ سنی جاسکتی تھیں۔ یہ وہی سیڑھیاں تھیں جنہیں دن کے وقت پار کرنے کے بعد قاضی اُس چبوترے تک جا پہنچا تھا جہاں سے اُس نے مجرموں کی سزا کا اعلان کیا تھا۔ دیر سے خاموش فوارہ بھی آخر کار بول اٹھا۔ فضا روشن ہوتی جارہی تھی۔ آسمان پر چھائی سرمئی چادر میں جا بجا نیلے رنگ کی کھڑکیاں کھلتی جارہی تھیں۔

بارش اب ہولے ہولے ٹپک رہی تھی۔ اس دھیمی شڑاپ، شڑاپ میں قاضی کے کانوں میں کہیں دور سے بگل کی آواز اور کئی سو گھوڑوں کی ٹاپیں ٹکرانے لگیں۔ یہ آوازیں سنتے ہی قاضی کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔ سپاہیوں کا دستہ غالباً گل دری پہاڑی سے واپس مارچ کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ فوجی دستہ اس وقت محل سے ملحقہ میدان سے گزر رہا ہے۔ یہ وہی میدان تھا جہاں یشوا کی موت کا پروانہ پڑھ کر سنایا گیا تھا۔

آخر کار کسی کے سیڑھیاں چڑھتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ قاضی بے چینی سے اس آواز کا منتظر تھا۔ یہ سیڑھیاں بالکونی کے سامنے باغیچے کی نسبتاً بلند سطح پر بنے چبوترے کو جاتی تھیں۔ قاضی نے سر بڑھا کر نیچے جھانکا تو سیڑھیاں چڑھتے مہمان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پرمسرت روشنی سے چمک اٹھیں۔

سنگ مرمر سے بنے شیروں کی جوڑی کے درمیان پہلے ایک ٹوپی ظاہر ہوئی اور پھر پانی سے شرابور ایک شخص نمودار ہوا جس کا پانی میں نچڑا برساتی کوٹ بری طرح اس کے جسم سے چپکا پڑا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو سزائے موت کا اعلان ہونے سے قبل محل کے نیم روشن کمرے میں قاضی کے ساتھ سرگوشیوں کا تبادلہ کر رہا تھا۔ مجرموں کے صلیب پر چڑھائے جانے کے دوران وہ پھانسی گھاٹ کے ایک کونے میں ایک سہ پایہ کرسی پر بیٹھا آہنی سلاخ سے کھیل رہا تھا۔

مہمان نے لمبے بوٹ پہن رکھے تھے اور باغیچے میں جا بجا جمع ہونے والے پانی اور کیچڑ کو خاطر میں لائے بغیر فوجی انداز میں باوقار طریقے سے چلتا ہوا وہ بالکونی پر پہنچ گیا اور بلند آواز میں بولا۔

بلند پایہ قاضی کی خدمت میں غلام حاضر ہے۔نووارد لاطینی زبان میں بول رہا تھا۔

او خدایا! پلات پریشان ہوتا ہوا بولا۔''آپ کے جسم پر تو غالبًا ایک دھاگہ بھی خشک نہیں ہے۔ کیسا خوفناک طوفان تھا! براہ کرم فوراً کپڑے تبدیل کر لیجئے۔مجھ پر بڑا احسان ہوگا''۔

مہمان نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور بولا۔اس گیلے پن سے خادم کو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اس لئے کپڑے تبدیل کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

''بالکل نہیں۔میں ایسی کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوں''۔قاضی نے جواب دیا اور تالی بجا کر غلام کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور اسے مہمان کے کپڑے تبدیل کروانے اور گرم گرم کھانا پیش کرنے کو کہا۔کپڑے اور جوتے تبدیل کرنے میں مہمان کو زیادہ وقت نہیں لگا۔اپنی ہیئت درست کرنے کے بعد وہ دوبارہ بالکونی پر منتظر قاضی کے روبرو حاضر ہوگیا۔

اس دوران کچھ دیر بعد دور سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبنے سے قبل سورج کے چہرے سے بادلوں کا گھونگھٹ ہٹ گیا تھا اور اس کی سنہری کرنوں نے محل کی سفید مرمریں سیڑھیوں پر شرارے بکھیرنے شروع کر دیئے تھے۔باغیچے کے وسط میں نصب فوارہ اب پورے جوبن پر آ گیا تھا۔اس کا پانی لہراتا، بل کھاتا گنگنا رہا تھا۔فوارے کے ارد گرد ان گنت کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتے ہوئے گیلی مٹی میں چونچیں مارتے دانہ تلاش کر رہے تھے۔فرش پر بکھرے صراحی کے ٹکڑے سمیٹ لئے گئے تھے۔انگوری شراب کے سرخ دھبے صاف کر دیئے گئے تھے۔میز پر رکھے گرما گرم گوشت سے اشتہا کو بھڑکانے والی خوشبودار بھاپ اٹھ رہی تھی۔

میں معزز قاضی کے احکامات کا منتظر ہوں۔نووارد کھانے کی میز کے قریب پہنچ کر بولا۔

پہلے کھانا، پھر کوئی اور بات۔قاضی خوشگوار لہجے میں بولا اور مہمان کو دوسری مسہری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نووارد مسہری پر دراز ہوگیا۔سیاہ فام غلام نے اس کا پیالہ گاڑھی سرخ انگوری شراب سے بھر دیا۔ دوسرے غلام نے قاضی کا خالی پیالہ بھی لبریز کر دیا جس کے بعد قاضی نے ہاتھ کے اشارے سے غلاموں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔مہمان کھانے اور شراب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔قاضی بھی وقفے وقفے سے اپنا پیالہ ہونٹوں سے لگائے چسکیاں لے رہا تھا۔اس نے نگاہیں نووارد پر جما رکھی تھیں۔یہ مہمان درمیانہ عمر کا خوش رو آدمی تھا۔اس کے گول سرخ و سفید چہرے پر جھیل جیسی نیلی آنکھیں اور مختصر سے نتھنوں والی موٹی ناک بہت مناسب لگ رہی تھیں۔اس کے بالوں کا رنگ منفرد نوعیت کا تھا۔شائید سیاہ اور بھورے

رنگ کی آمیزش؟ خشک ہونے کے بعد اس کے بالوں کا رنگ ہلکا پڑتا جا رہا تھا۔ شکل وصورت سے اس کی قومیت کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے نرم دلی اور خوش مزاجی جھلکتی تھی۔ لیکن اس کی نظریں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا اپنے مخاطب کو دیکھنے کا انداز ان تاثرات کی صریحاً نفی کرتا تھا۔ وہ بالعموم اپنی آنکھیں نیم وا رکھتا تھا۔ اس دوران اس کی پلکوں پر سوجن کا گمان ہوتا تھا۔ اور آنکھوں سے ایک بے ضرر سی طمانیت جھانکتی نظر آتی تھی۔ کبھی کبھار اس کے رویے سے مزاح کی جھلک بھی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن طمانیت اور مزاح کے تاثرات اس کی آنکھوں سے بسا اوقات یکسر غائب بھی ہو جاتے تھے اور وہ پوری طرح کھلی آنکھوں سے اپنے مخاطب کو بغور یوں گھورنے لگتا تھا کہ جیسے اس کی ناک پر کوئی داغ تلاش کر رہا ہو۔ تاہم یہ کیفیت تادیر جاری نہیں رہتی تھی اور چند لمحوں بعد ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اس کی پلکیں پھر سے جھک جاتیں۔ طمانیت اور مزاح کے تاثرات دوبارہ اس کی آنکھوں میں عود کر آ جاتے تھے۔

مہمان نے شراب کا پیالہ خالی کرنے کے بعد دوبارہ بھر لیا تھا۔ بھنی ہوئی مچھلی کے کچھ ٹکڑے، ابلی ہوئی سبزیوں کا ایک پیالہ اور لذیذ دم پخت گوشت کا ٹکڑا نگلنے کے بعد مہمان اپنے پیٹ پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگ گیا کہ جیسے سیر ہو گیا ہو۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ انگوری شراب کے اعلیٰ معیار کی تعریف میں رطب اللسان ہو گیا۔

بہت اعلیٰ قسم کی شراب ہے۔ غالباً فلارنو کی کوئی قسم ہے!۔

جی نہیں۔ 'سکوبا' کہتے ہیں اسے۔ تیس سال لگتے ہیں اسے تیار ہونے میں۔ قاضی نے محظوظ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

مہمان نے سینے پر ہاتھ باندھ لیئے اور پیٹ بھر جانے کا اعلان کیا۔ قاضی نے اپنا پیالہ دوبارہ بھر لیا۔ دونوں نے اپنے اپنے پیالے سے چند قطرے شراب گوشت والی رقاب میں انڈیل دیئے اور قاضی اپنا پیالہ بلند کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے نام، تمہارے نام اور دنیا کے سب سے بلند مرتبہ انسان، رومنوں کے باپ، ہمارے عظیم قیصر کے نام!''

جام صحت تجویز کرنے کے بعد دونوں نے اپنے پیالے خالی کر دیئے۔ سیاہ فام غلاموں نے کھانے کے برتن سمیٹ لئے اور شراب کی صراحی کے ساتھ پھلوں سے بھری رقابیں سجانے کے بعد وہاں سے غائب ہو گئے۔ ان پر شکوہ ستونوں کے درمیان قاضی اور اس کا مہمان تنہا رہ گئے۔

اچھا تو۔ قاضی نے دھیمی آواز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ شہر میں اس وقت لوگوں کے جذبات کے بارے میں آپ کیا بتا سکتے ہو؟

میرا اندازہ ہے، محترم قاضی صاحب، کہ اس وقت لوگوں کے جذبات اطمینان بخش ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ اس بات کی ضمانت ہے کہ شہر میں اب کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کا اندیشہ نہیں ہے۔
ضمانت؟ دانش سے لبریز نگاہیں قاضی پر جمائے مہمان نے کہا۔ ضمانت صرف رومن قیصر کی عظمت کی دی جاسکتی ہے۔

خداوندگان ان کی عمر دراز کریں۔ قاضی فوراً بول اٹھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔''اچھا تو آپ کا کیا خیال ہے؟ فوجی دستوں کو شہر سے نکالا جاسکتا ہے یا نہیں؟۔
میرا خیال ہے کہ غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے والے خاص دستے کو نکالا جاسکتا ہے۔مہمان نے جواب دیا۔ ویسے بہتر ہوگا کہ شہر چھوڑنے سے قبل یہ دستہ اپنی قوت اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہر کی گلیوں میں مارچ کرے۔

بہت عقلمندی کی سوچ ہے۔ قاضی مہمان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔''میں پرسوں دستے کو چھٹی دے دوں گا اور خود بھی چلا جاؤں گا۔ میں بارہ خداؤں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا بس چلتا تو میں آج ہی یہ کام کر گزرتا''۔

میرے عظیم قاضی کو یروشلم پسند نہیں ہے؟۔مہمان نے مسکراتے ہوئے پوچھا
خدا غارت کریں اس شہر کو۔ قاضی نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ دنیا میں اس سے زیادہ منحوس جگہ اور کوئی نہیں ہے۔ موسم کو ہی لے لیں۔ میں جب بھی یہاں آتا ہوں بیمار پڑ جاتا ہوں۔ اس کے علاوہ یہاں کے تہوار۔ اوہ خدایا! یہ جادوگر، شعبدہ باز، مداری، بازیگر، پوجا پاٹ کرنے والوں کے ٹولے۔۔۔۔ جنونی! جنونی ہیں یہ لوگ۔ اسی ایک مسیحا کو لے لو جس کا امسال ان لوگوں نے اچانک انتظار شروع کر دیا ہے۔ ہر لمحہ اندیشہ رہتا ہے کہ کسی بھی وقت خوفناک خون ریزی شروع ہوجائے گی۔ ہمہ وقت فوجی دستوں کی نقل وحرکت کا دھیان رکھنا، ہر روز شکائیتوں کے انبار پڑھنا، اور مشکل ترین بات یہ کہ اکثر اوقات اپنی مرضی کے خلاف فیصلے کرنا، پھر انہیں پڑھ کر سنانا۔ یقین مانیئے انتہائی مکروہ کام ہے۔ صرف شاہی نوکری کی مجبوری ہے ورنہ۔۔۔۔۔۔۔

جی ہاں۔ یہاں کے تہوار برداشت کرنا واقعی بڑا دل گردے کا کام ہے۔ مہمان نے جواب دیا۔
میری دلی تمنا ہے کہ یہ سب جلد از جلد ختم ہوجائے۔ قاضی جذبات کی رو میں بہتا بولے جا رہا تھا۔ اور میں آخر کار اپنے گھر قیصریہ واپس لوٹ سکوں۔ ذرا اس آسیب زدہ عمارت کو ہی ملاحظہ کیجئے۔ قاضی محل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے در و دیوار مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ میں آج تک یہاں ایک لمحے کے لئے بھی آنکھ نہیں لگا سکا۔ نفرت ہے مجھے اس سے۔ دنیا میں کہیں بھی آپ کو ایسا عجیب و غریب طرز تعمیر دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ خدا غارت کریں اس شہر کو۔ چلیں اب کچھ کام کی بات بھی

کرلیں۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ وہ بدبخت برآباڈ کیت تو اب آپ کو فکر مند نہیں کرتا؟

یہ سوال سنتے ہی مہمان کی نیم وا آنکھیں پوری طرح کھل گئیں اور ایک مخصوص چمک کے ساتھ اس نے نگاہیں قاضی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ لیکن وہ کہیں دور فضاؤں میں گھور رہا تھا اور اپنی پیشانی پر بل ڈالے شام کے پھیلتے سایوں میں اوجھل ہوتے شہر سے اظہار نفرت کرتے ہوئے پاؤں بار بار زمین پر پٹک رہا تھا۔ مہمان کا دیکھنے کا انداز دوبارہ تبدیل ہوگیا۔

''میرا خیال ہے کہ برآبا اب کسی نوزائیدہ کی مانند بے ضرر ہو چکا ہے''۔ یہ کہتے ہوئے مہمان کے گول چہرے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔''اس کے لئے اب ہنگامہ کرنا آسان نہیں رہا''۔

کیا وہ بہت شہرت پا گیا ہے؟ قاضی نے بے تابی سے پوچھا۔

میں ہمیشہ سے عظیم قاضی کی باریک بینی کا مداح رہا ہوں۔ مہمان بولا

''تاہم اس کے باوجود''۔ قاضی اپنی لمبی انگشت شہادت جس میں وہ ہمیشہ سیاہ نیلم والی انگوٹھی پہنے رکھتا تھا۔ ہوا میں بلند کرتے ہوئے بولا۔''ہمیں دھیان رکھنا پڑے گا''۔

میرے محترم قاضی صاحب تسلی رکھیں۔ جب تک آپ کا یہ خادم یہودیہ میں موجود ہے برآبا کی ہر نقل وحرکت پر ہماری نظر رہے گی۔

اب مجھے اطمینان ہے۔ قاضی نے جواباً کہا۔ ویسے تو میں ہمیشہ ہی آپ کی موجودگی میں مطمئن رہتا ہوں۔

میں آپ کے بڑے پن کو سلام کرتا ہوں۔ مہمان تعظیماً جھکتے ہوئے بولا۔

اب آپ مجھے پھانسی کی تفصیلات سے آگاہ کریں۔ قاضی نے کہا

پھانسی کے کون سے مرحلے میں آپ کو خصوصی دل چسپی ہے؟۔ مہمان نے پوچھا۔

ہجوم کی جانب سے ہنگامہ کرنے کی کوئی کوشش تو نہیں ہوئی تھی؟۔ میرے نزدیک یہ سوال سب سے اہم ہے۔ قاضی نے کہا

جی نہیں۔ بالکل نہیں۔ مہمان نے جواب دیا۔

بہت خوب۔ موت کی تصدیق آپ نے خود کی تھی؟

جی ہاں۔ اس بات کی میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔ مہمان بولا۔

اچھا یہ بتائیں کہ صلیب پر چڑھائے جانے سے قبل مجرموں کو مشروب پلایا گیا تھا یا نہیں؟

جی ہاں۔ لیکن اُس نے۔ مہمان نے یہ کہتے وقت اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پینے سے انکار کردیا تھا۔

کس نے انکار کیا تھا؟ قاضی نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

معذرت چاہتا ہوں۔ مہمان بولا۔ کیا میں نے پہلے اس کا نام نہیں لیا تھا؟ وہی، عیشوا۔

''بے عقل، سر پھرا''۔ پلات ناک منہ چڑھاتے ہوئے بولا۔ اس کی بائیں آنکھ کے نیچے ایک پٹھا بہت تیزی سے پھڑک رہا تھا۔ ''سورج کی آگ کے نیچے جلنے سے قبل اگر قانون کسی سہولت کی اجازت دیتا ہے تو اس سے انکار کیوں؟ کن لفظوں میں اس نے انکار کیا تھا؟

''وہ کہہ رہا تھا''۔ یہ بتاتے ہوئے مہمان نے اپنی آنکھیں دوبارہ موند لیں اور کہنے لگا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ وہ شکر گزار ہے۔ اپنی زندگی چھینے جانے پر وہ کسی کو بھی موردِ الزام نہیں ٹھہراتا''۔

اس نے کسی کا نام تو نہیں لیا؟۔ قاضی نے پوچھا

نہیں۔ اس نے کسی کا نام نہیں لیا۔ مہمان نے جواب دیا۔

اس نے سپاہیوں کی موجودگی میں کوئی تبلیغ وغیرہ تو نہیں کی تھی؟

نہیں میرے عظیم قاضی۔ اس موقعہ پر اس نے کوئی خاص لفاظی نہیں کی۔ اس نے صرف یہ کہا تھا کہ انسان کی کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری وہ بزدلی کو سمجھتا ہے۔

یہ بات اس نے کس حوالے سے کہی تھی؟ قاضی کی آواز اچانک لرزنے لگ گئی۔

یہ اندازہ لگانا تو ممکن نہیں ہے۔ ویسے اس کی حرکات ہمیشہ کی طرح کچھ عجیب سی ہی تھیں۔

کیا عجیب تھا اس کی حرکات میں؟

تمام وقت یوں لگتا تھا کہ وہ کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے ہے۔ اور اس کے چہرے پر ہمہ وقت ایک مسکراہٹ طاری تھی۔

اس کے علاوہ کوئی اور بات؟ قاضی کی آواز بیٹھ سی گئی تھی۔

بس۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

قاضی نے اپنا پیالہ شراب سے بھر لیا اور پورے کا پورا غٹاغٹ پی گیا۔ اور کہنے لگا۔ ''اس وقت ہمیں سب سے بڑا یہ مسئلہ درپیش ہے کہ بے شک اس کا ایک بھی چاہنے والا یا اس کے فلسفے کا کوئی پیروکار ہمارے ہتھے نہیں چڑھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہنوز ایسے لوگ موجود نہیں ہیں''۔

مہمان گردن ٹیڑھی کیے قاضی کی گفتگو غور سے سن رہا تھا۔

''کسی بھی ممکنہ غیر متوقع صورت حال سے بچنے کے لئے''۔ قاضی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سے یہ گذارش کرتا ہوں کہ بلا تامل اور انتہائی خاموشی سے سزائے موت پانے والے تینوں مجرموں کی لاشیں صفحہ ہستی سے غائب کر دیجئے۔ ان کی تدفین اس طرح ہونی چاہئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے''۔

آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ یہ کہنے کے بعد مہمان اٹھ کھڑا ہوا اور اجازت طلب کرتے ہوئے

کہنے لگا۔ محدود وقت اور کام کی اہمیت کے پیش نظر میں فوری طور پر روانگی کی اجازت چاہتا ہوں۔

نہیں۔ ابھی کچھ دیر اور رک جائیے۔ پلات نے مہمان کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' میں آپ کو مزید دو باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس مشکل ترین صورت حال میں آپ نے بطور سربراہ خفیہ پولیس جو خدمات انجام دی ہیں میں شہنشاہ عالم رومن قیصر کے روبرو ان کا ذکر کرتے وقت فخر محسوس کروں گا''۔

یہ سنتے ہی مہمان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور قاضی کے سامنے ایک گھٹنے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

میں تو قیصر اعظم کا محض ادنیٰ ملازم ہونے کے ناطے اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

''بہرحال میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں''۔ قاضی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔'' کہ اگر آپ کو عہدے میں ترقی دے کر کسی اور جگہ منتقل ہونے کی پیش کش کی جائے تو آپ براہ کرم معذرت کر دیجئے گا اور یہیں رکے رہیے گا۔ میں آپ سے کسی قیمت پر جدا ہونا نہیں چاہتا۔ میں سفارش کروں گا کہ ان خدمات کے عوض آپ کو کسی اور طریقے سے نواز دیا جائے''۔

آپ کی سربراہی میں رومن شہنشاہ کی خدمت کرنا میرے لئے باعث فخر ہے۔ مہمان نے جواب دیا۔

''میرے لئے یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ ہاں، تو دوسری بات یہودا کے بارے میں ہے''۔ قاضی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی مہمان نے ایک لمحے کے لئے قاضی کو مخصوص نگاہ سے دیکھا۔ لیکن پھر معمول پر آ گیا۔

''سنا ہے''۔ قاضی سرگوشی کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔'' کہ اس نے ئیشوا نامی بے وقوف فلسفی کو اپنے ہاں مدعو کرنے کے عوض اچھی خاصی رقم وصول کی تھی''۔

''وصول کرے گا''۔ دھیمی آواز میں خفیہ پولیس کے سربراہ نے جواب دیا۔

رقم کیا کافی موٹی ہے؟

یہ بات کوئی نہیں جانتا۔

''آپ بھی نہیں؟'' قاضی نے حیرانگی سے پوچھا۔

''جی ہاں، میں بھی نہیں''۔ مہمان نے اطمینان سے جواب دیا۔'' لیکن یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ رقم وہ آج وصول کرے گا۔ اسے آج کیفا کے محل میں مدعو کیا جائے گا''۔

''اوہ۔ یہ لالچی بوڑھا''۔ مسکراتے ہوئے قاضی بولا۔'' ویسے وہ بڈھا ہی ہے نا''۔

میرے عظیم قاضی کا اندازہ آج تک کبھی غلط نہیں نکلا۔ لیکن آج غلطی ہوگئی ہے۔ مہمان نے

جواب دیا۔ ''بیہودا بوڑھا نہیں جوان آدمی ہے''۔

''اچھا، کیا آپ مجھے اس آدمی کے کردار کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟ کیا وہ جنونی ہے؟''۔

''ارے نہیں''۔

اچھا اور کچھ؟

بہت خوش شکل آدمی ہے۔

اور کوئی بات؟ شائید اس کی کوئی کمزوری رہی ہو؟

مہمان نے قدرے پشیمان ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''اتنے بڑے شہر میں ہر شخص پر نگاہ رکھنا ناممکن ہے''۔

ارے نہیں نہیں افرانی! مجھے آپ کی صلاحیت پر کوئی شک نہیں ہے۔ قاضی نے کہا

ہاں اس کی ایک کمزوری سے میں واقف ہوں۔ مختصر وقفے کے بعد مہمان نے جواب دیا۔ یہ کمزوری ہے دولت۔

وہ کرتا کیا ہے؟

افرانی نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور بولا۔ وہ ایک رشتہ دار کے ہاں کرنسی تبدیل کرنے کے ادارے میں ملازم ہے۔

اچھا تو یہ کام ہے اس کا؟ قاضی نے یہ کہنے کے بعد اپنے دائیں بائیں دیکھا اور یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ وہاں اس کے اور مہمان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے دھیمی آواز میں بولا۔ ''مجھے اطلاع ملی ہے کہ اسے آج رات قتل کر دیا جائے گا''۔

یہ سنتے ہی مہمان کا دیکھنے کا انداز یکسر تبدیل ہو گیا اور وہ قدرے شرمندگی کے عالم میں کہنے لگا۔ ''میرے گراں قدر قاضی صاحب! آپ نے میری اوقات سے کچھ زیادہ ہی میری تعریف کر ڈالی ہے۔ میرے پاس اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں ہے''۔

آپ یقین کیجئے کہ آپ کی تعریف بلا جواز نہیں ہے۔ قاضی نے جواب دیا۔ لیکن اس قسم کی اطلاعات یقیناً موجود ہیں۔

کیا میں پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ یہ مخبری کس نے کی ہے؟

''کسی کا نام لینا ابھی قبل از وقت ہوگا''۔ قاضی نے کہنا شروع کیا۔ ویسے بھی یہ اطلاع اتفاقیہ اور غیر مستند ہے۔ میرے فرائض کچھ ایسے ہیں کہ مجھے ہر وقت آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنی چھٹی حس پر بھی بہت زیادہ انحصار کرتا ہوں۔ اس نے مجھے آج تک دھوکہ نہیں دیا۔ میری اطلاع یہ ہے

کہ اس خبیث روح، سلطنت کے غدار عیشوا کا ایک نامعلوم پیروکار جو اس کی جادو اثر سوچ سے بری طرح متاثر ہو چکا ہے اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ آج رات یہودا کو قتل کر دے گا۔ عیشوا کی گرفتاری میں مدد کرنے کے عوض یہودا کی وصول کردہ رقم ایک رقعے کے ساتھ پجاریٔ اعظم کے گھر پھینک دی جائے گی۔ رقعے پر درج ہوگا۔

۔۔۔۔۔۔ایک معصوم کے خون سے آلودہ رقم لوٹائی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔

خفیہ پولیس کا سربراہ قاضی کی گفتگو بغور سن رہا تھا۔ اب اس کا دیکھنے کا انداز بھی تبدیل نہیں ہو رہا تھا۔ پلاٹ اس دوران اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

ذرا اندازہ کیجئے ایک تہوار سے قبل اس طرح کا تحفہ موصول ہونے پر پجاری کی حالت کیسی ہوگی؟

صرف ناخوشگوار ہی نہیں۔ بلکہ میرا اندازہ ہے کہ یہ صورت حال بہت بڑے ہنگامے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ مہمان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ اسی لئے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنی تمام تر صلاحیتیں اور وسائل بروئے کار لاتے ہوئے یہودا کی حفاظت کا بندوبست کریں۔

آپ کے حکم کی پوری پوری تعمیل ہوگی۔ افرانی نے جواب دیا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ویسے بھی ایک ہی دن میں کسی کو قتل کرنا، پھر ایک مخصوص رقم کو ڈھونڈ کر حاصل کرنا اور اسے کیفا پہنچانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

''ان تمام باتوں کے باوجود میری چھٹی حس مجھے بار بار یہ عندیہ دے رہی ہے کہ آج ہی اس کی گردن کاٹ دی جائے گی۔ قاضی مضطرب ہوتا ہوا بولا۔ اور میں آپ کو دوبارہ کہہ رہا ہوں کہ میری چھٹی حس نے مجھے آج تک دھوکہ نہیں دیا''۔ یہ کہتے ہوئے قاضی کا چہرہ کسی تشنج زدہ مریض کی مانند پھڑ پھڑانے لگ گیا۔

مہمان اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ اچھا تو آپ کا خیال ہے کہ اس کی گردن کاٹ دی جائے گی؟

جی ہاں۔ قاضی نے جواب دیا۔ اس کا بچاؤ اب فقط آپ کی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔

مہمان اپنی وزنی بیلٹ درست کرتے ہوئے بولا۔ ''میری خدمات عظیم قاضی کے لیئے وقف ہیں۔ میں اب خوش خبری کے ساتھ جلد لوٹ آنے کی اجازت چاہتا ہوں''۔

ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا کہ میں آپ کا مقروض ہوں۔ پلاٹ نے اچانک اعلان کیا۔

حیرت زدہ مہمان بولا۔

نہیں نہیں۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ میرے مقروض کیسے ہوگئے؟

کیسے نہیں ہوں! ذرا یاد کیجئے۔ جب یروشلم میں داخل ہوتے وقت مجھے بھکاریوں کے ہجوم نے

گھیر لیا تھا اور میرے پاس اس وقت پیسے نہیں تھے۔ ان بھک منگوں سے جان چھڑانے کے لئے آپ ہی نے میری مدد کی تھی۔

ارے قاضی صاحب! یہ بھی کوئی یاد رکھنے کی بات ہے کیا؟

ایسی باتیں تو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیں عزیز من۔ قاضی نے کرسی پر رکھے کوٹ کی جیب سے ایک چمڑے کی تھیلی نکالی اور مہمان کے حوالے کر دی۔ مہمان نے سرخم کرتے ہوئے تھیلی وصول کی اور اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

میں منتظر رہوں گا۔ پلات نے کہا۔'' مجھے آج ہی تدفین کی رپورٹ چاہیے۔ آپ سن رہے ہیں افرانی؟ آج ہی۔ اور ہاں یہودا کے معاملے کو بھی آج ہی سلجھا لیجئے۔ میں ابھی اپنے حفاظتی دستے کے سربراہ کو حکم دوں گا کہ خواہ رات کا کوئی بھی پہر ہو آپ کو محل میں دیکھتے ہی مجھے فوراً بیدار کر دیا جائے۔ میں آپ کا انتظار کروں گا''۔

میں آپ کا خادم۔ مہمان نے جھکتے ہوئے کہا اور بالکونی سے روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر تک گیلی ریت پر رواں قدموں کی سرسراہٹ اور بعد ازاں مرمر کے فرش پر افرانی کے لمبے بوٹوں کی ٹھک ٹھک، فضا میں بازگشت پیدا کرتی سنائی دینے لگ گئی۔ آہستہ آہستہ یہ آواز دھیمی پڑتی گئی اور مہمان نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ قاضی نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا تو سورج غائب ہو چکا تھا اور اندھیرے کی سرمئی چادر نے محل کو اپنے آنچل میں سمیٹ لیا تھا۔

باب ۲۶

تدفین

محل پر چھا جانے والی اندھیرے کی سرمئی چادر نے قاضی کی ہیئت یکسر تبدیل کر کے رکھ دی تھی۔ وہ اچانک بوڑھا دکھائی دینے لگا تھا اور کسی شدید بے چینی کا شکار لگ رہا تھا۔ خالی کرسی پر اچانک نگاہ پڑتے ہی نجانے وہ کیوں کانپ اٹھا تھا۔ تہوار کی رات آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈھلتی ہوئی شام کے دھندلے سائے اپنا کھیل کھیل رہے تھے۔ غالباً شدید تھکن کا شکار ہونے پر قاضی کو یہ گمان گزرا تھا کہ کرسی پر کوئی بیٹھا ہے۔ اعصابی تناؤ میں مبتلا پونتی پلات کبھی بالکونی سے نیچے جھانکنے لگتا تو کبھی اپنی ہتھیلیوں کو ملنے لگتا۔ کبھی میز پر پڑا خالی پیالہ اٹھالیتا تو کبھی رک کر فرش کو یوں گھورنے لگتا کہ جیسے کسی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

آج وہ دوسری مرتبہ اعصابی تناؤ میں مبتلا ہوا تھا۔ اپنی اس کنپٹی کو جس میں صبح چھڑنے والی شدید درد اب معمولی چبھن میں تبدیل ہو چکی تھی، سہلاتے ہوئے قاضی سوچ رہا تھا کہ آخر اس ہیجانی کیفیت کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ تاہم اسے جلد ہی اس بات کی سمجھ آ گئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ خود کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی تھی کہ آج اُس سے ایک ناقابل تلافی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے دیر ہو چکی ہے اب وہ اس غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش میں بے تکی حرکتیں کرنے میں معروف تھا۔ وہ اپنے آپ کو یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ صبح سرزد ہونے والی غلطی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

محل کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے ایک موڑ پر وہ اچانک رک گیا اور سیٹی بجانے لگ گیا۔

سیٹی کی آواز سن کر نیم روشن باغیچے سے سرمئی رنگ کا ایک جسیم کتا اچھلتا ہوا بالکونی میں آ گیا۔ اس کی گردن میں سنہری سکوں سے آراستہ پٹہ لٹک رہا تھا۔

بانگا۔ بانگا۔ قاضی نے آہستہ سے آواز دی۔

کتا پچھلے پنجوں پر کھڑا ہو گیا اور اگلے پنجے اپنے مالک کے شانوں پر لٹکانے کے بعد اس کے رخسار چاٹنے لگ گیا۔ کتے کے بھاری بھرکم جسم اور والہانہ اچھل کود کے دباؤ سے قاضی لڑکھڑا گیا اور گرنے

سے بال بال بچا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بانگا اپنی زبان لٹکائے تیز تیز سانس لیتے ہوئے مالک کے قدموں کے نزدیک دراز ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک اس بات کا اشارہ تھی کہ طوفان تھم گیا ہے۔ بادلوں کی گھن گرج وہ واحد طاقت تھی جس سے یہ بے خوف جانور ڈرتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اسے اس شخص کے قدموں میں دوبارہ لیٹنے کا موقعہ ملا ہے جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرتا ہے اور جسے وہ سب سے زیادہ قابل احترام سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک رومن قاضی نسل انسانی میں سب سے بلند پایہ اور ہر شے پر قادر شخصیت تھی۔ اسی وجہ سے بانگا خود کو بھی اعلیٰ نسل واحد اور منفرد ہستی تصور کرتا تھا۔ مالک کے قدموں میں پڑے رہنے اور شام کے اندھیرے میں باغیچے کی سمت گھورتے ہوئے اسے یہ احساس ہو چکا تھا کہ مالک کو کسی پریشانی نے گھیر رکھا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مالک کی بائیں جانب پہنچ کر اپنے اگلے پنجے اور سر قاضی کی گود میں رکھ دیا۔ وہ اداس آنکھوں سے مالک کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا اور اس کے لمبے نوکیلے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ اس کی حرکات سے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ مالک کے غم اور پریشانی میں برابر کا شریک ہے۔ اسی طرح مالک اور پالتو جانور نے محل کی بالکونی پر بیٹھے ایسٹر کی رات کا استقبال کیا۔

دوسری جانب قاضی کا مہمان ابھی افراتفری کے عالم میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ محل کی بالکونی سے نیچے اترنے کے بعد وہ باغیچے سے ہوتا ہوا دائیں جانب مڑ گیا اور محل کے اندر متعین فوجی دستوں کی بیرکوں کے پاس جا پہنچا۔ ان بیرکوں میں وہ دونوں دستے مقیم تھے جو قاضی کے ساتھ تہوار کے موقعہ پر یروشلم پہنچے تھے۔ ان کے علاوہ قاضی کی حفاظت پر مامور دستہ بھی وہیں رہائش پذیر تھا۔ مہمان اسی دستے کا سربراہ تھا۔ مہمان تقریباً دس منٹ تک ان بیرکوں میں موجود رہا۔ اس کی روانگی کے فوراً بعد محل سے تین گدھا گاڑیاں برآمد ہوئیں جن پر مختلف اوزار اور پانی کے ڈرم لادے گئے تھے۔ سلیٹی رنگ کے لمبے برساتی کوٹ پہنے پندرہ گھڑسواروں نے ان گاڑیوں کے کارواں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ گاڑیاں محل کے عقبی دروازے سے نکلنے کے بعد شہر کی فصیل کے مغربی حصے سے ہوتی ہوئی اس پگڈنڈی پر روانہ ہوگئیں جو شمال میں مشہور چوک سے گذر کر یفاء جانے والے راستے کی جانب نکلتی تھی۔ اسی راستے سے آج دن کے وقت سزائے موت پانے والے مجرموں کی سواری گزری تھی۔ گاڑیوں کا کارواں جب اس راستے تک پہنچا تو اندھیرا پوری طرح چھا گیا تھا اور افق پر چاند نمودار ہو چکا تھا۔

اوزار لیجانے والی گاڑیوں اور گھڑسواروں کی روانگی کے کچھ ہی دیر بعد قاضی کا مہمان بھی گہرے رنگ کا لمبا کوٹ پہنے گھوڑے پر سوار محل سے نکل پڑا۔ وہ گدھا گاڑیوں کی تقلید کرنے کی بجائے شہر کے وسطی علاقے کی طرف رواں تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ مرکزی مندر کی پرشکوہ عمارت سے ملحق انتونی قلعے کے قریب پہنچ گیا۔ قلعے میں کچھ وقت گزارنے کے بعد مہمان شہر کے نسبتاً نشیبی علاقے کی بھول بھلیوں میں گھوم رہا

تھا۔ ہاں البتہ گھوڑے کی بجائے اب وہ خچر پر سوار تھا۔ شہر سے بخوبی واقفیت رکھنے کی بنا پر اس نے جلد ہی مطلوبہ گلی تلاش کر لی۔ یہ گلی ''یونانی گلی'' کے نام سے مشہور تھی۔ اس نام کی وجہ یہاں یونانیوں کی چند دوکانیں تھیں جن میں غالیچوں کا کاروبار لوگوں کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا۔ ایک ایسی ہی دوکان کے قریب پہنچ کر مہمان خچر سے نیچے اتر آیا اور خچر کی رسی داخلی دروازے کے قریب لگے آہنی جنگلے کے ساتھ باندھ دی۔ دوکان اس وقت تک بند ہو چکی تھی۔ مہمان دوکان سے ملحقہ ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے گزرنے کے بعد وہ ایک مستطیل نما کھلی جگہ پہنچ گیا, جہاں کچھ سرائے اور ایک رہائشی مکان تھا جس کی بالکونی خوبصورت سرخ و سفید پھولدار بیل نے گلزار بنا رکھی تھی۔ بالکونی پر ابھی تک مشعلیں روشن نہیں ہوئی تھیں۔ مہمان نے آہستگی سے پکارا۔

نیزا!

جواب میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور شام کے گہرے اندھیرے میں ایک نوجوان عورت بالکونی پر نمودار ہوئی۔ اوپر سے جھک کر وہ پکارنے والے کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ مہمان کی پہچان ہو جانے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے, ہاتھ کے اشارے سے اس کا استقبال کیا۔

تم اکیلی ہو؟ افرانی نے یونانی زبان میں پوچھا

ہاں اکیلی ہوں! شوہر صبح سے قیصریہ گیا ہے۔ خاتون دائیں بائیں دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ لیکن ملازمہ گھر پر ہی ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مہمان کو اندر آنے کو کہا۔ افرانی چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد پتھریلی سیڑھیوں پر چڑھنے لگ گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں گھر کے اندر چلے گئے۔

اس عورت کے ساتھ افرانی نے بمشکل پانچ منٹ گزارے ہوں گے جس کے بعد وہ زینے سے نیچے اتر آیا اور اپنی ٹوپی پیشانی پر جھکانے کے بعد باہر گلی میں نکل گیا۔ اس دوران گھروں میں روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ تہوار کی وجہ سے گلیوں میں ابھی تک رونق تھی۔ افرانی خچر پر سوار اسی ہجوم میں گم ہو گیا۔ نیزا نامی خاتون کے ساتھ ملاقات کے بعد وہ کن راستوں سے گزرتا ہوا گیا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔

نیزا اس دوران اپنا لباس تبدیل کرنے میں مصروف تھی اور بہت جلدی میں تھی۔ اندھیرے کمرے میں مطلوبہ اشیا ڈھونڈنے میں دشواری کے باوجود اس نے نہ تو مشعل روشن کی اور نہ ہی ملازمہ کو مدد کے لئے بلایا۔ سر پر رومال لپیٹنے کے بعد وہ بلند آواز میں بولی۔

اگر کوئی میرا پوچھے تو کہہ دینا عنانتے کو ملنے گئی ہے۔

جواب میں بوڑھی ملازمہ کی آواز سنائی دی۔ ''عنانتے کو ملنے؟ اوہ, یہ عنانتے! تمہیں تو شوہر نے اسے ملنے سے منع کیا تھا۔ حرافہ ہے تمہاری عنانتے۔ میں تمہارے شوہر کو بتا دوں گی''۔

بس بس منہ بند کرو اپنا۔ نیزا نے چہک کر جواب دیا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی گھر سے باہر نکل آئی۔ ملازمہ نے بڑبڑاتے ہوئے بالکونی کا دروازہ بند کرلیا۔

ٹھیک اسی وقت شہر کے زیریں علاقے کی ایک ٹوٹی پھوٹی گلی میں ایک سلیقے سے تراشی گئی داڑھی والا نوجوان نمودار ہوا۔ اس نے سفید رنگ کی نئی نکور فراک اور آسمانی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے نئے سینڈل سے تازہ چمڑے کی مہک اٹھ رہی تھی۔ لمبی ناک والا خوش شکل نوجوان تہوار کی خوشی میں نئے کپڑے پہنے انتہائی خوشگوار موڈ میں تیزی سے چلتا ہوا راہ گیروں کو پیچھے چھوڑتا جارہا تھا۔ اس دوران عمارتوں کی کھڑکیاں یکے بعد دیگرے روشن ہوتی جارہی تھیں۔ یہ نوجوان بازار سے گزرتا ہوا کیفا محل میں واقع پجاریٔ اعظم کی رہائش گاہ کی جانب گامزن تھا۔

کچھ دیر بعد اسے کیفا کے محل میں داخل ہوتے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ جلد ہی محل سے رخصت بھی ہوگیا۔

مشعلوں سے روشن پررونق محل سے روانگی کے بعد نوجوان بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اس کی خود اعتمادی میں بھی واضح طور پر اضافہ ہوگیا تھا۔ اس موڑ پر جہاں گلی بازار سے جاملتی تھی ایک خوبصورت دوشیزہ سیاہ رومال سے سر کو ڈھانپے نوجوان کے قریب سے گزری۔ نوجوان سے چند قدم آگے نکل جانے کے بعد اس نے گھوم کر دیکھا اور غالباً اپنا چہرہ نمایاں طور پر دکھانے کے لئے اس نے رومال سر سے اتار لیا اور فوراً ہی تیز تیز قدم اٹھاتی آگے کو چل پڑی۔ نوجوان نے عورت کو فوراً پہچان لیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رک گیا اور پھر تیزی سے اس چنچل حسینہ کے پیچھے دوڑ پڑا۔ اس کے ٹکرانے سے ایک صراحی لیجانے والا آدمی بمشکل گرتے گرتے بچا۔ بالآخر نوجوان دوشیزہ کے قریب پہنچ گیا اور اس سے مخاطب ہوا!

نیزا !

خاتون چلتے چلتے رک گئی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور آنکھوں سے ایک عجیب سردمہری جھلکنے لگ گئی۔ وہ یونانی زبان میں بولی۔

ارے یہ تم ہو یہودا؟ میں تمہیں فوراً پہچان نہیں پائی۔ ہمیں تو یہ اچھا شگون ہے۔ ہمارے ہاں کہاوت ہے کہ اگر کسی واقف کار کو پہلی نظر میں نہ پہچانا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ آدمی بہت مالدار ہوگا۔

یہودا کے دل کی دھڑکن یکا یک تیز ہوگئی۔ اس نے چوروں کی مانند دائیں بائیں نظر دوڑانے کے بعد سرگوشی میں پوچھا۔ ''تم کہاں جارہی ہو، نیزا؟''

تم یہ جان کر کیا کرو گے؟ نیزا نے یہودا کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

یہ سوال سن کر یہودا کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کہنے لگا ''کیا مطلب، کیا کروں گا؟'' تمہیں معلوم تو تھا کہ میں نے آج شام تمہارے گھر آنا ہے اور تم نے وعدہ بھی کیا تھا کہ گھر پر

ہی موجود رہوگی''۔

''او، نہیں، نہیں''۔ نیزا بولی اور اس نے نخریلے انداز میں نچلا ہونٹ ذرا سا باہر کو لٹکا دیا۔ یہ ادا دیکھ کر یہودا کو یوں محسوس ہوا کہ اس کا خوبصورت چہرہ مزید دل کش ہوگیا ہے۔ ''گھر پر مجھے تنہائی کھائے جارہی تھی''۔ نیزا گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

تم لوگوں کا تو آج تہوار ہے نا۔ میں گھر بیٹھ کر کیا انتظار کرتی رہتی کہ تم کب آؤ گے اور کیسے بالکونی کے نیچے کھڑے ٹھنڈی آہیں بھرو گے؟ اور میں ہر لمحہ اس خوف میں مبتلا رہوں گی کہ کہیں ملازمہ میرے شوہر کو شکایت نہ لگا دے۔ اسی لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کی شام شہر سے باہر بلبلوں کے گیت سنوں گی''۔

کیا کہہ رہی ہو؟ شہر سے باہر؟ اکیلی؟ یہودا نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

ہاں اکیلی۔ نیزا نے جواب دیا۔

اجازت دو تو میں بھی تمہارے ساتھ ہو لوں۔ یہودا نے التجا کے انداز میں پوچھا۔ وہ اس خوبصورت حسینہ کی نیلی آنکھوں میں غوطے کھاتا دنیا کی ہر چیز سے بے خبر ہوگیا تھا۔

تم خاموش کیوں ہو نیزا؟ یہودا نے خاتون کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے روہانسی آواز میں پوچھا۔

تمہیں میرے ساتھ کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی؟ نیزا نے اچانک رکنے کے بعد پوچھا۔

یہودا کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اب پوری طرح ماؤف ہو چکی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح نیزا کو گھورے جارہا تھا۔

اچھا، چلو ٹھیک ہے۔ آ جاؤ۔ نیزا نے اپنا رویہ قدرے نرم کرتے ہوئے کہا۔

کہاں؟ کہاں جانا ہے؟

ٹھہرو! میرا خیال ہے کہ پہلے کہیں رک کر راستہ اور منزل طے کر لیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ شہر کی پررونق گلیوں میں کوئی شناسا مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر ڈھنڈورا پیٹ دے کہ میں اپنے عاشق کے ساتھ گھوم رہی تھی۔

دونوں بازار سے غائب ہوگئے اور کچھ دیر بعد ایک رہائشی مکان کے پچھواڑے اندھیرے میں کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔

تم تیلیوں کی گلی سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکل جاؤ۔ نیزا بول رہی تھی اور سیدھا گیتسیما کے ٹیلوں کے عقب میں زیتون کے باغ سے ملحقہ چشمے کے پاس پہنچ جانا۔

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں۔

ٹیلے میں نکلوں گی۔ نیزا بول رہی تھی۔تم میرا پیچھا نہ کرنا۔ بلکہ کوشش کرنا کہ میں تمہاری نظروں سے بھی اوجھل ہی رہوں۔اور جب ندی پار کرلو گے تو۔۔۔۔تمہیں معلوم ہے نا کہ ندی کو کہاں سے پار کرنا ہے؟

معلوم ہے۔معلوم ہے۔

ندی پار کرنے کے بعد دائیں جانب مڑ جانا۔ وہیں ٹیلے کے پیچھے میں تمہارا انتظار کروں گی۔ یہ کہنے کے بعد نیزا تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

یہودا کچھ دیر اکیلا ہی وہاں کھڑا رہا۔ وہ اپنے حواس اور سوچوں کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تہوار کے موقعہ پر گھر میں اپنی عدم موجودگی کی کیا وجہ بتائے گا۔لیکن ذہن منتشر ہونے کی وجہ سے اسے سردست کوئی بہانہ نہیں سوجھا تھا۔اس کے پاؤں خود بخود یونانی حسینہ کی تلاش میں چل نکلے۔

یہودا نے اپنا راستہ تبدیل کرلیا تھا۔اب وہ شہر کے زیریں حصے کی بجائے واپس کیفا محل کی جانب رواں تھا۔تہوار کی رونق اب اپنے عروج پر تھی۔گھر نہ صرف روشن ہوگئے تھے بلکہ مذہبی گیتوں کی صدائیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔گلیاں لوگوں کے ہجوم سے بھر گئی تھیں اور دوسرے شہروں سے خچر سوار ابھی تک جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔

یہودا یونانی ساحرہ کے خیال میں اس قدر مگن تھا کہ اسے نہ تو محل میں بجنے والے بگل کی آواز سنائی دی اور نہ ہی اُس کی توجہ مشعل بردار گھڑسواروں کے دستے کی جانب مبذول ہوئی۔ مینار انطونی پر پانچ بہت بڑی مشعلیں روشن کی گئی تھیں جنہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ جیسے چاند پانچ حصوں میں تقسیم ہوکر مینار میں آ بیٹھا ہے۔ یہودا نے ان روشنیوں پر بھی سرسری سی نظر ڈالی۔ اسے تو بس شہر سے جلدازجلد باہر نکلنے کی پڑی تھی۔ بسا اوقات اُسے یہ گمان ہو رہا تھا کہ جیسے اس سے چند قدم آگے ایک ناچتا ہوا زنانہ سایہ اپنے پیچھے آنے کی تاکید کررہا ہے۔ یہودا کو بخوبی اندازہ تھا کہ یہ محض اس کا وہم ہے اور نیزا تو کب کی اُس سے کہیں آگے نکل چکی ہے۔ بالآخر وہ شہر کے بیرونی دروازے پر آ پہنچا۔اس کے دل و دماغ پر اپنی محبوبہ سے ملنے کا جنوں سوار تھا جو اسے ہوا کے دوش اڑ کر منزل پر پہنچنے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔لیکن بدقسمتی سے اُسے شہر کے دروازے پر اونٹوں کے ایک کارواں کی وجہ سے کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ وہ دل ہی دل میں شتر سواروں کو کوس رہا تھا۔

راستہ صاف ہوتے ہی یہودا دوڑتا ہوا شہر کی فصیل سے باہر نکل آیا۔فصیل کے دروازے کی بائیں جانب ایک قبرستان تھا, جہاں کچھ لوگ خوشبودار جھاڑیاں جلائے دعا کرنے میں مصروف تھے۔گرد سے اٹے راستے کو پار کرنے کے بعد وہ ندی میں اتر گیا۔پتھروں سے اٹھکیلیاں کرتا پانی بلبلے اور جھاگ بناتا اس کی ٹانگوں سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ ایک پتھر سے دوسرے پر پھلانگتا کچھ ہی دیر میں ندی کے دوسرے کنارے

پر جا پہنچا۔ خوش قسمتی سے ٹیلوں کی سمت جانے والا راستہ بالکل سنسان پڑا تھا۔ شہر کی گرد آلود فضا کے بعد اس کھلی جگہ صنوبر اور گھاس کی مسحور کن مہک سے لدی لطیف ہوا یہودا کو مدہوش کئے جا رہی تھی۔

زیتون کے باغ کا دروازہ کھلا تھا اور وہاں کسی ذی روح کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ یہودا زیتون کے سرسبز درختوں کے بیچوں بیچ تیز تیز سانس لیتا بھاگا چلا جا رہا تھا۔ یہ عمودی راستہ پہاڑی نما ٹیلے کی چوٹی کو جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہودا جب اندھیرے سے نکل کر چاندنی میں آ جاتا تو درختوں کی شاخوں سے چھن کر آنے والی چاندنی زمین پر جو نقش ونگار بنا رہی تھی انہیں دیکھ کر یہودا کو نیزا کے شکی مزاج شوہر کی دوکان پر لٹکے خوبصورت غالیچوں کا گمان ہونے لگتا تھا۔ رات کی اس خاموشی میں بلبلوں کا سریلا گیت کانوں میں رس گھول رہا تھا۔

یہودا کی منزل اب قریب تھی۔ اسے معلوم تھا کہ دائیں جانب مڑنے کے بعد اسے چشمے کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں گی۔ فضا میں خنکی چھانے لگی تھی۔ اس نے اپنی رفتار کم کر دی اور دھیمی آواز میں پکارنے لگ گیا۔

نیزا۔ نیزا !!

لیکن نیزا کے بجائے ایک تناور درخت کے عقب سے ایک جسیم مرد کا ہیولا نمودار ہوا۔ اُس نے ہاتھ میں کوئی چمکدار چیز تھام رکھی تھی۔ یہودا پلٹ کر واپس بھاگنے لگا تو ایک دوسرے شخص نے اس کا راستہ روک لیا۔

پہلے شخص نے یہودا سے پوچھا!

اگر زندگی عزیز ہے تو فوراً بتاؤ کہ آج تم نے کتنے پیسے وصول کئے ہیں؟

یہ سن کر یہودا کے دل میں امید کی کرن روشن ہوگئی اور وہ بولا۔

تیس درہم! تیس درہم۔ ساری رقم میرے پاس ہے۔ تم لے لو۔ سب کچھ لے لو۔ لیکن خدارا میری زندگی بخش دو۔

یہودا کے سامنے کھڑے شخص نے پیسوں سے بھری تھیلی فوراً اپنے قبضے میں لے لی اور اسی لمحے پیچھے کھڑے شخص نے اس کی پشت میں چھرا گھونپ دیا۔ یہودا کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور وہ لڑکھڑاتا ہوا سامنے کھڑے شخص کے قریب پہنچ گیا جس نے اپنا چھرا یہودا کے دل میں اتار دیا۔

نی۔ زا۔۔ وہ دھیمی آواز میں بمشکل بول پایا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ اس کا بے جان جسم ایک زوردار آواز کے ساتھ زمین پر آن گرا۔

اس دوران ایک تیسرا شخص وہاں نمودار ہوا۔ اس نے گہرے رنگ کا لمبا کوٹ اور ٹوپی پہن رکھی تھی۔

جلدی کرو۔ تیسرا شخص تحکمانہ آواز میں بولا۔ قاتلوں میں سے ایک نے پیسوں والی تھیلی اور اس تیسرے شخص کا دیا ہوا رقعہ ایک کپڑے میں لپیٹنے کے بعد اپنی قمیض کے اندر محفوظ کرلیا۔ دونوں خنجر بردار کچھ ہی لمحوں میں رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ تیسرا شخص لاش کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے دودھ کی مانند سفید پڑ جانے والے چہرے کا بغور معائنہ کرنے لگ گیا۔ جلد ہی پیڑوں کے درمیانی راستے پر کسی زندہ انسان کا نام ونشان نہیں تھا۔ فقط یہودا کی خون میں نہائی بے یارو مددگار لاش وہاں اوندھے منہ پڑی تھی۔

زیتون کے باغ میں بلبلوں کا سریلا گیت اب بھی دور دور تک سنائی دے رہا تھا۔ یہودا کے دونوں قاتل اس مقتل سے نکل کر کہاں گئے؟ کوئی نہیں جانتا۔ ہاں تیسرے آدمی کا راستہ اور منزل ہمیں معلوم ہے۔ داخلی دروازے کی بجائے وہ باغ کی جنوبی دیوار کو پھلانگنے کے بعد باہر نکل گیا اور جلد ہی ندی کنارے جا پہنچا۔ وہ پانی میں اتر گیا اور کچھ دور تک پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کی متلاشی نگاہوں نے جلد ہی دو گھوڑوں اور ان کے ساتھ کھڑے ایک شخص کو دیکھ لیا۔ قریب پہنچنے پر اس آدمی نے خاموشی سے ایک گھوڑے کی باگ لمبے کوٹ والے کے ہاتھ میں دے دی۔ دونوں آدمی گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ کچھ دور تک پانی میں چلنے کے بعد وہ ندی سے باہر نکل آئے۔ یروشلم کی فصیل تلے دونوں گھڑسوار علیحدہ ہو گئے۔ گھوڑوں کی رکھوالی کرنے والا واپس مڑنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا جبکہ دوسرا شخص گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اس نے اپنا کوٹ اتار دیا اور سر پر آہنی ہیلمٹ جما لیا۔ اب وہ فوجی لباس میں ملبوس رومن فوجی افسر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد شہر کے جنوبی دروازے کی سمت روانہ ہو گیا۔

یروشلم کے جنوبی دروازے کی مہراب کے نیچے روشن مشعلوں کے بے تاب شعلے لپک رہے تھے۔ پتھر سے بنے بنچوں پر شہر کے داخلی دروازے کی حفاظت کے لئے مامور سپاہی بیٹھے کوڑی دانہ کھیل رہے تھے۔ گھڑسوار فوجی افسر پر نظر پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ انہیں ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوا تیزی سے شہر میں داخل ہو گیا۔

شہر تہوار کی خوشی میں روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کوئی کھڑکی ایسی نہیں تھی جس میں مشعل روشن نہ ہوئی ہو۔ ہر طرف مذہبی گیت الاپے جا رہے تھے۔ اکثر گھروں میں بکرے کا بھنا ہوا گوشت اور انگوری شراب کھانے کی میز پر پیش کی جا رہی تھی۔ گھڑسوار زیرلب کچھ گنگنا رہا تھا اور خراماں خراماں شہر کے زیریں علاقے کی بل کھاتی سنسان گلیوں سے گزرتا ہوا مینار انتھونی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھار وہ سر اٹھا کر مینار پر روشن پانچ مشعلوں اور آسمان پر تمتماتی مشعل کو دیکھنے لگتا تھا۔

عظیم ایرودیدِ محل ایسٹر کی تقریبات سے یکسر لاتعلق نظر آ رہا تھا۔ محل کی بے کراں خاموشی میں فقط جنوبی حصے میں مقیم فوجی افسروں اور سپاہیوں کے رہائشی کمروں میں الاؤ روشن تھے اور وہاں زندگی کے کچھ

آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ محل کے سامنے والا حصہ اپنے واحد مکین رومن قاضی پونتی پلات اور سنہری مجسموں کو اپنے اندر سموئے چاند کی روشنی میں ایک پراسرار سکوت کے عالم میں تھا۔ محل کے اس حصے میں مکمل خاموشی کا راج تھا اور در و دیوار سوگ میں ڈوبے محسوس ہو رہے تھے۔ قاضی، جیسا کہ افرانی کو بتایا گیا تھا محل کے اندر جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے بالکونی میں ہی بستر لگانے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ آرام دہ مخملیں بستر پر دراز تو ہو گیا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ٹمٹماتے ستاروں کے جھرمٹ میں شرمیلے چاند نے آج کسی حجاب کے بغیر پوری آب و تاب کے ساتھ اپنا حسن دنیا کے سامنے پیش کر رکھا تھا۔ قاضی کئی گھنٹوں سے پلکیں جھپکائے بغیر چاند کو گھورے جا رہا تھا۔

تقریباً آدھی رات کے وقت نیند کی دیوی بالآخر قاضی پر مہربان ہوتی نظر آنے لگی۔ قاضی نے اپنا لمبا کوٹ اور قمیض کے گرد بندھی چوڑی بیلٹ اتارنے کے بعد فرش پر پھینک دی اور رعشہ زدہ مریض کی مانند جمائیاں لیتا ہوا ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ بانگا بھی قاضی کے ساتھ بستر میں گھس گیا اور تکیے پر مالک کے ساتھ سر جوڑ کر لیٹ گیا۔ قاضی نے جانور کی گردن اپنے بازوؤں کے ہار میں سمیٹ لی اور بالآخر آنکھیں بند کر لیں۔ بانگا بھی جلد ہی گہری نیند سو گیا۔

بالکونی کے ستون چاندنی کے راستے میں حائل ہو رہے تھے۔ نتیجتاً بالکونی کا بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا پڑا تھا۔ سیڑھیوں کے دائیں کونے سے قاضی کے بستر تک چاندنی کی ایک لکیر بچھ گئی تھی۔ جونہی قاضی کا رابطہ اپنے گرد و پیش کے زندہ حقائق سے منقطع ہوا وہ اس چاندنی کی لکیر پر چلتا ہوا سیدھا چاند پر جا پہنچا۔ وہ ایک لطیف لذت کا احساس لئے اس آسمانی راستے پر گامزن تھا اور خوشی میں جھومتا ہوا کھلکھلا کر ہنسے جا رہا تھا۔ اس کے بائیں جانب بانگا جبکہ دائیں جانب وہی آوارہ گرد فلسفی چل رہا تھا۔ دونوں کسی انتہائی پیچیدہ موضوع پر بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے اپنا اپنا نقطہ نظر منوانے میں قاصر نظر آ رہے تھے۔ ان کی سوچ میں زمین و آسمان کے فرق نے اس بحث کو بہت دل چسپ بنا دیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ گفتگو کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی تھی۔ صبح کل وری پہاڑی پر سزائے موت دینے کا عمل بھی غالباً کسی غلط فہمی کی نذر ہو گیا تھا۔ کیونکہ انسانوں کے رحم دل ہونے کی بے وقوفانہ بات کا پرچار کرنے والا فلسفی تو قاضی کے پاس زندہ و سلامت موجود تھا اور ویسے بھی اس سے بڑھ کر خوفناک بات کیا ہو سکتی تھی کہ ایسے بے ضرر انسان کو واقعتاً پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔

نہیں ہوئی تھی پھانسی! نہیں ہوئی تھی! یہی وہ خوش آئند سوچ تھی جس نے چاندنی کے زینوں پر رواں رومن قاضی کے قدم بے وزن کر دیئے تھے اور وہ ہر فکر سے بے نیاز چاندنی کی روش پر اڑا چلا جا رہا تھا۔

طوفان کی آمد شام تک متوقع ہے اور بزدلی انسانیت کا بہت بڑا روگ ہے۔ عیشوا کہہ رہا تھا۔

نہیں بے وقوف فلسفی میں تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ بزدلی سب سے بڑا روگ ہے۔ رومن قاضی کی ہی مثال لے لو۔ کیا اس نے بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے؟ کیا تمہاری عقل اس بات کو ممکن سمجھتی ہے کہ یہودیہ کا قاضی رومن سلطنت کے شہنشاہ کی شان میں گستاخی کرنے والے شخص کو بچانے کی خاطر اپنا عہدہ اور اپنی قابل رشک حیثیت کو قربان کر سکتا ہے؟

ہاں۔ ہاں۔ قاضی نیند میں کراہتا ہوا بولا۔

بلا جھجک قربان کر دے گا۔ صبح شائید وہ اس قربانی سے گریز کر جاتا لیکن اب، اب رات کے وقت دن بھر کے واقعات کا بغور جائزہ لینے کے بعد وہ اس بے گناہ معصوم فلسفی طبیب کو بچانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

اب ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ چیتھڑوں میں ملبوس فلسفی کہہ رہا تھا۔ آج کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ جب کبھی مجھے یاد کیا جائے گا تو تمہارا تذکرہ بھی ضرور ہوگا۔ مجھے، غیر معروف ماں باپ کی اولاد کو اور تمہیں، ستارہ شناس بادشاہ اور آٹا چکی کے مالک کی بیٹی کی اولاد کو، اب ایک ساتھ ہی یاد رکھا جائے گا۔

''ہاں، لیکن میرے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ تم، مجھے، ستارہ شناس کی اولاد کو ہمیشہ یاد رکھنا''۔ قاضی نیند میں بڑبڑا رہا تھا اور نیند کے عالم میں ہی یہودیہ کا سنگ دل قاضی اس بدحال گداگر سے ہاتھ ملاتے وقت فرط جذبات سے کبھی ہنس رہا تھا تو کبھی رو رہا تھا۔

قاضی کے لئے یہ خواب جتنا رنگین تھا اس کا ٹوٹ جانا اتنا ہی سنگین تھا۔ بانگا نے اچانک چاند کی جانب منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا تھا اور قاضی کے سامنے بچھا چاندنی کا روشن راستہ غائب ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلی بات جو اس کے ذہن میں ابھری وہ یہ تھی کہ سزائے موت پر تو عمل درآمد ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی معمول کی عادت کے مطابق بانگا کو پٹے سے پکڑ لیا اور اپنی بیمار آنکھوں سے چاند کو ڈھونڈنے لگ گیا۔ چاند اس دوران اپنی جگہ سے سرک چکا تھا اور اس کی روشنی بھی سفیدی مائل ہو چکی تھی۔ چاند کی ٹھنڈی روشنی میں بالکونی کے ستونوں کے درمیان ایک ناخوشگوار سا الاؤ لرز رہا تھا۔ کینٹر ہاتھوں میں مشعل لئے بالکونی میں کھڑا تھا۔ اُس نے خوف اور نفرت کے ملے جلے تاثرات سے بھری نگاہیں کتے پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ کتا کسی بھی لمحے جست لگانے کو تیار کھڑا تھا۔

خاموش، بانگا! قاضی نے کہا اور کھانسنے لگ گیا۔ اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے مشعل کی تیز روشنی سے بچاتے ہوئے وہ بولا۔ میرے نصیب میں نہ تو رات کی تاریکی میں سکون ہے نہ ہی چاند کی روشنی میں۔ او خداؤ! تمہاری ذمہ داری بھی بہت کٹھن ہے مارک۔ اکتا نہیں جاتے تم؟

کینٹر حیرت زدہ نظروں سے قاضی کو دیکھے جا رہا تھا۔ قاضی کے حواس اب پوری طرح بحال ہو چکے تھے۔ اور وہ نیم خوابی کے عالم میں کہے گئے نامناسب کلمات کی خفت مٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''تم برا نہیں منانا کینٹر۔ میری صورت حال تم سے بھی ابتر ہے۔ کیا چاہیے تمہیں؟''۔

آپ سے خفیہ پولیس کا سربراہ ملنے آیا ہے۔ کینٹر نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

بلاؤ۔ بلاؤ۔ اسے جلدی سے بلاؤ۔ قاضی کو دوبارہ کھانسی کے دورے نے آن لیا۔ وہ نیچے دیکھے بغیر پاؤں سے اپنے جوتے تلاش کرنے لگ گیا۔ کینٹر ستون پر نصب مشعل روشن کرنے کے بعد باہر باغیچے کی جانب نکل گیا۔

اس چاندنی میں بھی سکون میرے نصیبوں میں نہیں ہے۔ قاضی کراہتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ بالکونی پر خفیہ پولیس کا سربراہ افرانی نمودار ہو گیا۔

بانگا! خاموش۔ قاضی نے کتے کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

لب کھولنے سے قبل اپنی خصلت سے مجبور افرانی نے دائیں بائیں نظر دوڑا کر تسلی کر لی کہ وہاں بانگا کے علاوہ کوئی دوسرا جان دار اس کی گفتگو نہیں سن رہا۔ اس نے بولنا شروع کیا۔

''میں التجا کرتا ہوں کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے اور مجھ پر مقدمہ چلایا جائے۔ محترم قاضی صاحب! آپ کے خدشات بالکل درست تھے۔ میں یہودا کی حفاظت نہیں کر سکا۔ مار ڈالا گیا اسے۔ چھرا گھونپ دیا گیا میرے آقا۔ حکم دیجیے کہ مجھے میرے منصب سے برخاست کر دیا جائے اور گرفتار کر لیا جائے''۔ افرانی کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اُسے بیک وقت چار درندگی سے بھرپور آنکھیں گھور رہی ہیں۔ دو کتے کی اور دو بھیڑیے کی۔

افرانی نے اپنی جیب سے ایک سربمہر خون آلود تھیلی نکالی اور قاضی کو پیش کرتے ہوئے بولا۔ یہودا کے قاتل یہ پیسوں سے بھری تھیلی پجاریٔ اعظم کے گھر پھینک گئے تھے۔ یہ تھیلی یہودا کے خون میں نچڑی ہوئی ہے۔

قاضی نے تھیلی کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کتنے پیسے ہیں اس میں؟

تیس درہم۔

قاضی حیرت زدہ ہوتا ہوا بولا۔ اتنے کم؟ مقتول کی لاش کہاں ہے؟

یہ میرے علم میں نہیں ہے۔ پروقار انداز میں افرانی نے جواب دیا۔ آج صبح ہوتے ہی تلاش شروع کر دی جائے گی۔

قاضی نے ایک جھرجھری لی اور جوتے کا تسمہ جسے باندھنے میں وہ بار بار ناکام ہو چکا تھا

جھنجھلاہٹ میں جھنکتے ہوئے بولا۔

لیکن آپ یہ تو وثوق سے جانتے ہو نا کہ وہ مر چکا ہے۔

اس سادہ سے سوال کا ہاں یا نہ میں جواب دینے کی بجائے افرانی نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

میں۔ میرے آقا۔ گذشتہ پندرہ برس سے یہودیہ میں تعینات ہوں۔ کسی انسان کے زندہ یا مردہ ہونے کا تعین کرنے کے لئے میرا اسے بذات خود دیکھنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ آپ کو آگاہ کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ یہودا نامی شخص جس کا تعلق کیراٰف سے ہے چند گھنٹے قبل قتل ہو چکا ہے۔

میں معذرت خواہ ہوں افرانی۔ قاضی نے کہا۔ میں دراصل نیم خوابی کی کیفیت میں تھا۔ اس لئے کچھ غلط بول گیا ہوں۔ ویسے بھی ان دنوں میری نیند کچھ گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ ذرا اندازہ کرو کہ مجھے نیند میں ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں چاندنی سے بنے راستے پر سیر کر رہا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ آپ کی اس بارے میں کیا تجاویز ہیں؟ کس جگہ لاش کو ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ آپ براہ کرم بیٹھ جائیں۔

افرانی تعظیماً قدرے جھکا اور قاضی کی مسہری کے نزدیک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں اسے گیفسیما کے ٹیلوں کے درمیان زیتون کے باغ میں ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

اچھا۔ اچھا۔ لیکن بالخصوص زیتون کے باغ میں ہی کیوں؟

میرے آقا۔ افرانی بولا۔ میری عقل یہی کہتی ہے کہ یہودا کو نہ تو شہر کے اندر اور نہ ہی شہر سے بہت دور، بلکہ کہیں مضافات میں قتل کیا گیا ہے۔

میرے نزدیک اس طرح کی گتھیوں کو سلجھانے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ روم کے حالات سے تو میں کوئی بہت اچھی طرح آشنا نہیں ہوں لیکن میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ رومن نو آبادیوں میں آپ کے پائے کا ماہر سراغ رساں یقیناً کوئی نہیں ہے۔ ذرا تفصیل سے بات سمجھائیں گے؟

اس امکان کو میں یکسر رد کرتا ہوں۔ افرانی دھیمی آواز میں بولنا شروع ہوا۔ کہ یہودا شہر کی حدود میں مشکوک لوگوں کے ہتھے چڑھا ہوگا۔ شہر کی بارونق گلیوں میں چھرے گھونپنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور جب چاروں اطراف خفیہ پولیس والے اس شخص کو ڈھونڈ رہے ہوں تو کسی کا اسے تہہ خانے میں گھسیٹ لیجانا بھی ممکنات میں سے نہیں ہے۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ وہ اس دوران شہر میں نہیں تھا۔ اگر اسے شہر سے کہیں دور قتل کیا جاتا تو اس خون آلود پیسوں والی تھیلی کا اتنی جلدی پجاری کے گھر پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ اسے یقیناً کہیں شہر کے مضافات میں ہی مارا گیا ہے۔ غالباً کسی بہانے سے اُسے شہر کے باہر نکلنے پر مجبور کیا گیا ہوگا۔

سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ کیسے ممکن ہوا ہوگا؟

جی ہاں میرے آقا! میرے نزدیک یہ سب سے کٹھن سوال ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ کبھی اس کا تسلی بخش جواب ڈھونڈ پاؤں گا۔

جی ہاں! یہ تو واقعی ایک پہیلی ہے! تہوار کی شام ایک صاحب ایمان شخص نجانے کیوں ایسٹر کی تقریبات کو چھوڑ کر شہر سے باہر نکل جاتا ہے اور وہاں مار دیا جاتا ہے۔ کون، کس بہانے اسے شہر سے نکالنے میں کامیاب ہوا ہوگا؟ کہیں یہ کسی عورت کا کام تو نہیں ہے؟ قاضی اچانک مشتعل انداز میں بولا۔

افرانی نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

نہیں میرے آقا، یہ کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ حالات کا منطقی انداز میں سلسلہ وار تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہودا کی موت میں کس کو دلچسپی تھی؟ کچھ آوارہ گداگروں کا انوکھی وضع کی سوچ رکھنے والا ٹولہ جس میں سرے سے کوئی عورت شامل ہی نہیں ہے۔ کسی عورت سے شادی کرنے کے لئے، جناب قاضی صاحب، پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور دنیا میں کسی نئی زندگی کو جنم دینے کے لئے بھی پیسے ہی درکار ہوتے ہیں۔ لیکن کسی آدمی کو عورت کی مدد سے قتل کرنے کے لئے، میرے آقا! کہیں زیادہ، بہت زیادہ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ان آوارہ گردوں کی جیبیں تو خالی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس طرز کی سوچ ہماری تفتیش کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مجھے اصل راستے سے بھٹکا سکتی ہے۔

آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو افرانی۔ پلات بولا۔ میں تو محض اپنے خدشات کا اظہار کر رہا تھا۔

آپ کے خدشات بالکل بے بنیاد ہیں میرے آقا۔

چلیں تسلیم کرتا ہوں آپ کی منطق۔ لیکن یہ سب کیونکر ممکن ہوا؟ تجسس بھری نظریں افرانی کے چہرے پر جمائے قاضی نے پوچھا۔

میرے خیال میں اصل وجہ پیسے ہیں۔

زبردست خیال ہے۔ لیکن رات کے وقت اُسے شہر سے باہر کس نے بلایا ہوگا اور کس کام کے عوض پیسوں کا لالچ دیا ہوگا؟

ارے نہیں، قاضی صاحب۔ میرے پاس صرف ایک ہی مفروضہ ہے۔ اگر یہ غلط ثابت ہو جائے تو میں خالی ہاتھ رہ جاتا ہوں۔ افرانی قاضی کی جانب جھکتے ہوئے سرگوشی کر رہا تھا" یہودا اپنے پیسے کسی ایسی جگہ چھپانا چاہتا تھا جس کا اس کے علاوہ کسی کو بھی علم نہ ہو"۔

بہت باریک بینی کی بات کی ہے آپ نے۔ حقیقت میں بھی غالباً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اب مجھے آپ کی بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ اسے کسی انسان نے نہیں بلکہ اس کے اپنے ذہن کی اختراع نے شہر سے نکلنے کے لئے مائل کیا ہوگا۔ بالکل ٹھیک۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہودا کو کسی پر بھروسہ نہیں تھا۔ اور

وہ پیسے لوگوں سے چھپانا چاہتا تھا۔ لیکن آپ اسے گیفسیما ہی میں کیوں تلاش کرنا چاہتے ہو؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ واحد بات ہے جو ابھی تک میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

قاضی صاحب! یہ بات تو بالکل آسان ہے۔ کھلی جگہوں اور راستوں کے نزدیک پیسے کوئی نہیں چھپائے گا۔ اس مقصد کے لئے درختوں کے جھنڈ سے بہتر کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟ اور گیفسیما کے علاوہ یروشلم کے مضافات میں ایسی کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔

آپ نے اب مجھے حتمی طور پر قائل کر لیا ہے۔ یہ بتائیں کہ اب لائحہ عمل کیا ہوگا؟

سب سے پہلے تو میں ان قاتلوں کا کھوج شروع کروں گا جنہوں نے شہر کے مضافات تک یہودا کا پیچھا کیا تھا اور اس کے بعد، جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، خود کو انصاف کے حوالے کر دوں گا۔

وہ کس جرم کی پاداش میں؟

میرے پہرہ داروں نے یہودا کا سراغ اُس وقت کھو دیا تھا جب وہ کیفا کے محل سے باہر نکلا تھا۔ ایسا کیونکر ممکن ہوا، میری عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ میری پیشہ ورانہ زندگی میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ہماری آپ کے ساتھ گفتگو کے فوراً بعد یہودا پر ہر وقت نظر رکھی جانے لگی تھی۔ لیکن بازار میں داخل ہونے کے بعد نجانے وہ کیسے میرے سپاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہاں سے غائب ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ کو عدلیہ کے حوالے کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے اپنے تئیں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور دنیا میں کوئی بھی۔ یہ کہتے ہوئے قاضی مسکرا اٹھا۔ اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ جن سپاہیوں کی نگرانی کے دوران یہودا غائب ہوا تھا انہیں بے شک کچھ سزا کا اعلان کر دیجیئے۔ لیکن دھیان رکھیئے گا کہ ان کی سزا میں بھی کوئی خاص سختی نہ برتی جائے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس بدبخت کی حفاظت کے لئے آپ نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی ہے۔

ارے ہاں۔ میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا تھا۔ قاضی پیشانی صاف کرتے ہوئے بولا۔ ان بدمعاشوں کے لئے پجاریٔ اعظم کے گھر پیسوں کی تھیلی پھینکنا کیونکر ممکن ہوا؟

دیکھیئے میرے آقا! یہ کوئی خاص مشکل کام نہیں تھا۔ یشوا کے پیروکار کیفا کے محل کے باہر جمع ہونے والے ہجوم میں شامل ہو گئے تھے اور محل کے عقبی باغیچے کی فصیل کے اوپر سے انہوں نے یہ پیکٹ اندر پھینک دیا تھا۔

کیا رقعہ بھی پیکٹ میں ہی شامل تھا؟

جی ہاں! عین آپ کی پیش گوئی کے مطابق میرے آقا! ملاحظہ کیجیۓ۔ افرانی نے تھیلی پر لگی مہر

توڑنے کے بعد اس میں موجود اشیا قاضی کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

ارے یہ آپ نے کیا کیا؟ قاضی نے کہا۔ یہ مہر تو غالباً پجاریٔ اعظم کے مندر کی ہے؟

میرے آقا! افرانی تھیلی کو بند کرتے ہوئے بولا۔ اس سلسلے میں آپ کو کوئی تشویش نہیں ہونی چاہیے۔

آپ کے پاس کیا ہر طرح کی مہریں موجود ہیں؟ قاضی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

جی ہاں۔ اس کے بغیر میرا کام ممکن نہیں ہوسکتا۔ یہ کہتے وقت افرانی کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔

مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ کیفا کے محل میں کیسی ہل چل مچ گئی ہوگی!

جی میرے آقا! شدید بے چینی کا عالم تھا۔ فوراً ہی مجھے طلب کرلیا گیا تھا۔

بالکونی کے نیم روشن ہونے کے باوجود قاضی کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی چمک نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی تھی۔

دلچسپ! بہت دلچسپ!!

یہاں میں آپ سے متفق نہ ہونے کی جسارت کرتا ہوں میرے آقا! یہ کام تو انتہائی ناخوشگوار اور اکتا دینے والا تھا۔ میرے اس سوال پر کہ مندر سے کسی کو پیسوں کی ادائیگی تو نہیں کی گئی تھی، انتہائی مشتعل انداز میں منفی جواب دیا گیا تھا۔

ارے واہ! چلو اب کیا ہوسکتا ہے؟ نہیں دیئے تو نہیں دیئے۔ اس صورت میں تو قاتل کو ڈھونڈنا اور بھی مشکل ہوجائے گا۔

جی ہاں بالکل ایسا ہی ہے میرے آقا!

اچھا سنو! میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا ہے۔ کہیں یہودا نے خود سے تو چھرا نہیں گھونپ لیا؟

افرانی حیرت سے اچھل پڑا اور کرسی سے گرتے گرتے بچا۔

نہیں میرے آقا یہ تو بالکل ناممکن ہے۔ اس نے رائے دی۔

ارے نہیں۔ اس شہر میں ہر بات ممکن ہے۔ میں شرط لگانے کو تیار ہوں۔ جلد ہی شہر میں اس قسم کی افواہ گردش کرنے لگے گی۔

افرانی کا دیکھنے کا انداز یکا یک تبدیل ہوگیا۔ اس نے اپنی تمام توجہ قاضی کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

''درست فرمارہے ہیں آپ! ایسا ممکن ہوسکتا ہے''۔

باوجودیکہ ہر بات تفصیلاً واضح ہو چکی تھی، قاضی کا ذہن ابھی تک یہودا کے قتل میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بصد کوشش بھی اس خیال کو جھٹک نہیں پا رہا تھا۔ کچھ توقف کرنے کے بعد وہ بولا۔

کاش میں اس ملعون کو قتل ہوتے دیکھ سکتا!

آپ اطمینان رکھئے میرے آقا۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ قتل اعلیٰ درجے کی پیشہ ورانہ صلاحیت رکھنے والے فن کاروں نے بڑی مہارت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ افرانی نے قدرے مضحکہ خیز انداز میں جواب دیا۔

آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟

آپ ذرا اس پیسوں سے بھری تھیلی کو تو غور سے دیکھیں۔ افرانی بولا۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہودا کا خون فوارے کی مانند چھلک پڑا تھا۔ میرے لئے اس بات کا تعین کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کیونکہ میں اپنی زندگی میں متعدد قتل ہوتے دیکھ چکا ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ کبھی اٹھ نہیں سکے گا؟

نہیں میرے آقا۔ نہیں اٹھے گا۔ افرانی نے مسکراتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ جب تک وہ مسیحا، جس کا یہاں کے لوگوں کو انتظار ہے، اُس کے کانوں میں بگل نہیں بجا دیتا۔ اس سے پہلے وہ یقیناً نہیں اٹھے گا۔

ٹھیک ہے افرانی۔ اس قصے کی تو سمجھ آ گئی ہے۔ اب ذرا تدفین کے متعلق بات ہو جائے۔

سزائے موت پانے والوں کو دفنا دیا گیا ہے میرے آقا!

میرے عزیز افرانی، آپ کو عدالت کے حوالے کرنے سے بڑا جرم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ تو اعلیٰ ترین اعزاز کے مستحق ہو۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔

میرے آقا! جس دوران میں یہودا کے معاملات پر نظر رکھے ہوئے تھا میرا ایک معاون خفیہ پولیس کے دستے کے ہمراہ سرِ شام ہی پھانسی گھاٹ پر پہنچ چکا تھا۔ ہاں، پہاڑی سے ایک مجرم کی لاش غائب تھی۔

یہ سن کر پلات کانپ اٹھا اور نحیف آواز میں بولا۔

او خداوٗ! اس امکان کی جانب میرا دھیان کیونکر نہیں جا سکا!

آپ پریشان نہ ہوں میرے آقا! افرانی اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ویسماس اور گیسٹاس کی لاشیں جن کی آنکھیں مردار خور پرندے نوچ چکے تھے وہاں سے فوراً اٹھا لی گئی تھیں اور گمشدہ لاش کی تلاش شروع کر دی گئی تھی۔ اور اسے جلد ہی ڈھونڈ نکالا گیا۔ اسے ایک شخص جس کا نام۔۔۔۔۔

میتھیو۔ میتھیو نام تھا نا اس کا؟ قاضی افرانی کی بات کاٹتے ہوئے بول اٹھا۔

جی ہاں میرے آقا! افرانی نے قاضی کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا"یہ میتھیو نامی شخص کل وری پہاڑی کے شمالی حصے میں ایک کھائی میں چھپا بیٹھا تھا۔ عیشوا کی برہنہ لاش اسی کے قبضے میں تھی۔ جب مشعل بردار سپاہی کھائی میں داخل ہوئے تو انہیں دیکھ کر اس شخص نے پاگلوں کی طرح چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ قانون کسی بھی سزائے موت پانے والے کو دفن کئے جانے کا حق دیتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کسی صورت لاش سے جدا ہونے کو تیار نہیں ہے۔ وہ بہت مشتعل ہو گیا تھا۔ کبھی دھمکیاں دیتا تو کبھی ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا اور کبھی بددعائیں دینے لگتا"۔

اسے تو گرفتار کرنا پڑ گیا ہوگا؟ سراسیمگی کے عالم میں قاضی نے پوچھا۔

نہیں میرے آقا، اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ افرانی نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "اس جنونی کو جلد ٹھنڈا کر دیا گیا تھا۔ یہ جان کر کہ لاش کو ضرور دفنا دیا جائے گا وہ بہت حد تک پرسکون ہو گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بے شک اس کی جان لے لی جائے لیکن وہ لاش سے کسی صورت جدا نہیں ہوگا۔

اچھا تو پھر کیا اسے بھگا دیا گیا تھا؟ قاضی نے پوچھا۔

نہیں میرے آقا! میرے معاون نے اسے تدفین میں شامل ہونے کی اجازت دے دی تھی۔

کیا نام ہے آپ کے معاون کا؟

تلمائی۔ افرانی نے جواب دیا اور قدرے بے چین ہو کر بولا۔"کیوں، اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

"نہیں، کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ قاضی نے جواب دیا۔ میں دراصل کچھ کچھ بھولنے لگا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ میرا واسطہ ایسے شخص سے پڑ گیا ہے جس نے آج تک کوئی غلطی نہیں کی۔ ہاں تو آپ اپنی کہانی جاری رکھیں"۔

میتھیو کو بھی تینوں لاشوں کے ساتھ گدھا گاڑی میں سوار کر دیا گیا تھا۔ اور تقریباً دو گھنٹوں کا سفر طے کرنے کے بعد یروشلم کے شمال میں ریگستانی گھاٹی پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں کم و بیش ایک گھنٹے کی مشقت کے بعد سپاہی ایک گہرا گڑھا کھودنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ تینوں لاشوں کو اسی گڑھے میں دفن کر دیا گیا۔

کیا لاشیں برہنہ تھیں؟

"نہیں میرے آقا! سپاہیوں نے تمام لاشوں کو لمبی قمیصیں پہنا دی تھیں اور ان کی انگلیوں پر پہلے سے تیار کردہ دھاتی چھلے چڑھا دیئے گئے تھے۔ عیشوا کے چھلے پر ایک، ویسماس کے دو اور گیسٹاس کے چھلے پر تین گھاؤ کرید دیئے گئے تھے۔ گڑھے کو مٹی ڈال کر برابر کر دیا گیا اور اس جگہ کی پہچان کے لئے کچھ نشان بھی لگا دیا گیا تھا جس کا علم صرف تلمائی کو ہے"۔

اوہ! اگر مجھے کبھی پہلے سے حالات کا اندازہ ہو گیا ہوتا تو! قاضی ملال کے عالم میں ہاتھ ملتے

ہوئے بولا۔ کاش! میں اس میتھیو سے بھی مل پاتا۔

وہ یہیں ہے میرے آقا!

یہ سنتے ہی قاضی گم سم ہو کر رہ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے افرانی کو چند لمحے گھورنے کے بعد بولا۔

آپ نے اس انتہائی پے چیدہ معاملے کو جس احسن طریقے سے سلجھایا ہے میں اس کے لئے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں اور آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ کل صبح اپنے معاون تلمائی کو میرے پاس بھیج دیں۔ اسے پہلے سے آگاہ کر دیں کہ میں اس کے کام سے بہت خوش ہوں۔ اور آپ افرانی۔ قاضی نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک بیش قیمت پتھر سے جڑی انگوٹھی نکال کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔ میری جانب سے یہ تحفہ قبول کیجئے۔

افرانی نے سر خم کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے لئے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے میرے آقا!

قاضی نے مزید کہا۔ میری گذارش ہے کہ تدفین میں حصہ لینے والے تمام سپاہیوں کو تمغوں سے نوازا جائے۔ ہاں! البتہ یہودا کی حفاظت پر مامور پہرے داروں کو وارننگ دی جائے اور میتھیو کو ابھی فوری طور پر میرے سامنے پیش کیا جائے۔ میں اس سے عیشوا کے متعلق چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔

جو حکم میرے آقا! افرانی یہ کہنے کے بعد بالکونی سے رخصت ہو گیا۔ قاضی نے زور سے تالی بجائی اور حکم دیا۔ ''فوری طور پر مشعل لائی جائے''۔

اس دوران افرانی باہر باغیچے میں نکل چکا تھا۔ قاضی کی پشت پر کھڑے سیاہ فام غلام کے ہاتھوں میں پکڑی مشعل کی روشنی نے بالکونی میں چاندنی کو ماند کر دیا تھا۔ قاضی کے سامنے رکھی میز پر مزید تین مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ کچھ دیر بعد لمبے تڑنگے کینٹر کی نگرانی میں ایک ناٹے قد کا جسیم شخص بالکونی میں نمودار ہوا۔ کینٹر قاضی کا اشارہ پاتے ہی فوراً وہاں سے غائب ہو گیا۔

قاضی اس نووارد کو کافی دیر تک سوالیہ اور شائید قدرے خوف زدہ نظروں سے بغور دیکھتا رہا۔

نووارد کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کا رنگ سیاہی مائل اور جسم جا بجا خشک کیچڑ سے آلودہ تھا۔ لباس کی جگہ چند چیتھڑے اس کے بدن پر جھول رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور کرب کی ملی جلی چنگاریاں خارج ہو رہی تھیں۔ اس کی ہیئت بالکل ان بھکاریوں جیسی تھی جن کا ہجوم مندروں کے اردگرد اور شہر کے زیریں علاقے میں دکھائی دیتا تھا۔

بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ سکوت اس وقت ٹوٹ گیا جب نووارد کا چہرہ اچانک متغیر ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا گیا اور فرش پر گرنے سے بال بال بچا۔

کیا ہوا تمہیں؟ قاضی نے پوچھا

کچھ نہیں۔میتھیو نے جواب دیا۔ وہ کچھ ایسی حرکت کرنے لگا کہ جیسے کچھ نگل رہا ہے۔اس کا کیچڑ سے آلودہ گلا کچھ پھول گیا مگر جلد ہی معمول کی حالت میں واپس آ گیا۔

یہ کیا ہو رہا ہے تمہارے ساتھ؟ جواب دو۔ قاضی نے دوبارہ پوچھا۔

میں تھک گیا ہوں۔ اکتاہٹ میں گرفتار میتھیو نے جواب دیا اور اپنی نظریں فرش پر مرکوز کر دیں۔

بیٹھ جاؤ! قاضی نے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میتھیو نے بے یقینی کے عالم میں قاضی کی جانب دیکھا اور کرسی کے نزدیک پہنچ کر اس کے سنہری بازوؤں کا جائزہ لینے کے بعد وہ بیٹھ گیا۔لیکن کرسی کے بجائے فرش پر۔

ذرا مجھے یہ تو بتاؤ گے کہ تم کرسی پر کیوں نہیں بیٹھے؟ قاضی نے پوچھا

میں اس وقت غلاظت کے ڈھیر کی مانند ہوں۔ کرسی گندی ہو جائے گی۔میتھیو نے فرش سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

ابھی تمہارے لئے کھانا لایا جائے گا۔

مجھے کھانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔میتھیو نے جواب دیا۔

جھوٹ مت بولو! پلات نے کہا۔تم نے آج سارا دن کچھ نہیں کھایا۔ اچھا مت کھاؤ۔ میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ میں وہ چھری دیکھنا چاہتا ہوں جو تم آج لئے گھوم رہے تھے۔

یہاں لانے سے قبل وہ چھری سپاہیوں نے مجھ سے چھین لی تھی۔میتھیو نے جواب دیا۔تم لوگ وہ چھری مجھے واپس کر دو۔ میں نے جہاں سے چرائی تھی وہیں واپس کرنا چاہتا ہوں۔

چھری کیوں چرائی تھی تم نے؟

رسیاں کاٹنے کے لئے۔میتھیو نے جواب دیا۔

مارک! قاضی نے بلند آواز میں پکارا۔ ذرا اس کی چھری تو لاؤ۔

بالکونی پر کینٹر دوبارہ نمودار ہوا اور ایک زنگ آلود چھری قاضی کے حوالے کرنے کے بعد واپس سیڑھیوں پر غائب ہو گیا۔

کہاں سے لی تھی تم نے یہ چھری؟

ایک ڈبل روٹی والے کی دوکان سے۔ فیوروں کے گیٹ کے پاس بائیں جانب۔

پلات نے چھری کا بغور معائنہ کرنے کے بعد انگلی سے اس کی دھار کو محسوس کیا اور بولا۔

تم چھری کے لئے پریشان ہونا بند کر دو۔ اسے تمہاری خواہش کے مطابق مالک کو لوٹا دیا جائے گا۔میری دل چسپی چمڑے کے ان ٹکڑوں میں ہے جن پر تم نے عیشوا کی کہی باتیں لکھ رکھی ہیں۔

یہ سنتے ہی میتھیو کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے اور چہرے پر زہر آلود مسکراہٹ ناچنے لگ گئی۔ اس نے کہا۔

سب کچھ چھین لینا چاہتے ہو؟ یہ جو آخری یادگار میرے پاس بچی ہے اس سے بھی محروم کر دینا چاہتے ہو؟

میں نے یہ تحریریں میرے حوالے کرنے کو تو نہیں کہا۔ میں تو صرف انہیں دیکھنے کا مشتاق ہوں۔

میتھیو نے اپنی قمیض، یا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی قمیض سے جو کچھ باقی بچا تھا، کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک میلا کچیلا چمڑے کے ٹکڑوں کا گولا برآمد کرنے کے بعد قاضی کے حوالے کر دیا۔ پلات نے ان ٹکڑوں کو میز پر پھیلا دیا اور مشعل کی تیز روشنی میں آنکھیں سکیڑتے ہوئے بغور ان کا معائنہ کرنے لگ گیا۔ سیاہی سے لگائے گئے نشان بمشکل پہچانے جا رہے تھے۔ پلات اس تحریر کو بہتر طریقے سے جانچنے کے لئے چمڑے کے ٹکڑوں کو کبھی میز پر جھک کر دیکھنے لگتا تو کبھی اٹھا کر مشعل کے قریب لے جاتا۔ آخر کار وہ ان بے ربط الفاظ کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان ٹکڑوں پر کہیں تاریخوں کا اندراج تھا اور کہیں کچھ اشعار درج تھے۔ اور کہیں زندگی کا فلسفیانہ نقطہ نظر۔ جو سطور قاضی پڑھنے میں کامیاب ہوا وہ کچھ یوں تھیں۔

''موت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کل ہم نے موسم بہار کے میٹھے پھل کھائے۔ ہم زندگی کا شفاف دریا ضرور دیکھیں گے۔ انسان ایک دن سورج کی روشنی کو کھلی آنکھوں سے دیکھے گا۔۔۔۔۔۔''

ان تحریروں کا مطالعہ کرنے کے دوران قاضی بار بار کسی رعشہ زدہ مریض کی مانند کانپنے لگتا تھا۔

ایک ٹکڑے کے اخیر میں یہ الفاظ قابل شناخت تھے۔

''اس سے بڑا کوئی روگ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ بزدلی''

پلات نے چمڑے کے ان ٹکڑوں کو سمیٹنے کے بعد واپس میتھیو کے حوالے کر دیا اور کہنے لگا۔

''یہ لو اپنی امانت۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم پڑھنے لکھنے کے شوقین ہو۔ اس طرح میلے کچیلے چیتھڑوں میں ملبوس ہو کر گلیوں میں آوارہ پھرنا تمہارے شایان شان نہیں ہے۔ میرے پاس قیصریہ میں بہت بڑی لائبریری ہے۔ میں کافی امیر آدمی ہوں۔ تمہیں اپنے ہاں ملازمت کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ تم وہاں لائبریری میں کام کرو گے۔ تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے ہاں تمہیں کھانے اور پہننے کو بھی اچھا ملے گا''۔

میتھیو اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

''نہیں۔ مجھے نہیں چاہیے تمہاری ملازمت''۔

''کیوں؟'' قاضی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''تم مجھ سے نفرت کرتے ہو یا پھر ڈرتے ہو مجھ سے؟''

میتھیو کے چہرے پر دوبارہ زہر آلود مسکراہٹ طاری ہو گئی اور وہ کہنے لگا۔

نہیں۔اس لئے کہ الٹا تم مجھ سے ڈرتے رہو گے۔اس معصوم کی جان لینے کے بعد تم میں حوصلہ نہیں ہے کہ مجھ سے نظریں ملا سکو۔

''خاموش ہو جاؤ''۔قاضی تلملا اُٹھا۔''اچھا کچھ پیسے ہی لے لو!''

میتھیو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

قاضی اس دوران اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم خود کو عیشوا کا شاگرد سمجھتے ہو۔لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس سے کچھ بھی نہیں سیکھ سکے۔اگر تم صحیح معنوں میں اس کے شاگرد ہوتے تو مجھ سے کچھ نہ کچھ ضرور قبول کر لیتے۔یاد رکھو اس نے اپنی موت سے قبل کہا تھا کہ وہ کسی کو بھی قصوروار نہیں سمجھتا''۔پلات نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت فضا میں اٹھا رکھی تھی اور اس کے چہرے کی نسیں بری طرح پھڑ پھڑا رہی تھیں۔''اگر تمہاری جگہ وہ خود یہاں موجود ہوتا تو یقیناً مجھ سے کچھ نہ کچھ لے لیتا۔تم سنگدل ہو۔وہ سنگدل نہیں تھا۔اچھا یہ بتاؤ کہ اب تم کہاں جاؤ گے؟''

میتھیو اچانک میز کے نزدیک پہنچ گیا اور دہکتے انگارے اگلتی آنکھوں سے قاضی کو گھورتے ہوئے کہنے لگا۔

قاضی! تم یہ جان لو کہ یروشلم میں ابھی مزید خون بہنا ہے۔میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ اپنے ان ہاتھوں سے ایک آدمی کو کاٹ ڈالوں گا۔

مجھے پہلے سے ہی اس بات کا علم تھا۔پلات بولا۔تمہارے الفاظ سے میں حیران نہیں ہوا۔تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو نا؟

نہیں۔تمہیں قتل کرنا تو میرے لئے ممکن نہیں ہے۔میتھیو نے جواب دیا۔میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔مجھے اپنی اوقات کا بخوبی اندازہ ہے۔میں کیراٰق کے رہنے والے یہودا کی بات کر رہا ہوں۔اپنی باقی ماندہ زندگی اب اس آدمی کو شکار کرنے میں وقف کر دوں گا۔

یہ سن کر قاضی کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔اس نے انگلی کے اشارے سے میتھیو کو قریب بلاتے ہوئے کہا۔

اس کام کے لئے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ویسے بھی تمہارے لئے یہ اب ممکن نہیں رہا کیونکہ یہودا کو تو پہلے ہی قتل کیا جا چکا ہے۔

میتھیو اچھل کر میز سے دور ہٹ گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

کس نے مارا ہے اس ملعون کو؟

بچگانہ سوال مت پوچھو۔ قاضی نے جواب دیا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے علاوہ بھی اس کے اور بہت سے پیروکار ہیں۔

نہیں۔تم مجھے بتاؤ کہ یہ قتل کس نے کیا ہے؟ میتھیو نے دوبارہ پوچھا

قاضی نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا

میں نے مارا ہے اسے۔ یہ سن کر میتھیو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اس کی آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگ گئی۔

قاضی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

بے شک یہ کفارہ ہے تو بہت کم۔ لیکن بہرحال یہ کام میں نے ہی کیا ہے۔ اب بولو۔ مجھ سے کچھ لے لو گے؟

میتھیو کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی حد تک موم ہو چکا ہے۔ آخر کار وہ بولا۔

حکم کرو کہ مجھے چمڑے کا ایک صاف ٹکڑا دے دیا جائے۔

ٹھیک ایک گھنٹہ گذرنے کے بعد میتھیو محل سے جا چکا تھا۔ پو پھٹنے سے پہلے چھائی خاموشی میں فقط باغیچے میں پہرہ دینے والوں کے قدموں کی دھیمی دھیمی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ چاند کی روشنی تیزی سے ماند پڑتی جا رہی تھی۔ آسمان کے دوسرے کنارے پر نجم السحر ایک سفید نکتے کی مانند دمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ مشعلیں کب کی گل ہو چکی تھیں۔ محل کی بالکونی میں قاضی ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے دنیا سے بے خبر گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے قریب بانگا بھی اپنے مالک کی تقلید میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔

ایک ہنگامہ خیز رات کے بعد بالآخر نسان کے اس مہینے کی پندرہویں صبح رومن قاضی پونتی پلات کے لئے پرسکون نیند کا تحفہ لئے رات کے اندھیروں پر آہستہ آہستہ غالب آتی جا رہی تھی۔

باب ۲۷

فلیٹ نمبر ۵۰ کی تباہی

جب مارگریٹا زیر مطالعہ باب کی آخری سطور۔۔۔''ایک ہنگامہ خیز رات کے بعد بالآخر نسان کے اس مہینے کی پندرہویں صبح رومن قاضی پونتی پلات کے لئے پرسکون نیند کا تحفہ لئے رات کے اندھیروں پر آہستہ آہستہ غالب آتی جا رہی تھی۔۔۔'' تک پہنچی تو صبح ہو چکی تھی۔

درختوں کی شاخوں اور بیلوں پر چڑیوں کے جھنڈ چہچہا رہے تھے۔

مارگریٹا کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اب اندازہ ہوا کہ اس کا جسم تھکاوٹ سے کس قدر چور ہو چکا ہے۔ وہ اچانک ہی نیند کے شدید غلبے میں آ گئی۔ تاہم اس کے دل و دماغ پر چھائی بے چینی غائب ہو چکی تھی۔ اس کے سوچنے کا انداز بھی انتہائی متوازن اور اطمینان بخش ہو گیا تھا۔ اسے اب یہ پریشانی بھی نہیں تھی کہ اس کی گذشتہ رات ایک مافوق الفطرت ماحول میں گزری تھی۔ اسے شیطان کے ہاں تہوار کی تقریبات میں حصہ لینے کا بھی کوئی ملال نہیں تھا۔ اس بات پر بھی اسے حیرانی نہیں تھی کہ اسے ''ماسٹر'' کیسے معجزانہ طور پر واپس مل گیا تھا۔ نہ ہی وہ راکھ کے ڈھیر سے ناول کا مسودہ برآمد ہونے پر حیران تھی اور نہ ہی تہہ خانے کی زندگی اور اس کے گرد و پیش کے واپس اپنی پرانی حالت میں لوٹ آنے پر اسے کوئی الجھن تھی۔ ولاند کے ساتھ تعارف اور اس کی معیت میں گزارے گئے لمحات نے مارگریٹا کے ذہن پر کسی قسم کا منفی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہونا چاہیے تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ ماسٹر سکون کے ساتھ گہری نیند سو رہا ہے، ٹیبل لیمپ بجھانے کے بعد وہ ماسٹر کے مقابل، دیوار کے ساتھ ایک بوسیدہ میلی چادر اوڑھے دیوان پر دراز ہو گئی۔ ٹھیک ایک منٹ بعد وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔ آج اسے کوئی خواب دکھائی نہیں دیا۔ تہہ خانے میں مکمل خاموشی کا راج تھا۔ باہر گلی میں بھی مکمل سکوت تھا۔

لیکن ٹھیک اسی وقت ماسکو شہر کی ایک دفتری عمارت میں ایک پوری منزل جاگ رہی تھی۔ اس کی

روشن کھڑکیوں کے نیچے واقع سڑک کو اپنے مخصوص سائرن بجاتی گاڑیاں بڑے بڑے گھومنے والے برشوں سے صاف کر رہی تھیں۔ سورج کی پہلی کرنوں نے عمارت کو منور کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ پوری منزل ولاند کے معاملے پر مغز خوری کر رہی تھی۔ منزل کے سبھی دس کمروں میں تمام رات تیز روشنی میں ادھر ادھر بھاگتے سائے دیکھے جا سکتے تھے۔ دراصل یہ افراتفری اس وقت شروع ہوئی تھی جب جمعہ کے روز ورائٹی تھیٹر کو اس کے اعلیٰ افسروں کی گمشدگی کی وجہ سے بند کرنا پڑا تھا۔ جب کالے علم کے شعبدوں کے مظاہروں کے دوران ہڑبونگ مچ گئی تھی اور دنیا کا بدترین طوفان بدتمیزی برپا ہو گیا تھا۔ تفتیشی اداروں کے اہلکاروں کے لئے تشویش کی بات یہ تھی کہ انہیں مسلسل کوئی نہ کوئی نئی خبر مل رہی تھی۔

اس کیس کے غیر معمولی حالات نے تفتیشی حکام کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ اجتماعی ہپناٹزم کی خبروں اور شہر کے مختلف علاقوں میں رونما ہونے والے ناقابل فہم واقعات نے تفتیش کے عمل کو بھنور میں الجھا کر رکھ دیا تھا۔

تفتیشی کمیٹی کے سامنے سب سے پہلے شہر کے تھیٹر کی تنظیمی کمیٹی کے رکن اپالون کو پیش ہونا پڑا تھا۔

جمعہ کے روز سنگرائی پل کے نزدیک واقع ایک گھر میں بعد از دوپہر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ایک بھاری مردانہ آواز نے اپالون کو بلانے کا کہا۔ اپالون کی بیوی نے بیزاری کے عالم میں جواب دیا کہ اپالون کی طبیعت ناساز ہے اور وہ اس وقت آرام کر رہا ہے۔ لہٰذا فون پر بات نہیں کر سکتا۔ تاہم اسے فون سننے کے لئے آنا ہی پڑا۔ خاتون خانہ کے یہ پوچھنے پر کہ آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔ دو لفظوں میں انتہائی مختصر جواب دیا گیا جسے سنتے ہی اپالون کی بیوی کا لب و لہجہ تبدیل ہو گیا اور وہ بولی۔۔۔ جی ابھی۔۔۔ جی ابھی میں اسے بلاتی ہوں۔ وہ تیر کی مانند اڑتی ہوئی اپالون کے پاس جا پہنچی جو بستر پر اوندھے منہ لیٹا ورائٹی تھیٹر میں گذشتہ شام پیش آنے والے ان غیر مہذب واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا جن کی وجہ سے دوسرے شہر سے آئی رشتہ دار لڑکی کو بھی گھر سے نکالنا پڑ گیا تھا۔

بیوی کی بات سن کر وہ بنیان اور پاجامے میں ہی بائیں پاؤں میں چپل گھسیٹتا ہوا فون کے پاس پہنچ گیا اور بولا۔ جی میں اپالون بول رہا ہوں۔ فرمایئے، فرمایئے۔

اس دوران اپالون کی بیوی داشتاؤں کے ساتھ شوہر کی مہم جوئیاں بھول کر خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ چپل، دوسری چپل بھی پہن لو۔ ننگے پاؤں ٹھنڈ لگ جائے گی۔ اپالون نے اسے وحشی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور فون پر بولا۔ ''جی میں سمجھ رہا ہوں۔ ابھی، اسی لمحے نکل رہا ہوں''۔

اپالون کی پوری شام اسی منزل پر گزر گئی جہاں تفتیش جاری تھی۔ گفتگو بہت طویل اور تکلیف دہ

تھی۔ کیونکہ گذشتہ شب تھیٹر کے واقعات اور جھگڑوں کی تفصیلات بیان کرنے کے علاوہ اسے اپنی نجی زندگی کی پوشیدہ سرگرمیوں پر سے بھی پردہ اٹھانا پڑ رہا تھا جن میں تھیٹر کی خوبرو اداکاراؤں، دوسرے شہر سے آئی ہوئی رشتہ دار لڑکی اور بہت ساری دوسری خواتین کے ساتھ تعلقات کا ذکر بھی دیانتداری سے کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ ماضی کے حسین لمحات اپالون کے لئے کڑوی گولی بن کر حلق میں اٹک گئے تھے۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نستعلیق شخصیت کے حامل اپالون کا بیان یقیناً بہت مستند تھا۔ اس نے تھیٹر میں رونما ہونے والے واقعات کی تفصیل کسی پیشہ ور داستان گو کی طرح بلا جھجک بیان کی۔ شو کے دوران سیاہ رنگ کے نقاب میں ڈھکے کالےعلم کے ماہر پروفیسر کا نام ''ولانہ'' اسے تلفظ سمیت بالکل صحیح طرح یاد تھا۔ اس کے ساتھیوں کی ہیئت تو اسے یوں ازبر تھی جیسے وہ اب بھی اس کے سامنے موجود ہیں۔ اپالون کا بیان تفتیشی افسروں کے لئے کافی مددگار ثابت ہوا۔ کچھ خواتین کے احوال بالخصوص وہ جو شو کے بعد برہنہ ہوگئی تھیں اور اپالون کے بیان کی روشنی میں تفتیش کا عمل کافی حد تک سہل ہوگیا۔

فلیٹ نمبر ۵۰ کی متعدد بار تلاشی لی گئی۔ دیواروں کو ٹھونک بجا کر پرکھا گیا۔ انگیٹھی اور چمنیوں کو کھنگالا گیا۔ خفیہ راستے ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی لیکن کوئی غیر معمولی چیز سامنے نہ آسکی۔ ہاں ایک اچنبھے کی یہ بات ضرور تھی کہ فلیٹ میں آنے والے ہر اہلکار کو یہ محسوس ہوا تھا جیسے آس پاس کوئی موجود ہے۔ اڑوس پڑوس کے لوگ یک زبان اس بات پر متفق تھے کہ فلیٹ میں کسی غیر متعلقہ شخص کو آتے جاتے نہیں دیکھا گیا۔ شہر میں غیر ملکی فن کاروں کو رہائش اور سفری سہولتیں فراہم کرنے والے ادارے کے اہلکار اس بات پر بضد تھے کہ گذشتہ چند دنوں کے دوران کالےعلم کا کوئی غیر ملکی ماہر نہ تو تھا اور نہ ہی اب موجود ہے۔

ایک حقیقت یقیناً واضح ہوچکی تھی کہ اس غیر ملکی نے سرحد پار کرتے وقت کسی کو اپنا پاسپورٹ نہیں دکھایا اور نہ ہی اس کی آمد کا کہیں اندراج ہوا تھا۔ تھیٹر میں منعقد ہونے والے شو کے سربراہ نے حلفیہ بیان دیا کہ ورائٹی تھیٹر کے ڈائریکٹر ستیپال نے نہ تو اسے کوئی فون کیا۔ نہ ہی اسے توثیق کے لئے کسی ولانہ نامی فن کار کے مجوزہ شو کی تفصیل سے آگاہ کیا گیا تھا۔ اس کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ستیپال نے کیونکر کسی غیر ملکی فن کار کو شو پیش کرنے کی اجازت دی تھی۔ وہ حیرانگی کے عالم میں بار بار اپنے ہاتھ سامنے پھیلاتا اور سر آسمان کی جانب اٹھا کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ اس معاملے میں اس کے ہاتھ صاف ہیں۔

شہر کے تھیٹروں کی کمیٹی کا سربراہ پیٹر جو پولیس کے وارد ہونے سے قبل اپنے خالی سوٹ میں دفتر کی کرسی پر براجمان رہ چکا تھا، اب کسی غیر ملکی کالےعلم کے ماہر کے وجود کا علم ہونے سے دوٹوک انکار کر رہا تھا۔

صورت حال کچھ عجیب وغریب ہوگئی تھی۔ ہزاروں تماشائی، ورائٹی تھیٹر کے تمام ملازمین اور

پڑھے لکھے حلقوں میں اچھی شہرت رکھنے والا اپالون اس حقیقت کے چشم دید گواہ تھے کہ کالے علم کا ماہر غیر ملکی فن کار اپنے خبیث چیلوں کے ساتھ تھیٹر میں شو پیش کر چکا ہے لیکن سراغ رساں ادارے شہر میں کہیں بھی اس کا کوئی سراغ پانے میں ناکام رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کو زمین نگل گئی ہے یا پھر وہ سرے سے اس شہر میں آیا ہی نہیں تھا۔ اگر پہلی بات کو درست مان لیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کم بخت نے اپنے ساتھ ورائٹی تھیٹر کے سربراہان کو بھی غائب کر دیا تھا۔ اگر دوسرے امکان کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس بدنصیب تھیٹر میں شیطانی شو کے بانی، تھیٹر کے سربراہان کو ہی ٹھہرایا جائے گا جو یہ تمام غیر اخلاقی گھناؤنا کھیل کھیلنے کے بعد شہر سے غائب ہو گئے۔

تفتیشی ٹیم کے سربراہ کو داد دینی پڑے گی۔ گمشدہ رمیض چند گھنٹوں میں ہی تلاش کر لیا گیا تھا۔ کھوجی کتے طوراب کا تھیٹر کے باہر ٹیکسی سٹینڈ پر رویہ، اس سلسلے میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ اس علاقے میں گھومنے والے ٹیکسی ڈرائیوروں سے پوچھ گچھ کے بعد تفتیش کا دائرہ فوراً دوسرے شہر لینن گراڈ تک بڑھا دیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہاں سے اطلاع ملی تھی کہ رمیض ہوٹل آستوریہ کی چوتھی منزل پر کمرہ نمبر ۴۱۲ میں مقیم ہے۔

ہوٹل آستوریہ کے کمرہ ۴۱۲ کی الماری میں چھپے ہوئے رمیض کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے لینن گراڈ ہی میں تفتیش کی گئی۔ اس کے بعد ماسکو میں ایک تار موصول ہوا جس کے مطابق رمیض شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا یا بلکہ یوں کہنا چاہیے کسی ذہنی عارضے میں مبتلا تھا اور کسی بھی سوال کا سیدھی طرح جواب دینے سے قاصر تھا۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ اسے فوری طور پر کسی پولیس سٹیشن میں منتقل کر دیا جائے اور کم از کم چار جدید ہتھیاروں سے لیس پہرے دار اس کی حفاظت پر مامور کئے جائیں۔ ماسکو سے جوابی تار میں حکم دیا گیا کہ رمیض کو پولیس کے پہرے میں ماسکو بھیج دیا جائے۔ دارالخلافہ سے موصول ہونے والے حکم کی فوراً تعمیل کر دی گئی۔ اسی شام ستپال کا بھی سراغ لگا لیا گیا۔ ہر شہر کی پولیس کو ستپال کی گمشدگی کی اطلاع کر دی گئی تھی۔ بالآخر یالٹا سے خبر ملی کہ ستپال وہاں موجود تھا لیکن کچھ دیر قبل بذریعہ ہوائی جہاز ماسکو روانہ ہو چکا ہے۔

واحد شخص جس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا وہ تھا ورائٹی تھیٹر کا ہر دلعزیز ایڈمنسٹریٹر وریآم۔ تفتیش کے دوران ورائٹی تھیٹر کے علاوہ شہر کے مختلف علاقوں میں متعدد لوگوں کے ساتھ مغز خوری کی گئی۔ ''وہ سمندر کا پانی'' گانے والے عجیب و غریب واقعہ کی تفتیش اور کچھ لوگوں کا کرنسی نوٹوں کی جگہ عجیب سے کاغذ پیش کرنا اور ایسے لوگوں سے سوال و جواب انتہائی مشکل کام ثابت ہوا۔ (یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ 'سمندر کا پانی' گانے والے ہجوم کو قابو میں لانے کے لئے ڈاکٹر ستارین کو تقریباً دو گھنٹے لگے تھے۔ ان تمام ''گلوکاروں'' کو جلد کے اندر کوئی خاص قسم کا ٹیکہ لگانا پڑا تھا) سب سے کٹھن مرحلہ دن کی روشنی میں پریس

کلب کے ہال میں رکھے تابوت سے مرحوم مائیکل بیرلی کی لاش کے سر کا چوری ہو جانا اور پھر سر بریدہ لاش کی تدفین کا معاملہ تھا۔

کل ملا کر بارہ تفتیشی افسر اس مشکل ترین کیس کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک افسر پروفیسر ستارین کے ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ گذشتہ تین دنوں میں داخل ہونے والے مریضوں میں سے نکانور بوس اور ورائٹی تھیٹر میں شو کے دوران بلے کے ہاتھوں سر کٹوانے والے بدنصیب میزبان۔ بینگالی۔ سے تفتیش کے دوران یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ یہ دونوں ایک ہی گروہ کی سیاہ کاریوں کا شکار بنے تھے۔ تفتیشی افسر کے لئے اصل دلچسپی کا باعث ایوان بے گھر ثابت ہوا۔

جمعے کی شب ذہنی امراض کے ہسپتال میں ایوان کے کمرہ ۱۱۷ کا دروازہ کھلا اور ایک حلیم چہرے اور شائستہ گفتار والا نوجوان اندر داخل ہوا۔ وہ دیکھنے میں کسی صورت بھی سراغ رساں نہیں لگتا تھا۔ حالانکہ اسے شہر کا قابل ترین تفتیشی افسر مانا جاتا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر چارپائی پر دراز زرد رو نوجوان پر پڑی جس کی اردگرد کے ماحول سے لاتعلق نگاہیں دور کہیں فضاؤں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں یا پھر شاید اپنے ہی اندر جھانک رہی تھیں۔

سراغ رساں نے انتہائی حلیم لہجے میں اپنا تعارف کروانے کے بعد ایوان کو بتایا کہ وہ شہر کے مشہور وسطی چوراہے میں پرسوں پیش آنیوالے واقعات کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہی گفتگو تفتیشی افسر نے کچھ دیر پہلے کی ہوتی تو ایوان کا جوش وخروش یقیناً قابل دید ہوتا۔ وہ بے چارا تو خود یہ کہانی کئی لوگوں کے گوش گزار کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ لیکن اب جبکہ غیر ملکی مشیر کو پکڑوانے کے لئے اس کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا تو اس غیر ملکی کے پیچھے بھاگنے کا جذبہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ اس کے متعلق ایوان کا گفتگو کرنے کا انداز بھی جذبات سے خالی ہو چکا تھا۔

سراغ رساں کی آمد سے قبل ایوان اونگھ رہا تھا۔ اس نیم خوابی کی کیفیت میں اسے ایک عجیب و غریب تاریخی قسم کا شہر دکھائی دے رہا تھا۔ جس میں سنگ مرمر سے بنا ہوا ایک محل تھا۔ محل کے بڑے بڑے ستونوں کے وسط میں ایک بالکونی تھی جس کے سامنے ایک باغیچے میں سنہری رنگ کے متعدد مجسمے کھڑے تھے۔ اسے شہر کی فصیل کے سائے میں رومن سپاہیوں کے دستے مارچ کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

اسی نیم خوابی کے عالم میں ایوان کو آرام دہ کرسی میں بیٹھا ایک زردی مائل چہرے والا ادھیڑ عمر شخص دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سرخ استر والا سفید کوٹ پہن رکھا تھا اور نفرت بھری نظروں سے باغیچے کی سمت میں دیکھ رہا تھا۔

اور۔۔ گذشتہ روز غیر ملکی مشیر والے واقعات میں ایوان کو بظاہر اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

میرے محترم ایوان صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ جب مائیکل ٹرام کے نیچے کچلا گیا تو آپ جائے حادثہ سے کتنے فاصلے پر تھے؟ تفتیشی افسر نے پوچھا

میں کافی دور تھا۔ ایوان نے مختصر جواب دیا۔

اور وہ دھاری دار کوٹ والا؟ کیا وہ حادثے کے وقت مائیکل کے قریب تھا؟

نہیں۔ وہ مجھ سے کچھ دور بنچ پر بیٹھا تھا۔

کیا آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ وہ مائیکل کے قریب نہیں تھا؟

بالکل یاد ہے۔ وہ تمام وقت بنچ پر ہی بیٹھا رہا تھا۔

یہ آخری سوال پوچھنے کے بعد سراغ رساں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایوان سے ہاتھ ملا کر شکریہ ادا کیا اور اس کے جلد صحت یاب ہونے کی نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے بولا:

امید ہے آپ جلد صحت یاب ہو جائیں گے اور لوگوں کو پھر سے اپنے بیش قیمت کلام سے مستفید کریں گے۔

نہیں۔ ایوان آہستہ سے بولا۔ میں اب مزید شعر و شاعری نہیں کروں گا۔

تفتیشی افسر نے مسکراتے ہوئے ایوان کو تسلی دی اور کہنے لگا۔

آپ پریشان نہ ہوں۔ اس وقت آپ کچھ ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ لیکن مجھے پوری امید ہے کہ آپ جلد ہی اس کیفیت سے باہر نکل آئیں گے اور آپ کے قلم سے شعر خود بخود پھوٹنے لگیں گے۔

نہیں۔ ایوان دور افق میں گھورتے ہوئے بولا۔ میں اس کیفیت سے اب کبھی بھی نکل نہیں پاؤں گا۔ جو شعر میں کہتا رہا ہوں وہ انتہائی فرسودہ ہیں۔ یہ بات مجھے اب اچھی طرح سمجھ میں آ گئی ہے۔

سراغ رساں کو ایوان سے انتہائی مفید معلومات ملی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ تفتیش کے دھاگے کا آخری سرا گرفت میں لینے میں کامیاب ہو گیا ہے اور بالآخر اس کے ابتدائی سرے تک جا پہنچا ہے۔ اسے کامل یقین ہو چلا تھا کہ یہ سارا قصہ مائیکل بیرلی کی ناگہانی موت سے شروع ہوا تھا۔ وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتا تھا کہ مائیکل کو ٹرام کے نیچے کسی نے نہیں دھکیلا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ مائیکل حادثے کے وقت ہپناٹزم کے شکار ہو گیا تھا۔

ان تمام واقعات کا تانا بانا ملانے کے لئے اب اچھا خاصا مواد اکٹھا ہو چکا تھا اور یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ اصل مجرم کون ہیں۔ بس انہیں اب ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تمام شواہد مجرموں کو ایک ہی کمیں گاہ کی جانب اشارہ کرتے تھے۔ یعنی فلیٹ نمبر ۵۰۔

اس آسیب زدہ فلیٹ کا کونہ کونہ چھان مارا گیا تھا لیکن وہاں کسی ذی روح کی موجودگی کا نشان

تک نہیں ملا۔ تاہم فلیٹ سے وقتاً فوقتاً سنائی دینے والی آوازیں اور کچھ دوسرے حقائق اسی مفروضے کو تقویت پہنچاتے تھے کہ فلیٹ میں یقیناً کوئی رہتا ہے۔ کبھی وہاں سے فون کے بجنے کی آوازیں آتی تھیں۔ کبھی کوئی کھڑکی کھلتی اور کوئی بند کر دی جاتی تھی۔ بسا اوقات فون پر ایک منحوس سی آواز باتیں کرتی سنائی دیتی تھی۔ گذشتہ چند دنوں سے فلیٹ مستقل طور پر زیرِ نگرانی تھا۔ پہرے دار نہ صرف عمومی راستے پر متعین تھے بلکہ چھت پر، انگیٹھیوں کی چمنیوں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ فلیٹ نمبر ۵۰ سراغ رساں اداروں کا تمسخر اڑا رہا ہے اور وہ اس کی مافوق الفطرت حرکات کے سامنے بے بس دکھائی دیتے تھے۔

یہ سلسلہ جمعے سے ہفتے کی درمیانی شب تک جاری رہا۔ بارہ بجنے کے کچھ ہی دیر بعد خوش پوش نواب مائیکل وہاں نمودار ہوا۔ اس کے گھنٹی بجانے پر فلیٹ کا دروازہ کھول دیا گیا اور وہ اندر چلا گیا۔ ٹھیک دس منٹ بعد سراغ رساں ادارے کے اہلکار بغیر گھنٹی بجائے فلیٹ میں داخل ہو گئے۔ فلیٹ کے مکیں پہلے کی طرح غائب تھے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ نواب مائیکل کا بھی وہاں کوئی سراغ نہیں ملا۔

یہ غیر معمولی سرگرمیاں ہفتے کی صبح تک جاری رہیں۔ چند نئے حقائق سامنے آنے پر کیس مزید دلچسپ ہوتا جا رہا تھا۔ ماسکو کے ایئرپورٹ پر علی الصبح ایک چھ سیٹوں والا چھوٹا جہاز بحیرہ اسود پر واقع مشہور بندرگاہ یالٹا سے پہنچا۔ جہاز سے اترنے والے مسافروں میں منفرد سی شخصیت کا حامل ایک شخص شامل تھا۔ اس نے غالباً گذشتہ تین دنوں سے نہ تو شیو کی تھی نہ ہی منہ ہاتھ دھوئے تھے۔ سر کے بال ضرورت سے زیادہ ابلی ہوئی سویوں کی مانند چپکے ہوئے تھے۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ اس کا لباس کچھ عجیب سا تھا۔ اس نے میلے کچیلے جانگئے اور بنیان پر بغیر بٹنوں کا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں نیلے رنگ کی چپل تھی۔ وہ جیسے ہی جہاز کی سیڑھی سے اترا اسے تحویل میں لے لیا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ورائٹی تھیٹر کا ڈائریکٹر ستپال تفتیشی افسروں کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے بیان سے اب یہ بات واضح ہو گئی کہ وولانؔد نے فن کار کا روپ دھارنے کے بعد تھیٹر کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوا تھا۔ جہاں اس نے تھیٹر کے ڈائریکٹر کو ہپناٹائز کر دیا اور خدا جانے اس بدنصیب کو کس طرح ماسکو سے ہزاروں کلومیٹر دور پھینک دیا تھا۔

یہ شیطانی کھیل رچانے والے گروہ کے متعلق اچھا خاصا مواد اکٹھا ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے تفتیش سہل ہونے کی بجائے مزید الجھتی جا رہی تھی۔ اب ایک بات عیاں ہو گئی تھی کہ جو شخص ورائٹی تھیٹر کے ڈائریکٹر ستپال کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر قادر ہو سکتا ہے اسے قابو کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ستپال کو اس کی اپنی درخواست پر کڑے پہرے والی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد وریام کو تفتیشی ٹیم کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ تقریباً دو دن شہر سے غائب رہنے کے بعد اپنے گھر لوٹ آیا تھا۔ وہیں سے

اسے حراست میں لیا گیا تھا۔

عزازیل کے ساتھ آئندہ جھوٹ نہ بولنے کے وعدے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وریام نے اپنا بیان اسی ''نیک'' کام سے شروع کیا۔ اس کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے شاید یہ دروغ گوئی کوئی بڑا قابل تنقید جرم بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی عزازیل کے ساتھ وعدہ تو ٹیلیفون پر جھوٹ نہ بولنے کا تھا اور اس وقت وہ فون پر تو گفتگو نہیں کر رہا تھا۔ آنکھیں دائیں بائیں گھماتے ہوئے وریام نے اعلان کیا کہ جمعرات کے روز اس نے اپنے دفتر میں تنہا ہی شراب نوشی شروع کر دی تھی۔ جس کے بعد وہ کہیں چلا گیا تھا۔ کہاں۔ اسے یاد نہیں۔ کسی اور جگہ اس نے مزید شراب پی تھی۔ کہاں اسے یاد نہیں۔ پھر نشے کی حالت میں کسی باغیچے کی باڑ کے نیچے پڑا رہا۔ کہاں۔ یہ بھی اسے یاد نہیں۔

جب اسے خبردار کیا گیا کہ اپنی بے وقوفانہ اور مہمل باتوں سے وہ ایک انتہائی سنجیدہ مسئلے کو مزید الجھانے کی کوشش کر رہا ہے اور اگر اس نے اپنا رویہ درست نہ کیا تو ممکنہ نتائج کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ یہ سننے کے بعد اس نے باآواز بلند رونا شروع کر دیا اور فوراً ہی تسلیم کر لیا کہ وہ سزا اور ولانہ کے گروہ کے خوف کی وجہ سے جھوٹ بول رہا تھا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور تفتیشی افسروں سے التجا کی کہ اسے سخت پہرے والی حوالات میں بند کر دیا جائے۔

یہ کیا بکواس ہے۔ جسے دیکھو وہ انتہائی سخت پہرے والی حوالات میں بند ہونا چاہتا ہے۔ تفتیشی افسروں کا ایک ساتھی بولا۔ تاہم ایوان سے تفتیش کرنے والے افسر نے کہا:

دراصل ملعونوں کے اس ٹولے نے ان لوگوں کو بری خوف زدہ کر دیا ہے۔

وریام کو تسلی دے کر کسی حد تک پرسکون کر دیا گیا اور وعدہ کیا گیا کہ حوالات سے باہر بھی اس کی تسلی بخش طریقے سے حفاظت کی جائے گی۔ یہ سن کر وریام پھوٹ پڑا اور کہنے لگا کہ اس نے نہ تو اپنے دفتر میں اور نہ ہی کسی اور جگہ شراب پی تھی۔ بلکہ وہ تو تھیٹر کے باغیچے میں ہی ان بلوانوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ ان میں سے ایک کے بال سنہری تھے اور منہ سے بدنما لمبا دانت جھانک رہا تھا اور دوسرا ایک جسیم۔۔۔۔۔۔

بلے سے ملتی جلتی شکل والا۔ ایک تفتیشی افسر نے لقمہ دیا۔

جی ہاں۔ جی ہاں بالکل وہی۔ خوف سے وریام کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ چاروں جانب اس طرح نظریں گھما رہا تھا کہ جیسے وہی شیطانی چیلے کہیں آس پاس ہی موجود نہ ہوں۔ پھر اس نے ان دو ہولناک دنوں کی کہانی بیان کی جو اسے ویمپائر کے حلیے میں فلیٹ نمبر ۵۰ میں گزارنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ باتوں باتوں میں اسے وہ واقعہ بھی یاد آ گیا کہ فنانس ڈائریکٹر رمیض اس کے ہاتھوں کیسے قتل ہوتے ہوتے بچا تھا۔

اس دوران فنانس ڈائریکٹر رمیض کو بھی لینن گراڈ ریلوے سٹیشن سے سیدھا سراغ رساں ادارے

کے دفتر پہنچا دیا گیا۔ لیکن خوف سے کانپتا ہوا ذہنی طور سے منتشر سفید بالوں والا یہ ادھیڑ عمر شخص دو دن پہلے والے فنانس ڈائریکٹر سے یکسر مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کسی صورت زبان کھولنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس بیان پر بضد تھا کہ اس نے اپنے دفتر کی کھڑکی میں کسی گیلہ نامی برہنہ عورت کو نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ ہی وریام اسے وہاں نظر آیا تھا۔ ہاں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ بے خبری کی حالت میں نجانے کیوں لینن گراڈ چلا گیا تھا۔ دیگر زیر تفتیش لوگوں کی طرح رمیفش نے بھی سخت پہرے والی حوالات میں بند کئے جانے کی التجا کی۔

انوشکا کو اس وقت حراست میں لیا گیا جب وہ ایک سٹور سے کچھ خریداری کرنے کے بعد ملکی کرنسی کی بجائے دس ڈالر کا نوٹ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی کھڑکیوں سے پرواز کرنے والوں کے متعلق کہانی اور سیڑھیوں میں ملنے والے ہیروں سے جڑاؤ کنگن کا قصہ بہت انہماک سے سنا گیا۔ بقول اس کے وہ کنگن پولیس سٹیشن میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

کیا وہ کنگن واقعی سونے کا تھا اور ہیروں سے جڑا تھا؟ انوشکا سے پوچھا گیا۔

آپ کیا بات کرتے ہیں۔ مجھے کیا ہیروں کی پہچان نہیں ہے؟ وہ بولی۔

آپ کے بیان کے مطابق اس آدمی نے آپ کو دس دس روبل کے نوٹ دیئے تھے؟

یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے کیا روبلوں کی پہچان نہیں ہے؟

اچھا تو پھر یہ روبل ڈالر میں کب تبدیل ہو گئے؟

''میں کچھ نہیں جانتی۔ کیسے ڈالر؟ کون سے ڈالر؟ میں نے ڈالر آج تک نہیں دیکھے''۔ وہ کچھ افراتفری میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگی ''ہم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ ہمیں تو ایمانداری کا انعام دیا گیا تھا۔ اسی انعام کی رقم سے ہم کچھ چیزیں خریدنے گئے تھے۔ جہاں تک فلیٹ نمبر ۵۰ میں شیطانی قوتوں والے گروہ کو رہائش دینے کا تعلق ہے تو ہمارا بھلا اس سے کیا لینا دینا ہے؟''

اس کم عقل باتونی عورت کی تقریر سے سبھی تنگ آ چکے تھے۔ افسروں میں سے ایک نے قلم کے اشارے سے انوشکا کو مزید کچھ بولنے سے منع کر دیا اور پھر اسے وہاں سے دفعان کر دیا گیا۔ چند ہی لمحوں بعد تفتیشی افسر اس عذاب کے ٹل جانے کی خوشی میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔

انوشکا کے جانے کے بعد متاثرین کی ایک طویل قطار تفتیشی ٹیم کے سامنے پیش ہوئی۔ ان لوگوں میں نکولائی بھی شامل تھا۔ اس کی گرفتاری شکی مزاج بیوی کی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ اس نے خود ہی صبح پولیس کو خاوند کی گمشدگی کی اطلاع کروی تھی۔ نکولائی نے جب شیطان کے ہاں پارٹی میں رات گزارنے کے بارے میں بلّے بیگموت کا جاری کردہ سرٹیفکیٹ پیش کیا تو تفتیشی افسروں میں سے کسی نے بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ مارگریتا کے برہنہ حالت میں کھڑکی میں بیٹھنے، اس کی ملازمہ نتاشا کو اپنی

پشت پر سوار کر کے فضاؤں میں اڑانے اور پھر کسی دور افتادہ جنگل میں اسے دریا میں نہاتے دیکھنے کے مناظر بیان کرتے وقت نکولائی حقیقت بیانی سے کچھ کترا گیا تھا۔ مثلاً باغیچے سے اٹھائی گئی مارگریٹا کی انگیہ اس کی خواب گاہ میں پہنچانے کا ذکر اس نے نامناسب سمجھا تھا۔ نتاشا کو پری کہہ کر پکارنے کا ذکر بھی اسے غیر ضروری لگا تھا۔ اس کی کہانی کے مطابق نتاشا کھڑکی سے اڑان لیتی ہوئی باہر نکلی تھی اور باغیچے میں نکولائی پر سوار ہونے کے بعد ماسکو سے دور پرواز کر گئی تھی۔

اس تمام کہانی میں نکولائی نے خود کو حالات کا شکار اور مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ آخر میں اس نے تفتیش کنندگان سے التجا کی کہ اس پر ہونے والے ظلم کی روداد اس کی بیوی کو نہ بتائی جائے۔ تفتیشی افسروں نے ہنستے ہوئے اس کی بیوی سے یہ تمام باتیں پوشیدہ رکھنے کا وعدہ کیا اور اسے وہاں سے چلے جانے کا اشارہ دیا۔

نکولائی کے بیان کے بعد اس حقیقت کی تصدیق ہوگئی کہ مارگریٹا اور اس کی ملازمہ نتاشا کہیں غائب ہوچکی ہیں۔ ان دونوں کی فوراً ہی تلاش شروع کردی گئی۔ اور یوں ہفتے کی صبح تک تفتیش کا یہ عمل ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جاری رہا۔

اس دوران شہر میں عجیب وغریب افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ ہر کوئی حقیقت کے دو دانے لے کر اپنا پلاؤ تیار کر رہا تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ ورائٹی تھیٹر میں شو کے بعد ہزاروں تماشائی سڑکوں پر برہنہ حالت میں گھومتے دیکھے گئے تھے اور کرنسی نوٹوں کے چھاپہ خانے پر کچھ بدمعاشوں نے قبضہ کر کے جعلی نوٹوں کے انبار لگا دیئے ہیں۔ تھیٹر سے منسلک پانچ اہم شخصیات کو جرائم پیشہ افراد کے ٹولے نے اغوا کرلیا لیکن پولیس نے ہمیشہ کی طرح مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں فوراً ہی بازیاب کرالیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی غیر متعلقہ باتوں کا تذکرہ کیا جارہا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے کچھ دیر قبل سراغرساں ادارے کا فون بج اٹھا اور اطلاع موصول ہوئی کہ اس آسیب زدہ فلیٹ نمبر پچاس میں ازسرنو زندگی کے آثار دیکھے گئے ہیں۔ بتایا گیا کہ کچھ دیر پہلے فلیٹ کی کھڑکیاں کھولی گئی ہیں۔ اندر سے پیانو بجنے اور گانے کی آوازیں سنی گئی ہیں۔ ایک کھڑکی کی دہلیز پر ایک جسیم بلے کو بھی دھوپ کی حدت سے لطف اندوز ہوتے دیکھا گیا ہے۔

شام کے تقریباً چار بجے ایک جیسے یونیفارم میں ملبوس، تین گاڑیوں میں سوار مردوں کا ایک دستہ عمارت نمبر ۳۰۲ کے پاس پہنچا۔ گاڑیوں سے اترنے کے بعد یہ دستہ دو برابر حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک حصہ عام استعمال ہونے والے راستے سے اور دوسرا ہنگامی حالت کے لئے مخصوص زینوں سے ہوتا ہوا فلیٹ نمبر ۵۰ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ عام راستے سے چڑھنے والا دستہ جب فلیٹ نمبر ۵۰ کے دروازے تک پہنچا تو وہاں

دو سینیٹری ملازمین کچھ مرمت کا کام کرنے میں مصروف تھے۔ ان ملازمین نے فوراً اپنا کام روک دیا اور سراغرساں ادارے کے اہل کاروں کو سرگوشی میں یہ اطلاع دینے کے بعد کہ فلیٹ نمبر ۵۰ کے تمام مکین اس وقت اندر موجود ہیں، وہاں سے کھسک گئے۔ اس دوران ہنگامی راستے سے چڑھنے والا دستہ بھی فلیٹ کے دروازے تک آ پہنچا تھا۔

ان لمحات کے دوران فاگوٹ اور عزازیل اپنے عمومی لباس میں کھانے کے میز پر ناشتہ کر رہے تھے۔ ولاند حسب عادت اپنی خواب گاہ میں بیٹھا تھا۔ اور بلا۔۔۔ نجانے وہ کہاں تھا۔ البتہ دیگچیوں کے فرش پر الٹنے اور برتن ٹوٹنے کی آوازوں سے اخذ کیا جاسکتا تھا کہ اپنی عادت سے مجبور بیگھموت غالباً باورچی خانے میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

یہ سیڑھیوں پر قدموں کی آوازیں کیسی ہیں؟۔ فاگوٹ نے کافی کے پیالے میں چمچ ہلاتے ہوئے پوچھا۔

ہمیں حراست میں لینے والے آ رہے ہیں۔ عزازیل نے برانڈی سے بھرا گلاس حلق میں انڈیلنے کے بعد کہا۔

ارے واہ، کمال ہے! فاگوٹ نے جواب دیا۔

فلیٹ نمبر ۵۰ کے دروازے کے پاس پہنچ کر دستے کی قیادت کرنے والے افسر نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سیاہ رنگ کا ماؤزر نکالا اور دروازے پر تان لیا۔ دوسرے اہلکار نے ایک چوڑے دستے والا پستول تیار کرلیا۔ سراغ رساں ادارے کے اس خصوصی دستے کے اہل کار کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کے لئے جدید ہتھیاروں اور دوسرے لوازمات سے لیس تھے۔ دو اہلکاروں کی جیبوں میں نائلون کی جالیاں تھیں جبکہ ایک اہلکار نے کلوروفارم کی بوتل اور باریک پٹیوں سے بھرا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔

فلیٹ کا دروازہ چند لمحوں میں کھول دیا گیا اور تمام اہل کار اندر داخل ہو گئے۔ اس بار نامکمل ہی سہی لیکن کامیابی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اہل کار فوری طور پر تمام کمروں میں پھیل گئے جہاں انہیں کوئی زندہ یا مردہ انسان تو نہیں ملا, ہاں البتہ کھانے کی میز پر نامکمل ناشتہ چھوڑے جانے کے آثار پائے گئے۔ مہمان خانے میں انگیٹھی کے اوپر کرسٹل کی قیمتی صراحی کے پاس ایک سیاہ رنگ کا بلا براجمان تھا۔ اس نے پنجے میں مٹی کے تیل سے جلنے والا ایک لیمپ تھام رکھا تھا۔

مہمان خانے میں داخل ہونے والے اہلکار کافی دیر تک حیرانی کے عالم میں بلے پر نگاہیں جمائے دم بخود کھڑے رہے۔

''واہ، بہت خوب''۔ ایک اہلکار بولا

''نہ تو میں سرپھرا ہوں اور نہ ہی کسی کو چھیڑ رہا ہوں۔ میں تو بس یہ لیمپ مرمت کرنے کی کوشش کر

رہا ہوں''۔ بلاّ خفگی کے عالم میں منہ بسورتے ہوئے بولا۔''اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ بلاّ ایک قدیم اور ناقابل شکار جانور ہے''۔

''واہ۔ کیا زبردست تخلیق ہے''۔ ایک اہلکار بول اٹھا۔ جبکہ دوسرا آواز بلند بولا۔''اچھا تو ناقابل شکار قدیم نسل بلاّ صاحب ذرا ادھر تو تشریف لائیں''۔ اور بڑی مہارت کے ساتھ اس نے نائلون کی جالی بلّے کی جانب اچھال دی لیکن اس وقت تمام لوگ انگشت بدندان ہوگئے جب بلاّ کسی مچھلی کی مانند پھسلتا ہوا جالی کے نیچے سے نکل گیا۔ کرسٹل کی صراحی جالی کی لپیٹ میں آنے کے بعد فرش پر گری اور چور چور ہوگئی۔

مقابلہ۔ مقابلہ۔ مقابلہ۔ چلاّتے ہوئے بلّے نے کیروسین لیمپ احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا اور نجانے کہاں سے ایک پستول نکال کر نزدیکی اہلکار پر تان لیا۔ لیکن اہلکار اس نوسرباز جانور سے زیادہ مستعد ثابت ہوا اور اس کے پستول نے فوراً ہی شعلہ اگل دیا۔ گولی چلتے ہی بلاّ انگیٹھی سے سر کے بل فرش پر آن گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ کیروسین لیمپ بھی فرش پر گر گیا۔

ختم شد!! بلّے نے نحیف آواز میں اعلان کیا اور خون کے تالاب میں ٹانگیں پھیلائے لیٹا ہوا بولا۔''ایک لمحے کے لئے سب مجھ سے ذرا پرے ہٹ جائیں۔ جدا ہونے سے پہلے مجھے آخری مرتبہ زمین سے اچھی طرح مل لینے دو۔ او میرے دوست عزازیل کہاں ہو تم؟''۔ تکلیف سے کراہتے ہوئے بلاّ بولا۔ اس نے روشنی سے خالی ہوتی آنکھیں مہمان خانے کے دروازے پر جما رکھی تھیں۔''عزازیل! تم اس کلی طور پر بے جوڑ لڑائی میں میری مدد کو نہیں آئے اور برانڈی پینے کو ترجیح دی۔ برانڈی بلاشک بہت اعلیٰ معیار کی تھی لیکن تم جان لو کہ بیکیموت کا قتل تمہارے سر ہے۔ میں مرنے سے پہلے اپنا پستول تمہارے نام کرتا ہوں''۔

جالی۔ جالی۔ بلّے کے اردگرد کھڑے اہلکار بے چینی کے عالم میں پکار رہے تھے۔ لیکن نجانے کیوں جالی ایک اہلکار کی جیب میں الجھ کر رہ گئی تھی اور بصد کوشش بھی برآمد نہیں ہوسکی۔

''واحد درماں جو شدید زخمی قریب المرگ بلّے کو بچا سکتا ہے''۔ بلاّ لمبی لمبی سانسیں کھینچتا ہوا بمشکل بولا۔''وہ ہے مٹی کے تیل کا گھونٹ''۔ اس نے پنجہ بڑھا کر کیروسین لیمپ دبوچ لیا اور اس کے سوراخ سے منہ لگا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھر لیا۔

اور ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوگیا۔ یکا یک زمین پر بنا خون کا تالاب ایک فوارے کی شکل اختیار کرنے کے بعد واپس بلے کے جسم میں داخل ہوگیا اور وہ دوبارہ زندگی سے لبریز اور توانائی سے بھرپور نظر آنے لگ گیا۔ لیمپ کو بغل میں دبائے وہ اچھل کر انگیٹھی پر جا چڑھا اور وہاں سے ایک ہی جست میں کھڑکی کے اوپر لگی پردوں کی ریلنگ پر جا بیٹھا۔

متعدد ہاتھ بلند ہوئے۔ کچھ نے پردے کو پکڑ لیا اور کچھ نے ریلنگ کے کونوں پر رکاوٹ بنانے کی

کوشش کی۔ اس کھینچا تانی میں پردے ریلنگ سمیت نیچے آ گرے اور نیم روشن کمرہ سورج کی کرنوں سے منور ہوگیا۔ بلّا کمال صفائی سے لیمپ کو گرائے بغیر اڑتا ہوا چھت کے وسط میں لٹکے فانوس پر جا بیٹھا۔

سیڑھی، سیڑھی۔ کچھ آوازیں بلند ہوئیں۔

''میری جانب سے اب ڈوئل کی دعوت عام ہے''۔ پنڈولم کے مانند جھولتے ہوئے فانوس پر بیٹھے بلّے نے چہک کر اعلان کیا۔ اس دوران اس کے پنجے میں پھر سے پستول نمودار ہوگیا تھا۔ وہ لیمپ کو احتیاط سے فانوس کے ایک سوراخ میں اٹکا چکا تھا۔ بیگموت نے نیچے کھڑے اہل کاروں پر گولیاں برسانی شروع کردیں۔ پستول کے دھماکوں سے فلیٹ گونج اٹھا۔ فرش پر فانوس سے گرنے والے کرسٹل کی بارش ہورہی تھی۔ انگیٹھی کے اوپر آویزاں آئینہ ٹوٹ کر چھوٹے بڑے ستاروں کی شکل میں بکھر گیا۔ دیواروں کا پلستر اکھڑنے سے فضا میں دھول اڑنے لگی تھی۔ گولیوں کے خالی خول فرش پر لڑھک رہے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے بھی چکنا چور ہوگئے۔ کیروسین لیمپ پر گولی لگنے سے مٹی کا تیل فرش پر بہہ نکلا۔ اب بلّے کو زندہ حالت میں پکڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دستے کے اہلکاروں نے جوابی کاروائی کرتے ہوئے بلّے کے سر، سینے اور پیٹ پر اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کردیں۔ شدید فائرنگ کی آواز سے باہر گلی میں بے چینی اور افراتفری پھیل گئی تھی۔

گولیوں کے تبادلے کی شدت میں جلد ہی کمی واقع ہونے لگی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس قدر شدید فائرنگ کے باوجود کسی کا مرنا تو درکنار کوئی اہلکار زخمی تک نہیں ہوا تھا۔ بلّا بھی ہشاش بشاش فانوس پر بیٹھا جھولے لے رہا تھا۔ اپنے دل کی تسلی کے لئے ایک اہلکار نے یکے بعد دیگرے پانچ گولیاں سیدھی بلّے کے سر کا نشانہ لے کر داغ دیں۔ جواباً بلّے نے بھی اس اہلکار پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ لیکن نتیجہ وہی۔ نہ کوئی خراش۔ نہ کوئی خون کا قطرہ۔ بلّا نجانے کیوں بار بار کبھی پستول کی نالی میں پھونکیں مار رہا تھا اور کبھی اپنے پنجے پر تھوک رہا تھا۔ نیچے کھڑے اہلکار حیرت میں گم، اپنی پلکیں جھپکانا بھی بھول گئے تھے۔

انسانی تاریخ کا غالباً یہ پہلا واقعہ تھا کہ گولیاں بے اثر ثابت ہورہی تھیں۔ یہ تو شائید فرض کیا جاسکتا ہے کہ بلّے کے ہاتھ میں پکڑا پستول کوئی کھلونا تھا۔ لیکن سراغرساں ادارے کے اہلکاروں نے تو یقینی طور پر کھلونے نہیں اٹھا رکھے تھے۔ سب سے پہلی گولی سے بلّے کا زخمی ہونا اور خون بہنا اور پھر مٹی کا تیل پی کر دوبارہ ہشاش بشاش ہوجانا یقینی طور پر اس شیطانی جانور کا شعبدہ ہی تھا۔

بلّے کو قابو کرنے کی ایک آخری کوشش میں اس پر کمند پھینکی گئی لیکن وہ فانوس میں الجھ کر رہ گئی اور فانوس ٹوٹ کر نیچے آ گرا۔ فرش پر فانوس کے گرنے سے زوردار دھماکہ ہوا جس سے پوری عمارت لرز اُٹھی، لیکن مقصد پھر بھی حاصل نہ ہوسکا۔ فانوس کے ٹوٹنے والے شیشوں سے کئی اہلکار زخمی ہوگئے جبکہ بلّا انگیٹھی

کے اوپر نصب آئینے کے دھاتی فریم پر جا بیٹھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کا فلیٹ سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس کم بخت نے فریم پر بیٹھے بیٹھے ایک اور تقریر جھاڑ دی۔

''میری سمجھ سے یہ بات بالکل باہر ہے کہ آپ لوگوں کو مجھ سے کیا عداوت ہے جو آپ لوگ میری جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔''

اچانک اس کی تقریر کو کاٹتے ہوئے ایک بھاری بھرکم آواز مخل ہوئی۔

یہ کیا اودھم مچا رکھا ہے؟ میری پڑھائی میں خلل پڑ رہا ہے۔

ایک دوسری منمناتی آواز آئی۔

یہ یقیناً بگیموت کے کرتوت ہیں۔ اس کا خانہ خراب ہو۔

ایک تیسری منحوس سی آواز نے اعلان کیا۔

میرے آقا آج ہفتہ ہے۔ سورج ڈھلنے لگا ہے۔ ہماری روانگی کا وقت آن پہنچا ہے۔

''معذرت چاہتا ہوں۔ مزید گفتگو کرنے سے قاصر ہوں''۔ آئینے کے فریم پر بیٹھا بلا بولا۔ ''ہماری روانگی کا وقت آ پہنچا ہے''۔ اس نے اپنی پستول کھڑکی میں دے ماری اور واحد سالم شیشے کو بھی توڑ ڈالا۔ بعد ازاں اس نے اپنے منہ سے پورے کمرے میں مٹی کے تیل کی پچکاریاں ماردیں جن سے فوراً ہی آگ بھڑک اٹھی جس کے شعلے آناً فاناً چھت تک پہنچ گئے۔ آگ اتنی تیزی اور شدت سے پھیلی کہ اہلکاروں کے لئے وہاں مزید ایک لمحے کے لئے بھی ٹھہرنا محال ہوگیا اور وہ افراتفری کے عالم میں فلیٹ سے باہر دوڑنے لگ گئے۔ بلے نے ''میاؤں'' کی آواز نکالی اور جست لگا کر کھڑکی کی دہلیز پر جا پہنچا جہاں سے وہ اپنے لیمپ سمیت غائب ہوگیا۔ باہر سے اچانک فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گلی کی دوسری جانب پانچویں منزل کی ہنگامی سیڑھی پر کھڑے ایک شخص نے بلے کو دیکھ کر اس وقت گولیاں برسانی شروع کردیں جب بلا فلیٹ کی کھڑکی سے باہر نکل کر برساتی پانی کے نکاسی پائپ کے سہارے چھت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ گولیاں بھی بے اثر ثابت ہوئیں اور بلا اطمینان سے چھت پر جا پہنچا۔

چھت کی چمنیوں پر پہرہ دینے والے اہل کاروں نے بھی بدقسمتی سے گولیوں کی ایک بڑی تعداد بلے کو نشانہ بنانے کی کوشش میں ضائع کردی اور اس ڈھلتی ہوئی شام میں بلا ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس دوران بھاگتے ہوئے اہلکاروں کو فرش کی وہ جگہ جہاں بلے نے زخمی ہونے کا ڈرامہ رچایا تھا، ابھرتی محسوس ہوئی۔ کچھ ہی لمحوں میں وہاں مرحوم نواب مائیکیل کی پتھرائی آنکھوں اور ادھ کھلے منہ والی لاش پڑی تھی۔ لاش کو وہاں سے نکالنا ناممکن ہو چکا تھا۔ فلیٹ میں دھواں بھرنے سے وہاں سانس لینا مشکل ہوگیا تھا۔ آگ کی شدت جہنم کا منظر پیش کر رہی تھی۔ کسی نے راہداری سے گزرتے ہوئے فائر بریگیڈ کو بھی

اطلاع کر دی تھی۔ فلیٹ میں اب کسی کا رکنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اس آسیب زدہ فلیٹ کی کھڑکیوں سے دھواں اٹھتا دیکھ کر، آگ۔ آگ۔ آگ کی انسانی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ عمارت کے متعدد مکین فائر بریگیڈ کو فون کرنے میں مصروف تھے۔

اس دوران جب عمارت نمبر ۳۰۲ کے گرد و نواح فائر بریگیڈ کی سرخ گاڑیوں کے دل دہلا دینے والے سائرن اور گھنٹیوں سے گونج رہے تھے، گلی میں کھڑے ہجوم کو پانچویں منزل کی کھڑکی سے خارج ہوتے دھوئیں میں چار ہیولے نظر آئے۔ ان میں تین سیاہ رنگ کے مردانہ اور ایک عریاں زنانہ ہیولا شامل تھا۔

باب ۲۸

فاگوٹ اور بیگیموت کی اختتامی مہم جوئیاں

یہ ہیولے درحقیقت دھوئیں کے مرغولوں میں موجود تھے یا پھر محض خوف سے ماؤف ذہنوں کی اختراع کا نتیجہ تھے، اس بات کا دوٹوک فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ اور اگر ان ہیولوں کا حقیقت میں کوئی وجود تھا بھی تو پھر یہ گئے کہاں؟ اس سوال کا جواب بھی کسی کے پاس نہیں تھا۔ یہ ہیولے کس مقام پر ایک دوسرے سے جدا ہوئے؟ یہ بھی ہم نہیں جانتے۔ ہاں ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ فلیٹ نمبر پچاس میں آگ لگنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد سالن کے بازار میں ایک مشہور سٹور کے آئینوں سے مزین دروازے کے قریب دھاری دار سوٹ میں ملبوس ایک دراز قد آدمی نمودار ہوا جس کے ساتھ ایک سیاہ رنگ کا جسیم بلا بھی تھا۔

یہ شخص آس پاس سے گزرنے والوں سے معذرت کرتا ہوا جونہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ایک دبلے پتلے ادھیڑ عمر تنگ مزاج دربان نے اس کا راستہ روک لیا اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کرخت آواز میں بولا۔

یہاں بلّوں کے ساتھ داخلہ ممنوع ہے۔

میں معذرت چاہتا ہوں۔ منمناتی آواز میں اس آدمی نے جواب دیا اور کمزور قوت سماعت والوں کی مانند کان پر ایک ہاتھ سے پیالہ بناتے ہوئے بولا۔ ''کیا کہا آپ نے؟ بلّوں کے ساتھ داخلہ ممنوع ہے؟ بلّا آپ کو کہاں نظر آ رہا ہے؟''

دربان کی آنکھیں حیرت سے باہر کو ابل آئیں کیونکہ دھاری دار سوٹ والے کے پاؤں میں کھڑا بلّا غائب ہو گیا تھا اور اس کی جگہ دھاری دار کوٹ کے عقب سے ایک درمیانے قد کا بھاری بھر کم آدمی جھانک رہا تھا۔ اس نے سر پر ایک پھٹی پرانی ٹوپی جما رکھی تھی اور اس کا چہرہ کسی حد تک بلّے سے مشابہت رکھتا تھا۔ اس نے اپنی دائیں بغل میں کیروسین لیمپ دبا رکھا تھا۔ دربان نے بادل ناخواستہ ان حضرات کا راستہ چھوڑ دیا لیکن یہ جوڑا اسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

ہمارے ہاں صرف غیر ملکی کرنسی چلتی ہے۔ دربان اپنی بھاری بھرکم بھنویں سکیڑتے ہوئے بولا۔

''میرے محترم!'' دراز قد شخص اپنی عینک کے شکستہ شیشے سے جھانکتا ہوا منمنایا۔ ''آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میرے پاس غیر ملکی کرنسی نہیں ہے؟ لباس دیکھ کر قیاس آرائی کر رہے ہو؟ اس طرح آپ غلطی بھی کر سکتے ہو، بلکہ بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر سکتے ہو۔ جاؤ اور سبق حاصل کرنے کے لئے اور کچھ نہیں تو مشہور زمانہ خلیفہ ہارون الرشید کی تاریخ ہی پڑھ لو۔ لیکن سردست اس عظیم خلیفہ سے معذرت کے ساتھ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی سٹور کے ڈائریکٹر سے آپ کی شکایت کروں گا اور آپ کے بارے میں ایسی ایسی باتیں بتاؤں گا کہ آپ کو اس خوبصورت آئینوں والے دروازے کی دربانی سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے''۔

''ہوسکتا ہے کہ میرا لمپ غیر ملکی کرنسی سے بھرا ہو''۔ دیر سے خاموش بلا نما موٹا شخص گفتگو میں دخل دیتے ہوئے بولا۔

ان دونوں کے عقب میں لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہو گیا تھا اور کچھ لوگ ناراضگی کا اظہار بھی کرنے لگے تھے۔

نفرت بھری نگاہوں سے گھورتے ہوئے دربان نے تکرار بند کر دی اور ہمارے جانے پہچانے فاگوٹ اور بہیموت سٹور کے اندر داخل ہو گئے۔

کچھ دیر ادھر ادھر جھانکنے کے بعد فاگوٹ نے سٹور کے مختلف شعبوں میں با آواز بلند اعلان کیا۔

''واہ کیا زبردست سٹور ہے! بہت ہی شاندار سٹور ہے!''

سٹور میں موجود گاہک حیرانی سے پلٹ پلٹ کر اعلان کرنے والے کی جانب دیکھنے لگ گئے۔ حالانکہ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی، یہ سٹور دیکھنے میں واقعی زبردست تھا۔

سٹور بیش قیمت رنگ برنگ کے زنانہ، مردانہ اور بچگانہ کپڑوں سے بھرا پڑا تھا۔ خریداروں کو متوجہ کرنے کے لئے جوتوں کے چھوٹے بڑے ڈبوں کے انبار لگائے جا رہے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھی پستہ قد خواتین نے اپنے دائیں پاؤں میں گھسے پٹے پرانے جوتے پہن رکھے تھے جبکہ بائیں پاؤں میں نئے چمچماتے جوتے پہن کر فرش پر بچھے غالیچے کو ٹھونک بجا رہی تھیں۔ کہیں دور سٹور کے ایک دوسرے حصے سے پیانو کے ساتھ گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

لیکن فاگوٹ اور بہیموت ان خوبصورت چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے کھانے پینے کی اشیا کے شعبے میں پہنچ گئے۔ سٹور کے اس شعبے میں خواتین کی دھکم پیل نسبتاً کم تھی۔

ایک چھوٹے قد کا کشادہ شانوں والا شخص جس نے نفاست سے شیو کر رکھی تھی، آنکھوں پر قیمتی چشمہ لگائے، سر پر سفید رنگ کا بالکل نیا ہیٹ سجائے، جامنی رنگ کا قیمتی اوور کوٹ پہنے اور ہاتھوں پر

بھورے رنگ کے خوبصورت دستانے چڑھائے، مچھلی کے سٹال پر کھڑا تحکمانہ انداز میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ایک نوجوان دوشیزہ سفید رنگ کا بے داغ اوورکوٹ اور سر پر نیلے رنگ کی ٹوپی پہنے اس گاہک کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ہاتھوں میں ایک تیز دھار چھری لئے مچھلی کی کھال صاف کر رہی تھی۔ یہ چھری اس چھری سے مشابہہ تھی جو میتھیو نے ڈبل روٹی کے سٹال سے چرائی تھی۔

''سٹور کا یہ حصہ بھی زبردست ہے''۔ فاگوٹ نے سرعام تسلیم کرتے ہوئے اعلان کیا۔ ''اور یہ غیرملکی''۔ وہ جامنی کوٹ والے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بہت مناسب شخصیت کا حامل لگ رہا ہے''۔

''نہیں، فاگوٹ نہیں''۔ سوچ میں ڈوبے بیکموت نے جواب میں کہا۔ ''میرے خیال میں اس کے چہرے پر کسی چیز کی کمی ہے''۔

جامنی کوٹ والے کی کمر میں کچھ لرزش محسوس ہوئی جو غالباً اتفاقیہ تھی کیونکہ فاگوٹ اور بیکموت کے درمیان روسی زبان میں ہونے والی گفتگو غالباً اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''اشی ہے؟'' جامنی کوٹ والے گاہک نے پوچھا

''بالکل تازہ۔ اعلیٰ معیار''۔ سٹال پر مامور خاتون نے مسکراتے ہوئے پرغرور انداز میں جواب دیا۔

''میں کو اشی پسند۔ نہ اشی نہ پسند''۔ غیرملکی گاہک جذبات سے عاری آنکھیں دوشیزہ پر جمائے بولا۔

''جی ہاں۔ جی ہاں''۔ لڑکی نے جواب دیا۔

ہمارے دونوں شناسا جامنی کوٹ والے غیرملکی میں مزید دلچسپی لینے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے اور اس کے قریب سے گزرتے ہوئے دوسرے سٹال پر پہنچ گئے جہاں قسم قسم کے مقامی اور درآمد شدہ پھل، چاکلیٹ اور ٹافیاں انتہائی مہارت کے ساتھ سجائی گئی تھیں۔

''آج بہت گرمی ہے''۔ فاگوٹ سٹال پر کھڑی گلابی رخساروں والی دوشیزہ سے مخاطب ہوا۔ لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ ''یہ سنگترے کس بھاؤ ہیں؟'' فاگوٹ نے پوچھا۔

''تمیں کوپک فی کلو''۔ جواب ملا

''یہاں تو ہر کوئی کاٹنے کو دوڑ رہا ہے''۔ لمبی آہ بھرتے ہوئے فاگوٹ بولا۔ قدرے توقف کے بعد اپنے ساتھی کو دعوت دیتے ہوئے اس نے کہا۔ ''کھاؤ بیکموت''۔

موٹے نے اپنا لیمپ بغل میں دبا لیا اور سنگتروں سے بنے ''اہرام'' کی چوٹی سے ایک سنگترہ اچک کر اسے چھلکے سمیت نگل گیا۔ اور فوراً ہی ایک دوسرا سنگترہ اٹھانے کے لئے جھپٹ پڑا۔

سٹال پر مامور لڑکی کا چہرہ حیرت اور غصے سے سفید پڑ گیا۔

آپ پاگل ہو گئے ہیں؟ اس نے چلا کر کہا۔ لائیں پیسے نکالیں! شدت جذبات میں ٹافیاں

اٹھانے والی چمٹی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔

میری جان! میری سوہنی! میری محترمہ! فاگوٹ سٹال کے اوپر سے پھلانگتا ہوا منمنایا اور شرارت بھری آنکھ مارنے کے بعد بولا۔''آج ہمارے پاس غیر ملکی کرنسی نہیں ہے لیکن پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ سوموار سے پہلے پہلے سارا قرض چکا دیا جائے گا۔ ہم نزدیک ہی ٹھہرے ہیں۔۔وسطی گلی میں جہاں آگ لگی ہے''۔

بیگیموت نے تیسرا سنگترہ ہڑپ کرنے کے بعد پنجہ چاکلیٹ کے ڈھیر میں گھسیڑ دیا اور اس پہاڑی کے سب سے نیچے والے حصے سے ایک چاکلیٹ نکالنے کے بعد اسے سنہری پنّی اتارے بغیر ہی نگل گیا۔ چاکلیٹ کی قرینے سے سجائی گئی پہاڑی بکھر کر فرش پر آن گری۔

مچھلی کے سٹال پر تعینات خواتین ہاتھوں میں چھریاں پکڑے پتھر کے مجسموں کی مانند ساکت ہوگئیں۔ جامنی کوٹ والے غیر ملکی نے پلٹ کر ان بدمعاشوں کی جانب دیکھا تو معلوم ہوا کہ بیگیموت کا اندازہ بالکل غلط تھا۔ غیر ملکی کے چہرے پر کسی چیز کی کمی نہیں بلکہ کچھ زیادتی تھی۔۔اس کے لٹکتے رخسار اور پھیلی ہوئی آنکھیں۔

سٹال پر کھڑی لڑکی کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ اپنا سارا زور لگاتے ہوئے چلائی۔

پولیس! پولیس!

سٹور کے باقی ماندہ سٹالوں سے بھی لوگ اس جانب متوجہ ہوگئے تھے۔ یہ تماشا دیکھنے کے لئے کھانے پینے کی اشیا کے شعبے میں گاہکوں کا ہجوم جمع ہونا شروع ہوگیا۔ اس دوران بیگیموت چاکلیٹ کا سٹال چھوڑ کر مچھلی کے سٹال پر پہنچ گیا۔ ایک ڈرم میں پنجہ ڈالنے کے بعد اس نے ایک تازہ مچھلی نکال لی جسے منہ میں ڈالنے کے چند لمحوں بعد اُس نے کانٹے اور مچھلی کی دم باہر کو اگل دی۔

چاکلیٹ کے سٹال سے دوبارہ چیخ گونجی۔''پولیس! پولیس!'' اور مچھلی کے سٹال پر کھڑی ایک خاتون نجانے کیوں ہسپانوی زبان میں بولی۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو، بدذات؟''

پاول یوسفی تقریباً دوڑتا ہوا جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ اس گٹھے ہوئے جسم کے خوش شکل آدمی نے سرجن کی مانند سفید رنگ کا اوورآل پہن رکھا تھا۔ پاول غالباً ایک انتہائی جہاندیدہ شخص تھا۔ بیگیموت کے منہ میں تیسری مچھلی کی دم دیکھتے ہی وہ حالات کو بھانپ گیا تھا اور ان بدمعاشوں سے الجھنے کی بجائے اس نے عملے کو فوراً پولیس طلب کرنے کا حکم دیا۔ لوگوں کے ہجوم نے ان ملعونوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ فاگوٹ نے ہجوم کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر کرنے کی ٹھان لی۔

''خواتین وحضرات!'' وہ منمناتی مگر بلند آواز میں بولنے لگ گیا۔

آخر یہ کیا ہورہا ہے؟ ہیں؟ میں آپ لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک غریب آدمی''۔ اس نے رقت آمیز لہجے میں بیگیموت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''جو صبح سے اپنی تمام توجہ کیروسین لیمپ کی مرمت پر مبذول کیے ہوئے ہے اور بھوک سے قریب المرگ ہے اب وہ بھلا غیر ملکی کرنسی کہاں سے لائے گا؟''

پاول یوسفی جو بالعموم انتہائی متحمل مزاج رہتا تھا، فاگوٹ کی یہ بات سن کر بھڑک اٹھا اور چیختے ہوئے بولا۔

''تم اپنی یہ شعبدہ بازی بند کرو! تمہاری طبیعت ابھی تھوڑی دیر میں ٹھیک کر دی جائے گی''۔ لیکن فاگوٹ پر پاول کی ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے تھا۔

میں پوچھتا ہوں، میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ اس کا بھوک اور پیاس سے برا حال ہوگیا ہے۔ وہ گرمی اور بھوک سے قریب المرگ ہے۔ اس نے ایک سنگترہ اٹھا کر منہ میں کیا ڈال لیا کہ اتنا بڑا طوفان کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس کی زندگی کے مقابلے میں بھلا اس سنگترے کی کیا قیمت ہے۔ اتنی معمولی سی بات پر پولیس کو آوازیں دی جارہی ہیں، سیٹیاں بجا بجا کر پولیس والوں کی توجہ ان کے اصل فرائض سے ہٹائی جارہی ہے۔ اور اس کو ہر بات کی اجازت ہے؟'' اس نے چہرے پر کرختگی طاری کرتے ہوئے جامنی کوٹ والے غیر ملکی کی جانب اشارہ کیا ''کون ہے وہ؟ کہاں سے آیا ہے وہ؟ کیوں آیا ہے وہ؟ ہم کیا اس کے بغیر اداس ہوگئے تھے؟ ہم نے کب اسے دعوت دی تھی؟ جی ہاں! وہ تمسخرانہ انداز میں ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ ''اس نے قیمتی جامنی کوٹ پہن رکھا ہے اور مچھلی ٹھونس ٹھونس کر پھول گیا ہے۔ اس کی جیبیں غیر ملکی کرنسی سے بھری پڑی ہیں اور ہم غریبوں کو۔ ہم غریبوں کو!'' وہ پرزور طریقے سے اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ''کیا کروں میں؟ کیا کروں؟ میرا ایک ایک مسام زہر اگل رہا ہے''۔

اس بے معنی، بے وقوفانہ اور شائید سیاسی طور پر خطرناک تقریر نے پاول کو سخت مشتعل کر دیا۔ اس کے برعکس ہجوم میں کھڑے بہت سے لوگوں کی آنکھوں سے ہمدردی کے جذبات جھلکنے لگے تھے۔ بیگیموت نے اپنی بوسیدہ آستین سے آنکھ ملتے ہوئے انتہائی دلگیر لہجے میں کہا۔

شکریہ میرے وفادار دوست! ایک مفلس اور بھوکے کا ساتھ دینے کا شکریہ۔

یہ سنتے ہی ایک عمر رسیدہ شخص جس نے کچھ دیر قبل دو پیسٹریاں خریدی تھیں، یکا یک ایک مختلف شخصیت دکھنے لگ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے لپکتے شعلے کسی خونیں جنگ کے آغاز کا عندیہ دے رہے تھے۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا، چہرے پر تنی خون کی رگیں نمایاں ہوگئیں۔ اس نے پیسٹریاں زمین پر دے ماریں اور چیخ کر بولا۔

''بالکل ٹھیک!'' اور اس نے وہ ٹرے جس پر چاکلیٹ سے ایفل ٹاور بنا تھا گھسیٹ لی اور زوردار آواز کے ساتھ زمین پر پٹخ دی اور قریب کھڑے جامنی کوٹ والے غیر ملکی کا ہیٹ نوچ لینے کے بعد اس کی ناک پر ایک زوردار مکہ جڑ دیا۔ غیر ملکی ایک زوردار آواز کے ساتھ مچھلی اور نمکین پانی کے ٹب میں جا گرا۔ پھر اچانک ایک معجزہ رونما ہوگیا۔ کچھ دیر قبل ٹوٹی پھوٹی روسی بولنے والا غیر ملکی اہل زبان کی مانند چلا اٹھا۔

''یہ قتل کرنا چاہتے ہیں مجھے! پولیس، پولیس! بچاؤ، بچاؤ مجھے ان بدمعاشوں سے!'' غالباً شدید ذہنی صدمے کے نتیجے میں غیر ملکی جو تھوڑی دیر پہلے مقامی زبان سے نابلد دکھائی دے رہا تھا اب اچانک اس زبان سے شناسا ہوگیا تھا۔

اس دوران سٹور کے صدر دروازے سے دو پولیس اہلکار نمودار ہوئے جو ہجوم میں راستہ بنانے میں مصروف تھے۔ بلّے نے انہیں دیکھتے ہی فروٹ اور چاکلیٹ کے سٹالوں پر اپنے لیمپ سے مٹی کے تیل کا چھڑکاؤ کر دیا جس نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ آگ نے سٹور کے اس تمام حصے کو آناً فاناً اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سٹالوں پر کام کرنے والے عملے نے بیرونی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ جامنی کوٹ والا بصد مشکل مچھلی والے ٹب سے جان چھڑانے میں کامیاب ہوا اور اپنے نمکین پانی میں نچڑے کپڑوں سے بوندیں ٹپکاتا دوکانداروں کی تقلید میں بھاگ کھڑا ہوا۔ گاہکوں کا ہجوم پاول یوسفی کو روندتے ہوئے بیرونی دروازوں کی طرف لپک پڑا۔ افراتفری کے اس عالم میں بیرونی دروازوں کے شیشے ٹوٹنے کی آوازیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

اس ہڑبونگ میں وہ دونوں بدمعاش۔ فاگوٹ اور پیٹو بیگموت نجانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ کچھ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ وہ دونوں ملعون غالباً اوپر کی جانب اڑ گئے تھے اور چھت سے ٹکرانے کے بعد غباروں کی مانند پھٹ گئے تھے۔ یہ بات کچھ مہمل سی معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت کیا تھی، کہنا مشکل ہے۔ بہرحال جو بات ہم نہیں جانتے اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ ہاں ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ سٹور میں آگ لگنے کے ٹھیک ایک منٹ بعد فاگوٹ اور بیگموت باہر سڑک پر گیری باد کی عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ فاگوٹ نے عمارت کی ایک کھڑکی سے جھانکا تو بے ساختہ بول اٹھا۔

''ارے واہ! یہ تو پریس کلب کی عمارت ہے۔ جانتے ہو بیگموت میں نے اس عمارت کے متعلق دل کش کہانیاں سن رکھی ہیں۔ میرے دوست اس عمارت کو اچھی طرح دیکھ لو۔ یہ سوچ کر ہی دل کھل اٹھا ہے کہ اس کی چھت کے نیچے اعلیٰ لیاقت والے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے''۔

''ارے واہ! یہ تو بہت زبردست عمارت ہے''۔ بیگموت بولا اور عمارت کا اندرونی حصہ دیکھنے کے شوق میں کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ بیٹھا۔

صرف چند سطور پڑھتے ہی بغیر کسی شناختی کارڈ کے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کا واسطہ لکھاری سے پڑا ہے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اس کے پاس کبھی کوئی شناختی کارڈ تھا ہی نہیں! تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے بیگیموت کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

پنجے جوڑ کر گواہی دیتا ہوں کہ نہیں تھا دستوویسکی کے پاس شناختی کارڈ۔ بیگیموت واقعی پنجے جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

آپ دستوویسکی تو نہیں ہو نا۔ خاتون نے تمسخرانہ انداز میں فاگوٹ سے کہا۔

ہو بھی سکتا ہے۔ ہو بھی سکتا ہے۔ بیگیموت بولا

نہیں ہو سکتا۔ دستوویسکی تو کب کا مر چکا ہے۔ خاتون کی اس سے قبل نمایاں طور پر جھلکنے والی خود اعتمادی کچھ متزلزل ہوتی نظر آ رہی تھی۔

میں احتجاج کرتا ہوں۔ بیگیموت مشتعل ہو کر بولا۔ دستوویسکی کبھی نہیں مر سکتا۔ وہ تو لازوال ہے۔

شناختی کارڈ پلیز۔ خاتون بیگیموت کا احتجاج نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

معاف کیجئے گا۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ فاگوٹ اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ شناختی کارڈ تو اہل ادب کی پہچان نہیں ہوا کرتا! وہ تو اپنی تصانیف سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ میرے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی ہے یا پھر اس کے ذہن میں؟ اس نے بیگیموت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس کے سر کی ٹوپی کھینچ لی تاکہ خاتون بیگیموت کے سر کا بہتر طور پر مشاہدہ کر سکے۔

دوسروں کا راستہ تو بند نہ کریں! خاتون جھنجھلا کر بولی۔

فاگوٹ اور بیگیموت نے پیچھے کھڑے ادیب کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ اس ادیب نے جیر ثائی کے سلیٹی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی سفید قمیض کے اوپر والے دو بٹن کھلے تھے اور کالر کوٹ سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ادیب نے بغل میں اخبار دبا رکھا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے خاتون کے ساتھ استقبالیہ کلمات کا تبادلہ کیا اور میز پر رکھے رجسٹر میں کچھ درج کرنے کے بعد برآمدے کے اندر داخل ہو گیا۔

آہ! ہمارے نصیب میں نہیں ہے۔ فاگوٹ سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ جس یخ بیئر کے گلاس کی آس میں ہم یہاں آئے تھے وہ غالباً اس اخبار والے کی قسمت میں لکھا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ ہمارے ستارے آج گردش میں ہیں۔

بیگیموت مایوسی کے عالم میں ہاتھ ہوا میں ہلا کر رہ گیا۔ اس نے فاگوٹ سے ٹوپی واپس لے کر اپنے بلّیوں کے مانند گول مٹول سیاہ بالوں سے اٹے سر پر دوبارہ سجالی۔

اتنے میں اچانک ایک دھیمی لیکن تحکمانہ آواز گونجی۔

صوفیہ! آنے دو مہمانوں کو۔ انہیں اندر آنے دو۔

سٹول پر بیٹھی خاتون دیدے پھاڑ پھاڑ کر بولنے والے کو دیکھنے لگ گئی۔ جبکہ اس شخص نے چہرے پر استقبالیہ مسکراہٹ سجائے ان بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس مہمانوں کی جانب دیکھتے ہوئے انہیں اندر آنے کی دعوت دی۔ یہ آرچی بالڈ نامی شخص ریستوران کا ڈائریکٹر تھا۔ صوفیہ نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فاگوٹ سے پوچھا۔

کیا نام ہے آپ کا؟

پاناَئف۔ فاگوٹ نے جواب دیا۔ خاتون نے رجسٹر میں یہ نام درج کیا اور سوالیہ نگاہوں سے بیگیموت کی جانب دیکھنے لگ گئی۔

سکاآئچ۔ نہ جانے کیوں بیگیموت نے لیمپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

صوفیہ نے یہ نام بھی درج کرلیا اور دستخط کرنے کے لئے رجسٹر مہمانوں کی جانب بڑھا دیا۔ فاگوٹ نے پاناَئف کے سامنے سکاآئچ لکھ دیا جبکہ بیگیموت نے سکاآئچ کے سامنے پاناَئف۔ صوفیہ کو مزید حیرت میں مبتلا کرتے ہوئے آرچی ان غیر معمولی ہیئت کے حامل مہمانوں کو ریستوران کی سب سے اعلیٰ میز پر لے گیا۔ اس کے اشارے پر دو بیرے فوراً میز کی جانب لپکے اور انہوں نے میز پر پڑی چادر کی جگہ بے داغ اجلا میز پوش بچھا دیا۔ آرچی نے بنفس نفیس کرسیاں مہمانوں کو پیش کیں۔ بیگیموت نے اپنا لیمپ کرسی کے پائے کے نزدیک رکھ دیا۔ آرچی قدرے جھک کر سرگوشی میں فاگوٹ سے بولا۔

آپ کی خدمت میں کیا پیش کروں؟ میرے پاس خاص مہمانوں کے لئے عمدہ ترین ٹراؤٹ موجود ہے۔ اعلیٰ ترین افسروں کی پارٹی کے لئے منگوائی تھی۔ حاضر کروں؟

آپ ہمیں جو جی میں آئے منگوا دیجئے۔ فاگوٹ میز کے نیچے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

سمجھ گیا۔ سب سمجھ گیا۔ آرچی معنی خیز انداز میں آنکھیں نچاتا ہوا بولا۔

ان مشکوک قسم کے مہمانوں کی طرف اپنے باس کا رویہ دیکھ کر بیروں کی دوڑیں لگ گئیں۔ بیگیموت کو جیب سے ایک ادھ جلے سگریٹ کا ٹکڑا نکالتے دیکھ کر ایک بیرا پھرتی کے ساتھ ماچس کی ڈبیا سے دیا سلائی نکال کر اس کے قریب آ پہنچا۔ ایک دوسرا بیرا ٹرے پر کرسٹل کے گلاس اور چینی کے چمچماتے برتن سجائے مہمانوں کی جانب لپک پڑا۔

سرخ مچھلی کے کباب پیش کرنے جا رہا ہوں۔ آرچی نے کسی خاص سُر میں گنگناتے ہوئے اعلان کیا۔ دھاری دار سوٹ والا سر ہلا ہلا کر ریستوران کے ڈائریکٹر کی مہمان نوازی پر اپنی طمانیت کا اظہار کر رہا تھا اور چہرے پر مدبرانہ تاثرات طاری کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف اپنی عینک کے ٹوٹے

ہوئے شیشے سے آرچی کو بلا مقصد گھورتا جارہا تھا۔

قریبی میز پر مشہور افسانہ نویس پیتراک اپنی اہلیہ کے ہمراہ کھانا کھا رہا تھا۔ عمومی ادیبوں کی مانند مشاہدے کی باریک بینی سے لبریز پیتراک، آرچی کو ان غیر معمولی ہیئت کے حامل مہمانوں کے نخرے اٹھاتے دیکھ کر شدید حیران ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی جو اپنی ذات میں اعلیٰ درجے کی نستعلیق خاتون تھی اس صورت حال سے کچھ حسد محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے عملے کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لئے چمچ سے میز کو بجایا اور خفگی کے ساتھ اعلان کیا کہ آئس کریم لانے میں تاخیر کیوں کی جارہی ہے؟ کہاں ہیں سب لوگ؟

آرچی نے مسکراتے ہوئے پیتراک کی بیوی کی جانب دیکھا اور فوراً ہی ایک بیرے کو اس کی میز پر بھیج دیا۔ لیکن خود اپنے مہمانوں کے گرد ہی منڈلاتا رہا۔ آرچی انتہائی عقلمند آدمی تھا اور مشاہدے کی باریک بینی میں تو غالباً ادیبوں سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ اس نے ورائٹی تھیٹر میں ہونے والے واقعات کے متعلق سن رکھا تھا اور اس نے دوسرے لوگوں کی طرح نہ تو لفظ ''دھاری دار'' اور نہ ہی لفظ ''بِلّا'' نظر انداز کئے تھے۔ ان ملعونوں پر نظر پڑتے ہی اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے مہمان کون ہیں۔ اسی لئے وہ انہیں صوفیہ کے ساتھ بحث مباحثے سے بچانے کے لئے خود وہاں پہنچ گیا تھا۔ ان کی آؤ بھگت بھی وہ ان کی اصلیت سے واقف ہونے کی وجہ سے کر رہا تھا۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ کسی وقت صوفیہ کو بھی دماغ سے مستفید ہونے کا گر سکھانا پڑے گا۔

پیتراک کی بیوی اپنے سامنے پڑے آئس کریم کے کپ میں بے مقصد چمچ چلاتے ہوئے حقارت بھری نگاہیں شیطانی چیلوں کی میز پر مرکوز کئے بیٹھی تھی جس پر نت نئے لوازمات سجائے جارہے تھے۔ تین مختلف اقسام کا سلاد، دو قسم کی مچھلی اور ایک الگ سے مہیا کی گئی میز پر سلور رنگ کی بالٹی رکھی تھی۔ بالٹی سے اعلیٰ درجے کی شیمپین کی بوتل جھانک رہی تھی۔

یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ مہمانوں کی تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی آرچی عین اس وقت وہاں سے چلا گیا جب ایک بیرا بھاپ اگلتا فرائنگ پین اٹھائے میز کے پاس پہنچا۔ جانے سے قبل آرچی نے مہمانوں کو اکیلا چھوڑنے کی معذرت چاہی کیونکہ وہ خود مچھلی کے کبابوں کی تیاری کی نگرانی کرنے جارہا تھا۔

مہمانوں سے الگ ہونے کے بعد آرچی باورچی خانے کی بجائے سیدھا سٹور روم میں جا گھسا۔ دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے دو بڑے بڑے خشک گوشت کے پیکٹ اخبار میں لپیٹے اور انہیں ڈوری سے اچھی طرح باندھنے کے بعد احتیاط سے ایک میز پر رکھ دیا۔ سٹور سے ملحقہ کمرے میں جھانک کر اپنے اوورکوٹ اور ہیٹ کی موجودگی کا اطمینان کرنے کے بعد وہ باورچی خانے میں چلا گیا جہاں بڑے جوش و جذبے کے ساتھ مچھلی کباب تیار کئے جارہے تھے۔

آرچی کی نقل و حرکت بظاہر بے معنی لگتی تھی، لیکن ان بن بلائے مہمانوں کے بارے میں سنی گئی کہانیاں اور آرچی کی اپنی چھٹی حس اس بات کی جانب اشارہ کر رہی تھی کہ ان شیطانی شخصیات کا کھانا زیادہ دیر تک جاری نہیں رہے گا۔ آرچی کی چھٹی حس نے اسے آج تک دھوکہ نہیں دیا تھا۔

اس دوران جب فاگوٹ اور بیگیموت دوسری مرتبہ ووڈکا سے بھرے جام بلند کر رہے تھے برآمدے سے پسینے میں شرابور اور شدید بے چینی میں گرفتار مشہور اخباری رپورٹر بوبا نمودار ہوا۔ بوبا کو اخباری حلقوں میں اپنی پیشہ ورانہ اہلیت اور فرض شناسی کی بنا پر خاص مقام حاصل تھا۔ وہ ہانپتا ہوا افسانہ نویس پیتراک کی میز پر آ بیٹھا اور اس کے کان کے پاس سرگوشی کرتے ہوئے کوئی پراسرار کہانی سنانے لگ گیا۔ پیتراک کی پرتجسس بیوی نے بھی اپنا دائیاں کان بوبا کے موٹے لبوں سے تقریباً چپکا دیا۔ بوبا بے چینی کے عالم میں بار بار نظریں دائیں بائیں دوڑاتا ہوا اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ اس کی سرگوشیوں کے باوجود کچھ الفاظ نزدیک بیٹھے لوگوں کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ یہ الفاظ کچھ یوں تھے:

میں حلفیہ کہہ رہا ہوں ۔۔شہر کی وسطی گلی میں ۔۔۔ گولیاں بغیر چھوئے ۔۔۔۔ گولیاں۔ گولیاں۔ نہ خون۔ نہ چیخیں۔ گولیاں۔ گولیاں۔ مٹی کا تیل۔ آگ۔ گولیاں ۔۔۔۔

ایسی جھوٹی خبریں پھیلانے والے بے شرم لوگوں کو تو۔۔۔ قدرے بلند آواز میں پیتراک کی بیوی بولی۔ کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔ دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا! یہ وطن دشمن لوگ زود یا بدیر قانون کی گرفت میں ہوں گے۔

کیسا جھوٹ؟ کیسی افواہیں؟ بوبا ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میں تو آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔ گولیاں ان پر اثر نہیں کرتیں۔ فلیٹ میں ہولناک آگ ۔۔ اور وہ ہوا میں اڑ گئے ۔۔ ہوا میں ۔۔۔ مشتعل بوبا اب بلند آواز میں بول رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جن شیطانوں کی خرمستیاں وہ بیان کر رہا تھا وہ قریبی میز پر بیٹھے اس کی کہانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تاہم ان کا یہ لطف اٹھانا کچھ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ ریستوران کے ہنگامی دروازے سے چمڑے کی پیٹیوں میں جکڑے یونیفارم میں ملبوس تین ایک جیسے تنومند اشخاص اندر داخل ہوگئے۔ ان کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے لمبی نالیوں والے پستول تھے۔ ان میں سے ایک نے دہلا دینے والی زوردار آواز میں کہا۔

کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے! تینوں نے فاگوٹ اور بیگیموت کے سروں کا نشانہ لے کر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ دونوں شیطانی چیلے فوراً ہی ہوا میں تحلیل ہوگئے۔ بیگیموت کے کیروسین لیمپ سے نکلنے والے شعلے نے آناً فاناً پورے ریستوران کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے سیاہ کناروں والا ایک کشادہ دہانہ لپک کر چھت تک جا پہنچا ہے۔ اس سے سنہرے رنگ کی لہریں خارج ہو رہی تھیں جو تمام

عمارت میں سرائیت کرتی جارہی تھیں۔ دوسری منزل پر ایڈیٹر کے کمرے میں مسودوں کی فائلیں جمع تھیں۔ ان فائلوں میں اس طرح آگ بھڑک اٹھی کہ جیسے کسی نے ان پر پٹرول چھڑک دیا ہے۔ کھڑکیوں پر آویزاں دبیز پردے بھی دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ آگ کے شعلوں سے ایسی گونج سنائی دے رہی تھی کہ جیسے کوئی دھونکنی سے انہیں ہوا دے رہا ہے۔

عمارت کے باغیچے کی پگڈنڈیوں پر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ریستوران میں نامکمل کھانا چھوڑ کر بھاگنے والے ادیب، شاعر، اخباری رپورٹر، بیرے، صوفیہ، بوبا، پیتراک اور اس کی بیوی سبھی اپنی جانیں بچانے کے لئے بگٹٹ بھاگے جارہے تھے۔

ریستوران کے بغلی دروازے سے بروقت برآمد ہونے والا آرچی اپنا گرم اوورکوٹ پہنے، بغل میں خشک گوشت کے دو پیکٹ دبائے خراماں خراماں چلا جارہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی تشویش یا ملال نہیں تھا۔ اس کی چال بھی معمول کے مطابق تھی۔

یہ گیری باد کی عمارت جل رہی ہے، میرے آقا۔ عزازیل نے بتایا

اس کا مطلب یہ ہوا کہ فاگوٹ اور بیگیموت کی کبھی جدا نہ ہونے والی جوڑی اس عمارت کو عزت بخش چکی ہے۔

جی، بے شک! ایسا ہی ہے میرے آقا۔

بالکونی میں دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ اور وہ دونوں، یعنی شیطان اور اس کا چیلا، عمارتوں کے مغربی حصے کی بالائی منازل کی کھڑکیوں کے شیشوں میں غروب ہوتے سورج کا آنکھوں کو چندھیا دینے والا عکس دیکھنے میں مصروف تھے۔ ولاند کی ایک آنکھ میں بھی ان کھڑکیوں کی مانند ایک الاؤ روشن تھا۔ حالانکہ اس نے سورج کی جانب پشت کر رکھی تھی۔

اچانک کسی چیز نے ولاند کی شہر پر مرکوز توجہ کو منتشر کر دیا اور اسے پلٹ کر اس گول مینار کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا جو عمارت کی چھت پر نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اس مینار کی دیوار سے ایک خستہ حال، کیچڑ میں لت پت، ہاتھوں سے بنی سینڈل پہنے، چیتھڑوں میں ملبوس نیم عریاں داڑھی والا شخص برآمد ہوا۔

آں ہاں! ولاند شانے اچکاتا حیرانگی کے عالم میں نووارد پر ٹکٹکی لگائے بولا۔ غیر متوقع! بالکل غیر متوقع! تمہاری آمد کا تو میں یقینی طور پر کسی صورت بھی منتظر نہیں تھا۔ بہر حال بن بلائے مہمان! بولو تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟

اے برائیوں اور سایوں کے سلطان! میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ نووارد نے زہر آلود لہجے میں جواب دیا۔

اچھا، قدیم زمانے کے بھکاری میتھیو! اگر تو میرے پاس آ ہی گیا ہے تو مجھ سے علیک سلیک کیوں نہیں کی؟ ولاند نے ناراضگی سے جواب دیا۔

مجھے تجھ جیسے ملعون سے علیک سلیک کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔

لیکن تجھے میرے وجود کی حقیقت کو تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ جواب دیتے وقت ولاند کا چہرہ نجانے کیوں کچھ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ تمہارا یہاں آنا ہی درحقیقت میرے وجود کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ تمہارے بولنے کے انداز سے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم برائی اور سایوں کے وجود کو مانتے ہی نہیں ہو۔ ذرا عقل کے ناخن لو اور سوچو کہ اگر برائی نہ ہوتی تو تمہاری نیکی کس کام کی تھی۔ اگر سائے غائب ہو جائیں تو یہ زمین کیسی نظر آئے گی؟ کسی بھی سائے کے معرض وجود میں آنے کے لئے انسانوں، دیگر جانداروں اور دوسری چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ وہ دیکھو میری تلوار کا سایہ ہے۔ اسی طرح درختوں اور جانوروں کا بھی سایہ ہوتا ہے۔ تم تو روشنی کی حکمرانی قائم کرنے کے جنون میں جانداروں سمیت تمام موجودات کو صفحہ ہستی

آرچی کی نقل و حرکت بظاہر بے معنی لگتی تھی لیکن ان بن بلائے مہمانوں کے بارے میں سنی گئی کہانیاں اور آرچی کی اپنی چھٹی حس اس بات کی جانب اشارہ کر رہی تھی کہ ان شیطانی شخصیات کا کھانا زیادہ دیر تک جاری نہیں رہے گا۔ آرچی کی چھٹی حس نے اسے آج تک دھوکہ نہیں دیا تھا۔

اس دوران جب فاگوٹ اور بیگیموت دوسری مرتبہ ووڈکا سے بھرے جام بلند کر رہے تھے برآمدے سے پسینے میں شرابور اور شدید بے چینی میں گرفتار مشہور اخباری رپورٹر بوبا نمودار ہوا۔ بوبا کو اخباری حلقوں میں اپنی پیشہ ورانہ اہلیت اور فرض شناسی کی بنا پر خاص مقام حاصل تھا۔ وہ ہانپتا ہوا افسانہ نویس پیتراک کی میز پر آ بیٹھا اور اس کے کان کے پاس سرگوشی کرتے ہوئے کوئی پراسرار کہانی سنانے لگ گیا۔ پیتراک کی پرتجسس بیوی نے بھی اپنا دائیاں کان بوبا کے موٹے لبوں سے تقریباً چپکا دیا۔ بوبا بے چینی کے عالم میں بار بار نظریں دائیں بائیں دوڑاتا ہوا اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ اس کی سرگوشیوں کے باوجود کچھ الفاظ نزدیک بیٹھے لوگوں کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ یہ الفاظ کچھ یوں تھے:

میں حلفیہ کہہ رہا ہوں ۔۔شہر کی وسطی گلی میں ۔۔۔ گولیاں بغیر چھوئے ۔۔۔۔ گولیاں۔ گولیاں۔ نہ خون۔ نہ چیخیں۔ گولیاں۔ گولیاں۔ مٹی کا تیل۔ آگ۔ گولیاں۔۔۔

ایسی جھوٹی خبریں پھیلانے والے بے شرم لوگوں کو تو۔۔۔ قدرے بلند آواز میں پیتراک کی بیوی بولی۔ کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔ دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا! یہ وطن دشمن لوگ زود یا بدیر قانون کی گرفت میں ہوں گے۔

کیسا جھوٹ؟ کیسی افواہیں؟ بوبا ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میں تو آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔ گولیاں ان پر اثر نہیں کرتیں۔ فلیٹ میں ہولناک آگ۔۔۔ اور وہ ہوا میں اڑ گئے۔۔۔ ہوا میں۔۔۔ مشتعل بوبا اب بلند آواز میں بول رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جن شیطانوں کی خرمستیاں وہ بیان کر رہا تھا وہ قریبی میز پر بیٹھے اس کی کہانی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تاہم ان کا یہ لطف اڑانا کچھ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ ریستوران کے ہنگامی دروازے سے چمڑے کی پیٹیوں میں جکڑے یونیفارم میں ملبوس تین ایک جیسے تنومند اشخاص اندر داخل ہوگئے۔ ان کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے لمبی نالیوں والے پستول تھے۔ ان میں سے ایک نے دہلا دینے والی زوردار آواز میں کہا۔

کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے! تینوں نے فاگوٹ اور بیگیموت کے سروں کا نشانہ لے کر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ دونوں شیطانی چیلے فوراً ہی ہوا میں تحلیل ہوگئے۔ بیگیموت کے کیروسین لیمپ سے نکلنے والے شعلے نے آناً فاناً پورے ریستوران کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے سیاہ کناروں والا ایک کشادہ دہانہ لپک کر چھت تک جا پہنچا ہے۔ اس سے سنہرے رنگ کی لہریں خارج ہو رہی تھیں جو تمام

فاگوٹ اور بیگیموت چہکتے ہوئے نمودار ہوئے۔ بیگیموت نے اب کیروسین لیمپ کی جگہ بغل میں سنہری فریم والی پینٹنگ دبا رکھی تھی اور کاندھوں پر ایک ادھ جلا باورچیوں والا کوٹ لٹکا رکھا تھا جبکہ ایک ہاتھ میں وہ مچھلی پکڑے ہوئے تھا۔ فاگوٹ اور بیگیموت سے جھلسنے کی بدبو آ رہی تھی۔ بیگیموت کا چہرہ راکھ سے آلودہ تھا۔ اس کی ٹوپی بھی کافی حد تک جل چکی تھی۔

سلیوٹ میرے آقا! فاگوٹ اور بیگیموت نے یک زبان نعرہ بلند کیا۔

کیا خوب حلیہ ہے! وولاند نے کہا

میرے آقا ذرا اندازہ کریں۔ بیگیموت طنزیہ انداز میں بولا۔ مجھے لٹیرا سمجھ لیا گیا تھا۔

تمہاری ہیئت اور تمہارے اوپر لدا سامان دیکھ کر یقیناً تمہیں لٹیرا ہی کہا جا سکتا ہے۔ وولاند بولا۔

یقین کیجئے میرے آقا۔۔۔۔۔ اپنے دفاع میں بیگیموت نے بولنا چاہا۔

نہیں کرتا میں یقین۔ وولاند نے اس کی بات کاٹتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

میرے آقا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنے تئیں ہر چیز کو بچانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن بدقسمتی سے یہی کچھ ہے جو میں بچا سکا ہوں۔

اچھا یہ بتاؤ کہ گیری باد میں آگ کیسے لگی؟ وولاند نے پوچھا۔

فاگوٹ اور بیگیموت نے شانے اچکا دیئے اور نگاہیں آسمان کی جانب اٹھا لیں۔ تاہم بیگیموت نے چلاتے ہوئے کہا۔ میری سمجھ سے تو باہر ہے! ہم پرامن طریقے سے خاموش بیٹھے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔۔۔۔۔۔

اور اچانک تڑاخ! تڑاخ!! فاگوٹ نے لقمہ دیا۔ فائرنگ! اندھا دھند گولیاں۔ میں اور بیگیموت خوف زدہ کیفیت میں دوسرے لوگوں کے ساتھ عمارت سے باہر دوڑ نکلے تھے۔

لیکن فرض شناسی۔ بیگیموت بولا۔ اس شرمناک خوف پر غالب آ گئی اور ہم واپس لوٹ آئے۔

اچھا تو تم واپس لوٹ آئے تھے۔ وولاند بولا۔ اور تب تک عمارت یقیناً مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں آ چکی ہو گی۔

مکمل طور پر! غمناک لہجے میں فاگوٹ نے تصدیق کی۔ میرا مطلب ہے میرے آقا۔ کہ آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔ مکمل طور پر! شعلے ہی شعلے!

میں نے تو پوری کوشش کی۔ بیگیموت بولا۔ کہ ستونوں سے آراستہ میٹنگ ہال میں کچھ نہ کچھ بچا لوں۔ اوہ میرے آقا! یوں سمجھ لیجئے کہ میری بیوی نے اس دوران کم از کم بیس مرتبہ بیوہ ہونے کا خطرہ مول لیا ہوگا! لیکن میری خوش نصیبی کہ میں غیر شادی شدہ ہوں اور ویسے خوش قسمت ہی تو ہوں کہ اب تک غیر

باب ۲۹

ماسٹر اور مارگریٹا کی تقدیر

غروب آفتاب کے وقت ماسکو کی تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل تعمیر کردہ خوبصورت ترین عمارت کی بالکونی میں دو آدمی موجود تھے۔ ولاند اور عزازیل۔ گلی سے گزرنے والوں کی نظروں سے وہ اوجھل تھے۔ بالکونی پر بڑے بڑے پھولوں سے لدے گملوں نے انہیں اپنے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ تاہم انہیں شہر کے مضافات تک پھیلے تمام علاقے بخوبی دکھائی دے رہے تھے۔

ولاند اپنے عمومی سیاہ لبادے میں ملبوس ایک سٹول پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی چوڑے بلیڈ والی لمبی تلوار بالکونی کی دوسلوں کے درمیان خالی جگہ پر عمودی حالت میں اس طرح پھنسا رکھی تھی کہ دور سے اس پر شمسی گھڑی کا گمان ہوتا تھا۔ تلوار کا سایہ بتدریج طویل ہوتا جارہا تھا اور آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا شیطان کے جوتوں تک پہنچ گیا تھا۔ ولاند اپنی نوکیلی ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹکائے شہر کے محلات، چھوٹی بڑی عمارتوں اور جھونپڑی نما خستہ حال گھروں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ عزازیل نے اپنا جدید طرز کا لباس یعنی کوٹ، پتلون اور چمڑے کے نوکدار جوتے اتار پھینکے تھے۔ اب ولاند کے مانند وہ بھی سیاہ لبادے میں ملبوس اپنے ناخدا کے قریب دم سادھے شہر پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

یکا یک ولاند بول اٹھا۔

کیا دل چسپ شہر ہے! ہے نا؟

عزازیل نے ہلکی سی جنبش کی اور کہنے لگا۔

میرے آقا مجھے تو روم زیادہ پسند ہے۔

ہاں یہ تو اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ ولاند نے جواب دیا۔

کچھ توقف کے بعد دوبارہ اس کی آواز سنائی دی:

شہر کے وسط میں دھواں کیسا اٹھ رہا ہے؟

لمحوں میں شہر تاریکی کی چادر میں سمٹنے لگ گیا۔

مغرب کی جانب سے اٹھنے والی اس تاریکی نے عظیم شہر کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ محل اور پل غائب ہو گئے تھے۔ ہر چیز یوں اوجھل ہو گئی تھی کہ جیسے یہاں کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ آسمان سے شعلوں کی ایک لہر زمین کی جانب لپکی جس کے فوراً بعد پورا شہر ایک ہولناک دھماکے سے لرز اٹھا۔ کچھ ہی دیر بعد شعلے اور دھماکے مسلسل رونما ہونے لگ گئے اور شدید بارش نے جل تھل ایک کر دیئے۔ طوفانی بارش کے غبار میں ولاند کا ہیولا غائب ہو گیا۔

سے مٹا کر اس کرہ ارض کی رونق چھین لینا چاہتے ہو۔ نادان ہو تم۔

میں تجھ جیسے مکّار کے ساتھ بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ میتھیو نے جواب دیا۔

تمہاری میرے ساتھ بحث سے گریز کرنے کی ایک ہی وجہ ہے جو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں ۔تم نادان ہو، بے وقوف ہو! ولاند نے جواب دیا اور کہا۔ اچھا جلدی سے میرا دماغ خراب کئے بغیر یہاں آنے کی وجہ بیان کرو۔

مجھے اُس نے بھیجا ہے۔

اے غلام! کیا پیغام لائے ہو؟

میں غلام نہیں ہوں ۔میتھیو نے برا مناتے ہوئے کہا۔ میں اُس کا شاگرد ہوں۔

ہم اور تم ہمیشہ کی طرح دو مختلف زبانوں میں بات کر رہے ہیں۔ ولاند نے جواب دیا۔لیکن جن چیزوں کے متعلق بات کر رہے ہیں وہ تو بہر حال تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ ہاں تو؟

اس نے ماسٹر کی تصنیف پڑھ لی ہے۔میتھیو بولا۔ اور وہ چاہتا ہے کہ تو ماسٹر کو اپنے ساتھ لے جائے اور انعام میں اسے سکون بخش دے۔ اے ظلمت کے شہنشاہ تیرے لئے بھلا یہ کون سا مشکل کام ہے۔

میرے لئے کچھ بھی کرنا مشکل نہیں ہے۔ ولاند نے جواب دیا۔ اور اس حقیقت سے تو بخوبی آشنا ہے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ نا،تو! تم اسے اپنی طرف روشنی میں کیوں نہیں لے جاتے؟

وہ روشنی کے لائق نہیں ہے۔ اسے صرف سکون دیا جا سکتا ہے۔میتھیو نے غمناک آواز میں جواب دیا۔

اچھا جاؤ کہہ دو۔ ہو جائے گا۔ جواب دیتے وقت ولاند کی آنکھ شعلے اگلنے لگی تھی ۔ اور اب یہاں سے فوراً غائب ہو جاؤ۔

اس کی التجا ہے کہ ماسٹر سے محبت کرنے والی اور اس کی خاطر اذیتیں جھیلنے والی کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔میتھیو نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

ہاں ہاں،تمہارے بغیر تو یہ بات ہماری عقل میں نہیں آ سکتی تھی نا۔ جاؤ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

یہ سنتے ہی میتھیو وہاں سے غائب ہو گیا۔ اور ولاند نے عزازیل کو اپنے پاس بلا کر حکم دیا۔ جاؤ فوراً اڑان لو اور بندوبست کرو۔

عزازیل نے ہوا میں جست لگائی اور اگلے ہی لمحے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ولاند بالکونی میں تنہا رہ گیا۔لیکن یہ تنہائی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ کچھ ہی دیر بعد بالکونی کی سلوں پر قدموں کی چاپ اور زندگی سے لبریز آوازیں سنائی دیں۔

فاگوٹ اور بیگیموت چہکتے ہوئے نمودار ہوئے۔ بیگیموت نے اب کیروسین لیمپ کی جگہ بغل میں سنہری فریم والی پینٹنگ دبا رکھی تھی اور کاندھوں پر ایک ادھ جلا باورچیوں والا کوٹ لٹکا رکھا تھا جبکہ ایک ہاتھ میں وہ مچھلی پکڑے ہوئے تھا۔ فاگوٹ اور بیگیموت سے جھلسنے کی بدبو آرہی تھی۔ بیگیموت کا چہرہ راکھ سے آلودہ تھا۔ اس کی ٹوپی بھی کافی حد تک جل چکی تھی۔

سلیوٹ میرے آقا! فاگوٹ اور بیگیموت نے یک زبان نعرہ بلند کیا۔

کیا خوب حلیہ ہے! ولاند نے کہا

میرے آقا ذرا اندازہ کریں۔ بیگیموت طنزیہ انداز میں بولا۔ مجھے لٹیرا سمجھ لیا گیا تھا۔

تمہاری ہیئت اور تمہارے اوپر لدا سامان دیکھ کر یقیناً تمہیں لٹیرا ہی کہا جا سکتا ہے۔ ولاند بولا۔

یقین کیجئے میرے آقا۔۔۔۔۔ اپنے دفاع میں بیگیموت نے بولنا چاہا۔

نہیں کرتا میں یقین۔ ولاند نے اس کی بات کاٹتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

میرے آقا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنے تئیں ہر چیز کو بچانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن بدقسمتی سے یہی کچھ ہے جو میں بچا سکا ہوں۔

اچھا یہ بتاؤ کہ گیری باد میں آگ کیسے لگی؟ ولاند نے پوچھا۔

فاگوٹ اور بیگیموت نے شانے اچکا دیئے اور نگاہیں آسمان کی جانب اٹھا لیں۔ تاہم بیگیموت نے چلاتے ہوئے کہا۔ میری سمجھ سے تو باہر ہے! ہم پرامن طریقے سے خاموش بیٹھے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔۔۔۔۔۔

اور اچانک تڑاخ! تڑاخ!! فاگوٹ نے لقمہ دیا۔ فائرنگ! اندھا دھند گولیاں۔ میں اور بیگیموت خوف زدہ کیفیت میں دوسرے لوگوں کے ساتھ عمارت سے باہر دوڑ نکلے تھے۔

لیکن فرض شناسی۔ بیگیموت بولا۔ اس شرمناک خوف پر غالب آ گئی اور ہم واپس لوٹ آئے۔

اچھا تو تم واپس لوٹ آئے تھے۔ ولاند بولا۔ اور تب تک عمارت یقیناً مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں آ چکی ہو گی۔

مکمل طور پر! غمناک لہجے میں فاگوٹ نے تصدیق کی۔ میرا مطلب ہے میرے آقا۔ کہ آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔ مکمل طور پر! شعلے ہی شعلے!

میں نے تو پوری کوشش کی۔ بیگیموت بولا۔ کہ ستونوں سے آراستہ میٹنگ ہال میں کچھ نہ کچھ بچا لوں۔ اوہ میرے آقا! یوں سمجھ لیجئے کہ میری بیوی نے اس دوران کم از کم بیس مرتبہ بیوہ ہونے کا خطرہ مول لیا ہوگا! لیکن میری خوش نصیبی کہ میں غیر شادی شدہ ہوں اور ویسے خوش قسمت ہی تو ہوں کہ اب تک غیر

شادی شدہ ہوں۔ اوہ میرے آقا اس اکیلے پن کی آزادی کو شادی کے جھمیلوں پر بھلا کیسے قربان کیا جاسکتا ہے؟

پھر بکواس شروع ہوگئی! ولاند بڑبڑایا

بہک جانے کی معذرت چاہتا ہوں۔ بلا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس پینٹنگ کے علاوہ میٹنگ ہال سے کچھ بھی بچانا ممکن نہیں ہوسکا۔ آگ کا ایک شعلہ تو سیدھا میرے چہرے پر لپکا۔ میں باورچی خانے کی طرف دوڑا اٹھا اور وہاں سے صرف اس اوور آل اور اس معصوم مچھلی کو بچا سکا۔ میرے خیال میں میرے آقا میں نے تو اپنے بس میں ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ اور یہ آپ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ میری سمجھ سے باہر ہے۔

تمہارے لوٹ مار کرنے کے دوران فاگوٹ کیا کر رہا تھا؟ ولاند نے پوچھا۔

میرے آقا! میں آگ بجھانے والوں کی مدد کر رہا تھا۔ فاگوٹ اپنی ادھ جلی پتلون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔۔

اچھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عمارت نئے سرے سے تعمیر کرنی پڑے گی!

جی میرے آقا! فاگوٹ نے جواب دیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عمارت اب از سر نو ہی تعمیر ہوگی۔

بس تو پھر یہی توقع کرنی چاہیے کہ نئی عمارت پرانی سے بہتر ہوگی۔ ولاند بولا

بالکل ایسا ہی ہوگا میرے آقا! فاگوٹ نے جواب دیا

میرا کہا تو پتھر پر لکیر کے مترادف ہے نا میرے آقا! بیگیموت بولا۔ آخر میرا رتبہ بھی پیغمبر کے برابر ہی ہے نا۔ بہرکیف ہم آپ کے قدموں میں حاضر ہیں۔

اب ہمارے لئے کیا حکم ہے، میرے آقا! فاگوٹ نے پوچھا۔

ولاند سٹول سے اٹھ کھڑا ہوا اور کافی دیر تک خاموشی سے ٹہلنے کے بعد دوبارہ سٹول پر آ بیٹھا۔

مزید کوئی احکامات نہیں ہیں۔ تم لوگوں نے تمام ممکنہ کام بخوبی انجام دیئے ہیں۔ تمہاری خدمات کی فی الوقت مزید ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ آرام کرو۔ ابھی طوفان آنے والا ہے۔ آخری طوفان، جو بچے کھچے کام مکمل کر دے گا۔ اس کے بعد ہم یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔

جو حکم میرے آقا۔ دونوں نے بیک زبان جواب دیا اور گول مینار کے عقب میں روپوش ہوگئے۔

جس طوفان کی پیشگوئی ولاند نے کی تھی اس کے آثار دور افق پر ظاہر ہونے شروع ہوگئے تھے۔ مغرب سے سیاہ رنگ کا غبار اٹھا جس نے نصف سورج کو ڈھانپ دیا اور کچھ ہی دیر میں اسے پوری طرح اپنی گھٹا ٹوپ تاریک آغوش میں لپیٹ لیا۔ بالکونی پر تازہ ہوا کے جھونکے محسوس ہونے لگے تھے اور چند ہی

لمحوں میں شہر تاریکی کی چادر میں سمٹنے لگ گیا۔

مغرب کی جانب سے اٹھنے والی اس تاریکی نے عظیم شہر کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ محل اور پل غائب ہو گئے تھے۔ ہر چیز یوں اوجھل ہو گئی تھی کہ جیسے یہاں کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ آسمان سے شعلوں کی ایک لہر زمین کی جانب لپکی جس کے فوراً بعد پورا شہر ایک ہولناک دھماکے سے لرز اٹھا۔ کچھ ہی دیر بعد شعلے اور دھماکے مسلسل رونما ہونے لگ گئے اور شدید بارش نے جل تھل ایک کر دیے۔ طوفانی بارش کے غبار میں ولانڈ کا ہیولا غائب ہو گیا۔

باب ۳۰

جلدی! جلدی!

جانتے ہو۔ مارگریٹا بول رہی تھی۔ گذشتہ رات تمہارے سو جانے کے بعد میں سمندر کی جانب سے اٹھنے والی تاریکی کے بارے میں پڑھ رہی تھی۔ اور ہاں وہ سنہری مجسمے۔ نجانے کیوں یہ مجسمے مجھے ہر پل بے چین کیے رکھتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ابھی بارش ہونے والی ہے۔ تم تازہ ہوا کے جھونکوں کو محسوس کر رہے ہو نا؟

یہ سب تو ٹھیک ہے اور یہ سنہری مجسمے بھی خوب ہیں۔ ماسٹر نے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے اڑاتے ہوئے کہا۔ لیکن مجھے تو یہ تشویش کھائے جا رہی ہے کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے۔

غروب آفتاب کے وقت یہ گفتگو اُس دوران جاری تھی جب میتھیو بالکونی پر نمودار ہوا تھا۔ تہہ خانے کی کھڑکی کھلی تھی۔ اگر کوئی کھڑکی سے اندر جھانک لیتا تو گفتگو میں مصروف لوگوں کی ہیئت دیکھ کر یقیناً حیران ہو جاتا۔ مارگریٹا نے اپنے جسم کو فقط ایک سیاہ رنگ کے برساتی کوٹ سے ڈھانپ رکھا تھا جب کہ ماسٹر نے مریضوں والی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ دراصل مارگریٹا کی ضرورت کی تمام اشیاء اس کے باغیچے والے گھر میں تھیں۔ باوجودیکہ یہ گھر تہہ خانے سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا مارگریٹا اب ادھر کا رخ کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ماسٹر کے تمام کپڑے الماری میں موجود تھے لیکن وہ مریضوں والا یونیفارم ہی پہنے رکھنے پر مصر تھا۔ وہ مارگریٹا کو یہ باور کرانے میں مصروف تھا کہ کچھ انہونی ابھی شروع ہونے والی ہے۔ البتہ اس نے اب شیو کر رکھی تھی۔ ہسپتال میں تو سر اور داڑھی کے بال ایک ہی مشین سے مونڈ دیئے جاتے تھے۔

کمرے کی حالت بھی کافی خراب تھی۔ قالین اور دیوان پر ہاتھ سے لکھے اوراق بکھرے پڑے تھے۔ کرسی پر ایک ادھ کھلی کتاب پڑی تھی۔ گول میز پر کھانے کا سامان اور چند بوتلیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ یہ کھانے کا سامان اور مشروبات کہاں سے آئے! نہ تو ماسٹر کو اس کا علم تھا اور نہ ہی مارگریٹا کو۔ جب ان لوگوں کی آنکھ کھلی تو یہ تمام لوازمات پہلے سے یہاں موجود تھے۔

ہفتے کے دن غروب آفتاب تک سوئے رہنے کے بعد ماسٹر اور اس کی محبوبہ خود کو بہت حد تک ہشاش بشاش اور توانا محسوس کر رہے تھے۔ دونوں کو نجانے کیوں بائیں کنپٹی میں کچھ دکھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ ذہنی طور پر دونوں نمایاں تبدیلی پا چکے تھے۔

ہت تیرے کی! اچانک ماسٹر بولا۔ ذرا ملاحظہ تو کیجئے۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں مسلنے کے بعد اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ نہیں، سنو تو ذرا! تم تو بہت عقلمند ہو اور کبھی کسی ذہنی عارضے میں بھی مبتلا نہیں رہی ہو۔ کیا تم بقائمی ہوش و حواس اس بات پر یقین رکھتی ہو کہ کل رات ہم شیطان کی محفل میں تھے؟

جی ہاں! بلاشک وشبہ۔ مارگریٹا نے جواب دیا۔

جی ہاں! جی ہاں! ماسٹر طنزیہ انداز میں بولا۔ مطلب یہ ہوا کہ یک نہ شد دو شد۔ پہلے تو صرف میں اکیلا پاگل تھا اور اب دونوں۔ شوہر بھی اور بیوی بھی۔ اس نے ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا لیئے اور زور سے بولا۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ شیطانیت ہے۔ محض شیطانیت، شیطانیت۔

جواب دینے کی بجائے مارگریٹا دیوان پر دراز ہوگئی اور زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولی:

اوئے ہوئے۔ میں اس ہنسی کو کیسے قابو کروں۔ دیکھو تو تمہیں کیا ہوگیا ہے! ہنسی کا دورہ ختم ہونے پر مارگریٹا شرمندگی کے عالم میں مریضوں والے یونیفارم کی آستین ہونٹوں میں دبائے ماسٹر کو غور سے دیکھتی ہوئی سنجیدہ لہجے میں بولی:

تم اس وقت خود ہی غیرارادی طور پر حقیقت بیان کر چکے ہو۔ شیطانیت کہہ رہے ہو نا! ہاں یہ واقعی شیطانیت ہی تو ہے۔ اور یہ شیطان ہی ہے جو سب کچھ جانتا ہے اور یہ شیطان ہی ہے جس نے سب کچھ ممکن بنا دیا ہے۔

اس کی آنکھیں یکایک روشن ہوگئیں، وہ جست لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کسی مدہوش شرابی کی طرح رقص کرتی ہوئی چلا چلا کر کہنے لگی۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں! میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ مجھے خود شیطان نے ملاقات کا شرف بخشا! واہ شیطان واہ! میرے محبوب اب تمہیں ایک چڑیل کے ساتھ زندگی گزارنی پڑے گی۔ یہ کہنے کے بعد وہ ماسٹر سے لپٹ گئی اور والہانہ انداز میں اس کے ہونٹ، رخسار، ناک اور پیشانی کو چومنے لگ گئی۔ اس کے منتشر سیاہ گیسو ماسٹر کے اردگرد لہرا رہے تھے۔ ماسٹر کے رخسار اور پیشانی مارگریٹا کے لبوں کے لمس سے دہک اٹھے تھے۔

تم تو واقعی چڑیل دکھائی دینے لگی ہو۔

ہاں، ہاں اور میں اس سے انکاری بھی نہیں ہوں۔ مارگریٹا نے جواب دیا۔ میں واقعی اب چڑیل

ہوں اور اس بات پر بہت خوش ہوں۔

چلو ٹھیک ہے۔ ماسٹر نے کہا۔ چڑیل تو چڑیل ہی سہی۔ کتنے فخر اور خوشی کی بات ہے! اور جو مجھے ہسپتال سے اغوا کرلیا گیا! یہ بھی خوشی کی بات ہے۔ ہمیں واپس یہاں بھیج دیا گیا۔ چلو یہ بھی مان لیتے ہیں۔ یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ اب ہمیں گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن خدارا یہ تو بتاؤ کہ ہم کیسے اور کن وسائل کے سہارے زندہ رہیں گے؟ میرا یقین کرو میں یہ محض اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے دراصل تمہاری فکر ہے۔

اس دوران کھڑکی میں نوکدار جوتے اور ایک پتلون کے پائنچے دکھائی دیئے۔ یہ پتلون گھٹنوں کے بل جھک گئی اور دن کی ڈھلتی ہوئی روشنی میں کسی کا جسیم پچھواڑہ دکھائی دیا۔

الوزی تم گھر میں ہو؟ کھڑکی کے باہر پتلون کے بالائی حصے کے کہیں اوپر سے آواز آئی۔

یہ لو شروع ہوگیا۔ ماسٹر بول اٹھا

الوزی؟ مارگریتا نے کھڑکی کے پاس جا کر کہا۔ اسے تو کل گرفتار کرلیا گیا تھا۔ آپ کون ہیں؟ کیا نام ہے آپ کا؟

یہ سنتے ہی گھٹنے اور پچھواڑہ غائب ہوگیا اور کہیں دور دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی جس کے بعد ہر چیز اپنی معمول کی حالت میں دکھائی دینے لگ گئی۔ مارگریتا دیوان پر لیٹ گئی۔ اس پر قہقہوں کا کچھ ایسا ہذیانی دورہ پڑا کہ اس کے آنسو نکل آئے۔ ہنسی کا دورہ ختم ہوتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوگئے اور اس پر سنجیدگی طاری ہوگئی۔ وہ سرکتی ہوئی ماسٹر کی آغوش میں پہنچ گئی اور اپنے محبوب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کا سر سہلانے لگ گئی اور بولی۔

تم نے کتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں، کتنی اذیتیں جھیلی ہیں۔ اوہ میرے بے چارے! یہ صرف میں اکیلی جانتی ہوں۔ دیکھو تو تمہارے بالوں میں سفید دھاگے نمایاں ہوگئے ہیں اور تمہارے ہونٹوں کے پاس ایک مستقل جھری بن گئی ہے۔ میری جان! میری زندگی! میرے محبوب تم کچھ مت سوچو۔ تمہیں پہلے ہی اپنی بساط سے بڑھ کر سوچنا پڑا ہے۔ تمہاری جگہ اب میں سوچا کروں گی اور میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا، مارگو۔ ماسٹر نے جواب میں کہا۔ اور جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو مارگریتا کو یوں لگا کہ اس کا پہلے والا ماسٹر لوٹ آیا ہے۔ وہ ماسٹر جو کبھی ان چیزوں کے متعلق لکھا کرتا تھا جنہیں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن ان کے متعلق غالباً وہ علم ضرور رکھتا تھا۔

اور میں ڈرتا اس لئے نہیں کہ میں ہر آزمائش سے گزر چکا ہوں۔ مجھے پہلے ہی اتنا ڈرایا گیا ہے کہ اب مزید ڈرنا ناممکن ہے۔ لیکن مجھے تمہاری فکر کھائے جا رہی ہے۔ سن رہی ہو مارگو! اب یہ واحد خوف

ہے جس نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ ہوش میں آؤ ماسٹر کی جان۔ تم کیوں ایک بیمار اور مفلس شخص کے ساتھ اپنی زندگی برباد کرنے جا رہی ہو؟ لوٹ جاؤ واپس؟ میں تمہیں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

اوہ تم۔ اوہ تم! فرط جذبات سے مارگریٹا سر کو جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔ اوہ تم کمزور ایمان والے بدقسمت آدمی! میں تمہاری وجہ سے کل تمام رات برہنہ حالت میں کانپتی پھری ہوں۔ میں نے اپنی حقیقت کی قربانی دے کر ایک نیا روپ دھار لیا۔ کئی مہینے میں تن تنہا ایک اندھیرے کمرے میں بیٹھی ایک ہی بات کے بارے میں سوچتی رہی۔ یروشلم پر چھا جانے والے طوفان کے بارے میں۔ میں نے تو اپنی آنکھوں سے تمام آنسو بہا ڈالے۔ اب جبکہ خوشیاں میرے آنگن میں برسنے لگی ہیں تو تم مجھے اپنے سے الگ کر رہے ہو۔ یہاں سے چلے جانے کو کہہ رہے ہو؟ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ چلی جاؤں گی۔ لیکن یہ جان لو کہ تم ایک سنگدل شخص ہو! انہوں نے تمہاری روح کو کھوکھلا کر دیا ہے۔

ایک تلخی سے بھرپور لیکن پیار بھرا گداز احساس ماسٹر کے دل میں سرائیت کر گیا۔ وہ مارگریٹا کی زلفوں سے لپٹ کر رونے لگ گیا اور وہ بھی روتے روتے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی سرگوشیاں کر رہی تھی۔

ہاں یہ دھاگے، میری آنکھوں کے سامنے ہی یہ سر برف کی مانند سفید ہو گیا ہے۔ اوہ میرا، اوہ میرا یہ دکھوں کا ستایا ہوا سر۔ دیکھو تو تمہاری آنکھوں کا کیا حال ہو گیا ہے۔ مارگریٹا کی باتیں بے ربط ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی رواں تھی۔ زوردار ہچکیوں سے اس کا پورا جسم لرزنے لگ گیا تھا۔

آنسو پونچھنے کے بعد ماسٹر دوزانوں بیٹھی مارگریٹا کو اپنی بانہوں میں سمیٹے اٹھ کھڑا ہوا اور فیصلہ کن انداز میں بولنے لگا۔۔

بہت ہو چکا۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بھی دل چھوٹا نہیں کروں گا اور نہ ہی اس موضوع پر کبھی دوبارہ گفتگو کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہم دونوں ہی روحانی مریض ہیں۔ شائید یہ بیماری تمہیں مجھ سے ہی منتقل ہوئی ہے۔ بس فیصلہ ہو گیا۔ اب ہم اکٹھے ہی اس بیماری سے بھگتیں گے۔

مارگریٹا نے اپنے ہونٹ ماسٹر کے کان کے ساتھ چپکائے سرگوشی میں کہا۔

مجھے قسم ہے تمہاری اُس زندگی کی جسے تم نے ستارہ شناس کی اولاد کو کھوجنے پر وقف کر رکھا تھا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ماسٹر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ جب لوگ تمہاری اور میری مانند پوری طرح لُٹ جاتے ہیں تو وہ ہمیشہ کسی غیبی مدد کے منتظر رہتے ہیں۔ تم نے بھی غیبی۔ بے شک شیطانی ہی سہی۔ مدد کا سہارا لے کر کوئی جرم نہیں کیا۔

دیکھا! دیکھا! اب تم پہلے والے ماسٹر ہو۔ میرے ہنستے، مسکراتے ہوئے ماسٹر۔ تم اپنے یہ ثقیل ادبی الفاظ استعمال کرنے اب بند کرو۔ غیبی، شیطانی یا خدائی۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟ اچھا مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ وہ ماسٹر کا ہاتھ تھامے اسے کھانے کی میز پر کھینچ لائی۔

مجھے شک ہے کہیں یہ کھانا زمین نہ نگل جائے یا پھر کھڑکی کے راستے باہر نہ اڑ جائے۔ ماسٹر پرسکون لہجے میں بولا۔

کہیں غائب نہیں ہوگا یہ کھانا!

اور عین اسی لمحے کھڑکی سے کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

آداب عرض ہے۔

یہ آواز سنتے ہی ماسٹر کانپ اٹھا۔ جبکہ مارگریتا جو اب غیر معمولی چیزوں کی عادی ہو چکی تھی۔ بولی۔

ارے یہ تو عزازیل ہے! واہ کتنی چاہت ہے اس آواز میں! ماسٹر کو مخاطب کرتے ہوئے وہ دھیمی آواز میں بولی۔ دیکھا! دیکھا تم نے! ہمیں تنہا نہیں چھوڑا گیا!۔۔۔ اور دروازہ کھولنے دوڑ پڑی۔

کوئی چادر ہی اوڑھ لو۔ ماسٹر اونچی آواز میں بولا۔

ارے لعنت بھیجو چادر پر! مارگریتا راہداری کے دوسرے کنارے سے بولی۔

عزازیل نے تہہ خانے میں داخل ہونے کے بعد ماسٹر کے ساتھ مصافحہ کیا اور اسے اپنی چمکتی بھینگی آنکھ سے بغور دیکھنے لگ گیا۔

اوہ میں کتنی خوش ہوں آج! میں زندگی میں پہلے کبھی اتنا خوش نہیں ہوئی! عزازیل! میں عریاں ہونے پر معذرت خواہ ہوں۔

عزازیل نے کہا کہ وہ زنانہ عریانیت سے بہت اچھی طرح مانوس ہے اور اُس نے آج تک کبھی اس بات کا برا نہیں منایا۔ بلکہ عریاں تو کیا وہ تو ایسی خواتین کو بھی دیکھ چکا ہے جن کے بدن سے جلد ہی نوچ لی گئی تھی۔

مارگریتا کے مدعو کرنے پر عزازیل سیاہ کپڑے میں لپٹا ایک پیکٹ احتیاط سے انگیٹھی کے پاس رکھنے کے بعد خوشی خوشی کھانے کی میز پر بیٹھ گیا۔

مارگریتا نے عزازیل کو برانڈی کا گلاس پیش کیا جو اس نے فوراً ماسٹر کے گلاس سے ٹکرانے کے بعد حلق میں انڈیل لیا۔ ماسٹر عزازیل پر بدستور نظریں جمائے میز کے نیچے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخا رہا تھا لیکن انگلیاں چٹخانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ نہ تو عزازیل ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس بھورے بالوں والے ناٹے قد کے شخص میں ایک آنکھ کی پتلی پر سفیدی کے علاوہ کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی۔ اور آنکھ کی پتلی کی سفیدی کسی کے بھوت پریت یا شیطان ہونے

کی نشانی تو نہیں ہوتی نا۔ ہاں البتہ اس کا لباس ضرور کچھ غیر معمولی سا تھا۔ لیکن اگر یادداشت کو کریدا جائے تو یقیناً اس طرز کے لباس میں کوئی ایک آدھ انسان ذہن میں ضرور آ سکتا ہے۔ برانڈی بھی وہ عام انسانوں کی طرح ہی پی رہا تھا۔ ویسے اس برانڈی کے زیراثر ماسٹر کا اپنا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا اور وہ سوچ رہا تھا!۔۔

۔۔''نہیں۔ مارگریٹا ٹھیک ہی کہہ رہی ہے! میرے سامنے یقیناً شیطان کا چیلا ہی براجمان ہے۔ میں تو خود دو روز قبل ہسپتال میں ایوان کو یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مائیکل بیرلی کو پیش آنے والے حادثے سے قبل جس شخص کے ساتھ ان لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی وہ بنفس نفیس خود شیطان ہی تھا۔ اور اب نجانے کیوں اس قسم کی سوچ سے خوف زدہ ہو کر میں خود ہپناٹزم اور وہم کے چکروں میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ بھلا کیسا وہم؟ کیسا ہپناٹزم؟''

عزازیل کا بغور تجزیہ کرنے کے بعد ماسٹر کو یقین ہو گیا کہ وہ ان سے کچھ چھپا رہا ہے۔ وہ غالباً کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آیا ہے لیکن فی الوقت انہیں بتانا نہیں چاہتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اسے کسی بہت ہی اہم کام پر مامور کیا گیا ہے۔ ماسٹر سوچ رہا تھا۔

ماسٹر کی چہرہ شناسی نے اسے دھوکہ نہیں دیا۔

برانڈی کا تیسرا گلاس چڑھانے کے بعد عزازیل کچھ یوں گویا ہوا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ تہہ خانہ اتنا آرام دہ ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آپ لوگ اس تہہ خانے میں پڑے پڑے کیا کرو گے؟

میں بھی یہی کہہ رہا تھا۔ ماسٹر بولا

آپ کیوں مجھے ہراساں کر رہے ہو عزازیل؟ مارگریٹا بولی۔ ہم جیسے تیسے کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔

یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ عزازیل نے کہا۔ میں تو کبھی بھولے سے بھی آپ کو ہراساں کرنے کا نہیں سوچ سکتا۔ میں تو خود یہی کہہ رہا ہوں کہ جیسے تیسے۔ ارے ہاں میں تو بھول ہی گیا کہ میرے آقا نے آپ کے لئے نیک خواہشات کا پیغام بھیجا ہے۔ اور اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ آپ کے ساتھ ایک مختصر سیر پر جانا چاہتے ہیں۔ ہاں تو کیا جواب ہے آپ کا؟

مارگریٹا نے میز کے نیچے سے ماسٹر کو ٹھوکر مارتے ہوئے جواب دینے کا اشارہ کیا۔

بصد خوشی! ماسٹر نے عزازیل پر ٹکٹکی باندھے جواب دیا۔

ہم توقع رکھتے ہیں کہ مادام مارگریٹا بھی ہمیں عزت بخشنے سے انکار نہیں کریں گی۔

جی ہاں! میں بھی غالباً منع نہیں کروں گی۔ مارگریٹا نے جواب دیا اور اپنا پاؤں دوبارہ ماسٹر کے گھٹنے سے ٹکرا دیا۔

زبردست! عزازیل چہکتے ہوئے بولا۔ مجھے انسانوں کا فوراً دوٹوک فیصلہ کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ نہ کہ

تذبذب کی کیفیت میں الجھے رہنا۔ جس کا مظاہرہ آپ نے دریا کنارے ہماری پہلی ملاقات کے دوران کیا تھا۔

آہ! وہ ملاقات! وہ ملاقات! مت یاد دلاؤ مجھے عزازیل۔ میں اس وقت ناسمجھ تھی۔ مجھے اس بات کے لئے کٹہرے میں کھڑا کرنا ناانصافی ہے۔ دیکھو! شیطان کے چیلے سے ہر روز ملاقات تو نہیں ہوتی نا!

جی ہاں! صحیح کہا آپ نے۔ عزازیل بولا۔ ویسے اگر ہر روز ملاقات ہوسکتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

میں خود بھی فوری فیصلہ کرنے کی قوت ارادی پر یقین رکھتی ہوں۔ مارگریتا پرجوش انداز میں بولی۔ میں تو دلدادہ ہوں پھرتیلے پن کی اور عریانی کی۔ جیسا کہ پستول سے ٹھاہ! اوہ کیا نشانہ ہے اس کا۔ مارگریتا ماسٹر کو متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ تکیئے کے نیچے چھپا تاش کا پتا یا پھر۔۔۔۔۔۔۔ مارگریتا شراب کے نشے میں دھت ہوتی نظر آ رہی تھی۔

اوہ! میں ایک اور بات بھول رہا ہوں۔ عزازیل اپنی پیشانی ٹھونکتے ہوئے بولا۔ میرے آقا نے آپ کے لئے ایک خصوصی تحفہ بھیجا ہے۔ اس نے ماسٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ انگوری شراب کی ایک بوتل۔ اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ وہی انگوری شراب ہے جو یہودیہ کا قاضی پیا کرتا تھا۔

اس نوعیت کے فقیدالمثال تحفے کے بارے میں سن کر ماسٹر اور مارگریتا دنگ ہو کر رہ گئے۔ عزازیل نے سیاہ کپڑے میں لپٹے پیکٹ کو کھولا۔ پیکٹ سے ایک قدیم زمانے کی کائی لگی صراحی برآمد ہوئی۔ انگوری شراب کی مہک پورے کمرے میں پھیل گئی۔ شراب گلاسوں میں انڈیل دی گئی۔ اس دوران کھڑکی سے باہر طوفان نے تمام فضا ارغوانی رنگ میں رنگنا شروع کر دی تھی۔

ولاند زندہ باد! مارگریتا نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے نعرہ بلند کیا۔ تینوں نے جام ہونٹوں سے لگائے اور دو دو گھونٹ پینے کے بعد گلاس واپس میز پر رکھ دیئے۔ شراب حلق سے نیچے اترتے ہی ماسٹر کی آنکھوں کے سامنے سیاہی چھانے لگ گئی, اس کی سانس حلق میں اٹک گئی اور اسے محسوس ہوا کہ آخری وقت آ پہنچا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مارگریتا کا چہرہ سفید پڑ گیا اور مدد کے لئے ماسٹر کی جانب اٹھے اُس کے ہاتھ میز پر گر گئے اور وہ کرسی سے لڑھکتی ہوئی زمین پر آ رہی۔

قاتل۔ ماسٹر بمشکل چلایا۔ اور عزازیل کو مارنے کے لئے وہ میز پر رکھی چھری کی جانب لپکا۔ لیکن اس کا بے جان ہاتھ چھری تک پہنچنے سے پہلے ہی میز پر گر گیا۔ ماسٹر کے اردگرد ہر چیز تاریکی میں ڈوبنے کے بعد بالکل غائب ہوگئی اور اس کا جسم کرسی سے پھسلتا ہوا فرش پر آن گرا۔ اس دوران اس کا سر میز سے ٹکرانے کے بعد زخمی ہوگیا۔

جب زہر خورانی کے شکار خاموش ہوگئے تو عزازیل نے اپنی کاروائی شروع کر دی۔ وہ فوراً کھڑکی کی جانب لپکا اور وہاں سے ہوتا ہوا ایک ہی لمحے میں مارگریتا کے باغیچے والے گھر میں جا پہنچا۔ اپنے فرائض

کی انجام دہی میں ہمیشہ محتاط اور مستعد رہنے والا عزازیل اپنا اطمینان کرنے کے لئے یہ دیکھنے آیا تھا کہ اس کے کام میں کوئی چوک تو نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کر وہ مطمئن ہوگیا کہ سب کچھ منصوبے کے عین مطابق ہوا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اپنے شوہر کی منتظر ستم زدہ خاتون خواب گاہ سے برآمد ہوئی. اس کا چہرہ اچانک سفید پڑ گیا اور وہ اپنا دل تھامے مدد کے لئے چیخی۔

مدد! مدد! نتاشا، خدارا مدد! مدد! اور پھر اُس کا بے جان جسم مہمان خانے کے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

سب ٹھیک ہے۔ عزازیل بولا اور دوسرے ہی لمحے وہ زہر خوردہ پیار کرنے والوں کے پاس کھڑا تھا۔ مارگریٹا غالیچے پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ عزازیل نے اپنے آہنی ہاتھوں سے کسی گڑیا کے مانند مارگریٹا کا جسم سیدھا کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مارگریٹا کا چہرہ تبدیل ہونا شروع ہوگیا۔ کمرہ نیم روشن ہونے کے باوجود واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ مارگریٹا کے چہرے پر وقتی طور پر چھائی کرختگی، اس کی آنکھوں کا بھینگا پن اور چڑیلوں والی ڈراؤنی ہیئت غائب ہوتی جا رہی تھی۔ مرحومہ کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس کے تناؤ کا شکار اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور اس کی خونخواروں جیسی ہیئت ایک عام غم زدہ عورت کی ہیئت میں تبدیل ہوگئی۔ عزازیل نے اس کا منہ زبردستی کھولا اور انگوری شراب کے چند قطرے اس کے منہ میں انڈیل دیئے۔ مارگریٹا کے جسم نے ایک جنبش لی اور وہ عزازیل کی مدد کے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے نحیف آواز میں عزازیل سے پوچھا۔

کیوں؟ عزازیل کیوں؟ یہ تو نے میرے ساتھ کیا کر ڈالا؟

اس کی نظر فرش پر پڑے ماسٹر پر پڑی اور وہ کانپتے ہوئے بولی۔

مجھے اس کی امید نہیں تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ قاتل!

جی نہیں، بالکل نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ عزازیل نے جواب دیا۔

وہ ابھی اٹھ کھڑا ہوگا۔ آپ کیوں اتنی مضطرب ہو رہی ہیں؟

شیطان کے چیلے کا لہجہ اتنا پر اعتماد تھا کہ مارگریٹا نے بلا جھجک اس کا یقین کر لیا۔ وہ زندگی اور توانائی سے بھرپور نظر آ رہی تھی۔ وہ فوراً ماسٹر کے منہ میں شراب کے قطرے انڈیلنے میں عزازیل کا ہاتھ بٹانے لگ گئی۔ ماسٹر آنکھیں کھولتے ہی نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

قاتل!!

جی ہاں! یہ تو قدیم روایت ہے۔ عزازیل نے کہا۔ جب کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اسے اسی طرح لعن طعن اور بے عزتی سے نوازا جاتا ہے۔ آپ کیا اندھے ہو؟ حقیقت کو دیکھ نہیں سکتے ہو؟

ماسٹر اٹھ کھڑا ہوا اور زندہ روشن آنکھوں سے چاروں اطراف نظر دوڑاتے ہوئے بولا۔

یہ سب کیا ہے؟ اس کا مطلب کیا ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے۔ عزازیل نے کہا۔ کہ آپ کو اب روانہ ہو جانا چاہیے۔ سن رہے ہو نا! طوفان شروع ہو چکا ہے۔ سیاہی کی چادر چہار سو پھیلتی جا رہی ہے۔ بے چین گھوڑے زمین کے سینے کو زخمی کئے دے رہے ہیں۔ پورا باغیچہ لرز رہا ہے۔ تہہ خانے کو اب الوداع کہنے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ جلدی کریں۔

میں سمجھ گیا ہوں۔ ماسٹر نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ تم نے ہمیں مار ڈالا ہے۔ ہم مر چکے ہیں۔ میں داد دیتا ہوں تمہاری دانشمندی کی۔ اور تم نے یہ سب کتنا بروقت کیا ہے۔ اب میں سب سمجھ گیا ہوں۔

معذرت چاہتا ہوں۔ عزازیل نے جواب دیا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا کہ یہ آپ بول رہے ہیں۔ آپ کی محبوبہ تو آپ کو ماسٹر کے نام سے پکارتی ہے۔ ماسٹر، یعنی تخلیق کرنے والا۔ پھر آپ بھلا کیسے مردہ ہو سکتے ہو؟ کیا زندہ رہنے کی نشانی یہی ہے کہ آپ مریضوں والا لباس پہنے اس تہہ خانے میں پڑے رہو؟ کیسی مضحکہ خیز بات ہے!

تمہاری بات اب مجھے پوری طرح سمجھ آ گئی ہے۔ ماسٹر بولا۔ مجھے مزید شرمندہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عظیم ولاند! مارگریٹا بولی۔ عظیم ولاند۔

اس سے بہتر میرے لئے یقیناً کوئی نہیں سوچ سکتا تھا۔ ہاں مگر ناول۔ وہ ماسٹر کو چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ تم جہاں کہیں بھی جاؤ ناول ساتھ رکھنا نہ بھولنا۔

کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ماسٹر نے جواب دیا۔ مجھے پورا ناول اب زبانی یاد ہے۔

وعدہ کرو کہ تم اس میں سے ایک لفظ بھی نہیں بھولو گے۔ مارگریٹا نے اپنے محبوب سے لپٹتے ہوئے کہا۔

پریشان مت ہو۔ میں اب کبھی بھی کچھ نہیں بھول سکتا۔ ماسٹر نے جواب دیا۔

تو پھر لگا دیں آگ؟ عزازیل بھڑک کر بولا۔ وہی آگ جس سے سب کچھ شروع ہوا تھا اور جس پر سب کچھ ختم بھی ہوگا۔

آگ! آگ! مارگریٹا نے ہذیانی انداز میں چلانا شروع کر دیا۔

تیز ہوا کے جھونکے سے تہہ خانے کی کھڑکی زوردار آواز کے ساتھ کھل گئی اور پردہ کسی بلند عمارت پر لگے جھنڈے کی مانند پھڑ پھڑانے لگ گیا۔ عزازیل نے انگیٹھی سے ایک سلگتی ہوئی لکڑی اپنے پنجے میں دبوچ لی۔ میز پر بچھے کپڑے کو آگ لگانے کے بعد اس نے دیوان پر پڑے کچھ پرانے اخبار اور ماسٹر کے ناول کے مسودے کو بھی شعلوں کی نذر کر دیا۔ متوقع پرواز کے نشے میں بدمست ماسٹر نے الماری سے ایک کتاب اچک لی اور اس کے اوراق آگ میں پھینکنے شروع کر دیئے اور پھر کتاب سے جو بچا تھا وہ بھی آتش زدہ میز پر پھینک دیا۔

جل جاؤ، جل جاؤ۔ میری پہلے والی زندگی جل جاؤ!! جل جاؤ میرے دکھو! جل جاؤ ستم گرو۔ مارگریٹا چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔

تہہ خانہ اب پوری طرح آگ کے مشتعل شعلوں اور کثیف دھویں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ عزازیل کی قیادت میں بھاگتے ہوئے تینوں دروازے کے راستے باہر نکل آئے۔ باغیچے میں مالک مکان کی باورچن زمین پر بیٹھی آلو اور سبز پیاز دھو رہی تھی۔ ان تینوں کو دیکھ کر باورچن کی جو حالت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ سیاہ رنگ کے تین گھوڑے سرائے کے نزدیک کھڑے نتھنے پُھلا پُھلا کر پُھنکار رہے تھے اور رسّے تڑانے کی کوشش میں ہانپتے ہوئے زمین سے گرد کے بگولے اڑا رہے تھے۔ سب سے پہلے مارگریٹا، پھر عزازیل اور آخر میں ماسٹر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ خوف زدہ باورچن ہاتھ اٹھائے سینے پر صلیب کا نشان بنانے ہی والی تھی کہ عزازیل نے غراتے ہوئے کہا۔

کاٹ کر رکھ دوں گا یہ ہاتھ! اس نے تیز سیٹی بجائی اور گھوڑے رسیوں کو توڑتے ہوئے ایک ہی لمحے میں سیاہ بادلوں تک جا پہنچے۔ نیچے زمین پر باورچن کی بے آواز سی خوف زدہ چیخ سنائی دی۔

آگ۔ آگ

میں اپنے شہر۔ اپنے ماسکو کو آخری بار الوداع کہنا چاہتا ہوں۔ ماسٹر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ اس کا آدھا جملہ بادلوں کی گرج میں دب کر رہ گیا۔ گھڑسواروں کی قیادت کرنے والے عزازیل نے سر سے اشارہ کیا اور اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگ گیا۔ ایک سیاہ بادل کا ٹکڑا گھڑسواروں کی جانب اڑا چلا آ رہا تھا۔ اس نے فی الحال پانی برسانا شروع نہیں کیا تھا۔

وہ شہر کی شاہراہوں اور گلیوں کے اوپر اڑ رہے تھے۔ انہیں وہ لوگ دکھائی دے رہے تھے جو متوقع بارش سے بچنے کے لئے افراتفری کے عالم میں سر چھپانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ انہیں گیری باد سے اٹھتا ہوا دھواں دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے شہر تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ آسمانی بجلی گاہے بگاہے ان پر اپنے شرارے بکھیر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد عمارتوں کی رنگ برنگ چھتوں کی جگہ صرف سبزہ نظر آنے لگا تھا۔ بادلوں نے اپنے گیسو نچوڑنے شروع کر دیئے تھے اور پیاسی زمین نے مشروب حیات کو تیزی سے نگلنا شروع کر دیا تھا۔ بارش کے پانی میں تینوں گھڑسوار بلبلوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

مارگریٹا اس طرح کی پرواز سے بخوبی آشنا تھی جبکہ ماسٹر کے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ وہ جس مقام پر الوداعی ملاقات کا متمنی تھا اسے اچانک اپنے سامنے پا کر حیران رہ گیا۔ شہر کی واحد عمارت جسے وہ آخری بار دیکھنا چاہتا تھا۔۔ پروفیسر ستارین کا ہسپتال۔ اس نے فوراً ہی دریا اور دریا کے پار درختوں کے جھنڈ کو پہچان لیا۔ گھوڑے ہسپتال کے عقب میں پھیلی گھاس کی چادر پر اتر گئے۔

میں آپ لوگوں کا یہیں رک کر انتظار کروں گا۔ کبھی آسمانی بجلی کی چمک میں ظاہر ہوتے ہوئے اور کبھی رات کی تاریکی میں گم ہوتے ہوئے عزازیل نے شور مچاتے ہوئے کہا۔ ''زیادہ دیر نہ لگانا''۔

ماسٹراور مارگریٹا گھوڑوں کی پشت سے نیچے اتر آئے اور ہوا میں تیرتے ہوئے سایوں کی مانند کمرہ نمبر ۱۱۷ کی بالکونی میں پہنچ گئے۔ ماسٹر نے بالکونی کے جانے پہچانے دروازے کو بآسانی کھول لیا اور وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے۔ طوفانی بارش کے شور میں ان کی نقل وحرکت کی آوازیں دب کر رہ گئی تھیں۔ ماسٹر ایوان کی چارپائی کے پاس پہنچ کر رک گیا۔

ایوان کوئی حرکت کئے بغیر اُسی دن کی مانند ساکت لیٹا تھا جب وہ پہلی مرتبہ باہر برپا ہونے والے طوفان سے خوف زدہ تنہا بیٹھا تھا اور ایک اجنبی ہیولا بالکونی سے اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ یکا یک وہ اٹھ بیٹھا اور ماسٹر کی جانب ہاتھ بڑھاتا ہوا پرمسرت لہجے میں بولا۔

ارے یہ آپ ہیں! میں تو کب سے آپ کا منتظر ہوں۔ آخر آپ آ ہی گئے ہو! میرے پیارے ہمسائے!

جی ہاں میں آ گیا ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے میں اب مزید آپ کی ہمسائیگی میں نہیں رہ سکتا۔ میں یہاں سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ میں تو صرف آپ کو الوداع کہنے کے لئے آیا ہوں۔

مجھے پہلے ہی معلوم تھا! میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔ ایوان آہستگی سے بولا۔ آپ کی اُس سے ملاقات ہوئی؟

جی ہاں۔ ماسٹر نے جواب دیا۔ میں یہاں فقط آپ کو الوداع کہنے آیا ہوں کیونکہ آپ وہ واحد ہستی ہیں جس کے ساتھ میں نے آخری مرتبہ کوئی گفتگو کی تھی۔

یہ سن کر ایوان کی آنکھوں میں رونق لوٹ آئی اور وہ بولا۔

یہ آپ نے بہت اچھا کیا جو مجھ سے ملنے یہاں چلے آئے۔ میں اپنے وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔ میں اب مزید شاعری نہیں کروں گا۔ میری دلچسپی کا موضوع اب کچھ اور ہے۔ ایوان مسکراتے ہوئے دیوانہ وار دور کہیں خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ ''میں اب کچھ مختلف لکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں لیٹے لیٹے بہت ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئی ہیں''۔

یہ سن کر ماسٹر کچھ پریشان ہو گیا اور ایوان کے پاس بستر پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

اچھی بات ہے۔ بلکہ بہت ہی اچھی بات ہے۔ آپ اُس کی کہانی کے تسلسل کو آگے جاری رکھنا۔

ایوان کی آنکھوں میں دوبارہ ویرانی چھا گئی اور وہ کہنے لگا۔

کیا مطلب؟ کیا آپ خود نہیں لکھو گے؟ اور پھر گہری سوچ میں غوطے لگاتے ہوئے خود ہی بول اٹھا۔

یہ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ ایوان کی نظریں اس وقت فرش پر مرکوز تھیں اور وہ اچانک خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔

جی ہاں! ماسٹر بولا۔

ایوان کو اس کی آواز میں قدرے نامانوسیت سی محسوس ہوئی اور یوں لگا کہ جیسے آواز کہیں دور سے آ رہی ہے۔

ماسٹر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا" میں اس کے بارے میں اب مزید کچھ نہیں لکھوں گا۔ میری مصروفیات اب قدرے مختلف ہوں گی"۔

طوفان کے شور کو چیرتی ہوئی سیٹی کی تیز آواز سنائی دی۔ آپ سن رہے ہو نا؟ ماسٹر نے پوچھا۔

جی ہاں! طوفان کا شور ہے۔ ایوان نے کہا

نہیں۔ یہ مجھے بلایا جا رہا ہے۔ میرے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ کہنے کے بعد ماسٹر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک منٹ، ایک منٹ۔ صرف ایک اور بات۔ ایوان نے التجا کی۔" کیا وہ ملی آپ کو؟ کیا اُس نے اپنی وفا نبھائی؟"

یہ رہی وہ۔ ماسٹر نے دیوار کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سفید دیوار سے مارگریٹا کا سیاہ ہیولا الگ ہو کر ایوان کے بستر کے قریب آ گیا۔ وہ نوجوان شاعر کو بغور دیکھ رہی تھی اور اس کی اپنی آنکھوں میں دکھ اور کرب جھلک رہے تھے۔

بے چارہ! بے چارہ! کہتے ہوئے وہ بستر پر جھک گئی۔

بہت خوب! یہ تو بہت حسین ہے! ایوان کوئی حسد دل میں لائے بغیر بولا۔ تاہم اس کے لہجے میں اداسی کی آمیزش ضرور تھی۔ آپ لوگوں کی کہانی کا انجام تو اچھا ہو گیا۔ لیکن میری تقدیر غالباً آپ لوگوں سے مختلف ہے۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ یا شاید ٹھیک ہی ہے۔

ٹھیک ہے! ٹھیک ہی تو ہے! مارگریٹا ایوان کے اوپر جھکتی ہوئی بولی۔ ابھی میں آپ کو پیشانی پر بوسہ دوں گی اور دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میری بات کا یقین کیجئے میں سب کچھ دیکھ چکی ہوں۔ سب کچھ جانتی ہوں۔

نوجوان نے مارگریٹا کی صراحی دار گردن کے گرد اپنی بانہوں کا حصار بنا لیا اور خوبصورت ساحرہ نے اس کی پیشانی کو پرجوش انداز سے چوم لیا۔

الوداع شاگرد! ماسٹر مدھم آواز میں بولا۔ اور ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اس کی تقلید میں مارگریٹا بھی وہاں سے غائب ہو گئی۔ بالکونی کے دروازے کی چٹخنی بند ہونے کی آہٹ وہ آخری آواز تھی جو ایوان کو سنائی دی۔

ایوان اب بے چین نظر آ رہا تھا۔ وہ بستر پر بیٹھ گیا اور بار بار خوفزدہ نظریں چاروں طرف دوڑانے لگ

گیا۔ کبھی آہیں بھرتا اور کبھی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا۔ باہر طوفان کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ غالباً یہ شور اس کی روح کو مزید بے چین کئے جا رہا تھا۔ اس کی بے چینی میں اضافے کا سبب ایک دوسرا شور بھی تھا۔ ہسپتال کی راہداری سے، جو بالعموم پرسکون رہتی تھی، شور بلند ہو رہا تھا۔ ایوان کے کمرے کے بند دروازے کے اس پار سے ٹرالی گھسیٹنے اور عملے کے لوگوں کی باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایوآن پریشان ہو کر چلایا۔

فہمیدہ! فہمیدہ!

ہر دلعزیز نرس اگلے ہی لمحے ایوان کے کمرے میں موجود تھی اور پریشان نگاہوں سے ایوان کو دیکھ رہی تھی۔

کیا؟ کیا ہوا؟ طوفان نے خوف زدہ کر دیا ہے؟ گھبراؤ نہیں ہم سب ٹھیک کر دیں گے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔ نرس نے کہا۔

نہیں! نہیں! میری عزیزہ شاف فہمیدہ۔ ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ فہمیدہ کی بجائے دیوار پر نظریں جمائے بولا۔ میں بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔ بلکہ میں تو اب پہلے سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ ساتھ والے کمرہ نمبر ۱۱۸ میں اس وقت کیسی ہلچل ہے؟ کیا ہوا ہے؟

کمرہ نمبر ایک سو اٹھارہ میں؟ فہمیدہ نے ایوان کا سوال دہرایا۔ اس کی آنکھوں سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ تاہم اس نے جواب دیا۔ ''کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں''۔ لیکن اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ حقیقت کو چھپا رہی ہے۔ ایوآن اس کے تذبذب کو بھانپ گیا اور کہنے لگا۔

فہمیدہ! فہمیدہ! آپ تو اتنی صاف گو ہو کہ۔۔۔۔۔ آپ یہی سوچ رہی ہیں نا کہ میں پریشان ہو جاؤں گا۔ نہیں محترمہ! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ مجھے بلا جھجک حقیقت بتا سکتی ہیں۔ ویسے بھی دیوار کے اس پار ہونے والے واقعات کو میں پہلے ہی محسوس کر چکا ہوں۔

آپ کے ہمسائے کی موت واقع ہوگئی ہے۔ ہمیشہ سچ بولنے والی حساس دل فہمیدہ خوف زدہ نظروں سے ایوان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

لیکن خلاف توقع ہمسائے کی موت کا سن کر ایوان میں واقعی کوئی غیر معمولی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ وہ بالکل پرسکون تھا۔ اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت بلند کرتے ہوئے بولا۔

مجھے پہلے سے ہی معلوم تھا۔ میں ایک اور بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں میری محترمہ! اس وقت شہر میں ایک اور انسان کی موت واقع ہوئی ہے۔ اور میں اُس انسان کو بھی جانتا ہوں۔ وہ مسکرا کر بولا۔ وہ ایک خوبصورت عورت ہے۔

باب ۳۱

ورابی کی پہاڑی پر

دریا کے اُس پار طوفان جس طرح آناً فاناً آیا تھا اُسی طرح کچھ دیر بعد اچانک غائب بھی ہو گیا۔ آسمان رنگ برنگ کی قوسِ قزح سے سج گیا تھا۔ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ کے دامن میں ایک نسبتاً بلند جگہ پر تین سیاہ ہیولے دیکھے جاسکتے تھے۔ ولاند۔ فاگوٹ اور بیگیموت گھوڑوں پر سوار دریا کے دوسری جانب پھیلے شہر پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ ہزاروں عمارتوں کی مغربی کھڑکیاں غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں کو شراروں کی شکل میں منعکس کر رہی تھیں۔ شہر کے مشہور جیاوچ کانونٹ کے خوبصورت مینار اس زرد روشنی میں اپنی عظمت کے نشے میں چُور سر بلند کئے کھڑے تھے۔

ہوا میں پرشور ارتعاش پیدا ہوا۔ فضا میں عزازیل، ماسٹر اور مارگریٹا نمودار ہوئے اور تینوں پہلے سے منتظر حضرات کے پاس اتر گئے۔

ماسٹر اور مارگریٹا! آپ لوگوں کو زحمت اٹھانا پڑی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ولاند بولا۔ لیکن مجھے اعتماد ہے کہ آپ لوگوں کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ وقت آن پہنچا ہے۔ وہ ماسٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔ شہر کو آخری مرتبہ دیکھ لیں اور الوداع کہہ دیں۔ ہمیں اب روانہ ہونا ہے۔ ولاند نے اپنے سیاہ دستانے میں ملبوس ہاتھ سے شہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس شہر کی جانب اشارہ کیا گیا وہاں ان گنت آفتاب کھڑکیوں کے شیشوں میں تیر رہے تھے۔ اور ان روشن چراغوں کے اوپر پھیلتی ہوئی تاریکی اور دھند دن بھر کے تھکے ماندے شہر کو نگلتی جارہی تھی۔

ماسٹر گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اپنے ہمراہیوں کو وہیں چھوڑ کر وہ درختوں کے جھنڈ سے باہر آ گیا اور شہر کو غور سے دیکھنے لگ گیا۔ ابتدا میں گہری افسردگی ماسٹر کے دل پر چھا گئی لیکن جلد ہی ایک شیریں اضطراب اور بنجاروں کے بول بلارے سے ملتے جلتے احساس نے اس افسردگی کی جگہ لے لی۔

ہمیشہ کے لئے! کس قدر مشکل ہے ایسا خیال ذہن میں لانا! ماسٹر اپنے خشک، جابجا زخمی ہونٹ

چاٹتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ اس دوران وہ ساری توجہ اپنے اندر تیزی سے تغیر پذیر ہیجانی کیفیت پر مرکوز کئے ہوئے تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا اندرونی اضطراب گہری آزردگی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ احساس بھی تادیر جاری نہ رہ سکا اور جلد ہی نجانے کیوں تمکنت سے بھرپور بے اعتنائی نے اس کی جگہ لے لی۔ اور آخر میں اس کے جسم اور روح پر ابدی طمانیت حاوی ہو گئی۔

دوسرے گھڑسوار خاموشی کے ساتھ ماسٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ کیسے کچھ فاصلے پر ماسٹر کا سیاہ ہیولا اپنی حرکات و سکنات سے کبھی یہ تاثر دے رہا تھا کہ جیسے اپنے محبوب شہر کی ایک ایک گلی، ایک ایک گھر کو اپنی آنکھوں میں اتار لینا چاہتا ہو اور کبھی وہ اپنے پیروں تلے روندی گئی گھاس کو بے پناہ بے چارگی کے عالم میں دیکھنے لگ جاتا تھا۔

آخرکار بیگیموت نے اس اکتا دینے والی خاموشی کو توڑنے کا قصد کر لیا اور کہنے لگا۔

میرے آقا! سفر شروع کرنے سے قبل سیٹی بجانے کی اجازت چاہتا ہوں۔

تم خاتون کو خوفزدہ کر سکتے ہو۔ ولاند نے جواب دیا۔ لیکن یاد رکھو تمہاری آج کی تمام بے ہودگیاں اب اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہیں۔

نہیں، نہیں میرے آقا! گھوڑے کی زین سے آراستہ کمر پر باوقار انداز میں بیٹھی مارگریٹا بول اٹھی۔ دے دیجئے اجازت۔ بجانے دیں اسے سیٹی۔ اس طویل سفر کے آغاز پر ہی میں شدید مایوسی اور گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ میرے آقا! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اس بات کا علم ہونے کے باوجود کہ سفر کے اختتام پر خوشیاں منتظر ہیں اداس اور مایوس ہونا فطری عمل ہے۔ بیگیموت کو اپنے مزاح سے ہمیں ہنسا لینے دیجئے ورنہ ڈرتی ہوں کہیں آنسو نہ چھلک پڑیں اور روانگی سے قبل ماحول غمناک نہ ہو جائے۔

ولاند نے بیگیموت کو اشارہ کیا اور وہ فوراً زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اس نے انگلیاں منہ میں ٹھونس لیں اور گالوں میں ہوا بھرنے کے بعد زوردار سیٹی بجا دی۔ مارگریٹا کے کانوں میں گھنٹیاں بج اٹھیں۔ اس کا گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ درختوں سے خشک پتوں اور ٹہنیوں کا ڈھیر نیچے آ گرا۔ کوؤں اور چڑیوں کا بہت بڑا غول ہوا میں بلند ہو گیا۔ گرد و غبار کا جھکڑ دریا کی جانب چل پڑا۔ گھاٹ کے قریب سے گزرنے والی کشتی کے کئی مسافروں کی ٹوپیاں اڑ کر دریا میں جا گریں۔

سیٹی کی آواز سن کر ماسٹر نے ایک جھرجھری لی لیکن پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس کی حرکات میں شدت آ گئی۔ کبھی وہ اپنی پیشانی کو ٹھونکتا تو کبھی یوں لگتا کہ جیسے مکے دکھا کر شہر کو دھمکا رہا ہے۔ بیگیموت اپنی کاروائی پر فخریہ انداز میں گھڑسواروں کی جانب غالباً ستائش لینے کے لئے دیکھ رہا تھا۔

سیٹی بلاشبہ دلی جذبے کے ساتھ بجائی گئی ہے۔ فاگوٹ بولا۔ سیٹی واقعی بجائی گئی ہے۔ لیکن سچ تو

یہ ہے کہ سیٹی کا معیار درمیانہ سا تھا۔

میں کوئی بینڈ ماسٹر تو نہیں ہوں۔ بیگیموت نے منہ پھلاتے ہوئے روتی آواز میں جواب دیا اور غیرارادی طور پر مارگریٹا کو آنکھ ماردی۔

اب میں بھی ایک پرانی یادداشت ذرا تازہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ فاگوٹ نے جوابی حملہ کیا۔ اس نے انگلیاں منہ میں ٹھونس لیں اور نتھنے پھلانے شروع کر دیئے۔

اب دھیان سے! گھوڑے پر سوار ولاند کی آواز سنائی دی۔ دیکھنا کوئی جاندار زخمی نہیں ہونا چاہیے۔

میرے آقا اطمینان رکھیں۔ یہ تو مذاق کے طور پر ہے۔ محض مذاقاً۔ فاگوٹ نے جواب دیا۔

یہ کہنے کے بعد وہ اچانک کیسی غبارے کی طرح ہوا میں معلق ہوگیا۔ دائیں ہاتھ سے کچھ عجیب سا نقشہ کھینچنے کے بعد اس نے کیچوے کی طرح نیم دائرے کی شکل اختیار کر لی اور ایک لمبی سانس کھینچنے کے بعد سیٹی بجادی۔

اس سیٹی کی آواز مارگریٹا کے کان تو محسوس نہ کر سکے, لیکن اس کے اثرات کا مشاہدہ اُس نے ضرور کیا۔ اُس کا گرم مزاج گھوڑا اپنی جگہ سے تقریباً دس قدم دور جا گرا۔ اس کے قریب برگد کا ایک پیڑ جڑ سے اکھڑ کر زمین پر آ گرا۔ زمین پر جا بجا دراڑیں پڑ گئیں۔ دریا کے کنارے واقع ریستوران, جہاز رانی کے لئے استعمال ہونے والے گھاٹ سمیت اپنی جگہ سے اکھڑ کر پانی میں گر گیا۔ دریا کا پانی ابل پڑا اور دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے والی کشتی ہوا میں اچھلنے کے بعد واپس دریا میں آ گری۔ تاہم کشتی میں سوار کسی مسافر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ مارگریٹا کے گھوڑے کے قدموں میں ایک مردہ گلہری آن گری۔

فاگوٹ کی سیٹی نے ماسٹر کو خوفزدہ کر دیا۔ وہ اپنا سر ہاتھوں میں تھامے دوڑتا ہوا واپس گھڑسواروں کے دستے میں شامل ہوگیا۔

ہاں تو۔ ولاند ماسٹر سے مخاطب ہوا۔ سارے حساب چکا دیئے گئے ہیں؟ الوداعی کلمات مکمل ہو گئے ہیں کیا؟

جی ہاں مکمل ہو گئے ہیں۔ ماسٹر نے بلاخوف ولاند کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

درختوں کے بیچوں بیچ اس پہاڑی نما ٹیلے پر ولاند کی پر ہیبت آواز گونجی۔ چلو! ولاند کے نعرے کے بعد ایک اور سیٹی کی آواز اور بیگیموت کا قہقہہ بھی سنائی دیا۔

گھوڑوں نے جست لگائی اور سواروں کو لے کر فضا میں بلند ہو گئے۔ مارگریٹا اپنے منہ زور گھوڑے کی خرمستیوں کی وجہ سے شدید ہچکولے کھا رہی تھی۔ ولاند کا لمبا سیاہ کوٹ ہوا کے دوش پر محو پرواز چمگادڑ کے پروں کی مانند گھڑسواروں کے سروں پر پھیل گیا تھا۔ آسمان ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ولاند کا کوٹ ایک لمحے کے لئے مارگریٹا کے سر سے سرک گیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو سارا شہر اپنے رنگ برنگ کے میناروں سمیت غائب ہو چکا تھا اور فضا میں پھیلی فقط ایک دھندلی چادر دکھائی دے رہی تھی۔

باب ۳۲

معافی اور ابدی سکون

او میرے خدایا! کتنی غمگین دکھائی دے رہی ہے یہ شام کے سائے میں لپٹی ہوئی زمین۔ کتنی پراسرار ہے یہ دلدلوں پر چھائی ہوئی دھند! جو کوئی بھی اس دھند میں بھٹکتا رہا, جو کوئی بھی موت سے قبل تڑپتا رہا, جو کوئی بھی اس زمین پر اپنی بساط سے بڑھ کر بوجھ لادے پھرتا رہا وہ بخوبی جانتا ہے اور کسی ملال کے بغیر زمین پر چھائی دھند، ان دلدلوں اور دریاؤں کو خیر باد کہنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ وہ ایک لطیف احساس دل میں لئے موت کے رتھ پر سوار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہی اس کی نجات کا واحد راستہ ہے۔

جادوئی گھوڑے بھی آخر کار تھکن کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی رفتار واضح طور پر سست ہو گئی تھی اور اٹل رات کی سیاہی ان پر حاوی ہو رہی تھی۔ اپنے شانوں پر لپکتی رات کی سیاہی کو محسوس کرتے ہوئے باتونی بیگیموت نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ اپنے پنجے زین میں گاڑے اور ہوا میں بل کھاتی ہوئی دُم سمیت وہ انتہائی سنجیدگی کے عالم میں اڑا جا رہا تھا۔

رات کے اندھیرے کی سیاہ چادر جنگلوں اور ان میں بہنے والے دریاؤں کو اپنی آغوش میں سمیٹتی جا رہی تھی۔ کہیں دور نیچے کچھ چراغ روشن تھے, جن کی ٹمٹماتی لو غمگین انداز میں ناچتی محسوس ہو رہی تھی۔ ان روشنیوں میں نہ تو ماسٹر اور نہ ہی مارگریٹا کو اب کوئی دل چسپی تھی۔ رات نے گھڑسواروں کو پیچھے چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اداس بے رونق آسمانی چھت پر قمقموں کی مانند جا بجا سفید اور زرد ستارے جگمگانے لگ گئے تھے۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور گھڑسواروں کے کاندھوں سے ان کے سیاہ کوٹ نوچتی جا رہی تھی۔ یوں ظاہری بہروپ بے نقاب ہونے لگ گئے تھے۔ جب ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں سے لطف اندوز ہوتی ہوئی مارگریٹا نے آنکھیں کھولیں تو اس نے دیکھا کہ تمام گھڑسواروں کی ہیئت کیسے تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ جب جنگل کے ایک سرے سے دمکتا ہوا ماہتاب نمودار ہوا تو تمام فریب غائب ہو گئے, دُور کہیں دلدل میں غرق ہو گئے۔ آسیبی پوشاکوں کو گہری دھند نگل گئی۔

مارگریتا کے دائیں جانب اڑنے والے خود ساختہ ترجمان فاگوٹ کو اب شائید ہی کوئی پہچان سکتا تھا۔ دریا کنارے درختوں کے جھنڈ سے سیاہ بوسیدہ چغے میں ملبوس کچھ دیر پہلے روانہ ہونے والے فاگوٹ نامی شخص کی جگہ اب سنہری لگام تھامے گہرے بنفشی رنگ کا اعلیٰ فوجی عہدیدار مسکراہٹ سے عاری اداس چہرہ لئے گھوڑے پر سوار نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی سینے سے لگا رکھی تھی۔ وہ نہ تو چاند کی جانب دیکھ رہا تھا اور نہ ہی اُسے پاؤں تلے بچھی زمین میں کوئی دل چسپی تھی۔ وہ ولآند کے شانہ بشانہ اڑتا ہوا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

وہ کیوں اس قدر تبدیل ہوگیا ہے؟ مارگریتا نے ولاند سے پوچھا

اس جنگجو نے کسی زمانے میں ایک بے موقع مذاق کیا تھا۔ ولاند نے مارگریتا کو اپنی دھیرے دھیرے سلگتی آنکھ سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی روشنی اور تاریکی کے متعلق مباحثے میں ایک مبہم سی تصنیف بے کار ثابت ہوئی جس کے نتیجے میں اس بہادر جنگجو کو اپنی توقع سے بڑھ کر اور کافی طویل عرصے تک اس مذاق کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ لیکن آج کی رات ایسی رات ہے جب حساب چکائے جاتے ہیں۔ اس جنگجو نے بھی اپنا حساب چکا دیا ہے۔ اس کا کھاتہ آج بند کر دیا گیا ہے۔

پھیلتی ہوئی رات نے بیگیموت کی پھولی ہوئی دُم جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اُس کی کھال جسم سے الگ کرنے کے بعد ایک ایک بال نوچ کر دلدل کے اوپر بکھیر دیا۔ کالے علم کے شعبدوں سے ہر کسی کو محظوظ کرنے والا بلا ایک خوبرو اکہرے جسم والے نوجوان میں تبدیل ہوگیا۔ یہ نوجوان کسی زمانے میں اپنی بے مثل بزلہ سنجی اور مزاح گوئی کے لئے چہار دانگ عالم میں جانا جاتا تھا۔ اب وہ خاموشی کے ساتھ اپنا چاندنی میں نہایا چہرہ ایک ہاتھ پر جمائے اڑا چلا جا رہا تھا۔

گھڑسواروں کے دستے کے انتہائی دائیں جانب چمکتے ہوئے فولادی ہتھیاروں سے لدا عزازیل محو پرواز تھا۔ چاندنی نے اس کا روپ بھی بدل ڈالا تھا۔ اس کا ہونٹوں سے باہر لٹکتا ہوا بدنما دانت کوئی نشان چھوڑے بغیر غائب ہوگیا تھا۔ اس کا بھینگا پن بھی یکسر دور ہو چکا تھا اور دونوں آنکھیں مساوی ہوگئی تھیں۔ سیاہ اور ویران۔ اس کا چہرہ سفید اور بے حس۔ اب عزازیل اپنی اصل حالت میں دکھائی دے رہا تھا۔ جیسا کہ بے آب و گیاہ صحرا کا بھوت۔ جیسے کہ ایک سفاک قاتل۔

مارگریتا خود کو تو دیکھ نہیں پا رہی تھی البتہ اسے ماسٹر کی بدلتی ہوئی ہیئت بخوبی نظر آ رہی تھی۔ اُس کے سر کے بال بالکل سفید ہوگئے تھے اور ایک چٹیا میں بندھے دُم کی مانند لہرا رہے تھے۔ وہ مسکراتا ہوا انتہائی انہماک کے ساتھ چاند کو اس طرح دیکھ رہا تھا کہ جیسے اسے صدیوں سے جانتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ذہنی امراض کے ہسپتال کے کمرہ ۱۱۸ میں اپنائی گئی عادت کے مطابق کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔

بالآخر ولآند بھی اپنی اصل ہیئت میں واپس آنا شروع ہوگیا تھا۔ مارگریتا کے لئے یہ اندازہ کرنا

مشکل ہوگیا تھا کہ اس کے گھوڑے کی لگا میں کن اجزا سے بنی ہیں۔ ان پر چاندنی سے کھینچی دو زنجیروں کا گمان ہو رہا تھا اور گھوڑا ایک سیاہ ہیولا جبکہ اُس کی ایال کے بال بادل کے ٹکڑے کی مانند تھے۔ گھڑسوار کے جوتوں میں لگے کیل ٹمٹماتے ستاروں کا عکس معلوم ہو رہے تھے۔

گھڑسوار کافی دیر تک خاموشی کے ساتھ محو پرواز رہے۔ ان کا نیچے کا منظر یکسر تبدیل ہوگیا تھا۔ اداس جنگل کو دھاگوں کی مانند پھیلے دریاؤں سمیت زمین کی تاریکی نگل گئی تھی۔ چاندنی سے منور بڑی بڑی چٹانیں اور ان کے درمیان چاند کی روشنی سے محروم اندھیرے میں ڈوبی کھائیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔

ولاند نے اپنا گھوڑا ایک سبزے سے عاری چٹیل پہاڑی پر اتار لیا۔ اس کی تقلید کرتے ہوئے دوسرے گھڑسواروں نے بھی زمین کو چھونا شروع کر دیا۔ ان کے گھوڑوں کے نعلوں کی رگڑ سے پتھروں اور چقماق کے چٹخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چٹان اور اس کے اردگرد کی زمین سبزی مائل چاندنی کی تیز روشنی میں نہا گئی تھیں۔

جلد ہی اس ویرانے میں مارگریٹا کی نظر ایک آرام دہ کرسی پر براجمان سفید لباس میں ملبوس ایک شخص پر پڑی۔ یہ شخص یا تو قوت سماعت سے محروم تھا یا پھر اپنے ہی خیالات کی دنیا میں اتنا گم تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپ اور پتھروں کے تڑخنے کی آوازوں نے بھی اسے اپنی جانب متوجہ نہیں کیا۔ گھڑسوار اس شخص کے انہماک میں مخل ہوئے بغیر اس کے سر پر پہنچ گئے۔

چاندنی نے مارگریٹا کے سامنے والے منظر کو بجلی کے قمقمے سے بھی زیادہ روشن کر رکھا تھا۔ وہ واضح طور پر دیکھ رہی تھی کہ کرسی میں بیٹھے شخص کی آنکھیں بے نور ہیں۔ لیکن یہ بے نور آنکھیں چاند پر مرکوز تھیں۔ چاند کی روشنی میں پتھر سے بنی کرسی لاتعداد جگنو منعکس کر رہی تھی۔ کرسی کے نزدیک ایک گہرے رنگ کا نوکدار کانوں والا جسیم کتا اپنے مالک کی طرح بے چینی کے عالم میں چاند پر ٹکٹکی لگائے بیٹھا تھا۔ کرسی نشین کے پاؤں میں ایک شکستہ صراحی کی ٹھیکریاں بکھری پڑی تھیں جن کے بیچوں بیچ سرخی مائل سیاہ رقیق مادے کا تالاب بن گیا تھا۔

یہاں گھڑسواروں نے اپنے گھوڑے روک لئے۔

آپ کا ناول پڑھ لیا گیا ہے۔ ولاند نے ماسٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس کے متعلق صرف ایک بات کہی گئی ہے کہ کہانی کا انجام نامکمل ہے۔ آیئے میں آپ کا تعارف ناول کے مرکزی کردار سے کرواتا ہوں۔ وہ تقریباً دو ہزار سال سے اس جگہ بیٹھا سو رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں جب بھی پورا چاند نمودار ہوتا ہے تو بے خوابی اس کا چین چھین لیتی ہے۔ مالک کے ساتھ اس کا وفادار کتا بھی اس اذیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بات درست مان لی جائے کہ۔۔۔ بزدلی سے بڑا کوئی روگ نہیں

ہے۔۔۔۔تو یہ جانور بے چارہ تو بالکل بے قصور ہے۔ وہ صرف اور صرف بادلوں کی گھن گرج سے ڈرتا ہے۔لیکن کیا کیا جا سکتا ہے؟ جب آپ کسی سے پیار کرتے ہیں تو پھر اس کے کیئے پر آپ کو بھی کچھ نہ کچھ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

وہ کیا کہہ رہا ہے؟ مارگریتا نے یہ پوچھ تو لیا لیکن اُس کے چہرے پر کرب ناک پر چھائیاں پھیل گئی تھیں۔

وہ ایک ہی بات کی تکرار کرتا رہتا ہے۔ ولاند نے جواب دیا۔ وہ کہتا ہے کہ اُسے چاندنی میں بھی سکون نہیں ملتا۔ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ انتہائی مکروہ منصب پر فائز ہے۔ بے خوابی کے دوران وہ ہمیشہ یہی بات کہتا رہتا ہے۔ جبکہ سوتے میں اسے چاندنی سے بنا راستہ دکھائی دیتا ہے اور اس راستے پر وہ ملزم عیشوا کے ساتھ اپنی گفتگو جاری رکھنا چاہتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ بہت عرصہ قبل نسان کے مہینے کی چودہ تاریخ کو اس کی گفتگو نامکمل رہ گئی تھی۔لیکن افسوس کہ چاندنی کے اس راستے پر وہ قدم نہیں رکھ پاتا۔ اسے ملنے بھی کوئی نہیں آتا۔ اس صورت حال میں اس کے لئے خود سے ہمکلام ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ویسے کبھی کبھار اپنی گفتگو کی یکسانیت یعنی تکرار کو تبدیل کرنے کے لئے وہ کہتا ہے کہ اسے اپنی حیات جاودانی اور کروفر سے سخت نفرت ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنی شان وشوکت والی حیثیت کو چیتھڑوں میں ملبوس میتھیو جیسے بھکاری کے ساتھ تبدیل کرنے کو تیار ہے۔

اُس ایک چاند کی پاداش میں بارہ ہزار چاند! یہ تو بہت بڑی زیادتی ہے۔ آپ کا کیا خیال؟ مارگریتا نے پوچھا۔

کیا اب فریدہ کی کہانی دہرائی جانے لگی ہے؟ ولاند نے کہا۔ مارگریتا آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔سب ٹھیک ہی ہوگا۔اسی پر تو دنیا قائم ہے۔

آزاد کر دیں! مارگریتا اچانک اُسی انداز میں چلائی جیسے کبھی وہ چڑیل کے بہروپ میں چیخی تھی۔ اس کا چیخنا اتنا ہیبت ناک تھا کہ ایک بہت بڑا پتھر چٹان سے ٹوٹ کر دھماکے کے ساتھ دور کہیں کھائی میں جا گرا۔ مارگریتا کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ پہاڑوں میں بازگشت پیدا کرنے والی گونج پتھر کے گرنے سے اٹھی تھی یا پھر شیطانی قہقہے کا کرشمہ تھا۔ انہونی سہی لیکن شیطان واقعی ہنس رہا تھا۔ وہ مارگریتا کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

پہاڑی علاقوں میں چیخنا اچھی بات نہیں ہے۔ ویسے وہ چٹانوں کے ٹوٹ کر بکھرنے کے شور کا عادی ہو چکا ہے۔اب وہ آپ کی سفارش کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ وہ شخص جسے ملنے کے لئے وہ بے تاب ہے پہلے ہی اس کی سزا میں کمی کی سفارش بھیج چکا ہے۔

اس موقعہ پر ولاند اچانک ماسٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔''آپ اپنا ناول اب صرف ایک

جملے میں مکمل کر سکتے ہیں"۔

ماسٹر جو قاضی کو بغور دیکھے جا رہا تھا اور اب تک چپ سادھے کھڑا تھا, غالباً یہی بات سننے کا منتظر تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کا ہونٹوں کے گرد حلقہ بنا کر اسقدر زور سے بولا کہ اس کی آواز اور بازگشت کافی دیر تک ان بنجر اور زندگی کی تازگی سے محروم پہاڑوں سے ٹکراتی رہی۔

آزاد! آزاد ہو تم! جاؤ وہ تمہارا منتظر ہے!!

ماسٹر کی آواز پہاڑوں سے ٹکرانے کے بعد ایک بلند آہنگ گونج میں تبدیل ہوگئی۔ اس گونج نے بالآخر پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہولناک چٹانوں کی دیواریں غائب ہوگئیں۔ صرف زمین کا وہ قطعہ باقی بچا جس پر پتھر سے بنی کرسی پڑی تھی۔ زمین کے اس قطعے کے گرد ایک عظیم شہر اپنی روشنیوں سمیت ابھر آیا جس کے ہزار ہا چاندوں کے چشم دید امین، پودوں پھولوں اور بیلوں سے اٹے باغیچے پر قابض لاتعداد سنہری مجسمے چاند کی روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ چاندنی سے بنا وہ راستہ جس کا قاضی صدیوں سے منتظر تھا اس باغیچے تک بچھ گیا تھا۔

سب سے پہلے نوکیلے کانوں والا کتا اچھل کر اٹھا اور اس راستے پر دوڑ پڑا۔ خونی آستین والے سفید کوٹ میں ملبوس شخص بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھنسی پھنسی آواز میں وہ ناقابل فہم الفاظ بڑبڑا رہا تھا۔ یہ اندازہ لگانا بھی ناممکن تھا کہ وہ ہنس رہا ہے یا پھر رو رہا ہے۔ وہ بھی اپنے وفادار جانور کے پیچھے چاندنی کے راستے پر چل نکلا۔

کیا مجھے بھی ان کے پیچھے اُدھر جانا ہے؟ ماسٹر نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے پوچھا۔

نہیں۔ ولاند نے جواب دیا۔ جن لوگوں کی کہانی ختم ہو چکی ہو اور جن کے نقش پا مٹ چکے ہوں اُن کا پیچھا نہیں کیا کرتے۔

اچھا تو اس کا مطلب ہے اُدھر! ماسٹر نے پیچھے کی جانب اپنے بچھڑے ہوئے محبوب شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نہیں اُدھر بھی نہیں۔ ولاند بولا۔ اس کی آواز اچانک بھرا گئی اور شائید چٹانوں سے ٹکرانے کے بعد کچھ مترنم بھی ہوگئی۔ میرے محترم رومانوی ماسٹر! آپ کا تخلیق کردہ ہیرو جس ہستی کے ساتھ ملاقات کے لئے تڑپ رہا ہے اُس نے آپ کا ناول پڑھ لیا ہے۔ پھر اچانک مارگریٹا سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ بولا۔ آپ نے اپنے محبوب کے لئے بلاشک وشبہ بہترین مستقبل سوچ رکھا ہے۔ لیکن اس معاملے میں میری پیش کش, جس کی سفارش تو عیشوا نے بھی کر دی ہے, آپ کی سوچ سے کہیں بہتر ہے۔

ان دونوں کو اکیلا چھوڑ دیں۔ ولاند نے نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے قاضی کی جانب اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔ ان کی گفتگو میں مخل ہونا مناسب نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ آخر کار کسی متفقہ نتیجے پر پہنچ ہی جائیں۔ یہ کہنے کے بعد ولاند نے ہاتھ سے یروشلم کی سمت اشارہ کیا اور یہ روشن چراغوں والا عظیم شہر اندھیروں میں اوجھل ہو گیا۔

اور وہاں بھی۔ ولاند نے اپنے عقب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس تہہ خانے میں آپ لوگ کیا کرو گے؟ اس نے انتہائی ملائم لیکن اعتماد سے لبریز لہجے میں کہا۔ او میرے رومانوی ماسٹر! کیا آپ اپنی محبوبہ کے ساتھ مہکتے پیڑوں کے نیچے بیٹھنا نہیں چاہتے؟ کیا اپنی شامیں روح پرور موسیقی میں ڈبونا نہیں چاہتے؟ کیا آپ قندیلوں کی لو میں پروں کے قلم سے اپنی افسانوی تحریریں رقم کرنا نہیں چاہتے؟ کیا آپ قدیم کیمیا دانوں کی طرح سیٹیاں بجاتی اور بھاپ اگلتی صراحیوں کے سامنے کسی معجزے کے انتظار میں بیٹھنا نہیں چاہتے؟ اُدھر، اُس طرف، آپ کا گھر اور آپ کا پرانا وفادار ملازم اب بھی آپ کے منتظر ہیں۔ بہت دیر تک روشن رہنے والی قندیلیں اب بجھنے کو ہیں کیونکہ آپ لوگوں کے لئے ایک نئی زندگی کی سحر طلوع ہونے والی ہے۔ یہی ہے راستہ آپ لوگوں کے لئے۔ الوداع! مجھے بھی اب جانا ہے!

الوداع!۔ ماسٹر اور مارگریٹا نے یک زبان ہو کر کہا۔

ولاند کی سیاہ شبیہ کسی منزل کا تعین کئے بغیر تاریک گھاٹیوں میں غائب ہوگئی۔ اُس کے چیلے بھی شور مچاتے اُس کی تقلید کرتے ہوئے تاریکیوں میں گم ہو گئے۔ اس کے بعد نہ تو وہ چٹانیں موجود رہیں۔ نہ پتھر کی کرسی کو برداشت کئے رکھنے والا قطعہ زمین وہاں رہا۔ نہ چاندنی سے بنا راستہ اور نہ ہی چراغوں سے روشن یروشلم رہا۔ سیاہ گھوڑے بھی غائب ہو گئے۔

ماسٹر اور مارگریٹا سے جس نئی سحر کا وعدہ کیا گیا تھا وہ ظاہر ہونا شروع ہوگئی۔ اچنبھے کی بات ہے کہ چاند اب تک سروں کے اوپر چمک رہا تھا۔ لیکن پو پھٹنے کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ صبح نور کی پہلی کرنوں میں نہائے پیار کرنے والے کائی لگے پتھریلے پُل سے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ پُل پار کرنے کے بعد یہ سچے عشق میں بندھی جوڑی ایک ریتلے راستے پر اپنی کہانی کے نشانات ثبت کرتی چلی جا رہی تھی۔

سنو اس خاموشی کو! مارگریٹا ماسٹر سے کہہ رہی تھی۔ سنو اور محسوس کرو اس خاموشی کو جس کے لئے تم ساری زندگی ترستے رہے ہو۔ مجھے تو نسیم سحر کی منتظر انگور کی بیل سے سجی کھڑکی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ رہا تمہارا گھر! تمہارا ابدی ٹھکانہ! مجھے معلوم ہے کہ شام کے وقت وہ تمام لوگ جو تمہیں عزیز ہیں تمہارے پاس چلے آئیں گے۔ وہ تمہارے لئے گائیں گے اور موسیقی بجائیں گے۔ تم قندیلوں کی روشنی میں اپنے کمرے کے نقش و نگار بھی دیکھ سکو گے۔ تم اپنی پسندیدہ ٹوپی پہنے، ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے، نیند کے مزے بھی لوٹو

گے۔ پرسکون نیند کے بعد تم اور بھی توانا ہو جاؤ گے۔ تمہاری تخلیقی سوچ میں مزید نکھار آ جائے گا اور۔۔۔۔۔۔
اور تم مجھے کبھی بھی خود سے الگ نہیں کر سکو گے۔ تمہاری پرسکون نیند کی نگہبانی میں خود کروں گی۔

یہ سب باتیں مارگریٹا ماسٹر کو اپنے ابدی گھر کی جانب جاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ماسٹر کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے مارگریٹا کے الفاظ ہو بہو اس چشمے کے فوارے کی مانند پھوٹ رہے ہیں جسے وہ مستانہ وار بل کھاتا اور گنگناتا پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اس کی کانوں سے بھری اذیت ناک تلخ یادیں یکا یک مدھم پڑنے لگ گئیں اور لطیف بے وزنی کی کیفیت اس کے پورے وجود پر چھانے لگ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اس نے کچھ دیر قبل اپنے ناول کے ہیرو کو آزاد کیا تھا ویسے ہی اب کوئی اسے آزاد کر رہا ہے۔ اس کا ہیرو ہمیشہ کے لئے دور گھمبیر اندھیروں میں غرق ہو گیا تھا۔ ستارہ شناس کا بیٹا، یہودیہ کا پانچواں سنگ دل رومن قاضی پونتی پلات آج حیات نو کی رات معافی پا کر ابدی سکون کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

حرف آخر

یقیناً یہ جاننا دلچسپی کی بات ہے کہ وولانداور اس کے گھڑسوار دستے کی دریا کنارے سے روانگی کے بعد بالآخر ماسکو شہر میں حالات کیسے تھے؟

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ شہر میں ایک طویل عرصے تک طرح طرح کی افواہیں گردش کرتی رہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان افواہوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہوا پہلے پہل ماسکو کے مضافات اور بعد ازاں دور افتادہ مقامات تک پھیل گیا۔

اس تقریباً سچی داستان کا راقم خود اس بات کا گواہ ہے کہ ایک مرتبہ ریل گاڑی میں سفر کے دوران ایک خاتون نے کیسے حلفاً یہ بیان کیا کہ ماسکو میں دو ہزار زن و مرد تھیٹر سے بالکل برہنہ برآمد ہوئے تھے اور ٹیکسیوں میں سوار ہونے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے تھے۔

''شیطانی طاقت'' کے متعلق سرگوشیاں دوکانوں اور ٹرام کے انتظار میں لگی قطاروں میں، گھروں میں، باورچی خانوں میں، ریل گاڑیوں میں، ریلوے سٹیشنوں پر، دریا کنارے، ساحل سمندر پر اور بحری جہازوں میں سنی جا سکتی تھیں۔

پڑھے لکھے اور نستعلیق قسم کے لوگ ''شیطانی طاقت'' کے بارے میں کہانیوں پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے بلکہ اس قسم کی کہانیاں بیان کرنے والوں پر ہنستے تھے اور اپنی دانشورانہ دلیلوں سے ان کی بے عقلی ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بہر حال ماننے یا نہ ماننے سے حقیقت تو تبدیل نہیں ہو جاتی۔ آخر کوئی تو شہر میں افراتفری پیدا کرنے والا آیا تھا! گیری باد کی عمارت کی جگہ پڑے راکھ کے ڈھیر اور بہت ساری دوسری چیزیں اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ پڑھے لکھے لوگ تفتیش کے اس رخ سے متفق تھے کہ ہپناٹزم اور مصنوعی صوتی اثرات پیدا کرنے کے فن کے ماہر افراد کا گروہ شہر پر حملہ آور ہوا تھا۔

اس گروہ کی گرفتاری کے لئے نہ صرف ماسکو بلکہ دور دراز کے علاقوں میں بھی کی جانے والی ان تھک کوششیں بدقسمتی سے بے سود ثابت ہوئیں۔ خود کو وولانڈ کے نام سے متعارف کرانے والا اور اس کے دیگر ساتھی اپنے بارے میں کوئی ثبوت چھوڑے بغیر غائب ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کے کسی اور جگہ ظاہر ہونے

کی بھی کوئی شہادت نہیں ملی تھی۔ نتیجتاً یہ مفروضہ عام ہوگیا کہ ولآند نامی خبیث روح شخص اپنے حواریوں سمیت ملک سے فرار ہوگیا ہے۔ لیکن وہاں بھی وہ غالباً گمنامی میں غائب ہے۔

اس کیس کی تفتیش عرصہ دراز تک جاری رہی۔ آخر کیس بھی تو غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ کم از کم چار عمارتیں جل کر راکھ ہوگئی تھیں۔ متعدد قتل بھی ہوئے تھے۔ دو افراد کے قتل کے بارے میں تو ہم یقینی طور پر جانتے ہیں۔ ایک تو مائیکل بیرلی اور دوسرا غیر ملکیوں کی سیاحت پر مامور ماضی کا نواب مائیکیل جس کی جلی ہوئی ہڈیاں فلیٹ نمبر ۵۰ میں بھڑکتی آگ پر قابو پانے کے بعد برآمد کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے لوگ حادثات سے دوچار ہوئے تھے۔

ولاند کے غائب ہونے کے بعد کچھ عرصے تک ملک میں حادثات رونما ہوتے رہے۔ ان حادثات کا شکار تھے بلّے۔ بدنصیب سیاہ رنگ کے بلّے۔

تقریباً ایک سو امن پسند اور انسان کے لئے بے حد مفید یہ جانور گولیوں اور کچھ دوسرے انتہائی ظالمانہ لوازمات قتل کے نذر ہوگئے۔ ملک کے مختلف حصوں میں پندرہ کے لگ بھگ سیاہ بلّے انتہائی بگڑی ہوئی حالت میں مقامی تھانوں میں بھی پیش کئے گئے تھے۔ مثال کے طور پر شہر ارماویر میں ایک شخص سیاہ بلّے کی اگلی دونوں ٹانگیں جکڑ کر اسے پچھلے پنجوں پر زبردستی چلاتے ہوئے پولیس سٹیشن پہنچ گیا۔

اس بلّے کو اُس وقت قابو کیا گیا تھا جب وہ چور نظروں کے ساتھ (اب کیا کہا جاسکتا ہے؟ بلّے تو دیکھے ہی چور نظروں سے ہیں۔ ان کی یہ فطرت کسی عیب کی وجہ سے نہیں ہے۔ وہ دراصل خوف زدہ رہتے ہیں کہ کہیں ان سے زیادہ طاقتور جاندار یعنی کتا اور انسان انہیں کوئی جسمانی نقصان یا ذہنی اذیت پہنچانے کی کوشش نہ کر رہے ہوں۔ ہیں تو یہ دونوں کام آسان سے، لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ یہ ہے سراسر زیادتی) ایک سٹور میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بلّے کو دبوچنے کے بعد حملہ آور شخص نے اپنی ٹائی سے اس کے اگلے پنجے باندھ لئے اور زہر آلود آواز میں بولا:

اچھا تو اب ہمارے شہر ''ارماویر'' کو شرف بخشنے آدھمکے ہو! خبیث روح ہپناٹسٹ! تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس شہر کے لوگ تم سے خوفزدہ نہیں ہیں۔ گونگا بننے کی اداکاری مت کرو۔ ہم تمہاری فن کاریوں سے بخوبی واقف ہیں۔

یہ شہری سبز رنگ کی ٹائی سے اگلے پنجوں کو باندھے غریب بلّے کو زبردستی گھسیٹتا ہوا پولیس سٹیشن لایا تھا اور راستے میں اسے بار بار جھٹکے دے کر پچھلے پنجوں پر چلنے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔

تم یہ مکاری اب بند کرو۔ شہری چیخ رہا تھا۔ جبکہ نوعمر لڑکوں کا ایک جلوس سیٹیاں بجاتا اور بلّے پر

پتھر برساتا چلا آ رہا تھا۔ ہم تمہاری حقیقت بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اٹھو! اٹھو اور عام لوگوں کی طرح پاؤں کے بل چلو!

سیاہ بلا ستم گروں کو دکھ بھری نظروں سے دیکھنے کے علاوہ کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ قوت گویائی سے محروم بے چارہ کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا تھا۔ بلے کی نجات میں پولیس کے اہلکاروں اور بلے کی مالکہ بیوہ بڑھیا کی حیوان دوستی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ جب بلے کو پولیس سٹیشن پہنچا دیا گیا تو سبز ٹائی والے کا بیان لیتے وقت اس کے منہ سے آنے والی شراب کی تیز بُو نے فوراً ہی اس کے بیان کے قابل اعتبار ہونے پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ اس دوران بیوہ بڑھیا بھی ہمسائیوں سے اپنے بلے کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا سن کر بروقت پولیس سٹیشن پہنچ گئی تھی۔ اس نے بلے کے چال چلن کے متعلق انتہائی مثبت بیان دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ بلے کو گذشتہ پانچ سال سے جانتی ہے اور حلفاً کہہ سکتی ہے کہ اس شریف الطبع جانور نے آج تک کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، نیز یہ کہ وہ کبھی ماسکو نہیں گیا۔ اس نے ارمادیر میں آنکھیں کھولیں، یہیں جوان ہوا اور یہیں پر اس نے چوہوں کا شکار کرنا سیکھا تھا۔

بلے کو ٹائی کی گرفت سے آزاد کرنے کے بعد مالکہ کو سونپ دیا گیا۔ سانس درست کرتے ہوئے بلے پر آج کے تلخ تجربے سے عملاً یہ ثابت ہوگیا تھا کہ غلطی کرنے اور بہتان لگنے کا خمیازہ کیا ہوتا ہے۔

سیاہ بلوں کے علاوہ کچھ انسان بھی غلط فہمیوں کی بھینٹ چڑھے تھے۔ کچھ لوگ گرفتار بھی ہوئے۔ لینن گراڈ میں ولان، ولام اور وولنام نامی افراد تفتیش کا نشانہ بنے جبکہ کیف اور متعدد دوسرے شہروں میں ولادین، ولاخین اور ولاتین نامی حضرات کو بھی ولاند سے نام کی مشابہت ہونے کی پاداش میں کئی کئی گھنٹے اذیت کاٹنی پڑی۔

اس کے علاوہ متعدد مقامات پر فاگوسن، فاگورن، فاگوم نامی آدمیوں کو بھی تفتیش کا سامنا کرنا پڑا۔

بیلاگور کے سٹیشن پر ایک شخص کو ہتھکڑیوں میں جکڑنے کے بعد ریل گاڑی سے اتار لیا گیا۔ وہ گاڑی میں سوار مسافروں کو تاش کے پتوں سے شعبدے دکھا کر متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جب یرسل شہر کے مشہور ریستوران میں دوپہر کے کھانے کے وقت ایک شخص بغل میں کچھ دیر قبل مرمت کروایا گیا کیروسین لیمپ دبائے پہنچا تو سیکورٹی پر مامور دونوں گارڈ سرپٹ بھاگ اٹھے۔ انہیں بھاگتا دیکھ کر وہاں کھانے میں مصروف سب مہمان اور ریستوران کے ملازمین بھی افراتفری کے عالم میں دوڑ اٹھے۔ اس دوران کوئی شعبدہ باز نجانے کس طرح خزانچی کا غلّہ خالی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے علاوہ بھی پتہ نہیں کیا کیا گل کھلتے رہے۔ تمام واقعات کو چند سطروں میں سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔

تفتیشی افسران کی بار بار تعریف کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ان غیر معمولی واقعات کی تہہ تک پہنچنے

اور مجرموں کو قابو کرنے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انہوں نے ان تھک محنت کے بعد تمام واقعات کی تفصیلات اور وجوہات معہ اپنے دلائل کے رقم کر ڈالی تھیں۔ ایمانداری سے تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام پیش کردہ وجوہات اور دلائل ٹھوس بنیادوں پر قائم کئے گئے تھے۔

تفتیشی اہلکاروں اور ذہنی امراض کے تجربہ کار ماہرین کی مشترکہ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ اس جرائم پیشہ گروہ کے تمام اراکین یا ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی ایک (سب سے زیادہ شک فاگوٹ پر کیا جا رہا تھا) ہپناٹزم کرنے کی بے پناہ خداداد صلاحیت کا مالک ہے، جس کے بل پر وہ اپنی موجودگی اس جگہ ظاہر کرسکتا ہے جہاں وہ اصل میں موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ لوگوں کو آسانی یہ باور کرانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں کہ یہ لوگ درحقیقت وہاں موجود ہی نہیں ہوتے جہاں وہ خود کو محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ اور وہ چیزیں جو نظر آ رہی ہوتی ہیں ان کے متعلق وہ ہپناٹزم کے ذریعے ذہنوں میں ایسا تاثر پیدا کردیتے ہیں کہ وہ لوگ اور چیزیں دراصل وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔

یہ وضاحت ولانڈ سے متعلقہ تمام واقعات کو (بالخصوص فلیٹ نمبر پچاس میں بلّے کا قابو میں نہ آنا اور گولیوں کا بے اثر ہونا) سمجھنے کے لئے بظاہر کافی تھی یعنی حقیقت غالباً کچھ یوں ہوگی کہ بلا دراصل فانوس پر موجود ہی نہیں تھا اور گولیاں خالی جگہ پر برسائی گئی تھیں۔ جبکہ اہلکاروں کی پشت پر کھڑا فاگوٹ اپنی ہپناٹزم کرنے کی صلاحیت کا کرشمہ دیکھ کر غرور سے اکڑ رہا ہوگا۔ فلیٹ کو آگ بھی اسی کم بخت نے لگائی ہوگی۔

اور غالباً ستپال بھی کسی یالٹا والٹا نہیں گیا ہوگا۔ الکوحل کے زیر اثر اور اپنی ہپناٹزم کی طاقت کے ذریعے فاگوٹ نے جب اس کے ذہن میں یہ تاثر پیدا کردیا کہ اس کے سامنے ایسا سیاہ بلا بیٹھا ہے جو انسانوں کے مانند چھری کانٹے سے مچھلی کھا رہا ہے تو ستپال شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے بے ہوش ہوگیا ہوگا۔ سارے ٹیلی گرام بھی فاگوٹ نے بھجوائے ہوں گے اور تفتیشی اہلکاروں کے ذہن میں ہپناٹزم کے ذریعے یہ بات نقش کرنے کے بعد کہ ستپال بحیرہ اسود کی بندرگاہ سے بذریعہ ہوائی جہاز ماسکو پہنچ رہا ہے اسے چالاکی کے ساتھ ایئرپورٹ چھوڑ دیا ہوگا۔

لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یالٹا کے پولیس اہلکار اس بات پر بضد تھے کہ ستپال واقعی پولیس سٹیشن آیا تھا اور انہوں نے ہی ماسکو پولیس اور ورائٹی تھیٹر کی انتظامیہ کے ساتھ ٹیلی گراموں کا تبادلہ کیا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بطور ثبوت ایک بھی ٹیلی گرام کی کاپی پیش نہ کرسکے۔ اس صورت حال کی وضاحت میں بھی طویل فاصلے تک اثر کرنے والے ہپناٹزم کا حوالہ دیا گیا۔ حقیقت یہی لگتی تھی کہ یہ طاقتور ہپناٹزم نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی طور پر بھی مسلط کیا جاسکتا ہے اور یقینی طور پر اس بے پناہ صلاحیت کے مالک جرائم پیشہ لوگ کسی بھی ہوش مند انسان کا دماغ خراب کرسکتے ہیں۔

ان واقعات کی روشنی میں تھیٹر میں نظر آنے والے شعبدے ،مثلاً تاش کے پتوں کی گڈی کا تماشائی کی جیب سے برآمد ہونا یا زنانہ سکرٹ کا غائب ہوجانا، یا پھر کرنسی نوٹوں کا برسنا،معمولی نوعیت کی جادوگریاں محسوس ہوتی ہیں۔ اس معیار کے شعبدے غالباً کوئی بھی درمیانہ صلاحیت کا مالک ہپناٹسٹ پیش کرسکتا ہے۔تھیٹر کے میزبان بینگالی کا سرتن سے الگ کردینا بھی غالباً ایک سستا سا شعبدہ تھا۔ باتیں کرنے والا بلا بھی یقیناً ہپناٹزم سے متاثر ذہن کی ایک اختراع تھا۔تماشائیوں کے سامنے اس قسم کا شعبدہ پیش کرنے کے لئے مصنوعی صوتی اثرات پیدا کرنے کی صلاحیت کے بنیادی اصولوں سے واقفیت ہی کافی ہے۔صاف ظاہر ہے کہ فاگوٹ ان صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔

نکانور کے بیگ سے جعلی کاغذات اور نوٹوں کا برآمد ہونا بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔اسی فاگوٹ نے مائیکل بیرلی کو ٹرام کے پہیوں تلے دھکیلا ہوگا۔ اسی فاگوٹ نے بیچارے شاعر ایوان بے گھر کے دماغ میں بذریعہ ہپناٹزم خلل پیدا کر کے اسے اپنے اذیت ناک خوابوں میں قدیم یروشلم اور سورج کی تپش سے دہکتی کل وری پہاڑی پر تین صلیبوں پر لٹکتے جسم دیکھنے پر مجبور کیا ہوگا۔

غالباً اسی فاگوٹ اور اس کے ساتھیوں نے مارگریتا اور اس کی ملازمہ نتاشا کو ماسکو سے غائب کردیا تھا۔کیس کی اس کڑی کو سراغ رساں اداروں کے اہلکاروں کی خصوصی توجہ حاصل تھی۔ اس پہلو پر بھی غور کیا جارہا تھا کہ آیا یہ خواتین قاتلوں اور آتش زنی کرنے والے مجرموں کے گروہ کے ہاتھوں اغوا ہوئی تھیں یا پھر اپنی رضامندی سے ان کے ساتھ فرار ہوئی تھیں۔نکولائی کا بے ربط بیان، مارگریتا کا اپنے شوہر کے نام تحریر کردہ بے معنی رقعہ ,جس میں اُس نے اپنے چڑیل میں تبدیل ہونے کا دعویٰ کیا تھا، اور نتاشا کا اپنی تمام چیزیں چھوڑ کر غائب ہوجانا، اس مفروضے کی تائید کررہے تھے کہ یہ تینوں افراد بھی دوسرے تمام متاثرین کے مانند طاقت ور ہپناٹزم کا شکار ہوئے تھے۔ان خواتین کا غیر معمولی طور پر خوبصورت ہونا بھی مجرموں کے ہاتھوں اغوا ہونے کی ایک بڑی وجہ معلوم ہوتا تھا۔

ایک بات قطعی طور پر ناقابل فہم اور ناقابل وضاحت تھی۔اور وہ بات تھی ماسٹر نامی ذہنی مریض کا نفسیاتی ہسپتال سے ہپناٹزم کے ماہر جرائم پیشہ گروہ کے ہاتھوں غائب ہونا۔ یہ بات سمجھ سے بالا تھی کہ مجرموں کو ایک ذہنی مریض سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب ملنا ناممکن ثابت ہوا اور نہ ہی ماسٹر کا اصل نام معلوم ہوسکا تھا۔اس کی اچانک موت کے بعد دستاویزات میں نام کے خانے میں نمبر ۱۱۸ درج کردیا گیا تھا۔

چند سال گزرنے کے بعد ولانداور فاگوٹ وغیرہ کی یادیں مدہم پڑنی شروع ہوگئیں۔ان شیطانی قوتوں کی خباثت کا شکار ہونے والے لوگوں کی زندگی یکسر تبدیل ہوکررہ گئی تھی۔ان تبدیل شدہ شخصیات کا

ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔

ورائٹی تھیٹر کا مشہور میزبان بینگالسکی علاج گاہ میں تین مہینے گزارنے کے بعد صحت یاب ہو گیا اور گھر واپس لوٹ آیا۔ لیکن تھیٹر کی ملازمت اس نے ترک کر دی تھی۔ کیونکہ ہر شام دو ہزار تماشائیوں کے سامنے بسا اوقات بلاوجہ ہنسنا، مسکرانا اور اس تکلیف دہ سوال کا سامنا کرنا کہ سر کے بغیر انسان کیسا محسوس کرتا ہے، یقیناً ایک اذیت ناک عمل تھا۔ ویسے بھی وہ بے چارہ مزاح کی حس تقریباً کھو چکا تھا اور اس کے بغیر سٹیج پر میزبانی کے فرائض ادا کرنا ناممکن تھا۔

موسم بہار میں پورے چاند کی رات بینگالسکی کے لئے کسی قیامت سے کم نہیں ہوتی تھی۔ اس رات اس کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی گردن مضبوطی سے تھامے خوف زدہ نظروں کے ساتھ ارد گرد دیکھتے ہوئے رونے لگتا تھا۔ دورے کی کیفیت چند گھنٹوں میں ٹھیک تو ہو جاتی تھی لیکن اس کی ذہنی حالت بہت دنوں تک ہیجانی رہتی تھی۔ اس دوران کسی تخلیقی کام کے متعلق سوچنا بھی بے وقوفی کی بات تھی۔ اس لئے بینگالسکی نے اپنی ''پس پشت'' جمع کردہ پونجی پر گزارہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی کفایت شعاری کی عادت کو مدنظر رکھا جائے تو یہ پونجی آئندہ کم از کم پندرہ سال کے لئے کافی تھی۔

تھیٹر کو اس نے ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا تھا۔ وہ تھیٹر میں اپنے سب سے بڑے مداح وریام کو بھی کبھی ملنے نہیں گیا تھا۔ وریام اس دوران تھیٹر کے ملازمین اور تماشائیوں میں اپنی غیر معمولی شائستگی کے لئے بہت مشہور ہو گیا تھا۔ ٹکٹ فروش عملے نے تو اسے ''شفیق پاپا'' کے نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ جب کبھی، جس کسی نے بھی تھیٹر میں فون کیا تو ہمیشہ ایک میٹھی لیکن اداس آواز نے اس کا استقبال کیا۔ ''جی میں ہمہ تن گوش ہوں''۔ اور وریام سے بات کرانے کا سن کر اسی شیریں لہجے میں جواب ملتا۔ ''جی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں''۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نوعیت کی شائستگی وریام کو اکثر اوقات بہت مہنگی پڑتی تھی۔

ستپال کو اپنی باقی ماندہ زندگی میں ورائٹی تھیٹر میں بجنے والے ٹیلیفون سننے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ ہسپتال میں سات دن گزارنے کے بعد اسے وہاں سے چھٹی مل گئی اور اسی روز اسے ورائٹی تھیٹر سے بھی چھٹی کا پروانہ تھما دیا گیا تھا۔ چند دنوں کے بعد اسے ایک دور افتادہ شہر کے شاپنگ سنٹر کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ شنید ہے کہ اس نے سستی قسم کی شراب پینا بالکل ترک کر دیا تھا۔ اب وہ صرف اور صرف اعلیٰ درجے کی ووڈکا استعمال کرتا تھا جس کی بدولت اس کی صحت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ اب اس نے خواتین سے بھی کترانا شروع کر دیا تھا۔

ستپال کا تھیٹر کی ملازمت سے برخاست کیا جانا وہ لمحہ تھا جس کا فنانس ڈائریکٹر رمیض گذشتہ کئی سالوں سے منتظر تھا، لیکن اب جبکہ اس کی دیرینہ امید بر آنے والی تھی تو وہ بے چارہ اس سے مستفید ہونے

سے قاصر تھا۔ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اس رعشہ زدہ سفید بالوں والے، چند ہی دنوں میں بوڑھا ہو جانے والے شخص نے ورائٹی تھیٹر کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ استعفیٰ رمیض کی بیوی نے انتظامیہ کو پہنچایا کیونکہ فنانس ڈائریکٹر میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دن کی روشنی میں بھی اس عمارت میں داخل ہو سکتا، جس کی چاندنی میں نہائی نیم روشن کھڑکی سے ایک لمبا ہوتا ہوا ہاتھ چٹخنی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ورائٹی تھیٹر سے فارغ ہونے کے بعد فنانس ڈائریکٹر نے ماسکو کے مضافاتی علاقے میں بچوں کے ایک پتلی تھیٹر میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہاں اسے دیگر قباحتوں کے علاوہ کمپنی کے مہذب ترین رکن اپالون سے بھی چھٹکارا مل گیا تھا۔ اس محترم شخصیت کو بھی اس کے بلند مقام سے نیچے اتار لیا گیا اور ایک زرعی فارم پر کھمبیاں محفوظ کرنے کی فیکٹری کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔

تھیٹر سے تعلق توڑنے والوں میں تھیٹر کے باقاعدہ ملازمین کے علاوہ نکانور بوس بھی شامل تھا۔ حالانکہ اس کا تھیٹر سے مفت کی ٹکٹ پر شو دیکھنے کے علاوہ اور کوئی تعلق نہیں تھا لیکن آج کل وہ نہ صرف پیسے خرچ کرنے سے گریزاں ہے بلکہ مفت ٹکٹ پر بھی تھیٹر جانے کو تیار نہیں ہے۔ تھیٹر کا ذکر ہوتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ تھیٹر کے علاوہ مشہور شاعر پشکین اور مایہ ناز فن کار ساوا بھی نکانور کی نفرت کا نشانہ بنے تھے۔ خصوصاً ساوا سے تو وہ اس حد تک متنفر ہو گیا تھا کہ اخبار میں اس کی موت کی خبر دیکھ کر جوش سے اس کا رنگ جامنی ہو گیا اور وہ ہوا میں مکا لہراتے ہوئے بولا۔ ''بالکل ٹھیک ہوا ہے۔ یہی تمہارا علاج ہے''۔ یہ خبر پڑھنے کے بعد نکانور کی کچھ تلخ یادیں اس طرح تازہ ہو گئی تھیں کہ وہ سرشام پورے چاند کی روشنی میں نہائے باغیچے میں اکیلا بیٹھا شراب کے نشے میں دھت ہو گیا تھا۔ شراب کے ہر جام کے ساتھ اس کے سامنے نفرت انگیز سایوں کا سلسلہ لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ ان سایوں میں نکانور کے خواب میں نظر آنے والے غیر ملکی کرنسی کا ناجائز کاروبار کرنے والے لوگ، سونے کی اینٹیں اور ہیرے چھپانے والے اور اس خوف ناک تھیٹر میں موجود دوسرے کرداروں کے علاوہ فن کار ساوا کا سایہ بھی شامل تھا۔ لیکن ماسوا ساوا کے دوسرے تمام کردار تو غالباً نکانور کے اپنے ذہن کی اختراع تھے۔ واحد شخص جسے نکانور بقائمی ہوش و حواس میں دیکھ چکا تھا وہ ساوا ہی تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ صرف ساوا ہی حقیقت میں موجود تھا اور بقیہ تمام لوگ نہ صرف خواب میں بلکہ حقیقی زندگی میں بھی محض سائے ہی تھے۔

اسی طرح ممکن ہے کہ الوزی مگارچ کا بھی وجود نہیں تھا؟

ارے نہیں! مگارچ نہ صرف ماضی میں مسلمہ حقیقت تھا بلکہ آج بھی موجود ہے۔ وہ آج کل رمیض کی جگہ ورائٹی تھیٹر کا فنانس ڈائریکٹر ہے۔ ولاند سے ملاقات کے تقریباً چوبیس گھنٹے بعد الوزی مگارچ

ہوش میں آیا تو وہ خود کو ماسکو سے کئی سو میل دور ایک ریل گاڑی کے ڈبے میں پا کر ششدر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صرف جانگیہ اور بنیان پہنے گھر سے دور گاڑی میں کس مقصد کے تحت سوار ہے۔ وہ یہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ بلڈنگ آفس کے رجسٹرار کا کتابچہ چرانے کی اسے کیا ضرورت تھی۔ وہ ریل گاڑی کے ایک سٹیورڈ سے بھاری رقم کے عوض ایک میلی کچیلی بوسیدہ پتلون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ماسکو واپس پہنچ کر اس نے تہہ خانے والی رہائش گاہ میں واپس جانے کی کوشش نہیں کی۔ تقریباً دو ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ شہر کے ایک صاف ستھرے علاقے میں فلیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور جلد ہی اس نے ورائٹی تھیٹر کے فنانس ڈائریکٹر کی کرسی بھی قابو کر لی تھی۔ وریام اس نووارد فنانس ڈائریکٹر کے لئے ویسے ہی منفی جذبات رکھتا تھا جیسے سابقہ فنانس ڈائریکٹر رمیض اور تھیٹر کے ڈائریکٹر ستپال کے لئے رکھا کرتا تھا۔ نجی محفلوں میں وریام کو اکثر یہ سرگوشی کرتے سنا جا سکتا تھا۔ ''نئے فنانس ڈائریکٹر سے بڑا خنزیر میں نے آج تک نہیں دیکھا''۔

ویسے عین ممکن ہے کہ ایڈمنسٹریٹر وریام کی مگارتچ کے لئے نفرت بے بنیاد ہی ہو کیونکہ فنانس ڈائریکٹر کینٹین کے نئے انچارج کی تقرری کے سوا بظاہر کسی بے قاعدگی میں ملوث نہیں پایا گیا تھا۔ اس تقرری کی ضرورت بھی اس لئے پیش آئی تھی کہ ولاند کے غائب ہونے کے تقریباً نو مہینے بعد کینٹین کے سابقہ انچارج کی سٹیٹ یونیورسٹی ہسپتال میں جگر کے کینسر سے موت واقع ہو گئی تھی۔

چند سال بیت جانے کے بعد اس کتاب میں بیان کردہ تقریباً حقیقت پر مبنی واقعات کی یادیں سب لوگوں کے ذہنوں سے مٹنی شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن نہیں، سب کے نہیں! سب کے نہیں!!

ہر سال موسم بہار میں پورے چاند کی رات شہر کے وسط میں ایک ہی مخصوص جگہ پر ایک تیس سالہ یا شائید اس سے کچھ زیادہ عمر کا سنہری بالوں اور سبز آنکھوں والا صاف ستھرے لباس میں ملبوس آدمی دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ تھا تاریخ اور فلسفے کے انسٹی ٹیوٹ کا پروفیسر ''ایوان پانیز''۔

خوشبو سے مہکتے درخت تلے وہ ہمیشہ اُسی بنچ پر بیٹھتا تھا، جس پر بیٹھے اس نے کبھی، سب کے فراموش کردہ مائیکل بیرلی کو زندگی میں آخری مرتبہ کئی ٹکڑوں میں منقسم چاند کا نظارہ کرتے دیکھا تھا۔ لیکن اب چاند مکمل ہوتا ہے۔۔ سرشام سفیدی مائل اور رات گئے پوری طرح چھا جانے کے بعد سنہری۔ سابقہ شاعر ایوان بے گھر کے سر کے اوپر چاند دھیرے دھیرے تیرتا ہوا اور شائید بیک وقت ایک ہی جگہ ایک ہی فاصلے پر ساکت، منجمد شدہ بھی ہوتا ہے۔

ایوان کو ہر بات کا علم ہے اور وہ ہر بات کو سمجھتا بھی ہے۔ اسے بخوبی معلوم ہے کہ نوعمری میں وہ کچھ جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں ہپناٹزم کا شکار ہو گیا تھا۔ جس کے مضر اثرات کی وجہ سے اسے کافی عرصہ تک

زیرِ علاج رہنا پڑا تھا اور بالآخر وہ صحت یاب ہو ہی گیا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کچھ چیزیں آج بھی اس کے بس میں نہیں ہیں۔ مثلاً موسم بہار کے پورے چاند کی آمد کے ساتھ ہی طبیعت کا غیر ہو جانا تو کسی صورت بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ جوں جوں یہ رات قریب آتی ہے توں توں اس کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ اعصابی تناؤ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ بھوک، پیاس اور نیند غائب ہو جاتی ہے اور پورے چاند کی رات کوئی بھی طاقت اسے گھر میں قید نہیں رکھ سکتی۔ وہ سرِ شام ہی اپنے مانوس بنچ پر جا بیٹھتا ہے۔ بنچ پر بیٹھے بیٹھے ایوان خود سے بلا حجاب ہم کلام ہو جاتا ہے، تمبا کو نوشی کرتا ہے اور بار بار چاند کو گھورتا ہے۔

ایک دو گھنٹے بیٹھے رہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ہمیشہ ایک ہی راستے سے ہوتا ہوا وسطی شہر کی گلیوں میں اندھوں کی طرح ٹھوکریں کھاتا گھومتا رہتا ہے۔

وہ مٹی کے تیل کے ڈپو کے نزدیک سے گزرتا ہوا دائیں جانب مڑ جاتا ہے اور اپنی اصل جگہ سے قدرے کھسکے ہوئے قمقمے کی روشنی میں سیاہ رنگ کے آہنی جنگلے سے چپک جاتا ہے جہاں سے اسے سبزے اور پھولوں سے لدا باغیچہ دکھائی دیتا ہے۔ باغیچے کے دوسری جانب ایک خوبصورت فنِ تعمیر کا نمونہ، پروقار دو منزلہ عمارت دکھائی دیتی ہے۔

پروفیسر خود نہیں جانتا کہ اسے کون سی غیبی طاقت اس باغیچے اور عمارت کی جانب کھینچ لاتی ہے۔ لیکن وہ یہ ضرور جانتا ہے کہ اس پورے چاند کی رات اس کا اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہر سال اس باغیچے میں اسے ہمیشہ ایک ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔

ہر سال باغیچے کے درمیان، بنچ پر ایک باریش، عمر رسیدہ جسیم شخص بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے چہرے کے خدوخال میں کہیں کہیں سور کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایوان اس آدمی کو ہمیشہ ایک ہی انداز میں چاند پر ٹکٹکی لگائے پاتا ہے۔ ایوان کو یہ بھی معلوم ہے کہ کچھ دیر چاند کا نظارہ کرنے کے بعد یہ شخص اپنی تمام تر توجہ کسی انہونی کے انتظار میں دوسری منزل کی ایک کھڑکی پر مرکوز کر دیتا ہے۔

اس شخص کی ایک ایک حرکت ایوان کو پہلی جماعت کے سبق کی طرح یاد ہو چکی ہے۔ کھڑکی سے توجہ ہٹنے کے بعد بنچ پر بیٹھا شخص بے چینی کے عالم میں اپنا سر ادھر ادھر گھمانا شروع کر دیتا ہے اور بے قرار نگاہوں سے ہوا میں کچھ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ پھر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیئے بڑبڑانے لگتا ہے۔

پری! پری!۔۔۔۔۔۔۔اوہ میں کیسا بے وقوف ہوں!

اوہ میرے خدا! اوہ میرے خدا! جنگلے کے پیچھے سے اس پراسرار نامعلوم شخص پر نظریں مرکوز کئے ایوان سرگوشی میں بولتا ہے۔ یہ رہا چاند کا ایک اور شکار۔ جی ہاں بالکل میری مانند چاند کا ایک اور شکار۔ جبکہ اس دوران بنچ پر بیٹھا شخص اپنی بات جاری رکھتا ہے۔

اوہ میں بے وقوف! کیوں نہیں اُڑ گیا اُس کے ساتھ؟ کس بات سے میں بوڑھا گدھا ڈر گیا تھا؟ وہ اپنے آپ کو کوستا رہتا ہے۔

اس کی گفتگو تب تک جاری رہتی ہے جب تک عمارت کی پہلی منزل کی ایک کھڑکی میں کچھ سفید سا دکھائی نہیں دیتا۔ جس کے بعد ایک بھدی سی زنانہ آواز سنائی دیتی ہے۔

نکولائی آپ کہاں ہو؟ یہ کیسی معرکہ آرائی ہے؟ تم کیا ملیریا زدہ مچھروں کی تلاش میں ہو؟ آؤ چائے پی لو! یہ آواز سنتے ہی اس کی بڑبڑاہٹ رک جاتی ہے اور وہ جھوٹ سے لبریز آواز میں جواب دیتا ہے۔

تازہ ہوا۔ تازہ ہوا میں سانس لینے نکلا ہوں میری جان! آج ہوا بہت صاف ہے۔

یہ کہنے کے بعد وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور غصے میں بند کھڑکی کی جانب مکہ لہراتا ہوا گھر کے اندر چلا جاتا ہے۔

جھوٹ بولتا ہے! جھوٹ بولتا ہے! ایوان جنگلے سے ہٹنے کے بعد کہتا ہے۔ کسی تازہ ہوا کے چکر میں نہیں نکلا وہ۔ اِس پورے چاند کی رات اسے باغیچے کی فضا میں معلق کچھ دکھائی دیتا ہے۔ اس کا راز جاننے کے لئے میں کوئی بھی قیمت چکانے کو تیار ہوں۔ کاش میں کبھی جان سکوں کہ آخر وہ کون سی پری ہے جسے کھو دینے کے بعد وہ اتنا بے چین ہے۔

گھر واپسی پر ایوان شدید بیمار دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بیوی اس حالت کو بظاہر نظر انداز کرتی ہے اور اسے جلدی سے بستر میں لیٹا دیتی ہے۔ جبکہ وہ خود کتاب پڑھنے کے بہانے کرسی پر بیٹھی غمناک نگاہوں سے سوتے ہوئے ایوان کو دیکھتی رہتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ پو پھٹتے ہی ایوان ایک کرب ناک چیخ کے ساتھ جاگ اٹھے گا اور زور زور سے روتا ہوا تڑپنے لگے گا۔ اسی لئے وہ اپنے سامنے میز پر قہوے کی مانند گاڑھے رنگ کی دوا سے بھری سرنج تیار رکھتی ہے۔

اس شدید بیمار آدمی سے منسلک یہ بے چاری عورت اب آزاد ہو جاتی ہے اور بلا خوف سو سکتی ہے۔ ایوان اب دیر تک پر سکون چہرے کے ساتھ سوتا رہے گا اور اس دوران متعدد لوگ جو اس عورت سے نا آشنا ہیں ایوان کے خواب میں نمودار ہوتے رہیں گے۔

پورے چاند کی رات پروفیسر ایوان کے چیخ کر جاگ اٹھنے کی ہمیشہ ایک ہی وجہ ہوتی ہے۔ اسے ایک کٹی ناک والا، غیر معمولی حد تک بھیانک جلاد دکھائی دیتا ہے جو اپنی جگہ سے اچھل کر صلیب پر لٹکے بدحواس گیستاس کے دل میں نیزہ اتار دیتا ہے۔ خواب میں جلاد سے بھی زیادہ غیر معمولی وہ روشنی دکھائی دیتی ہے جو کسی بادل کے ٹکڑے سے نمودار ہوتی ہے اور جیسا کہ عموماً قدرتی آفات کے دوران ہوتا ہے، بادل کا یہ ٹکڑا ابلنے کے بعد زمین پر چھلکنا شروع ہو جاتا ہے۔

ٹیکہ لگنے کے بعد ایوان کے سامنے پھیلا منظر یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ بستر سے کھڑکی تک چاندنی سے بنا ایک راستہ بچھ جاتا ہے اور اس راستے پر خونی آستین والا لمبا سفید کوٹ پہنے مغرور چہرے والا ایک شخص چاند کی جانب بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بوسیدہ لباس پہنے، شدید زخمی چہرے والا ایک نوجوان بھی نظر آتا ہے۔ وہ دونوں کسی گرما گرم بحث میں الجھتے ہوئے چاند کی جانب گامزن نظر آتے ہیں۔

او خدایا! او خدایا! مغرور چہرے والا اپنے ہمسفر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ کیسی غیر منصفانہ اور فرسودہ پھانسی تھی! لیکن تم تو بخوبی جانتے ہو! بتاؤ! خدارا بتاؤ مجھے! یہ کہتے ہوئے مغرور چہرہ ایک ملتجی چہرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نہیں ہوئی تھی! خدارا کہہ دو کہ پھانسی نہیں ہوئی تھی۔

نہیں ہوئی تھی۔ زخمی چہرے والا پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیتا ہے۔ یہ محض تمہارا وہم ہے۔

تم یہ قسم کھا کر کہہ سکتے ہو؟ سفید کوٹ والا ہکلاتے ہوئے پوچھتا ہے۔

قسم کھاتا ہوں۔ زخمی چہرے والا جواب دیتا ہے۔ اور نجانے کیوں اس کی آنکھوں سے مسکراہٹ جھلکنے لگتی ہے۔

بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے! سفید کوٹ والا روہانسی آواز میں یہ کہنے کے بعد اپنے ہمسفر کے ساتھ تیزی سے چاند کی سمت بڑھنا شروع کر دیتا ہے اور ایک نوکدار لمبے کانوں والا جسیم کتا خاموشی سے ان دونوں کا پیچھا کرتا چلا جاتا ہے۔

چاندنی سے بنا راستہ روشنی کے پھیلتے ہوئے دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جس کی لہریں کناروں سے باہر چھلکنے لگتی ہیں۔ چاند سب پر راج کرتا نظر آتا ہے۔ چاند رقص کرتا نظر آتا ہے۔ چاند مستی میں جھومتا نظر آتا ہے۔

چاندنی کے دریا سے ایک غیر معمولی طور پر خوبصورت عورت ایک بکھرے ہوئے بالوں والے خوف زدہ آدمی کا ہاتھ تھامے نمودار ہوتی ہے اور وہ دونوں ایوان کی جانب بڑھتے ہیں۔ ایوان فوراً ہی اس شخص کو پہچان لیتا ہے۔ یہ تو وہی ہے۔ نمبر ۱۱۸۔ اس کا ہمسایہ۔ ایوان خواب میں اس کی جانب ہاتھ بڑھاتا ہے اور پر تجسس انداز میں پوچھتا ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ کہانی یہیں پر ختم ہو گئی؟

کہانی یہیں پر ختم ہو گئی۔ میرے عزیز شاگرد! نمبر ۱۱۸ جواب دیتا ہے۔ جبکہ عورت ایوان کے قریب پہنچ کر کہتی ہے۔

جی ہاں۔ بالکل یہیں پر۔ یہیں پر کہانی ختم ہوتی ہے۔ اب میں آپ کی پیشانی پر بوسہ دوں گی اور آپ کی زندگی میں ہر چیز آپ کی خواہش کے مطابق ہو جائے گی۔

وہ ایوان پر جھک جاتی ہے اور اس کی پیشانی چوم لیتی ہے۔ ایوان خاتون کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا اس کی جانب لپکتا ہے لیکن وہ پیچھے ہٹ جاتی ہے اور اپنے ساتھی کے ہمراہ چاند کی جانب روانہ ہو جاتی ہے۔

چاند ایوان کی خواب گاہ میں اتر آتا ہے اور اپنی کرنیں چاروں جانب بکھیرنی شروع کر دیتا ہے۔ کمرے میں چاندنی کا سیلاب آ جاتا ہے۔ روشنی ٹھاٹھیں مارتی بلند سے بلند ہوتی جاتی ہے۔ ایوان اپنے بستر سمیت پوری طرح اس میں ڈوب جاتا ہے اور اسی لمحے ایوان پر سکون چہرے کے ساتھ اطمینان کی نیند سو جاتا ہے۔

صبح بیدار ہونے پر وہ خاموش طبع ہونے کے باوجود مکمل طور پر صحت مند اور پر سکون ہوتا ہے۔ اس کی تلخ یادیں دھیمی پڑ جاتی ہیں۔ آئندہ پورے چاند کی رات تک کوئی بھی اس کے سکون میں مخل نہیں ہوتا ۔۔ نہ ہی گیستاس کا کئی ناک والا قاتل اور نہ ہی یہودیہ کا پانچواں سنگدل قاضی پونتی پلات۔
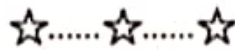
پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ
کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
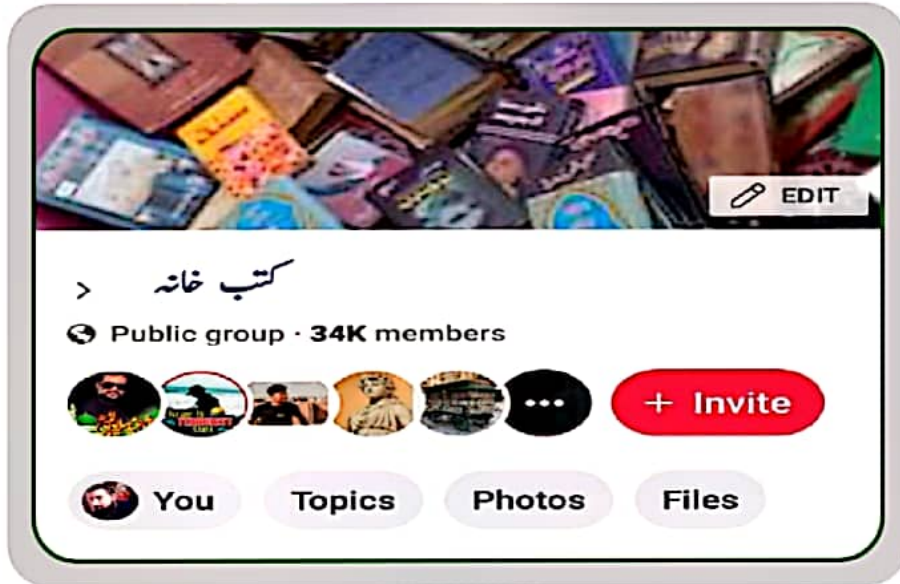
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

مجموعے

کتاب	مصنف
مجموعہ محمد حسن عسکری: (انسان اور آدمی، ستارہ یا بادبان، وقت کی راگنی، جھلکیاں، ...)	محمد حسن عسکری
مجموعہ شفیق الرحمٰن: پچھتاوے، مزید حماقتیں، دجلہ، دریچے، انسانی تماشہ	شفیق الرحمٰن
مجموعہ شفیق الرحمٰن: کرنیں، شگوفے، لہریں، مدوجزر، پرواز، حماقتیں	شفیق الرحمٰن
مجموعہ احمد ندیم قاسمی: درودیوار، گھر سے گھر تک، کپاس کا پھول، کوہ پیما، آبلے...	احمد ندیم قاسمی
مجموعہ احمد ندیم قاسمی: آنچل، آس پاس، بازارِ حیات، بگولے، برگِ حنا، نیلا پتھر، سناٹا	احمد ندیم قاسمی
مجموعہ قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا، چاندنی بیگم، میرے بھی صنم خانے	قرۃ العین حیدر
مجموعہ ڈاکٹر محمد یونس بٹ: بٹ پارے، بٹ تمیزیاں، مزاح پرسی، نوک جوک...	ڈاکٹر محمد یونس بٹ
مجموعہ انتظار حسین: گلی کوچے، کنکری، دن اور داستان، آخری آدمی، شہرِ افسوس، کچھوے، خیمے سے دُور...	انتظار حسین
مجموعہ عبداللہ حسین: اُداس نسلیں، باگھ، قید، رات، نشیب	عبداللہ حسین
مجموعہ مُنشی پریم چند: گئودان، غبن، میدانِ عمل (ناول)	مُنشی پریم چند
مجموعہ مُنشی پریم چند: (افسانے)	مُنشی پریم چند
مجموعہ مُنشی پریم چند: جلوۂ ایثار، نرملا، چوگانِ ہستی، منورما، بیوہ، روٹھی رانی (ناول)	مُنشی پریم چند
مجموعہ مرزا ہادی حسن رسوا: (امراؤ جان ادا، مرقع لیلیٰ مجنوں، اختری بیگم، شریف زادہ)	مرزا ہادی حسن رسوا
مجموعہ راشد الخیری: (صبحِ زندگی، شامِ زندگی، شبِ زندگی، نوحۂ زندگی، فسانۂ سعید، نالۂ زار)	راشد الخیری
ناول افسانے: (تمغۂ شیطانی، ماہِ عجم، عروسِ کربلا، شاہین و دُرّاج، وِدِ شہوار، آفتابِ دمشق، ...)	راشد الخیری
مجموعہ عظیم بیگ چغتائی: مضامین، داستان، ڈرامے، افسانے	تدوین: صلاح الدین محمود
مجموعہ عظیم بیگ چغتائی: ناول، ناولٹ	تدوین: صلاح الدین محمود
مجموعہ عاشق حسین بٹالوی: (تاریخ اور افسانہ)	عاشق حسین بٹالوی
مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد: (ابن الوقت، توبۃ النصوح، بنات النعش، فسانۂ مبتلا، ...)	ڈپٹی نذیر احمد
مجموعہ ڈاکٹر انور سجاد	ڈاکٹر انور سجاد
مجموعہ سیّد رفیق حسین (آئینۂ حیرت، افسانے، مضامین، شخصی تاثرات)	سیّد رفیق حسین
مجموعہ آغا حشر (ڈرامے)	آغا حشر کاشمیری
مجموعہ نثار عزیز بٹ (نگری نگری پھرا مسافر، نے چراغے نے گلے، کاروانِ وجود، دریا کے سنگ)	آغا حشر کاشمیری

Rs. 990.00

www.sangemeel.com

ISBN-10:969-35-2458-6
ISBN-13:978-969-35-2458-1
9 789693 524581